

تحریر

علمی مجلسِ دینی کا تہماہی رسالہ

شمارہ ۱

۱۹۷۲ء

جلد ۶

۲	ملاحظات محکمہ آثارِ قدیمہ	مالک لام ضیاء الدین دیبائی
۳	تاریخ تہذیب و تمدن کا آغاز تذکرہ عثمانیہ جاسوزیں	حکم چند نیر
۴۱	غالب اداس کے معاصرین	سید اکبر علی نوری
۵۷	غالب اور سفیرِ ہرات	مالک رام
۶۱	ذنیات	

دہ سالانہ (مع محصولِ جبری ٹوak) ۱۵ روپے
غیر مالک: ۲۲ پونڈ انگریزی یا ۷ ٹوال امریکی
اس شمارے کی قیمت ۵ روپے

پرنٹر و پبلشر ظہیر عباس عباسی نے کہ نوڈ پریس ہال کنواں دہلی سے چھپوا کر دفتر علمی مجلس
۱۳۲۹ ہجرتہ قمریہ صاحبِ نواخذہ دہلی سے شائع کیا۔

غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب

نا کردہ گنا ہی بھی پوئی کردہ گنا ہی
عشر میں تمہیں جو رکی پوش کا ہو کیا تو
یہ حال ہے دنیا کا تو جاقظ ہو خدا ہی
تم کو تو بچا لگی یہ معصوم گنا ہی

اہل دنیا سے جواب مطلب دنیا سے غرض
تم نہیں نشین نہیں پھر بھی پئے جاتا ہو میں
اپنے ہی دل میں بسائی ہم نے اک دنیا
میرے سارے نہیں ہوتی کبھی صبا تک

سارے کو تو دنیا کی گناہوں سے چھالو
ہم جلوہ گر ناز کے پردے تو اٹھا دیں
ہاسن کے جو جتنے ہیں پھیلے نہیں جاتے
انکھوں کے جو چہرے ہیں اٹھائے نہیں جاتے

ابھی تو اشک ہی ٹپکے ہیں دیدہ تر سے
عجب نہیں کہ جنوں ادھی کو سے چپک
رگ جیات سے ٹپکا ہوا تو کیا ہوگا
ہمارے صبر کا دامن روتو کیا ہوگا

موت کی روک تھام کر یا رہیڈ
نارے گئے سے تھوڑا کیا ہوگا
یہ تو ہر ایک پر چھپتی ہے
کٹتے کٹتے ہی رات کٹتی ہے

اللہ کی تو کیا بات پر حرف آ نہیں سکتا
اسرارِ حقیقت کوئی جانے بھی تو کیونکر
بس وعدہ بطل کو بھی جھٹلا نہیں سکتا
جو اب کو سمجھتا ہے وہ نہیں سکتا

ملاحظات

سش شمار سے کے ساتھ تحریر اپنی زندگی کے چھ برس میں داخل ہو رہا ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ ایسا ثقہ مزاج کا پرچہ اتنی مدت زندہ کیسے رہ گیا! یہ تو ظاہر ہے کہ تحریر عام روش کا رسد نہیں ہے، اس کے مضامین بھی متوسط سطح سے بلند تر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر یہ آج تک جاری ہے، تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس کا خریداروں کا حلقہ وسیع ہے، یا ہم اس کے مالی پہلو سے مطمئن ہیں۔ بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خریدار بھی کافی نہیں؛ اور ہر پرچہ جو شائع ہوتا ہے، وہ ہمارے خزانہ میں اضافے کا بھی باعث ہوتا ہے۔ ہر حال میں یہ دیکھنا ہے کہ کب تک ہمارے قدر دانوں کو اپنے فرض کا احساس نہیں ہوتا، اور وہ ہمیں اپنے تعاون سے محروم رکھے ہیں۔ یا پھر ہماری مالی حالت کب اتنی سقیم ہو جاتی ہے کہ ہم اس ذہنی عیاشی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پرچے کے ساتھ ہم ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔

اردو کے علمی پیرچوں میں (اور بد قسمتی سے ان کی تعداد ہی کتنی ہے؟) بالعموم ان موضوعات سے سروکار نہیں رکھا جاتا جن کا براہ راست اردو سے تعلق نہیں۔ میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جب تک ہماری زبان میں مختلف موضوعات پر وافر مواد مہیا نہیں ہو جاتا، جس سے ہر طرح کے قاری کو اپنی ضرورت کی چیز دستیاب ہو سکے، ہم کسی عنوان اردو کو ترقی یافتہ زبانوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ انار قدیمہ پر مضمون اسی مقصد کے پیش نظر شائع کیا جا رہا ہے۔ ایسے فاکٹر ضیا الدین ڈیساٹی نے ہماری درخواست پر قلمبند کیا ہے۔ چونکہ ان کی پوری عمر اسی دہشت کی سیاحتی میں گزری ہے، اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی کمی یا خامی نہیں رہ گئی ہے۔ خدا کرے، یہ قارئین کے بھی پسندیدہ موضوعات ہوں!

اگر احباب نے یہ اقدام پسند کیا، تو یہاں بعض اور عنوانات پر بھی خاص مضمون لکھوانے اور شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

مالک رام

بے ہوشی کی شکایت کیا کریں
 اب وفا داری بھی اک الوام ہے
 تو بہ کر سکتا ہوں، لیکن کیا کروں
 پارہ سائی بھی بہت بدنام ہے

جلائے اسے فلک، تو نے چھاننا، وہ اب جسم بھی
 ہلاکا ہے اندھیرا پھر بھی تیرے شامیے میں
 اٹھیں گی انگلیاں اے جوشش! ہرگز نرم میں تو

ہم ماہِ شرم میں چل نہیں سکتے کسی کے ساتھ
 چلیں گا پارہ سائی کا نہ سگداس زمانے میں
 رہتے ہیں آدمی کی طرح آدمی کے ساتھ
 پھر بڑا کس قدر ہیں محبت کے سلسلے
 دو روز بھی نہیں نہ کسی کی گسی کے ساتھ

تھوڑی قسم میں، تھوڑی قسم
 صداقت تو یہ ہے، صداقت نہیں
 بہت ہیں چمن آشیاں کے پے
 خدائی کسی کی وراثت نہیں

بتا سکا کوئی مسیحی کا مدعا نہ مجھے
 خدا پرست بھی کہنے لگے، خدا معلوم
 فلسفے کے مسائل، چھیرا، اے غفلت!
 مری نظریں تو معلوم بھی ہے نامعلوم
 دو درخشاں تو دو درخشاں تھا، لیکن ہم محفوظ آتے تھے

موسم گل کے آتے ہی پر لوٹ بھی گلو ادوں میں
 پھول گلو اسے فصل بہاری! کہتے ہیں تو کہتے دے
 لیکن یہ ناکید ہے تجھ کو گل نہ بکھلیں گلو ادوں میں

وہ مجھ کو آج بھی ہے، کل جو تھا شیخِ درہن میں
 فتنے رات دن بیدار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
 میسا ہے تھوڑی آنکھ ہر میا کے حق میں
 مگر یہ آنکھ خود دیوار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

محکمہ آثار قدیمہ تاریخ تہذیب تمدن کا ماخذ

تمہید

ہر مسکنِ خاکی کے وجود اور اس میں انسان کے ورود کی تاریخ کا قطعی تعین کم از کم موجودہ معلومات کی روشنی میں تقریباً ناممکنات میں شمار کرنا چاہیے۔ تاہم ماہرینِ اثاریات نے مختلف شواہد کی بنا پر انسان کی زندگی تقریباً پانچ لاکھ سال کی متعین کی ہے۔ نبی آدم کی اتنی طویل عمر کے جن حصوں کی تاریخ تو کیا، ان کی معمولی شناسائی تک نوبت آئی ہو، وہ بہت ہی قلیل ہے۔ محققینِ اثاریات کی کاوشیں اور کوششیں انسانی زندگی کے اس زمانہ وراثہ کی شکل پانچ ہزار سال یا اس سے کچھ ہی زیادہ کی کڑیوں طائفے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

خود تحریر اور کتابت کی عمر جو پچھلے ڈیڑھ سو سال کی تحقیقات کے نتیجے کے طور پر متعین ہوئی ہے، ساڑھے تین ہزار سال کے اندر تہائی جاتی ہے۔ فنیقی حروف کی ابتدا کا سراغ تیرہ صدی قبل از مسیح سے کچھ ہی پہلے تک لگایا جاسکا ہے؛ اس سے قدیم تر مصر کی تصویری تحریر کا وجود زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال کا طے ہوا ہے اور تقریباً یہی زمانہ وادی سندھ میں دریافت شدہ مہرمل کی تحریروں کا ہے، جو آج تک حل طلب ممتا بنی ہوئی ہیں۔

اس سے ثابت ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کا بہت تقوڑا حصہ ہمارے علم میں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ محدود علم بھی آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے کا عدم تھا؛ اور ہماری واقفیت جو کچھ بھی تھی، وہ اساطیر سمجھی جاتی تھی۔ علمِ اثاریات اس فراموش شدہ ورثے کو پہچاننے اور معلوم کرنے میں

تباہی خیروں تو سیکڑوں طوفان مارتے ہیں
 لنگو و قیصر و خاقان کی عظمت ہم نہ مانینگے
 انتخاب کیا کسی مظلوم کا آنسو سجا ان سے کہ نہیں
 کبھی ایسوں کے وار پر سرباز اتم نہیں

عیاں ہو کر کبھی وہ مستور کیوں ہو ہم نہیں سمجھے
 سر منزل بھی دلی دور ہے کیوں ہم نہیں سمجھے
 جگر کے داغ ڈال کے داغ عیب دشمن میں سینے میں

چھاغ زندگی بے نور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
 لڑوں اپنے دل سے کہ ان کی نظر سے
 دھڑکدھڑکانی اُدھر بدگمانی
 تمہارے نہ سننے سے ہوتا ہی کیا ہے
 زما دینے کا، ہماری کہانی

خستگی میں بھی جو گر گر کر سنھلتے دیکھا
 کل کی ہے بات کہ خود دل کو میں سمجھا نا تھا
 آفریں کہنے لگی مدد ہی منزل مجھ آ
 آج یہ کیا ہو کہ سمجھانے لگا دل مجھ کو

جس زہد پہ زہاد کو ہو رحمت کی توقع
 نادار کی تو قیر نہ ہوگی نہ ہونی ہے
 کچھ کم تو نہیں اس سے مراد امن تر
 دنیا میں تو ہے عیب غریبوں کا ہرنگی

صل و گہر ہیں دردِ سُرصل و گہر کو کیا کروں
 دغلا تو میں نے سن لیا اب یہ مجھے بتائیے
 نے تو نہیں ہو بوند بھر سا غرور کو کیا کروں
 آئیں اگر وہ سامنے، تو دلی نظر کو کیا کروں

بڑا کر دیا، یا سہلا کر دیا
 بڑی چیز ہے، جو خوشی یہ زندگی
 بس اب ہم نے جو کہ دیا کھپا
 جسے آپ نے اک سزا کہ دیا
 دینے دغم، درد، آرزو، حیرت
 یہ نہیں بوجہ قضا کہ نہیں
 حسن ہو ہر باں یہ ممکن ہے
 مگر ایسا کبھی ہوا تو نہیں

انسان کے آڑے آیا۔ البتہ اثریات کا موجود خود انسان ہی تھا، جس نے یہ ذریعہ اپنے ماضی کی پہچان کے لیے پیدا کیا۔ دراصل قدرتِ الہی نے انسان کے غیر میں شعور کے ساتھ ساتھ تجسس اور تحقیق کا جو مادہ ودیعت کیا ہے، اسی نے ہر دور میں اسے اپنی پیدائش کے اسرار کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ آفریش سے لے کر آج تک انسان اپنے آغاز اور نشوونما کی ارتقائی صورتوں بذمہ حالتوں کا پتہ لگانے میں تنگ و دو کر رہا ہے۔ مختلف ادوار میں، مختلف مقامات پر، مختلف لوگوں نے، اس سلسلے میں اپنے اپنے نظریے پیش کیے ہیں لیکن ایک عرصے تک اس کا یہ خواب پریشان ہی رہا۔ "تاریخی دور کے انسانی معاشرے کے جزئیات کا تو کیا ذکر، بنیادی پہلوؤں سے متعلق بھی ہماری معلومات محدود ہیں؛ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا خود ان ادوار کے بارے میں بھی جن کا قدرے مفصل حال کتبِ تاریخ یا اس قسم کے دیگر ذرائع میں قلمبند ہوا ہے، ہماری معلومات تشنہ ہیں۔ زمانے کی گردش نے کچھ تو شواہد کو مٹا دیا، کچھ اس دور کے مؤرخین کے نظریات تاریخ نے بھی معاشرے کے صرف انہیں گوشوں کو اجاگر کیا، جو اسے انہیں لکھی تھی اور اپنے زعم میں انہوں نے باقی غیر ضروری پہلوؤں کو رد و شناس کرالے کی کوشش نہ کی۔ ان حالات میں ہم یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ دو چار سوسال کی انسانی زندگی اور معاشرے ہی کے سبھی پہلو ہمارے علم میں پورے اور صحیح طور پر آچکے ہیں۔

بہر حال انسان کی اس سلسلے میں، انتہک کوششوں کا نتیجہ علمِ اثریات ہے۔ علمِ اثریات کو اکیلا ہی کہتے ہیں۔ آرکیالاجی کے لغوی معنی ہیں: آثارِ قدیمہ یا قدیم باقیات کی صحیح واقفیت اور علم؛ اس علم کے ذریعے حضرات (کھدائی) یا اس قسم کے دوسرے طریقوں سے دریافت یا حاصل شدہ مختلف النوع قدیم اشیاء، آثار اور باقیات کی تفتیش اور ان کے باقاعدہ مشاہدے اور مطالعے سے بنی نوعِ انسان اور اس کی زندگی اور تاریخ کے مختلف شعبوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس علم کا واحد مقصد انسانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے ارتقائی مدارج کی تعیین میں تفتیش اور تحقیق کرنا اور اپنے تحقیقی نتائج کو باثبوت، منظم، مستند اور مرتب طریقہ پر محققین اور عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی اور اس کے معاشرے کی تاریخ سے ان کو روشناس کرنا ہے۔ اس علم کے ذریعے سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہماری

انتخابِ کلام

ہو بھی ہوں ساقی بھی ہوں ساغر بھی ہو صبا بھی ہو

چاروں کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی ہو

عُن کا جو ہر تو ہے اس کی داد اسے دلکشی

اس کے کیا معنی کہ وہ آفت کا پرکالا بھی ہو

اُن کی باتوں میں اب وہ بات کہاں — اب وہ پہلا سا اشفاق کہاں

جوشِ بزمِ غمزدوں کی قسمت میں — عیشِ لادُنِ خوشی کی رات کہاں

نختم ہو اضطراب، ناممکن — عیش ہو کامیاب، ناممکن

لاکھ چمکا کرے سرِ کمال — اُن کے رُخ کا جواب ناممکن

ے دیا دردِ لا دوا مجھ کو — میرے خالق یہ کیا دیا مجھ کو

ہوت نے آگے کھول دیں آنکھیں — نظر آنے لگا خدا مجھ کو

اُطل ہے یہ تظارِ دُنیا مرے آگے — آتا ہو چین بن کے چھلدا مرے آگے

بے غش سے بھی دور تخیل کی رسانی — چلتا نہیں جبریل کا دُعا مرے آگے

مجموعے سے یاد آتا ہو گا نامِ خدا کا لوگوں کو

ان کو دیکھ کے ساری دنیا کا فر ہوتی جاتی ہو

دن پڑھیں گے، کون سینگے، اس مکتوبِ جستجو

جوشِ تمھاری عرضِ تمنا و فتنہ ہوتی جاتی ہو

رباعیات

جب غلام کا سیلاب رواں ہوتا ہے — جب کوئی غریب نوہ خواں ہوتا ہے

ظلم کی محوِ دن پہ پھر ی چلتی ہو جب — یاب! اس وقت تو کہاں ہوتا ہے

محکمہ آثار و عہدہ

گزشتہ علمی اور تمدنی کارناموں اور صنعت کاریوں کی عہدیداری اور ترقی کی سلسلہ وار تاریخ مرتب کی جائے؛ اور دیکھا جائے کہ مختلف ادوار میں انسان مختلف حالات اور حواض میں کیسی زندگی بسر کرتا رہا، زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے میں وہ کن ارتقائی مدارج سے گزرا؛ وہ کس دور میں کس نوعیت کی زندگی گزارتا رہا؛ اس کے معاشرے کا کیا حال تھا؛ اس کا مذہب کیا تھا؛ اور عقائد کیا تھے؛ وہ کن رسوم کا پابند تھا؛ اس کے ناؤ زین کا کیا سامان تھا؛ اس کا لباس کیا تھا؛ وہ کن اوزار کا استعمال کرتا تھا؛ اس کی وجہ معاش کیا تھی؛ دیگر اشغال کیا تھے؛ اس نے کیا کیا کام انجام دیے؛ اس کا فکری شعور اور مادی کیفیات کیا تھیں؛ اس کے ذہنی تصورات اور دینی فنون اور ہنر کس پایے کے تھے۔ غرض وہ تہذیب و تمدن کے کن مدارج پر پہنچ چکا تھا، یہ معلوم کرنا ہے۔ اثریات کے محقق کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ بدو خلق سے لے کر تاریخی عہد تک بلکہ اس کے بعد تک کروڑوں کے مختلف مقامات پر قائم انسانی نے جو سفر ہائے گوناگوں طے کیے ہیں، ان کی حقیقی الامکان تفصیلی تاریخ مرتب کرے۔

علم اثریات جو کبھی محض کھدائی کا مترادف سمجھا جاتا تھا، اب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ دنیا کی قدیم تہذیبوں کے ظہور اور ان کی ترقی اور پھیلاؤ کے بارے میں آج ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں، بیشتر اسی علم کی بدولت ہے۔ دنیا کے قدیم خطوں مثلاً افریقہ، مصر، بابل، عراق، ایران، ہندستان وغیرہ کی ماقبل تاریخ یا ابتدائی تاریخ کے ادوار سے مختلف معلومات کے حصول کا واحد ذریعہ یہی علم ہے۔ دجلہ اور فرات، نیل اور سندھ کی دابیوں میں جو مہذب اور متمدن معاشرے وجود میں آئے، اور پر دان چڑھے، ان کا حال کچھ وقت پہلے تک پردہ خفا میں پوشیدہ تھا؛ آج اثریاتی تحقیقات نے ان معاشروں کو بینظاہ کر دیا ہے۔

بن جانے، دین کی سطح پر کتنی بستیوں بسیں، اور آجڑیں اور ڈھیر ہو گئیں۔ بنی نوع انسان کے کتنے قافلے یہاں سے گزرے اور گوشہ نگہنامی میں دفن ہو گئے۔ آفریش سے لے کر آج تک زمین کے ہم آغوش ادبی عیندہ سونے والے یہ انسان اور ان کی بستیاں کب اور کہاں اور کیسے آجڑیں، ان کا حال تو کیا، اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا، اور صدیوں بلکہ ہزاروں سال کے لیل و نہار

فہمہ آثارِ قدیمہ

کی گردش نے ان خاک نشینوں کے آثار کو بھی تڑان کی، سلی حالت میں کہاں رکھا ہوگا۔ زیر بھی وقتاً فوقتاً ہزاروں سال کے بارودوش کو ہلکا کرنے کے لیے جو بے انتہا کوششیں کی ہوگی پہلو بدے ہو گئے، ان میں بھی ان زمیں دوزبستیوں اور آبادیوں کے آثار کی حالت کا دگر ہونا ظاہری بات ہے۔

بہر حال یہی آثار ہیں، جو انسان کی تاریخ کی ترتیب کا واحد ماخذ ہیں۔ انسان نے وہ جو بھی اور جس حالت میں بھی رہا ہوگا، زندگی کے لوازم مشق، بود و باش، خورد و نوش اور کھانے پینے کا انتظام کیا ہوگا۔ ابتدائی دور میں وہ ایسے مقامات پر آباد ہوا ہوگا، جہاں یہ لوازم حیات اسے آسانی مہیا ہو سکیں، اسی لیے عموماً وہ دنیا کے بڑے بڑے دریاؤں — فرات، دجلہ، نیل، سندھ وغیرہ کی وادیوں میں اپنا مسکن بناتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اپنی سست یا غیر مستقل چیزوں کو وہ بدلتا رہا، یا کھوتا رہا۔ یہ چیزیں حوادث اور حالات کے پیش نظر یا رسم و رواج کی تبدیلی کی وجہ سے ناکارہ بن کر بھی پھینک دی جاتی رہیں یا ایک طرف پڑا رہیں۔ جب اس نے تبدیلی مکان کی، تو بھی کئی چیزوں کو وہ چھوڑ کر گیا۔ کھلونے، برتن، زیور، دوسری روزمرہ کے استعمال کی چیزیں، اوزار وغیرہ۔ مختلف قسم کی عمارتوں کے کھنڈر اور اس قسم کے مختلف آثار زمین و زمان کی گردشوں میں دفن ہو کر ٹیلوں کی شکل میں محفوظ ہو گئے۔ یہی وہ آثار ہیں، جن سے کسی تحریری یا تاریخی مواد کی عدم موجودگی میں ان کے استعمال کرنے والے لوگوں کی زندگی اور معاشرے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

ماہر اثریات کی دلچسپی کا محض کسی تہذیب کی نوعیت یا اس کے ظہور اور ارتقاء کی مختلف منزلوں کو دریافت یا متعین کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان تہذیبوں کی ابتدا، عروج اور اختتام یا انحطاط کی تہ میں کون سے عوامل کار فرما تھے، وہ اپنی ابتداء سے انتہا کی منزلوں اور مرحلوں سے کیسے گزری، اس کا خاتمہ خود انسانی عمل کا نتیجہ تھا، یا فطری حوادث اور قدرتی عوامل اس کے ذمہ دار تھے۔ بالفاظ دیگر انسان اپنی ہری بھری آبادی کو عدم سہولیت یا ایسے دیگر وجوہ کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ یا سیلاب، زلزلہ، بھونچال اور اس قسم کے قدرتی حادثوں نے اسے بھجان دیا کیا۔ غرض علم اثریات کا تعلق انسان کی

بد و جہد سے ہے جو اسے اپنی ارتقائی زندگی کی منزلیں طے کرنے کے دوران میں کرنا پڑے۔

تقریباً

اثریات کی ابتدا آثار کی نشاندہی، تلاش و تفتیش اور ان کی دریافت سے ہوتی ہے، جیسا کہ
ہوا۔ انسان کے جو مادی آثار زیر زمین محفوظ رہ سکے ہیں، وہی اس کی زندگی کی حکایت
سلی کی ترتیب میں مقرر و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ انسان نے رو سے زمین پر جہاں
ہیں اپنا مسکن بنایا، وہاں اس نے کچھ نہ کچھ تبدیلیاں کیں اور اس کی سکونت کے ظاہری
پیشیدہ نشان وہاں رہ جاتے ہیں، جن کی نشاندہی مخصوص طریقوں سے ہوتی ہے۔
وہاں پر ان اثریات ایسے ہی مقامات کو اپنی توجہ اور کاوشوں کا مرکز بناتے ہیں کیوں کہ
ہاں پر انسانی سکونت کے آثار بکثرت ملیں گے، جن سے انسانی معاشرے اور تہذیب کی تاریخ
رتقا کے لیے وافر مواد مل سکیگا۔

ہرین اثریات جن چیزوں پر اپنی تلاش و تحقیق اور مطالعے کا مدار رکھتے ہیں، وہ دو طرح
ہیں: ایک وہ، جو خود انسان نے بنائیں اور دوسری وہ، جنہیں انسان اپنے استعمال
ب لایا۔ مقدم الذکر اشیا میں یہ چیزیں شامل ہیں: مکان، برتن یا ظروف، اوزار و
لمحہ، لباس، زیور یا خالص آرائش، وزینت کی چیزیں وغیرہ۔ دوسری قسم کی اشیا میں
ہ چیزیں شامل ہیں جو انسان نے نہیں بنائیں، لیکن اس کے استعمال میں رہی ہوں، جیسے
ان جانوروں کی ہڈیاں جنہیں اس نے مثلاً اپنی خوراک کے لیے شکار کیا، اناج یا خورد و پودوں
لے آثار، گھریا مذہبی یا دیگر مقامات کے آتش دانوں کا کوئلہ یا خاکستر وغیرہ۔

ان اشیا میں سے کچھ تو ماہرین اثریات کو زیر زمین تلاش کرنا پڑتی ہیں اور کچھ زمین کے اوپر
بوغیر الذکر میں خاص طور پر ماقبل تاریخ دور کے حجرے (یعنی پتھر کے) اوزار ہیں۔ بہر حال دونوں
قسم کے آثار کے لیے وسیع پیمانے پر تفتیش، اور تلاش کا سلسلہ ضروری ہے۔ سب سے پہلے
آثار کے حامل مقاموں کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کی قدامت کچھ تجربہ کچھ روایات اور
یا وہ ترتفتیش، تلاش اور مشاہدے سے متعین کی جاتی ہے۔ یہ مقامات عموماً دریاؤں
وادیوں میں پائے جاتے ہیں، خود دریاؤں کی تہیں (طاس) یا کنارے بھی ان مقامات میں

شامل ہیں۔ بستیوں اور آبادیوں کے آثار کے وجود کی ایک بڑی حد تک نشاندہی مٹی کے ادھنے اور پٹھنوں سے ہوتی ہے۔ یہ ماقبل تاریخ عہد کے آثار کے حامل ہیں، تاریخی عہد کے آثار میں مختلف قسم کی عمارات کتبے، سکے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔
محکمہ آثار قدیمہ ہند

ظاہر ہے، ان امور کے لیے ماہرین اثریات کو اپنی کارگزاریوں کو کئی شعبوں اور اعداد میں تقسیم کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ ان کے ذریعے دریافت شدہ اشیاء کے مختلف مسائل — تلاش، تفتیش، تحقیق، مطالعہ، حفاظت و تحفظ وغیرہ بخوبی کر سکیں۔ دنیا کے دیگر ممالک میں اس علم کے شیدائوں نے عرصہ ہوا، کام شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس کا باقاعدہ سلسلہ کچھ اوپر ایک سو سال ہوئے، شروع ہوا۔ لیکن اثریات اور آثار قدیمہ کی طرف ایٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی توجہ اٹھارہویں صدی کے رُپچ آخر میں مبذل ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۸۳ء میں سپریم کورٹ کے جج سرولیم جوس کی رہنمائی میں کلکتے میں ایشیاٹک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں اثریات کی تحقیق بھی شامل تھی۔ اس اولین قیام اثریاتی تحقیق اور مطالعہ کے لیے زبردست متحرک ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں سرانجام کے کارپردازوں کے ذریعے سے حاصل شدہ اشیاء کی حفاظت اور نمائش کی غرض سے ایک عجائب خانہ قائم کیا گیا، جو بعد کو انڈین میوزیم کے نام سے موسوم ہوا اور آج ہندوستان کا غالباً سب سے بڑا عجائب خانہ ہے۔

البتہ آثار کی تلاش و تحقیق کا کام ایشیاٹک سوسائٹی کی سرگرمیوں کا ایک جزئی حصہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس موضوع پر اس نے جو کام بھی کیا، وہ محدود ہونے کے علاوہ صحیح طور پر اثریاتی تحقیق کے اصولوں کے مطابق بھی نہیں تھا۔ مثلاً اس کام کی رپورٹیں اور رودادیں حیرت انگیز روایتوں اور قصہ کہانیوں سے مخلوط تھیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ سوسائٹی نے اس سلسلے میں نہایت ہی اہم خدمات سرانجام دیں، جن میں سب سے اہم اور عمدہ فنون ہندستان کے قدیم رسم الخطوں کا حل ہے۔ ۱۷۸۸ء میں چارلس وکسن نے گپتا اور کٹیلوڈسم الخط کی قرأت کا صحیح حل دریافت کیا۔ اسی طرح ہڈیس ہاین و سن نے افغانستان کا تفتیشی اور تحقیقی دورہ

کیا اور اس زمانے کے وسائل اور طریقوں کے پیش نظر اس کی رپورٹ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد ۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے فرانس پریشان کو ریاست میسور کی تفتیش پر مامور کیا۔ پھر ۱۸۰۶ء میں صوبہ بنگال کے (جس میں موجودہ بہار اور اڑیسہ کا بیشتر حصہ بھی شامل تھا) جغرافیہ تاریخ، اور قدیم آثار کی ترقیق اور تفتیش کا کام اس کے سپرد ہوا۔ پریشان نے آٹھ سال تک دینا چپور، رنگپور، پورنیا، بھاگلپور، پٹنہ، شاہ آباد اور گورکھپور ضلعوں کا معائنہ دورہ کیا اور اس دورے کی باقاعدہ رپورٹ چھپنے کی نوبت نہیں آئی، مگر منوگوری مارٹن نے ۱۸۳۸ء میں اس کا تھوڑا سا حصہ شائع کیا تھا۔

۱۸۳۸ء کا سال تاریخی عہد کی اثراتی تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال جیمس پرنسپ نے براہی رسم الخط کا عقدہ حل کر کے اشوک کے کتبوں کی قرائت کی راہ صاف کی۔ اس دریافت سے ہندوستان کے قدیم عہد کی مستند تاریخ کی ترتیب کا ایک نہایت اہم وسیلہ دستیاب ہو گیا۔ دوسری طرف انہی دنوں جیمس فرگوسن نے ۱۸۲۹ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک ملک کے فن تعمیر کے نمونوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان کی تعمیری خصوصیات کے اعتبار سے اس فن کے ارتقاء اور متعلقہ امور پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کی، جو آج بھی اس موضوع کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ہینکس، انڈیا کمپنی سے اجنتا اور دیگر غاروں کی تصاویر کی نقل اتروانے اور ان غاروں کے خاطر خواہ تحفظ کی درخواست کی۔ اس پرائیٹ انڈیا کمپنی کی مجلس منتظمہ نے ان قدیم یادگاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی غرض سے ایک کمیشن کی تشکیل کا اسادہ ظاہر کیا۔ لیکن بعد کو گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کے ایما پر کمیشن کی بجائے اس کام کے لیے کچھ افسر مقرر کر دیے تاکہ وہ ان یادگاروں سے متعلق ابتدائی رپورٹیں تیار کریں۔ بہر حال انھوں نے اس سلسلے میں کوئی خاص کام نہیں کیا۔

ہندوستان کی اثراتی تحقیق میں دوسرا اہم سال ۱۸۵۷ء کا ہے۔ آثار کی تفتیش اور مطالعے کے سلسلے میں آج تک جو جمود طاری رہا تھا، اسے اس سال توڑا گیا۔ اس کام کا سہرا

ایک فوجی انجنیر اگلوڈر کننگھم کے سر ہے۔ اس نے گورنر جنرل لارڈ کیلنگ کو ملک بھر کے تاریخی عمارتوں اور آثار کی تقویت اور کتبوں کے مطالعے اور ان سب کے تحفظ کے لیے باقاعدہ پروگرام مرتب کر کے ضرورت کا احساس دلایا۔ کیلنگ نے یہ تجویز منظور کر لی اور یوں آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کی بنیاد رکھی گئی۔ خود کننگھم اس کا پہلا ناظم اعلیٰ مقرر ہوا۔ کننگھم اور اس کے معاونین نے پورے چودہ برس تک شمالی، مشرقی اور وسطی ہند کے نشیب و فراز کو چھان مارا، اہم عمارتوں اور ہتھار کا کھوج نکالا، جو مقامات پہلے سے معلوم تھے، انھیں پھر سے دیکھا اور سکوں، کتبہ اور مجسموں اور دیگر آثار قدیمہ کو ڈھونڈا۔ اس نے ہند قدیم کے بہت سے مشہور شہروں اور تاریخی مقاموں کے صحیح جانے وقوع کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ان مقامات میں اورٹوس کی چٹانوں، تسکیلا کا شہر، سنگلا کا قلعہ، سنگیسا، ہراوتسی، کوسمبی، بھرپورت، اشوک کے کتبے، بنگلو، بالسر، بھیتراؤں، گھیسٹرا اور دیوگڑھ کے گیتا زمانے کے مندر وغیرہ شامل ہیں۔ کننگھم کے کام کی وسعت اور ساتھ ساتھ اس کی باقوسی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ایک پوری کتاب دیکر کا ہے۔ ۱۸۶۳ء میں مغربی ہند کے آرکیولوجیکل سروے کے نام سے ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا جس کے ذمے ۱۸۸۱ء میں جنوبی ہند کے سروے کی خدمت بھی سپرد کی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں کننگھم اپنے عہدے سے سبکدوش ہوا۔

اس کے تقریباً تین سال بعد حکومت نے آرکیولوجیکل سروے کی مرکزی ادارے کی حیثیت ختم کر دی اور اثریاتی کام کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام تقریباً بند ہو گیا۔ دس سال تک یہی صورت حال رہی۔ اگرچہ لارڈ کرزن کے گورنر جنرل بن کر ہندوستان آنے سے کچھ ہی پہلے محکمہ کو دوبارہ مرکزی ادارہ بنانے اور اسے فعال بنانے کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے، لیکن اس کی سرگرمیاں کرزن کے ۱۸۹۹ء میں آنے کے بعد از سر نو شروع ہوئیں۔ کرزن کے آتے ہی اثریاتی تحقیقات اور قدیم عمارتوں کے تحفظ پر پوری توجہ کی گئی، غرض کہ ۱۹۰۲ء میں محکمہ آثار قدیمہ کی از سر نو تشکیل ہوئی اور اس کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جان مارشل انگلستان سے بلائے گئے۔ مارشل نے تھوڑے ہی عرصے میں اثریاتی سرگرمیوں کی ترتیب و تنظیم مکمل کر لی۔ چند ہی سال میں ملک کی مستند تاریخی عمارتوں کی مرمت ہوئی، اہم مقامات

محکمہ آثار قدیمہ

برکھائی شروع ہو گئی اور عجائب خانے قائم کیے گئے۔ ۱۹۰۴ء میں قدیم یادگاروں کے تحفظ کا قانون بھی نافذ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں محکمہ آثار قدیمہ کو مستقل حیثیت ملی گئی اور طے پایا کہ اس کا عملہ ناظم اعلیٰ یعنی ڈائریکٹر جنرل، ماہر کتھات یعنی گورنمنٹ ایسیکرافٹ اور ملک کے ہر معلق یعنی سرکلوں کے افسران اعلیٰ پر مشتمل ہو گا۔

اپریل کے ۱۹۲۸ء میں وظیفہ یاب ہونے کے بعد محکمے کو کئی نشیب و فراز پیش آئے۔ ۱۹۳۲ء میں شعبہ تفتیش ختم ہو گیا اور محکمے کی دیگر مددوں کے اخراجات میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ دوسری رات انہی دنوں بیرونی افراد اور غیر ملکی اداروں نے اٹریاتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ چنبرہ ڈو ل کھدائی امریکن اسکول آف اٹھین و ایرانیین اسٹڈیز اور بورسٹن میوزیم آف فائن آرٹس نے ل کر کے اس کے اگلے سال سیل اور کیرج یونیورسٹیوں کی طرف سے ایک ماقبل تاریخی اور افسانوی وفد ہمت و نرا کی قیادت میں ہندوستان آیا۔ اس نے سارے ملک میں، خاص کر شمال مغرب کے علاقے، میں بڑا واقعہ کام کیا۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت ہند نے مشہور انگریز ماہر اٹریات سر لیڈ نارڈ وڈ کی تفتیش اور کھدائیوں کی پالیسیوں پر مشورہ کے لیے مدعو کیا۔ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر رابرٹ ایرک مارٹیر و ہیلر ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوا۔ اس کے چار سالہ دورِ نظامت میں محکمے نے ہمہ جہتی ترقی کی اور اٹریاتی سرگرمیاں مضاعف ہو گئیں۔ اس نے محکمے کے شعبہ، معلق اور عجائب خانوں کی بھی ادرس نو تشکیل کی۔ سر مارٹیر کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کھدائیوں کے دوران میں اس نے محکمے کے افسروں کے علاوہ بیرونی اشخاص کو کھدائی کی تکنیک کی باقاعدہ تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ ۱۹۵۰ء کے آئین ہند کی مد سے محکمہ اٹریات کی حیثیت میں اہم تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ اب قومی اہمیت کے اٹریاتی کام مرکزی محکمے کے ذمے ہو گئے اور اس کے علاوہ جو کام ہے اس کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر ہو گئی۔

آزادی تک حکومت ہند کے مرکزی ادارے کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں میں بھی کچھ اٹریاتی کام ہوتا رہا۔ سب سے پہلے ریاست میسور نے ۱۹۰۰ء میں اپنا الگ محکمہ قائم کیا۔ اس کے بعد کشمیر (جنوب میں)، پردوکنے اور (مشرق میں) میسور بھیج کی ریاستوں نے اپنے اپنے احاطہ قائم کیے کچھ عرصہ بعد حیدرآباد، گوالیار، ٹراونکور، کوچن، بھوپال، بڑودہ اور جمپور کی

ریاستوں نے بھی محکمے قائم کر لیے، ان میں سے بعض نے بہت ہی اہم خدمات انجام دیں۔ آزادی کے بعد جب ریاستوں کا خاتمہ ہوا، تو یہ ادارے بتدریج مرکزی حکومت کے دائرہ اثریات میں منم ہو گئے۔ سب سے آخر میں ۱۹۵۹ء میں کشمیر کے محکمے کا الحاق عمل میں آیا۔

مرکزی محکمہ اثریات اب حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم کے شعبہ ثقافتی امور سے متعلق ہے، اس کا وسیع نظام ملک کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے جس کا مختصر اُپہاں ذکر کیا جاتا ہے: (۱) مرکزی دفتر (نظامتِ اعلیٰ) نئی دہلی میں ہے۔ اس کے ڈائریکٹر جنرل (ناظمِ اعلیٰ) کی معاونت کے لیے ایک جوائنٹ ڈائریکٹر جنرل (معاونِ ناظمِ اعلیٰ) اور تین ڈائریکٹر (ناظم) ایک اثریاتی مہندس (چیف آرکیولا جیکل انجینیر) اور اس کا معاون (اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیکل انجینیر) اور ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ مقرر ہیں۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو محکمے کی جانب سے اثریات کا ایک اسکول کھولا گیا ہے، جس میں بیک وقت دس طلباء کو علمِ اثریات کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ اسکول مندرجہ بالا تین ڈائریکٹروں میں سے ایک کے ماتحت چل رہا ہے۔

(۲) محکمہ نو حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک حلقے میں ایک سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ اور ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ اور بعض میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیکل انجینیر بھی مقرر ہے۔ ان حلقوں اور ان کے صدر مقاموں کے نام یہ ہیں: (۱) شمالی حلقہ: آگرہ؛ (۲) شمال مغربی حلقہ: ڈیرہ دکن؛ (۳) وسط مشرقی حلقہ: پٹنہ؛ (۴) مشرقی حلقہ: کلکتہ؛ (۵) جنوب مشرقی حلقہ: حیدرآباد؛ (۶) جنوبی حلقہ: مدراس؛ (۷) جنوب مغربی حلقہ: اورنگ آباد؛ (۸) مغربی حلقہ: بڑودہ؛ (۹) وسطی حلقہ: بھوپال۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا حلقہ ریاست جموں و کشمیر کے لیے سرحدی حلقے کے نام سے بھی قائم کیا گیا ہے، جو ایک سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ان حلقوں کا بنیادی کام قدیم یادگاروں کی حفاظت کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کھوج یا تفتیش اور کھدائیاں بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کچھ برس میں تقریباً ہر حلقے میں چھوٹی موٹی کھدائی ہوئی اور کچھ تفتیشی منصوبوں

پر بھی عمل ہوا۔

(۳) لیکن حضرات یا کھدائی کا ایک مخصوص شعبہ ہے، جس کا صدر دفتر پہلے دلی میں تھا اور اب ناگپور میں ہے۔ اس کے لیے ایک سپرنٹنڈنگ آرکیالاجسٹ مقرر ہے۔ یہ شعبہ وسیع پیمانے پر کھدائی کرتا ہے۔ حکیمہ اثریات کی جملہ اہم کھدائیاں اسی شعبے کی طرف سے عمل میں آئی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: (موجودہ پاکستان میں) ضلع راولپنڈی میں تنکھیلہ، پانڈپوری کے قریب اریکمیڈو، ریاست میسور میں برہم گری، اڑیسہ میں شیشتوپال گڑھ، گنگا کی اوپری وادی میں ہستنپور، ستلج کے دامن میں روپڑ اور بارہ اور سلورہ، مالوہ میں ناگلا اور اچین، گجرات میں رنگپور اور لوتھل، راجستھان میں کالی بنگان، مہاراشٹر میں پاوئی وغیرہ پچھلے سال اس شعبے نے گجرات کے ضلع کچھ کے ہڑپائی تہذیب کے مقام دیسپور میں کھدائی شروع کی ہے۔

(۴) شعبہ ماقبل تاریخ: یہ شعبہ ۱۹۵۸ء میں مستقل طور پر قائم کیا گیا۔ اس کا دفتر بھی ناگپور میں ہے اور اس کا نگران افسر سپرنٹنڈنگ آرکیالاجسٹ فار پری ہسٹری کہلاتا ہے۔ (جنوبی ہند کے لیے اس شعبے کی ایک شاخ قائم کی جانے کی تجویز ہے) یہ شعبہ ماقبل تاریخ کی تہذیبوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے، جس کے لیے جبری عہد کے آثار کی تفتیش و تحقیق اور ان سے متعلق مسائل کا مطالعہ کرنا اس کا بنیادی کام ہے۔ اپنے مختصر زمانہ کار میں اس شعبے نے دریائے ناپتی کی وادی، بندیکھنڈ کے چند دریاؤں کی وادیاں، شمال میں بیاس اور ہان گنگا کی وادیاں، جنوب میں مشرقی ساحل پر گوڈیم اور دیگر مقام ہوشنگ آباد کے قریب نربڈا کی آبادی اور دیگر جگہوں میں تلاش و تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش اور مہاراشٹر کے کچھ غاروں کا بھی دقیق مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ کام ابھی جاری ہے۔

(۵) شعبہ کتبات: اس کی دو شاخیں ہیں: ایک سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے کتبوں کے لیے، اور دوسری، عربی اور فارسی کتبوں کے لیے۔ مقدمہ الذکر شاخ کا یہ دفتر کافی عرصے تک جنوبی ہند کے مشہور و معروف پہاڑی مقام اوٹاکامنڈ میں تھا۔ ۱۹۷۵ء میں طبرہ میں منتقل ہو گیا۔ اس شاخ میں ایک چیف کتبہ خوان، دو سپرنٹنڈنگ کتبہ خواں اور تین ڈپٹی ہیں۔

عربی اور فارسی کتبوں کے لیے ایک شاخ دلی کے مرکزی محلے میں ۱۹۴۶ء میں قائم کی گئی تھی۔ اب اس کا دفتر ناگپور میں ہے اور اس کے لیے ایک سپرنٹنڈنٹ کتبہ خواں مقرر ہے۔ مختلف زبانوں کے قدیم کتبوں کو ملک بھر سے فراہم کر کے انہیں پڑھنا اور ان کی تاریخی اہمیت کی نشاندہی کرنا شعبے کا بنیادی کام ہے۔ یہ مسئلہ بات ہے کہ ہند کی قدیم تاریخ کی ترتیب کتبوں کے بغیر ممکن نہیں تھی بلکہ ہمارے ملک کے اولین تاریخی دور کا واحد ماخذ یہی کہتے ہیں،

(۶) شعبہ کیمیا: ڈیرہ دُون میں واقع اس شعبے کا افسر اعلیٰ چیت آرکیولاجیکل کیمسٹ کہلاتا ہے۔ اس کے تین حلقے ہیں: ایک شمالی ہند کے کام کے لیے ڈیرہ دُون میں، دوسرا جنوبی ہند کے لیے حیدرآباد میں، اور تیسرا جو کرنا لاجی کے لیے ہے۔ اس شعبے کے ذیلی افسر ڈیرہ دُون اور بنشور اور مدراس اور اورنگ آباد میں کام کرتے ہیں، اس شعبے کے فرائض میں قدیم عمارتوں، مجسموں، تصویروں، سیکوں، عجائبخانوں کی اشیاء، دستاویزوں اور اس قسم کے اہم کاغذات اور دیگر آثار کی کیمیائی صفائی اور تحفظ کے کام کی نگرانی کرنا اور ساتھ ساتھ اپنے موضوع میں سائنسی تحقیق کرنا شامل ہے۔ پچھلے دو تین سال سے افغانستان کے مشہور مقام بامیان میں بودھی آثاروں کے تحفظ کے کام میں چیت آرکیولاجیکل انجینیر کے ساتھ یہ شعبہ خدمت انجام دے رہا ہے۔

(۷) شعبہ عجائبخانہ: یہ شعبہ کلکتہ میں ہے۔ اس کا افسر اعلیٰ سپرنٹنڈنٹ آرکیولاجسٹ فار میوزیمز کہلاتا ہے۔ اس کا ایک معاون بھی ہے۔ اس کے تحت تین اور مقامی دفاتر ہیں جو سارناتھ، ساپچی اور مدراس میں فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس شعبے کا کام ملک کے ان عجائبخانوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنا ہے، جن کا براہ راست تعلق محکمہ اشیاء سے ہے۔ اہم عجائبخانے ان جگہوں پر ہیں: دلی کا لال قلعہ، مدراس (فدرٹ سینٹ جارج)، سرنگاپٹن (ٹیڈ سلطان میوزیم)، سارناتھ، نالندہ، بودھ گلیا، ساپچی، کجوراہو، تاج مارین کٹہ، امراتی، ہسپی، کونڈاپور، بیجاپور، دھنل، گووہ وغیرہ کے عجائب گھر۔

(۸) شعبہ باغات: اس شعبے کا صدر دفتر بھی ۱۹۵۸ء تک دلی میں تھا، پھر اسے آگرہ منتقل کیا گیا۔ اس کا افسر اعلیٰ چیت ہارٹیکلچرسٹ کہلاتا ہے۔ اس کے تین معاون دلی، آگرہ

اور مید میں متعین ہیں۔ یہ شعبہ مشہور و معروف قومی یادگاروں کے ارد گرد باغات لگاتے ہیں یا جو باغ موجود ہیں ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

(۹) مندروں کی تفتیش کا شعبہ: ہندوستانی کے مشہور و معروف مندروں کے فن تعمیر اور ان کی مختلف طرزوں کی تحقیق اور مطالعہ کے لیے شمالی اور جنوبی ہند کے لیے بالترتیب بھوپال اور مداس میں دو شاخیں قائم کی گئی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ آف کلاسٹ ان کا افسر اعلیٰ ہے۔ اس شعبہ کی طرف سے جنوب کے چلکیا عہد کے مندروں اور شمال کے کچھ مندروں پر کتابیں تصنیف اور شائع ہو چکی ہیں۔

(۱۰) شعبہ نقشہ جات: ۱۹۵۸ء میں یہ شاخ قائم ہوئی۔ اس کا دفتر ناگپور میں تھا۔ اسے ابھی تھوڑے دن ہوئے، بند کر دیا گیا ہے۔ اس شعبہ کا فرض ہندوستان کے اثریاتی نقشوں کی ترتیب اور اشاعت تھا۔

مندرجہ بالا مستقل شعبوں کے علاوہ جب کوئی عارضی قسم کا اثریاتی کام کسی شعبے سے متعلق پیش آتا ہے، تو اس کے لیے مخصوص انتظام کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آندھرا پردیش کے مشہور ناگارجن ساگر منصوبہ میں جب معروف اور اہم بودھی مقام ناگارجن کنڈا زیر آب ہونے والا تھا، تو اس کے ارد گرد کے آثار کو بچانے کے لیے محکمہ اثریات نے پانچ سال سے زائد عرصہ کے لیے عارضی طور پر ایک شعبہ قائم کر دیا، اور اس مقام کی وسیع پیمانے پر کھدائی کرا کے وہاں کے آثار مثلاً استوپ وغیرہ کو بعینہ وہاں سے منتقل کر کے قریب کی جگہ کی چوٹی پر اسے اسی طرح از سر نو قائم کر دیا۔

مرکزی محکمہ اثریات کے علاوہ بیشتر صوبائی حکومتوں کے اپنے اثریاتی محکمے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں نے بھی جن میں یونیورسٹیاں پیش ہیں، اثریاتی کام کیا ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں علم اثریات کو تاریخ ہندو قدیم کے شعبے کے اہم زمرہ مضمون کی حیثیت دی گئی ہے۔ ان اداروں میں قدیم زمانی کا شرف کلکتہ یونیورسٹی حاصل ہے، جس نے جنگال میں ۱۹۳۷ء - ۱۹۴۱ء کے دوران میں بن گرہ کے مقام پر کھدائی کی۔ گزشتہ بیس برس میں پونہ کے دکن کالج پورٹ گریجویٹ اینڈ ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ کے کاشی پرشاد حبیبوالا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، الہ آباد، ساگر پور
میسور، مدراس، بنارس، ناگپور، کرکوشتر، علیگڑھ وغیرہ کی یونیورسٹیوں اور راجستھان،
مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، اندھرا پردیش، تامل ناڈو، اوڑیسہ، مغربی بنگال، اتر پردیش،
کیرالا، میسور وغیرہ کی ریاستی حکومتوں کے محکموں نے اس سلسلے میں قابل ذکر کام کیا ہے
بعض اہم تاریخی اور اثریاتی کتابوں کے علاوہ ان اداروں کے ذریعے سے متعدد اہم
کھدائیاں عمل میں آئی ہیں۔

محکمہ اثریات کا ایک اور کام مطبوعات ہے، آزادی سے قبل یہی ایک ادارہ
تھا، جس کی طرف سے فن تعمیر کے اثریاتی امور سے متعلق روادین، مستقل تصنیف
فہرستیں، کتابچے وغیرہ شائع ہوتے رہے۔ ان مطبوعات کی فہرست کافی طویل ہے، دوسری
عالمی جنگ کے دوران میں ان مطبوعات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آزادی کے دو ایک سال
پہلے سر رابرٹ ویلیز کے زمانہ نظامت کی نئی تنظیم کے مطابق محکمہ اثریات کی طرف سے ایک
سالانہ جریدہ الموسوم بہ ہندو قدیم (انٹینڈ انڈیا) کے نام سے شائع ہو رہا ہے، جس میں
اثریاتی تحقیق و تفتیش اور کھدائی اور ان کے نتائج اور مطالعے پر مشتمل مضامین اور دعویٰ
اور اسی طرح کی اور اثریاتی کارگزاریوں کے حالات شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک
بھر میں سال کے دوران میں بھی چھوٹا موٹا اثریاتی کام ہوتا رہتا ہے، چاہے وہ مرکز
محکمہ اثریات کی جانب سے ہو، یا کسی اور ادارے کی طرف سے۔ اس کی رپورٹ محکمہ
اثریات کا ناظم اعلیٰ مجلس مشاورت بڑے اثریات کے لیے ترتیب دیتا ہے، اس کے
علاوہ میمور کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے، اسی طرح کتبوں پر مستقل مطبوعات شائع ہوتی
رہتی ہیں، میمور کے کتبوں کو دفتر سے ایک رسالہ ایپیگرافیا انڈیکا کے نام سے شائع
ہوتا ہے، جس میں عربی اور فارسی زبان کے کتبوں کے علاوہ باقی سب کتبوں پر مضامین
ہوتے ہیں۔ اسی دفتر سے ایک اور سالانہ رپورٹ چھپتی ہے، جس میں سال بھر میں جو کتبہ
(عربی اور فارسی کتبوں میں) ملے ہوں یا مطالعے میں آئے ہوں، ان کا مختصر حال اور
بیان، ان کی تاریخی اہمیت پر مشتمل مہوط مقدمے کے ساتھ ایک فہرست کی صورت

میں شائع ہوتا ہے۔ پھر اسی دفتر کے افسروں یا بیرونی حضرات کے مرتبہ اہم تاریخی کتبوں کے مجموعے (CORPUS) بھی شائع ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح عربی اور فارسی کتبوں کی شائع کی طرف سے ایک رسالہ عربی اور فارسی کتبوں کا شائع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ محکمہ افریات و ثقافتاً مشہور تاریخی عمارتوں اور مقاموں سے متعلق ”زہنا“ (GUIDE) قسم کے عام فہم کتابچے بھی چھاپتا ہے۔ اسی کے ساتھ پوسٹ کارڈ سائز کی یادگاروں کی تصویروں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

۳

مندرجہ ذیل سطور میں اثریات کے مختلف شعبوں نے ہندوستان میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا مختصر مگر جامع بیان کیا جائیگا:

ہی نوع انسان کی ماقبل تاریخ زندگی کو کئی دہائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان عہدوں کے انسان کے بارے میں ہماری معلومات کا واحد ذریعہ اس کے چھوڑے ہوئے پتھر کے اوزار ہیں۔ جن مقامات میں جس قسم کے اوزار پائے گئے ہیں اس مقام میں ان کے استعمال کرنے والے انسان کی بود و باش اور طور طریقوں کا نماد، ان اوزاروں کی ساخت اور تراش اور دیگر متعلقہ اشیاء اور امور سے متعین کیا جاتا ہے۔ ماقبل تاریخی عہد کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں یا ملکوں میں یہ ادوار زمانی یا عصریہ عصر مطابقت رکھتے ہوں، ان میں مقام کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے، یہ چار ادوار یہ ہیں:

(۱) قدیم جہری دور (۲) درمیانی یا متوسط جہری دور (۳) متاخر جہری دور (۴) جدید جہری دور۔

دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے یہاں بھی انتہائی قدیم زمانے میں انسانی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ماہرین اثریات نے ہندوستان میں انسان کے ظہور کا زمانہ نیادہ سے زیادہ لاکھ سال کا بتایا ہے۔ یہاں البتہ ابھی تک پتھر سے ہوئے انسان کے آثار نہیں ملے۔ قدیم جہری دور کے انسان کی پہچان صرف اس کے چھوڑے ہوئے پتھر کے بعد سے

اور کھردرے آلات اور اوزاروں سے ہوتی ہے۔ یہ اوزار انسانی نے حوالہ ضروری کر پورا کرنے کے لیے بنائے اور استعمال کیے تھے۔ قدیم حجری دھکا آدمی اس وقت زندگی بسر کر رہا تھا جب کہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمین کی آب و ہوا آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ سخت تھی۔ سمندر کی سطح سے بہت بلند مقاموں پر جیسے عرصے تک سخت سردی پڑتی اور برف باری ہوتی تھی پھر اس کے بعد اچھی ہی سخت خشکی اور کڑا کے کی گرجی کا دور ہوتا تھا۔ ان اونچے مقاموں کے ساتھ کھلے ہوئے میدانی علاقوں میں باری باری موسلا دھار بارش اور زمین کی سکھائی ہوتی تھی۔ موسم کے ان تحولات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ زمین کی شکل اور ہیئت میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

قدیم حجری دھ کے اوزار پر پلنے دیباؤں اور ندیوں کے کناروں کی ڈھلوں سطح پر خشک شدہ ندیوں کی تہوں میں چٹانوں اور کنکرؤں کے نشین ذخیرہ ہیں، پہاڑی ٹرائیبل میں اور غاروں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک ایسے کسی غار کا پتا نہیں چلا، جس میں قدیم حجری اوزار تصنیف طور پر پائے گئے ہوں۔ ہندوستان میں آج تک جو شواہد ملے ہیں، ان کی بنا پر قدیم حجری دور تقریباً ڈیڑھ لاکھ سال پہلے شروع ہوا اور ستر ہزار سال پہلے تک رائج رہا۔

اس ملک میں قدیم حجری اوزاروں کا سب سے پہلا سراغ ۱۸۶۳ء میں ملا۔ یہ اوزار ہندوستان کے ارضیاتی تقسیم کے محکمے کے ایک افسر رابرٹ بروس کو مدراس شہر کے پاس (اور اب شہر کی حدود میں شامل) پلوزم نامی مقام میں ملے، اس کے بعد تقریباً ستر برس کے عرصے میں قدیم حجری اوزاروں کی کثیر تعداد سندھ اور گنگا کے میدانوں کو چھوڑ کر بھر میں ودیا فت ہوئی، لیکن ان اوزاروں کی ارضیاتی اصول پر تحقیق اور مطالعے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں پیل اور کمبرج یونیورسٹیوں کی طرف سے ایک ماقبل تاریخی و ارضیاتی مشن ہلمت دفنہ کی قیادت میں ہندوستان آیا اور اس نے ملک میں خاص کر شمال مغربی خطے میں بہت ہی وسیع کام کیا۔

علم ارضیات کے ماہروں نے کشمیر میں برفانی دھکے تھوں اور تہ در تہ پر توں کا پتا چلایا ہے،

جو ممکن ہے یورپ کے پلاسیٹوسین عہد یعنی علم ارضیات کے جدید ترین عہد کے ساتھ عصرِ بعصر مبالغتہ رکھتے ہوں، لیکن یہاں یورپ کی طرح ان برفانی پرتوں کے ساتھ قدیم جھری اوزار نہیں پائے گئے۔ کشمیر کے ان برفانی عہدوں کا رشتہ دتوا کے مشن کے نزدیک موجودہ پاکستان کے ضلع راولپنڈی میں پولوٹو ہار علاقہ میں دریائے سندھ کی معاون سوبہن ندی کی ڈھلوان سطحوں سے جا ملتا ہے۔ سوبہن ندی کی ان ڈھلوان سطحوں پر قدیم جھری اوزار پائے جاتے ہیں۔ انھیں ہندستان کے ماہرین اثریات نے ”سوبہن“ اوزار کا اصطلاحی نام دیا ہے۔ مخصوص سوبہن اوزاروں میں پتھر کے ٹکڑے کی اوپری حصے کی ایک طرف کی پرتیں تراش کر دھار نکالی گئی ہے۔ چونکہ ان اوزاروں میں ایک طرف دھار ہوتی ہے، اس لیے وہ گیرخی تیشے کہلاتے ہیں۔ ماہرین اثریات کا خیال ہے کہ اوزاروں کی یہ قسم ہندستان میں برما، جاوا، اور چین جیسے مشرقی ممالک سے آئی۔ حال میں اسی طرح کے اوزار شمالی ہند میں کانگڑہ کے نزدیک دریائے بیاس کے معاون بان گنگا کی وادی اور سرسہ کی وادی میں پائے گئے ہیں۔ ہلڈرم مدراس میں پائے گئے اوزاروں کی وضع قطع قدرے مختلف ہے۔ یہ پتھر کے ٹکڑے کے ایک حصے کے دونوں رنوں کو تراش کر دستی کھاری، پتھرا، بندھ، وغیرہ کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اس وضع کے اوزار سوبہن کی وادی میں بھی پائے تو گئے ہیں، لیکن بہت کم تعداد میں۔

اس طہ سرح ہندستان کا قدیم جھری دور دو موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک رنخی (سوبہن) اور دومنخی (ملاس) اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک رنخی اوزار ہمالیہ کے نچلے علاقوں ہی تک محدود ہیں، جب کہ دومنخی اوزار دوسری جگہوں میں عام ہیں، اگرچہ کہیں کہیں دونوں مخلوط بھی پائے گئے ہیں۔

پچھلے چند سال سے قدیم جھری عہد سے متعلق تلاط و تفتیش کا کام زور دہاں پر ہو رہا ہے۔ مرکزی محکمہ اثریات کے علاوہ اداروں اور یونیورسٹیوں بالخصوص دکن کالج اور بٹودہ یونیورسٹی کی کوششوں کے نتیجے میں پنجاب، راجستھان، گجرات، وسط ہند، دکن اور جنوبی ہند کی کئی ندیوں کی تہوں اور ڈھلوان پر اس قسم کے اوزاروں پر مشتمل سینکڑوں چٹانیں وغیرہ

حکمر آئینہ قدیم

اور کھردرے آلات اور اوزاروں سے ہوتی ہے۔ یہ اوزار انسان نے حراج ضروری کو پورا کرنے کے لیے بنائے اور استعمال کیے تھے۔ قدیم جبری دود کا آدمی اس وقت زندگی بسر کر رہا تھا جب کہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمین کی آب و ہوا آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ سخت تھی۔ سمندر کی سطح سے بہت بلند مقاموں پر لمبے عرصے تک سخت سردی پڑتی اور برف باری ہوتی تھی پھر اس کے بعد اچھی ہی سخت خشکی اور کڑا کے کی گرمی کا دورہ ہوتا۔ ان اونچے مقاموں کے ساتھ کے طے ہوئے میدانی علاقوں میں باری باری موسلا دھار بارش اور نمی کی سکھائی ہوتی تھی۔ موسم کے ان تحولات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ زمین کی شکل اہستہ اہستہ میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

قدیم جبری دود کے اوزار پرلنے و دیاؤں اور ندیوں کے کناروں کی ڈھلوان سطح پر خشک شدہ ندیوں کی تہوں میں چٹانوں اور کنگروں کے نشین ذخیروں میں پہاڑی تراٹھل میں اور غاروں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک ایسے کسی غار کا پتا نہیں چلا، جس میں قدیم جبری اوزار یعنی طور پر پائے گئے ہوں۔ ہندوستان میں آج تک جو شواہد ملے ہیں، ان کی بنا پر قدیم جبری دور تقریباً ڈیڑھ لاکھ سال پہلے شروع ہوا اور ستر ہزار سال پہلے تک رائج رہا۔

اس ملک میں قدیم جبری اوزاروں کا سب سے پہلا سراغ ۱۸۹۳ء میں ملا۔ یہ اوزار ہندوستان کے ارضیاتی تفتیش کے محکمے کے ایک افسر رابرٹ بروس کو مدراس شہر کے پاس (اور اب شہر کی حدود میں شامل) پلوزم نامی مقام میں ملے، اس کے بعد تقریباً ستر برس کے عرصے میں قدیم جبری اوزاروں کی کثیر تعداد سندھ اور گنگا کے میدانوں کو چھوڑ کر بھر میں دیا فت ہوئی، لیکن ان اوزاروں کی ارضیاتی اصول پر تحقیق اور مطالعے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ہیل اور کمبریج یونیورسٹیوں کی طرف سے ایک ناقابل تاریخی و ارضیاتی مشن ہلمت ونزا کی قیادت میں ہندوستان آیا اور اس نے ملک میں خاص کر شمال مغربی خطے میں بہت ہی دقیق کام کیا۔

علم ارضیات کے ماہروں نے کشمیر میں برفانی دود کی تہوں اور تہ درتہ پر تہوں کا پتا چلایا ہے،

محکمہ آثار قدیمہ

برمکن ہے یورپ کے پلاسیٹوسین عہد یعنی علم ارضیات کے جدید ترین عہد کے ساتھ عصرِ بعصر مطابقت رکھتے ہیں، لیکن یہاں یورپ کی طرح ان برفانی پرتوں کے ساتھ قدیم حجری اوزار نہیں پائے گئے۔ کشمیر کے ان برفانی عہدوں کا رشتہ دونا کے مشن کے نزدیک موجود پاکستان کے ضلع راولپنڈی میں پوٹھوہار علاقہ میں دریائے سندھ کی معاون سوہن ندی کی ڈھلوان سطحوں سے جا ملتا ہے۔ سوہن ندی کی ان ڈھلوان سطحوں پر قدیم حجری اوزار پائے جاتے ہیں۔ انھیں ہندستان کے ماہرین اثریات نے ”سوہن“ اوزار کا اصطلاحی نام دیا ہے۔ مخصوص سوہن اوزاروں میں پتھر کے ٹکڑے کی ادپری حصے کی ایک طرف کی پرتیں تراش کر دھار نکالی گئی ہے۔ چونکہ ان اوزاروں میں ایک طرف دھار ہوتی ہے، اس لیے وہ یک رخ تیشے کہلاتے ہیں۔ ماہرین اثریات کا خیال ہے کہ اوزاروں کی یہ قسم ہندستان میں برما، جاوا، اور چین جیسے مشرقی ممالک سے آئی۔ حال میں اسی طرح کے اوزار شمالی ہند میں کاگرہ کے نزدیک دریائے بیاس کے معاون بان گنگا کی وادی اور سرسہ کی وادی میں پائے گئے ہیں۔ پلوٹزم مدراس میں پائے گئے اوزاروں کی وضع قطع قدرے مختلف ہے۔ یہ پتھر کے ٹکڑے کے ایک حصے کے دونوں رخوں کو تراش کر دستی کلہاڑی، چھرا، بندوق، وغیرہ کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اس وضع کے اوزار سوہن کی وادی میں بھی پائے تو گئے ہیں، لیکن بہت کم تعداد میں۔

اس طہ سرح ہندستان کا قدیم حجری دور دو موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک رنجی (سوہن) اور دوسری (مدراس) اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ یک رخ رنجی اوزار ہمالیہ کے نچلے علاقوں ہی تک محدود ہیں، جب کہ دوسری اوزار دوسری جگہوں میں عام ہیں، اگرچہ کہیں کہیں دونوں مخلوط بھی پائے گئے ہیں۔

پچھلے چند سال سے قدیم حجری عہد سے متعلق تلاض و تفتیش کا کام زور دیں پہنچ رہا ہے۔ مرکزی محکمہ اثریات کے علاوہ اداروں اور یونیورسٹیوں بالخصوص دکن کالج اور بڑوہ ریونیورسٹی کی کوششوں کے نتیجے میں پنجاب، راجستھان، گجرات، وسط ہند، دکن اور جنوبی ہند کی کئی ندیوں کی تہوں اور ڈھلوان پر اس قسم کے اوزاروں پر مشتمل سینکڑوں تہ نشینی وغیرہ

دریافت کئے گئے ہیں۔

دسلی ہند اور دکن میں قدیم حجری دھلکی دستی کلہاڑی اور چھڑے کی قسم کے اوزاروں کی جگہ ایک دوسری وضع کے اوزار کا استعمال پایا گیا ہے۔ کچھ عرصے تک، قدیم الذکر اوزاروں کو سلسلہ اول اور موخر الذکر کے لیے سلسلہ دوم کے اصطلاحی نام استعمال کیے جاتے تھے، لیکن اب ماہرین ان کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ دوم والے اوزار جسامت میں چھوٹے ہیں اور نسبتاً بہتر قسم کے پتھر سے بنے ہیں۔ ان کی شکلوں میں بھی زیادہ تنوع پایا جاتا ہے مثلاً ان میں دھار والے اوزار شامل ہیں۔ کم از کم دریا سے زبدا کے کنارے پر واقع مہیشوڈی اور گوداوری کی معاون پرورا کے کنارے نواسا میں واضح طور پر ایسے طبقاتی شواہد پائے گئے ہیں، جن کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلے یعنی دوم کے اوزار سلسلہ اول کے اوزاروں کے بہت بعد کے ہیں کیونکہ اول الذکر واضح اور علیحدہ ذخیرے کی شکل میں بہت اوپری تہوں میں ملے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ دوم کے اوزاروں نے سلسلہ اول کے اوزاروں کی بلاد اسطہ جگہ نہیں لی۔ جسامت سے قطع نظر سلسلہ دوم کے اوزاروں کی شکلوں کو مانکر لینیۃ یعنی چھوٹے حجری اوزاروں کا پیشرو قرار دیا جاسکتا ہے۔

یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا (مشرق وسطی) میں مانکر و لیتھوں کو قدیم حجری عہد اور متاخر حجری عہد کے درمیان متوسط حجری عہد کے زمانے کا قریب لایا گیا ہے۔ ہندوستان میں متوسط حجری عہد کی موجودگی زیادہ یقینی طور پر ثابت نہیں ہوئی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عہد یہاں تقریباً پچھتر ہزار سال پہلے شروع ہوا اور اب سے دس گیارہ ہزار سال پہلے اختتام کو پہنچا۔ کچھ دریافت شدہ شواہد کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے آخر ہی میں نئے یعنی متاخر حجری دور کی اوزار سازی کی صنعت وجود میں آچکی تھی؛ گو یہ کب ہوا، اس کی تعیین ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اس متوسط حجری عہد کے اوزار مقابلاً صفات اور تیز اور نوکیلے پائے گئے ہیں۔ نوعیت میں یہ اوزار تیر اور نیزوں کی نوکوں جیسے، چھیلنے والے برے وغیرہ کی قسم کے ہوتے تھے۔ ابتدائیں اس دور میں دستی کلہاڑیاں اور چھڑے پائے جاتے ہیں، لیکن جلد ہی اس کی ساخت اور تراش میں تیزی آیا اور کچھ عرصہ میں ان کا بننا بند ہو گیا۔ اس

عکس آثار قدیمہ

ہند کے جن اوزاروں کا اوپر ذکر ہوا، وہ بھی جسامت میں چھوٹے ہوتے گئے اور آخری زمانہ ان کی شکل مائکرو لیتھ کی سی ہو گئی۔ جنوبی ہند کے مشرقی ساحل پر گوڈیم کے قریب کے آثار بھی اس دور کے حجری اوزار ملے ہیں، اگرچہ وہاں کسی سکونت کے آثار نہیں پائے گئے۔

ہندستان میں مائکرو لیتھ کو ان کی جگہ وقوع کے اعتبار سے تین واضح قسموں میں بانٹا ہے: پہلی قسم قدیم ترین مائکرو لیتھ کی ہے، جو منترہاے جنوبی ہند میں سرخ ریت کے ٹیلوں (جنہیں مقامی زبان میں تیری کہا جاتا ہے) اور مغربی بنگال میں صنلع بردوان کے ہیر بھل پورہ کے مقام پر پائے گئے ہیں۔ یہ شکل میں کچھ بھدے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور اشیاء آثار نہیں ملے۔ قسم دوم، ان مائکرو لیتھ کی ہے، جو آندھرا پردیش میں ناگارجن کٹھہ اور رات میں لنگن باج جیسی جگہوں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ جو اشیاء پائی گئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اس عرصے میں ظروف کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ مائکرو لیتھ انیسویں قسم، چاکولیتھک یعنی دھاتوں کے استعمال کے زمانے کے شباب سے تعلق رکھتی ہے۔

ہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دنیا کے دیگر ممالک کے برعکس ہندستان میں ابتدائی چاکولیتھک عہد کے آثار اب تک کہیں سے نہیں ملے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں اس عہد کی تہذیب قدرے تاخیر سے شروع ہوئی۔

قبل تاریخ کا تیسرا دور متاخر حجری دور ہے۔ اس کی ابتدا کے زمانے کی صحیح طور پر تعین کرنا ممکن نہیں ہو سکا اس کے آثار تقریباً دو ہزار سال قبل از مسیح تک بعض ایسے مقامات پر ملے ہیں، جو دشاو گندار ہیں۔ ان میں سے کچھ مقاموں پر اس حجری دور کے آثار دوسری صدی مسیح تک کے بھی ملے ہیں۔

قبل تاریخی عہد کا چوتھا دور جدید حجری دور ہے جس میں انسان کی تمدنی زندگی نے نمایاں رتی کی۔ اس دور کے حجری اوزار پچھلے دو ادوار کے اوزاروں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں ہندستان میں انسانوں نے زراعت اپنیشہ اختیار کیا اور مویشی اور دوسرے جانور پالنا شروع کیے۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا کہ یہاں اس دور کے جو اولین آثار ملے ہیں، وہ اس دور کی تہذیب کے بلوغ پر مبادل ہیں۔

محکمہ آثار قدیمہ

دریافت کئے گئے ہیں۔

دسلی ہند اور دسویں میں قدیم حجری دور کی دستی کھارڑی اور چھڑے کی قسم کے اوزاروں کی جگہ ایک دوسری وضع کے اوزار کا استعمال پایا گیا ہے۔ کچھ عرصے تک مقدم الذکر اوزاروں کو سلسلہ اول اور موخر الذکر کے لیے سلسلہ دوم کے اصطلاحی نام استعمال کیے جاتے تھے، لیکن اب ماہرین آثار کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ دوم والے اوزار جسامت میں چھوٹے ہیں، اور نسبتاً بہتر قسم کے پتھر سے بنے ہیں۔ ان کی شکلوں میں بھی زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ مثلاً ان میں دھار والے اوزار شامل ہیں۔ کم از کم دریا سے نزدیک کنارے پر واقع مہیشویں اور گوداوری کی معاون پرورا کے کنارے نواسا میں واضح طور پر ایسے طبقاتی شواہد پائے گئے ہیں، جن کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلے یعنی دوم کے اوزار سلسلہ اول کے اوزاروں کے بہت بعد کے ہیں کیونکہ اول الذکر واضح اور علیحدہ ذخیرے کی شکل میں بہت اوپری تہوں میں ملے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ دوم کے اوزاروں نے سلسلہ اول کے اوزاروں کی بلا واسطہ جگہ نہیں لی۔ جسامت سے قطع نظر سلسلہ دوم کے اوزاروں کی شکلوں کو مانگرولیتہ یعنی چھوٹے حجری اوزاروں کا پیشرو قرار دیا جاسکتا ہے۔

یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا (مشرق وسطی) میں مانگرولیتوں کو قدیم حجری عہد اور متاخر حجری عہد کے درمیان متوسط حجری عہد کے زمانے کا قریب دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں متوسط حجری عہد کی موجودگی زیادہ یقینی طور پر ثابت نہیں ہوئی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عہد یہاں تقریباً پچھتر ہزار سال پہلے شروع ہوا اور اب سے دس گیارہ ہزار سال پہلے ختم ہو گیا۔ کچھ دریافت شدہ شواہد کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے آخر ہی میں نئے یعنی متاخر حجری دور کی اوزار سازی کی صنعت وجود میں آچکی تھی؛ گو یہ کب ہوا، اس کی تعیین ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اس متوسط حجری عہد کے اوزار مقابلاً صاف اور تیز اور نکیلے پائے گئے ہیں۔ نوعیت میں یہ اولاد تیز اور نیزوں کی کوکڑی جیسے چھیلنے والے برے وغیرہ کی قسم کے ہوتے تھے۔ ابتدائیں اس دور میں دستی کھارڑیاں اور چھڑے پائے جاتے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کی ساخت اور تراش میں تیز رفتاری آتا اور کچھ عرصہ میں ان کا بننا بند ہو گیا۔ اس

حکمہ آثار قدیمہ

ہند کے جن اوزاروں کا ادھر ذکر ہوا، وہ بھی جسامت میں چھوٹے ہوتے گئے اور آخری زمانہ ان کی شکل مانگرولیتھ کی سی ہو گئی۔ جنوبی ہند کے مشرقی ساحل پر گوڈیم کے قریب کے غار بھی اس دور کے حجری اوزار ملے ہیں، اگرچہ وہاں کسی سکونت کے آثار نہیں پائے گئے۔

ہندستان میں مانگرولیتھ کو ان کی بجائے وقوع کے اعتبار سے تین واضح قسموں میں بانٹا ہے: پہلی قسم قدیم ترین مانگرولیتھ کی ہے، جو مستحضرے جنوبی ہند میں سرخ ریت کے ٹیلوں (جنہیں مقامی زبان میں تیری کہا جاتا ہے) اور مغربی بنگال میں صلیح بردوان کے ہیر بھلن پورہ کے مقام پر پائے گئے ہیں۔ یہ شکل میں کچھ بعد سے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور اشیاء آثار نہیں ملے۔

قسم دوم، ان مانگرولیتھ کی ہے جو آندھرا پردیش میں ناگارجن کٹھ اور رات میں لنگن باج جیسی جگہوں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ جو اشیاء پائی گئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اس عرصے میں ظروف کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ مانگرولیتھ، نمیری قسم، چاکولیتھک یعنی دھاتوں کے استعمال کے زمانے کے شباب سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دنیا کے دیگر ممالک کے برعکس ہندستان میں ابتدائی اکلولیتھک عہد کے آثار اب تک کہیں سے نہیں ملے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دوسرے لوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں اس عہد کی تہذیب قدرے تاخیر سے شروع ہوئی۔

قبل تاریخ کا تیسرا دور متاخر حجری دور ہے۔ اس کی ابتدا کے زمانے کی صحیح طور پر تعین کرنا ممکن نہیں ہو سکا اس کے آثار تقریباً دو ہزار سال قبل از مسیح تک بعض ایسے مقامات پر ملے ہیں، جو دشوار گزار ہیں۔ ان میں سے کچھ مقاموں پر اس حجری دور کے آثار دوسری صدی

قبل تاریخ عہد کا چوتھا دور جدید حجری دور ہے جس میں انسان کی تمدنی زندگی لے نمایاں تھی۔ اس دور کے حجری اوزار پچھلے دو ادوار کے اوزاروں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں ہندستان میں انسانوں نے زراعت پیشہ اختیار کیا اور مویشی اور دوسرے جانور پالنا شروع کیے۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا کہ ہاں اس دور کے جو اولین آثار ملے ہیں، وہ اس دور کی تہذیب کے بلوغ پر وال ہیں۔

مقدمہ آثار قدیمہ

اس دور کی ابتدائی شکل کی تشفی بخش نشاندہی کرنے والے کوئی آثار اب تک دریافت ہوئے؛ اسی لیے اس تہذیب کا ابتدائی حال معلوم نہیں ہو سکا، اس قدر کی جو قدیم تاریخ معلوم ہوئی ہے، وہ دو ہزار تین سو قبل از مسیح ہے اگرچہ یہ قریبی قیاس ہے۔ کی ابتدا تقریباً چار ہزار سال قبل از مسیح ہوئی ہوگی۔ اسی طرح اس کے اختتام کا بھی تقریباً گیارہ سو سال قبل از مسیح کا قیاس کیا جاتا ہے۔

جدید حجری یعنی نیولیتھ اوزار پیشتر ذکر کردہ صاف کیے ہوئے پتھر کے کھانڈوں پر مشتمل ہیں۔ پورے وسط ہند، دکن اور جنوبی ہند میں دستیاب ہوئے ہیں۔ شمال مشرقی ہند میں بھی ان کے اوزار ملے ہیں، لیکن یہاں وہ بحیثیت مجموعی، شکل میں قدرے مختلف ہیں مثلاً متعدد علاقوں میں ان کی شکل تراش کے لحاظ سے مدور اور بیضوی ہے جب کہ شمال مشرقی حصہ یہ لمبوتری ہے اور کسی کسی میں ان کے شانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال سے ماہرین اثریات نے یہ قیاس کیا ہے کہ کوئی تعجب نہیں، اگر شمال مشرقی اوزار کی وضع مشرقی ممالک کے اوزاروں کی طرز پر ہو۔

اس دور کے چند ہی قدیم مقاموں یعنی وہ مقام جو تانبے کی دریافت اور استعمال سے پہلے کے ہیں، ان کی کھدائی دکن ہی میں عمل میں آئی ہے۔ اس سلسلے میں جو بھی محدود قسم کی شہادتیں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ جدید حجری دور میں کھوری قسم کے کالے یا تھو رنگ کے ظروف رائج تھے۔ ان اوزاروں کے ذخیروں میں بعض اوقات ماگرو لیتھ بھی پائے گئے ہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ وسطی اور جنوبی ہند میں نیولیتھ (جدید حجری اوزار) اور ماگرو لیتھ (چھوٹے پتھر کے اوزار) تانبے کی بنی ہوئی چیزوں کے ساتھ ملے ہیں۔ یہ بعید از امکان نہیں کہ جدید حجری دور کی روایات چالکولیتھک یعنی وحالتوں کے عہد میں بندھنا چلے گئے ہوں، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہندستان میں چالکولیتھک عہد کے آثار دنیا کے دیگر ممالک کے برعکس کافی بعد کے زمانہ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ چاہے تو یہ تھا کہ چالکولیتھک عہد، جدید حجری دور کے بعد ہوتا، لیکن

ہاں جدید حجری دور اور پچانو لیتھک عہد کے درمیان ایک ادھ تہذیب کے رواج کا پتا
نہے جس کا تعلق کانسی عہد (برونز ایج) سے ہے۔

۱۶-۱۹۲۲ء میں سب سے پہلے اس تہذیب کے آثار دریافت ہوئے، لیکن ان میں
اس وقت تک کی کھدائیوں کے آثار میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ دادی سندھ کی
اس تہذیب کا اصطلاحی نام اب ہڑپا تہذیب ہے۔ اس کی دریافت تاریخ ہندستان
اس ایک معرکہ آراء واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس تہذیب کے آثار پہلے پہل مغربی
پاب (پاکستان) کے ضلع خشکری کے مقام ہڑپا میں برآمد ہوئے۔ اس کے بعد سندھ

پاکستان کے ضلع لاڑکانہ میں موہن جو دڑو کی کھدائی سے بھی اس کے آثار نکلتے ہیں۔ دریافت
ہندوستانی تہذیب کے آغاز کے نظریے میں انقلاب پیدا کر دیا۔ دریافت شدہ چیزوں
اس سنگ جراحہ کی وہ مہریں بھی تھیں، جن پر ایک نامعلوم زبان کی تحریریں ہیں (یہ
زیریں آج تک ناخواندہ ہیں) جب ان مہروں کی مختصر کیفیت لندن فی اخباروں میں شائع
وئی، تو غیر ملکی اہل تحقیق نے توجہ دلائی کہ ان مہروں میں اور عراق کے کچھ مقامات سے
آمد شدہ مہروں میں بڑی مشابہت ہے۔ چونکہ عراقی مہریں غالباً دو سے تین ہزار سال
بل اندیس کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے ہندوستانی آثار قدیمہ کی مدت عمر میں بھی
دو ہزار سال کا اضافہ ہو گیا، ورنہ اس سے یہاں پہلے یو جی عہد کے آثار کے علاوہ کوئی
قدیم چیز دریافت نہیں ہوئی تھی۔ دادی سندھ کی یعنی ہڑپا تہذیب کی دریافت کے
ملک بھر میں ایک ہوجان پیدا کر دیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے
۱۹۲۷ء میں شعبہ تفتیش قائم ہوا۔

ہڑپا تہذیب کی خصوصیات میں پختہ اینٹوں کے مکانات، مرتب و منظم شہری نقشہ بندی اور
پانی کی نکاسی کے لیے نالیوں اور موڑیوں کا باقاعدہ انتظام شامل ہیں۔ اس تہذیب کے لوگوں
کی بنائی ہوئی چیزوں میں مذکورہ بالا سنگ جراحہ کی مہریں جن پر غیر معمولی جانوروں کی
تصویریں اور نامعلوم تحریریں پائی جاتی ہیں، چاک پر بنائے ہوئے مخصوص شکلوں کے سرخ
طواف جن میں سے کچھ پر کالے رنگ کی خاص طرح کی نقاشی ہے، چرٹ قسم کے پتھر کے لیے

پھل، کانسی کی اشیاء، پکائی ہوئی مٹی گئے دیوڑیل، دیوتاؤں، انسانوں اور جانوروں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے، سونے کے زیور اور جھوٹے پتھروں کے منکے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موہن جو دڑو میں ۱۴۳۱ء تک وسیع پیمانے پر کھدائی ہوئی رہی۔ اس میں دو بڑے شہروں کے آثار برآمد ہوئے۔ ایسی اہم دریافت کو ادھورا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک سندھ اور بلوچستان کے مختلف حصوں میں تلاش و تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سے سندھ میں ہڑپا تہذیب کے حامل چھوٹے چھوٹے مقاموں کی بڑی تعداد منظر عام پر آگئی۔ لیکن اس کے علاوہ ایک نہایت اہم دریافت یہ ہوئی کہ امری کے مقام پر ہڑپا تہذیب سے قدیم تر تہذیب اور پھر چھوڑا اور چنودڑو کے مقامات پر اس کے بعد کی ایک اور تہذیب کا سراغ ملا۔ بلوچستان میں بھی بکثرت ایسے مقامات ملے، جن میں سے کچھ ہڑپا تہذیب سے قدیم تر تھے اور کچھ اس کے بعد کے زمانے کے ماہرین نے اس ماقبل ہڑپا تہذیب کا زمانہ تین ہزار سال قبل از مسیح کے اوپر متعین کیا ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد جن اور مقاموں میں ہڑپا تہذیب کے آثار کا پتا ملا ہے، ان میں خاص خاص یہ ہیں: ضلع انبالہ میں کوئلہ ننگ، ریاست بہاولپور (پاکستان) میں پرانے دیا سے سرسوتی کے ساتھ کے کئی مقام؛ ضلع انبالہ میں روڑی؛ ضلع میرٹھ میں عالمگیر پور؛ ریاست گجرات کے ضلع سریندر نگر میں رنگپور؛ ضلع احمد آباد میں کوٹھل؛ اور ضلع سورت میں مالون، وغیرہ۔ ہڑپا تہذیب کا انتہائی جنوبی مقام جو اب تک دریافت ہوا ہے، دریائے ناپتی کے دہانے کے قریب ضلع سورت کا یہی مقام مالون ہے۔

مغرب سے لے کر مشرق تک اور شمال سے لے کر جنوب تک تقریباً آٹھ سو میل کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی اس ہڑپا تہذیب کی بنیادی خصوصیات کم و بیش سب جگہ یکساں ہیں۔ اگرچہ قدرتا ان میں کچھ مقامی فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کوٹھل میں مخصوص ہڑپائی ظروف کے علاوہ ہلکے گیر سے رنگ کے اور سیاہ و سرخ رنگ کے ظروف بھی ملے ہیں۔ بہر حال اس تہذیب کا پھیلاؤ امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بات بلا غور و تردید کہی جاسکتی ہے کہ ایشیا کی کانسی عہد کی جملہ تہذیبوں میں اس

تہذیب کا پھیلاؤ سب سے زیادہ تھا۔

جب ۱۹۴۶ء میں ہڑپا میں اڑس نو کھدائی کی گئی، تو ایک ٹیلے کے چاروں طرف بہت اونچی فصیل برآمد ہوئی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ٹیلے پر شہر کی اہم عمارتیں ہونگی جس کی حفاظت خاص طور پر منظور تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کی کٹہری زندگی جمہوری طرز کی نہیں ہوگی، علاوہ انہیں، ایک قبرستان بھی برآمد ہوا، جس کے اجاڑے میں لاکھ دفنائی ہوئی لاشوں کے پھڑکے۔ روڑ میں کچی اور پکی اینٹیں، پتھر کی دیواریں، سنگ جراثیم کی مہریں اور اس تہذیب کی دوسری مخصوص اشیاء اور ظروف دستیاب ہوئے۔ یہاں بھی ایک قبرستان برآمد ہوا تھا۔ لوٹھل میں ہڑپا تہذیب کے لوگوں کے مکانات عموماً پکی اینٹوں کے تھے، جن میں باقاعدہ اندرونی حمام اور نالیوں کا انتظام تھا۔ یہ نالیاں باہر سرنگ کی نالیوں سے طائی گئی تھیں۔ گندے پانی کی نکاسی کے لیے گندے پانی کے حوض اور مشکوں والے گڑھوں کا استعمال رائج تھا۔ غرض ان دریا فتوں سے اس زمانے میں شہر کی بلدیاتی سہولتوں کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوٹھل کی سب سے اہم دریا فت اینٹوں کا بہت بڑا احاطہ ہے جس کی لمبائی مشرق سے مغرب تک ۸۰ میٹر اور شمال سے جنوب تک چوڑائی ۷۰ میٹر ہے۔ اس چوڑے سے یہاں کے لوگ گودی کا کام لیتے تھے۔ اس گودی کو قریب میں بہتے ہوئے دریا سے بھر گاؤہ کے ساتھ ایک سات میٹر چوڑے نالے سے جوڑا گیا تھا یہ اور دوسرے شواہد کی بنا پر یہ قیاس کیا گیا ہے کہ ملک کے اس حصہ سے مغربی ایشیا کے ممالک کے ساتھ تجارت یا اس قسم کی کسی اور غرض سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہڑپائی لوگ مشرق میں دریائے جمن کی وادی تک تو دریاؤں کے راستے سے پہنچتے تھے، لیکن گجرات میں ان کا ورود غالباً سمندری راستے سے ہوا تھا۔

لوٹھل کی سکونت کے بارے میں یہ دریافت ہوا کہ اس مقام کی پانچ ارتقائی منزلیں تھیں، جن میں سے چار تو ہڑپا تہذیب کے عہد تکمیل سے وابستہ تھیں اور آخری اس کے بعد کی حالت سے۔ آخری ارتقائی حالت میں شہری آبادی کا نقشہ اتنا مرتب نہیں تھا، جتنا کہ

حکماء آثار قدیمہ

تھمیتز حالتوں میں ؛ یہاں ظروف کی نئی قسمیں بھی تھمیتز ظروف کی ارتقائی شکلیں تھیں۔ یہاں بھی ایک قبرستان دریافت ہوا اس میں ابتدائی تاریخی زمانے کی اور بعد کے دوروں کی قبریں برآمد ہوئیں۔ قدیم زمانے کی قبروں میں دو انسانی ڈھانچے پہلو بہ پہلو رکھے ہوئے تھے۔ یہاں کی مہروں پر جانوروں کی جو شکلیں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے ایک شیر کی ہے ؛ دوسری شکل ایک ایسے جانور کی ہے جس کا منہ ہاتھی کی سونڈ جیسا ہے، سینک جیل جیسے ہیں اور دم کھڑی ہے اور سانپ کی سی دکھائی دیتی ہے ظروف کے نقش و نگار کے عام موضوع سارس، بارہ سنگا، مور، چڑیا، سانپ وغیرہ ہیں ؛ کچھ پرندوں کی جمع میں بھی ہے۔

عالمگیر پور میں چار زمانوں کی بستیوں کا سراغ ملا۔ ان میں سب سے پرانی آبادی کا تعلق ہڑپا تہذیب سے تھا۔ مگر اس زمانے کی عمارتوں کا کوئی نشان نہیں ملا، لیکن اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ یہ پختہ ایشیوں اور لمبرترے کپڑوں سے بنائی جاتی تھیں۔ اس کے ظروف میں پایہ دار نشتری، مخروطی پینڈے دار پیالے وغیرہ قسم کے ہڑپائی وضع کے مخصوص برتن ملے ہیں۔ ظروف کے نقش و نگار میں پیشوں، مثلث، مربع، متقاطع دائروں، ٹوڑوں، مرد، وغیرہ کو بعد موضوع استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ ناندوں پر کھدی ہوئی مخصوص علامتیں ہیں اور ان میں سے ایک پر کپڑے کے ٹپے کا نشان بھی پایا گیا ہے۔ کچھ ہڑپائی مٹی کے چھوٹے مجسمے بھالو، کوہنڈا، بیل اور سانپ کی شکلوں کے تھے۔ دوسری چیزوں میں قرص، گارڈیاں، گلاب پانسے، منکے جن میں سے ایک پر سونا چڑھا ہوا تھا، اور چوڑیاں شامل ہیں۔ نیز مٹی کی نقارہ، چوڑیاں، سنگ جراثیم اور نیم قیمتی پتھروں کے منکے، لپین اور ایک کالسی یا تانبے کا ٹوا ہوا پھل پایا گیا ہے۔

ہڑپائی یہ عظیم تہذیب کس طرح وجود میں آئی، اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ اس کا علاقہ سے قریبی تعلق ہونا برآمد شدہ مشترک النوع آثار اور اشیاء سے ثابت ہے۔ پھر بھی یہ بعید از اسکان نظر آتا ہے کہ ہڑپائی لوگ وسط ایشیا کی کسی جگہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہوں۔ بلوچستان میں کئی چاکلو، لیٹیک، یعنی دھاتوں کے عہد کی تہذیبوں کی موجودگی ہڑپا تہذیب کے

عروج کمال یا بلند سے قبل کی تسلیم کی جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ ہڑپائی عہد تک موجود تھیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی خصوصیات ہڑپائی تہذیب سے طبعی جلتی ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو بھی ہڑپا تہذیب کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسی طرح ہڑپا تہذیب کے خاتمے کے بارے میں بھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بہت سارے اسباب مثلاً بیرونی حملے، سیلاب، زمین کا سوکھ جانا وغیرہ بتائے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں بھی کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جہاں تک شمالی حصے کا تعلق ہے اثریاتی شواہد مبہم ہیں۔ موزہ جو ڈنڈو میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ہڑپا تہذیب شہر کے آخری فزوں میں بُد باخطاط ہو چکی تھی اور بیرونی ذرائع سے بھی کچھ تباہی ضرور عمل میں آئی۔ جھوکنا دھ چنودھو میں ایک بعد کی تہذیب کا جو جھوکڑ تہذیب کے نام سے موسوم ہے ہڑپا تہذیب کے بعد مداح ملتا ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، اس نئی تہذیب کے ظروف ہلکے گیرے یا ہلکے بادامی رنگ کے تھے، جن پر اودے یا لال رنگ کے نقش بنائے گئے تھے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ جھوکڑ تہذیب براہ راست ہڑپا تہذیب سے پیدا ہوئی۔ خود ہڑپا میں بھی بعد کے زمانے میں ایک نئی تہذیب رائج ہوئی، جو اثریاتی شواہد کی بنا پر ہڑپا کے باشندوں کے اس مقام کو ترک کر دینے کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہی۔

مشرق میں اوستائے، شمالی میدانوں میں ہڑپائی لوگوں کے بعد وہ لوگ آئے جن کے ظروف میں بعض نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان ظروف کو منقش بھورے ظروف کا اصطلاحی نام دیا گیا ہے۔ اس بات کے واضح اثریاتی ثبوت برآمد ہوئے ہیں کہ یہ لوگ ان مقامات پر ہڑپائی لوگوں کے فوراً بعد نہیں آئے، بلکہ کافی عرصے کے بعد مقیم ہوئے۔ شمالی ہند کا اثریاتی میں ہڑپا تہذیب کے خاتمے یعنی تقریباً ۱۶۰۰ قبل از مسیح سے لے کر اسکندر اعظم کے حملے یعنی ۳۲۶ قبل از مسیح تک ہماری معلومات آج سے کچھ سال پہلے تشریف لے گئیں۔ پچھلی دودھ پڑوں کا کھدائیں سے اس عہد تا دیکھ "پر کچھ روشنی پڑی ہے، جس سے اس تصویر کے خدو خال تو ابھرتے ہیں، لیکن ان کی تفصیلات ابھی مزید تحقیق اور دریافت پر منحصر ہیں۔ مثلاً عالمگیر اور میں مالہر ہڑپا تہذیب کے لوگ منقش بھورے ظروف کے علاوہ کالے رنگ کی مٹی کے گھول

سے پیسے بہتے سرخ و سیاہ اور سادے لال ظروف بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ پکی ہوتی تھی۔ جانوروں کی شکلوں کے پیسے دار کھلونے، پائے، تحریری آئنے، نوکدار سوسٹیاں اور ہڈیوں کے بہوتے پیکان، کالے یشب، شیشے کے مسالے اور ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹنگیاں اور شیشے کے تنکے بھی بناتے تھے۔ ان کے مکان نرکل کے ڈھانچوں پر مٹی کی موٹی تہیں جما کر بنائے جاتے تھے۔ گجرات میں ہڑپا تہذیب اور اس کے مابعد کی تہذیب کی صورت قدرے مختلف رہی ہو وہاں رنگپور اور لوتل میں ان دو تہذیبوں میں چند مشترک باتیں پائی جاتی ہیں مثلاً بعد کی تہذیب کے ظروف کی کچھ شکلیں ہڑپائی ظروف کی مخصوص شکلوں پر مبنی ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ یہاں آبا نے دوسری سے جنم لیا ہو۔ مابعد ہڑپا تہذیب کی ارتقائی حالتیں گجرات میں کئی مقاموں (مثلاً رومہڈی میں) ملتی ہیں۔ اس جگہ سکونت کے تین دور ملے ہیں۔ پہلے میں رہنے والا نے ایک نیچا چوڑا بنا کر اس پر مٹی اور مٹی کی اینٹوں کے مکان بنائے تھے۔ ان کے ظروف عام طور پر اچھی مٹی کے تھے اور خوب اچھی طرح سے پکائے گئے تھے اور چند سیاہ پٹریں۔ قطع نظر غیر منقول تھے۔ چھوٹے چمناتی اوزار، تانبے کے آلات، سونے کے کمانیدار حلقے، تانبے کی چوڑی، عقیق کے تنکے وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا۔ کچھ اور بعد کی تہذیب میں گڑا میں ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں بعض جگہوں سے خصوصی طور پر منقول نظر آتی ہیں۔ مثلاً پٹن سومناٹہ (پریماس پٹن) کی تہذیب۔

ریاست میسور میں واقع برہم گیری کی کھدائی سے ایک ایسی چاکرلیتھک عہد کی تہذیب ظاہر ہوئی جو سمورے اور لال ظروف و جن میں سے لال ظروف پر کالے رنگ میں نقاشی کی گئی ہے۔ چند چھری اور اڑا، مایکرو لیتھ، چوٹ پتھر کے بے پھل اور کچھ تانبے کی اشیاء کی حامل تھی۔ بعد تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ تہذیب اٹھارہ سو سال قبل از مسیح سے لے کر نو سو سال قبل از مسیح تک پورے کن اور وسط ہند میں رائج تھی جن اہم چاکرلیتھک مقاموں کی اب تک کھدائی ہوئی ہے وہ یہ ہیں: دریائے تنگ بھدرا کی وادی میں برہم گیری، اہک، دیاسے، گوداوری کی وادی میں ناسک، جھروے، نواسا، چاندولی اور واثم آباد، دیاسے، تاپتی کی وادی میں بہل، اور پرکاش، وادی نربدا کی وادی میں ہمشہد، نودالولی، ایرن اور تھوڑی

دی چنبل میں ناگدا، مغربی بنگال میں پانڈورا جاردھیبی؛ بہار میں چیراندا، اتر پردیش میں سو باگورا؛ اور راجستھان میں آبار اور گیلوند۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک خطے میں اس تہذیب کی اپنی انفرادی خصوصیت تھی، تاہم کچھ عام خصوصیتیں سب نظروں میں مشترک بھی تھیں، مثلاً جدید جھری اوزار، مایکرو لیتھ، تانبے کی چیزوں اور کالی نقاشی والے لال ظروف کا استعمال ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ان تہذیبوں میں اور مہجرات کی مابعد ہڑپا تہذیبوں میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے زمانے کی تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ کچھ خطوں میں تہذیب کی ابتدا دوسرے خطوں کے مقابلے میں کچھ قدیم رہی ہوگی۔ راجستھان میں اودھ پور کے نزدیک اباڑ میں چالکولیتھک تہذیب کی نمائندگی زیادہ تر مایکرو لیتھ اور منقش یا غیر منقش سیاہ و سرخ ظروف سے ہوتی ہے۔ شمال کے کچھ قدیم مقاموں میں اس تہذیب کے بعد ایک ایسی سیاہ و سرخ ظروف والی تہذیب کا رواج ہوا، جو برتنوں کو آگ میں اوندھا کر کھرجلانے سے بننے لگے تھے۔ اس طریقے سے برتنوں کے اندر دہنی تھے کہ ہر اند گھنے سے وہ کاسے پڑ جاتے تھے، جب کہ باہری تھے ہیں جن پر ہر لگتی تھی، لال ہر جلتے تھے۔ مامو کے قدیم شہر امبین میں اس تہذیب کے لوگوں کی سکونت قریب قریب ساتویں صدی قبل مسیح میں شروع ہوئی۔ لوہے کا استعمال اس زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے شمالی میدانوں کی منقش بھوسے ظروف کی تہذیب کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ روہنگی کھدائی میں یہ دیکھا گیا کہ ہڑپا تہذیب کے خاتمے اور اس تہذیب کے ظروف کی نمود کے درمیان ایک خلا ہے۔ یہ ظروف شمالی راجستھان، پنجاب اور مغربی اور وسطی اتر پردیش میں کئی مقاموں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ اس وضع کے ظروف کا خاص مقام ضلع میرٹھ میں ہستنا پور کا مقام ہے، جہاں یہ ظروف طبقاتی کھدائی میں جھدے لال ظروف کے بالکل اوپر پائے گئے تھے۔ ماہرین اثریات کا قیاس ہے کہ یہ لال ظروف تانبے کے ان ذخیروں سے تعلق رکھتے ہونگے، جو دیاسے گنگا کی وادی میں وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتے رہے ہیں اور جن کا زمانہ ۱۹۰۰ سال قبل مسیح سے لے کر ۱۳۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ پھر ہستنا پور اور اودھ پور میں منقش ظروف و سرخ اور سیاہ و سرخ ظروف کے ساتھ ملنے ہیں مگر کئی ہڑپا اینٹیں نہیں

دستیاب ہوتیں۔ لوہا بھی اس دور کے اور اخیر میں ملتا ہے۔ ہستناپور میں کھدائیوں سے ثابت ہوا ہے کہ اس تہذیب کا خاتمہ وہاں ایک بھاری سیلاب سے ہوا تھا۔
منقش بھورے ظروف کی تہذیب تقریباً ۱۱۰۰ سال قبل مسیح اور ۶۰۰ سال قبل مسیح کے درمیان رائج تھی۔ اس حقیقت کی بنا پر کہ اس تہذیب کے ظروف ہندوستان کے ان علاقوں پر ملے ہیں، جہاں آریہ قوم کی آبادی تھی (باستثنا مغربی پنجاب کے جہاں اس نقطہ نظر سے اثریاتی تفتیش عمل میں نہیں آئی، اور بعض ایسے مقاموں پر جن کا ذکر قدیم ہندی ادب میں ملتا ہے، دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ یہ ظروف آریوں کی مصنوعات کا نتیجہ ہیں۔

ہندوستانی اثریاتی کا دوسرا عہد آفرین واقعہ نہایت چمکدار سطح والے ظروف کا ہے، جو عموماً سیاہ رنگ کے ہیں، گو یہ دوسرے رنگوں میں بھی پائے گئے ہیں۔ اس وضع کے ظروف کا اصطلاحی نام شمالی سیاہ پالش والے ظروف ہے۔ چونکہ یہ ظروف ضلع الہ آباد میں کوسمبی اور راجگھاٹ، بنارس جیسے قدیم مقامات میں بکثرت ملے ہیں، یہ خیال کیا جا چکا ہے کہ سب سے پہلے یہ ظروف دیاپور گنگا کے وسطی میدانوں میں نمودار ہوئے اور پھر وہاں سے قریب قریب سارے ہندوستان میں پھیل گئے کیونکہ شمال مغرب میں ٹکسلا جنوب میں آندھرا پردیش کے ضلع گنڈاپ میں امراتلی کے مقام پر اس وضع کے ظروف برآمد ہوئے ہیں۔ اور ایسہ میں بھی یہ ظروف پائے گئے ہیں۔ اثریاتی شواہد کی بنا پر ان ظروف کا استعمال تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر غالباً دوسری صدی قبل مسیح تک رہا۔ اسی عہد میں جس کا آغاز ہما تمبا بدھ اور شری ہما ویر کے ظہور سے ہوتا ہے۔ شمال میں بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ عمارتوں میں عموماً پختہ اینٹیں استعمال ہونے لگیں۔ لوہے کا رول وسیع پیمانے پر ہوا اور نئے جامی ہوئے۔ اسی دور سے تاریخی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

دوسرے عہد میں قبل از مسیح پہلے ہزار سالہ دور کے نصف دوم میں اور اس دور کے اور اخیر میں ایک نئی تہذیب نمودار ہوئی، جو میگالیتھک یعنی بڑے پتھروں والی تہذیب کہلاتی ہے۔ اس کی خصوصیات میں تدفین کی ایک خاص رسم قابل ذکر ہے۔ اولاً لاش کھلی جبکہ چھوٹی

جاتی تھی، جب اس کی ہڈیاں الگ ہو جاتیں تو اسے بڑے بڑے گول مثل گنبد نما پتھروں سے گھرے ہوئے گڑھے میں دفن کر دیا جاتا اور گڑھے پر بھی ایسے ہی پتھر کی سلیں رکھی جاتی تھیں۔ جس علاقے میں یہ تہذیب رائج تھی، اس کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی قبروں کی شکل میں بھی فرق بھی ملتا ہے۔ کہیں کہیں ایک پتھر بھی نہیں پایا جاتا، تاہم اسی سبب سے جن مشترک خصوصیات ہیں۔ مذکورہ بالا جزوی تدفین کے علاوہ ان قبروں میں سیاہ و سرخ ادف اور لوہے کی اسلحہ ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میگالیتھک تہذیب ایک ہی قوم کے رہنے سے وجود میں آئی تھی، جو بعض اہل تحقیق کی رائے میں ڈراوڈی تھے۔

اس تہذیب کے بعد جنوب میں ایک اور تہذیب کے رواج کا پتا چلتا ہے، جو پہلی صدی بعد از مسیح کے ساتواہن راجاؤں کے عصر میں مروج تھی۔ آخر الذکر تہذیب میں ایک خاص قسم کے ظروف کا استعمال پایا جاتا ہے، جو سرخی مائل بادامی رنگ کے ہیں اور ان پر سفید چھاپوں کا نقش ہے۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے جنوبی جزیرہ نما اور سلطنتِ روم کے مابین بالخصوص تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ان ہزاروں رومی سکوں کے علاوہ جو ہندوستان کو اپنے مال کے لیے اصل ہوئے، پامیر پھری کے قریب آریکینڈو کی کھدائی میں ایسے رومی ظروف بھی دریافت ہوئے ہیں، جو روم سے درآمد کیے گئے ہونگے۔

شمالی اور وسطی ہند کے بہت سے مقامات پر مثلاً روڑھے، ہستناپور، ممتر، اہی چھتیر، سراوتی، راجگیر، چند کیو گڑھ، اور جین وغیرہ میں جہاں کھدائی ہوئی ہے، ایسی سکونتن کے آثار ملے ہیں، جن کا زمانہ شمالی سیاہ پالش واسے ظروف کے بعد کا ہے۔ ان مقاموں میں بعض ایسے بھی ہیں، جن میں قرونِ وسطیٰ تک آبادی قائم رہی، اس آبادی کی سب سے اہم نمائندگی شیشہ نما یعنی ٹکلیز ظروف سے ہوتی ہے۔

ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کا تاریخی ترتیب کے لحاظ سے جو مختصر خاکہ پیش کیا گیا وہ زیادہ تر پہلے ایک سو سال کے دوران کی کھدائیوں کا مرہونِ منت ہے۔ آزادی کے بعد سے کچھ ملک کے طول و عرض میں سرکاری یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کے ذریعے سے نکتہ مقاموں پر جو کھدائیاں ہوئی ہیں، ان کے نتیجے میں تین ہزار سال قبل از مسیح سے

لے کر آج تک کی ہندستان کے مختلف حصوں میں مروجہ تہذیب اور تمدن کا قدیمہ مسل
خاکا ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ ان کھدائیوں میں جدید تکنیکوں کے ساتھ ساتھ آثار کی تاریخ
متعین کرنے میں جدید سائنسی طریقوں مثلاً کاربن - ۱۴، فلوراین کا کیمیائی طور پر امتحان وغیرہ
کے استعمال سے اثریات اور منکشف شدہ اشیاء کے صحیح زمانے کی تعیین کے علاوہ اسی تہذیب
کا تاریخی تسلسل بھی مستند طور پر قائم ہو گیا ہے۔

آخر میں یہاں آبادی سے پہلے اور اس کے بعد کی افریاتی کھدائیوں کا مختصر ذکر بیجا نہ ہو گا۔ کنگم
کی طرح مارشل نے بھی بودھی مقامات کی کھدائی پر زور دیا تھا، چنانچہ اس کے دورِ نظامت
میں یعنی موجودہ صدی کی پہلی تقریباً ایک تہائی میں تکسیلا، سارانتھ، راجگیر، سانچی، سراوتی،
کوشی گمر، نالندہ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے کچھ مقامات میں کھدائی ہوئی جس کے نتیجے
میں بودھی دھرم کے علاوہ بودھی فن تعمیر، فنِ لطیفہ اور علم الاحصاء کے مطالعے کو کافی فروغ
حاصل ہوا۔ قدیم بودھی شہروں کے محل وقوع مثلاً الہ آباد کے قریب بھٹیٹ، بہار میں پٹنہ
تکسیلا میں کھدائی کی گئی۔ پٹنہ کے قریب پانچ پترا میں، عہدِ موریہ کے ایک محل کے آثار ملے، جو
کڑی کا بنا ہوا تھا اور اسی یا اس سے زائد پتھر کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ تکسیلا کی طویل کھدائی
میں جو ۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۴ء تک کے درمیانی زمانے میں ہوئی، سلسلہ وار تین شہروں کے آثار
برآمد ہوئے۔ ان میں سے بھیٹر شیلہ سب سے قدیم ہے، اس کی بنیاد تقریباً پانچ سو سال قبل
مسیح پڑی ہوگی اور یہ شہر اسکندر اعظم کے حملے سے ضرور دوچار ہوا ہو گا۔ دوسرا شہر سرکپ تھا
یہ شمال مغربی ہند کے یونانی حکمرانوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ یہاں آگے چل کر پار تھیل کے
عہد میں ایک نہایت مرتب شہری نقشہ بندی ہوئی۔ تیسرا شہر سیرسکھ تھا، جو کشانوں کے عہد
کی یادگار تھا۔

کھدائیوں کے سلسلے کی دوسری اہم کڑی ہڑپا اور موہن جو دھو کی کھدائی ہے ان کا ذکر اوپر ہوا۔
انہی دنوں میں پہاڑیوڑ، ناگارجن، کنڈ وغیرہ میں بھی کھدائی ہوئی۔ پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء
تک ضلع بریلی کے مقام اہی چھتر میں وسیع پیمانے پر کھدائی کی گئی۔ اس کھدائی سے پہلی بار
دریائے گنگا کی اوپری وادی کا تہذیبی تعلق پہلی سے پانچویں صدی قبل از مسیح سے لے کر

یادہ سو سال بعد از مسیح تک ثابت کیا گیا۔

۱۹۵۰ء کے بعد یہ کھدائیاں چوٹی ہیں: نئی دہلی میں پرانا قلعہ (جہاں پچھلے دو سال سے کھدائی پر جاری کی گئی ہے، جس میں قرون وسطیٰ سے لے کر مودیا عہد تک کے آثار برآمد ہوئے ہیں)؛ پٹنہ، سرانتھی، راجگیر، بیربھان پور اور تاملوک (مغربی بنگال)؛ جوگٹا رتنانگری اور اوداپٹیری (اڑیسہ)؛ سالیہونڈم اور کوٹور (آندھرا پردیش)؛ سالو، پٹومیدو، امرت لنگم اور گنٹور (اندرا پراش)؛ مسکی (میسور)؛ داتم آباد، بہل شیکوڑہ اور پرکاش (مہاراشٹر)؛ امرلی، رنگ پور، وٹی ماچالہ اور لوتھل (گجرات) وغیرہ

نہیں سے کچھ کھدائیوں کا ذکر تو مندرجہ بالا بطور میں آچکا ہے، باقی کا اور ان کے علاوہ دیگر اہم مقامات کا جو گزشتہ چند سال میں سامنے آئی ہیں، مختصر حال یہاں بیان کیا جاتا ہے:

جدید ہجری دور کی تہذیب سے متعلق جو دریافت حال میں ہوئی ہے، اس کی کافی اہمیت ہے۔ ادنیٰ شمیر میں برہمہ نام کے مقام پر کھدائی سے یہ انکشاف ہوا کہ وہاں تقریباً انیس سو سال قبل مسیح غاروں میں بسنے والے لوگوں کی سکونت تھی، جو ڈھلے اور پتھر کے مختلف شکل و صورت کے اوزار استعمال کرتا جانتے تھے اور ان کے ہاں انسانوں اور جانوروں کے مردوں کی تدفین کی رسم میں قدرے اہتمام اور تکلف برتا جاتا تھا۔ یہاں کی کھدائی سے ایک اور رسم کا پتہ چلا۔ کسی غرض سے یہ لوگ کھوپڑی میں سودا خ کرتے تھے۔ اس کھدائی میں ایک کھوپڑی ایسی ملی جس میں سات مکمل اور چار نامکمل سودا خ پائے گئے ہیں، مشرقی ہندوستان میں داو جلی ہونگ مقام پر جو شمالی کچا ضلع میں میکور کی پہاڑیوں میں ہے، پہلی مرتبہ جدید ہجری دور کے کلوڑار دور کی مٹی کے برتنوں کے ساتھ دستیاب ہوئے ہیں۔ اڑیسہ کے ضلع میونہج کے کوچانی مقام کی کھدائی میں کھروڑے لال ظروف کے ساتھ جدید ہجری دور کے چمکیلے اوزار ملے ہیں۔ جنوبی ہند میں ضلع بلاری میں ٹکل کوٹ مقام میں وسیع پیمانے پر جو کھدائی ہوئی، اس سے بھی گرینائٹ کی پہاڑی پر اسی دور کی کم و بیش انیس سکونتوں کے وجود کا پتہ چلا ہے نیز بلیک گرانٹ کے لیے جو سودا خ پائے گئے ہیں، ان سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ مدد گھروں میں رہتے

تھکڑہ آثار قدیمہ

ہو گئے؛ ان کے مکانوں کے فرش لیے ہوئے تھے اور ان کی رسم تدفین بھی کچھ انوکھی تھی۔ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا میں مردے کی جزوی طور پر تدفین عمل میں آتی تھی، لیکن بعد کے عہد میں مردے کے پورے جسم کو لٹا کر دفنایا ہوا پایا گیا ہے، آدھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں اسٹون بھی جدید پتھر کی لوگوں کی سکونت کی سواں ہزاروں قبل کے گڑھے ایک قطار میں پائے گئے، جس کا ظاہر ہوتا ہے کہ لکڑیاں کا ڈکرا حاطہ بنایا گیا تھا۔ نیز یہ کہ وہاں کی کھدائی میں جلی ہوئی چیزوں کئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سکونت کئی مرتبہ نذرِ آتش ہوئی ہوگی، جنوب میں جو دیگر مقاموں کی کھدائیوں سے اس عہد کی تہذیب کی بستیاں اور آثار برآمد ہوئے ہیں، وہ مسکی، پکھیل، ناگارجن کنڈ، سنگن کلوا دی نرسی پور ہیں۔

ان چند سالوں میں سب سے زیادہ اہم اور معرکہ آرا انکشاف موجودہ ہندوستان میں ماقبل ہڑپا سکونت کی دریافت ہے، جو شمالی راجستھان میں کالی بنگان مقام پر کھدائی سے ہوئی۔ اس نئی دریافت میں جو ظروف برآمد ہوئے ہیں، وہ ہلکے رنگ کی لال مٹی کے ہیں اور ان کے سیاہ اور کہیں کہیں اس کے ساتھ سفید رنگ کے نقوش بھی بنائے گئے ہیں۔ اس سٹی میں مکان کچی مٹی کی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور وہاں کے لوگ تانبے کا استعمال جانتے تھے نیز وہ پتھروں کے چھوٹے پھل کی قسم کے اوزار سے بھی کام لیتے تھے۔ ظروف کے نقوشوں کچھ ایسے ہیں، جو ہڑپائی ظروف پر بھی پائے جاتے ہیں۔ کالی بنگان کی اس ماقبل ہڑپا تہذیب میں بعض عناصر ایسے ہیں، جو مغربی پاکستان میں سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں کوٹ دیکھی اور دیگر ماقبل ہڑپائی مقامات کے آثار سے بہت مماثل ہیں۔

کالی بنگان کی کھدائی ۱۹۶۱ء میں شروع ہو کر آٹھ سو سال تک جاری رہی۔ آخری سال کی کھدائی کا اہم دریافتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ وہاں ایک مکمل کھیت نمایاں کیا گیا، جس میں چلائے ہوئے ہل کے نشانات پورے طور پر محفوظ تھے۔ ان نشانات سے اس زمانے کی کاشتکاری اور اناج پیدا کرنے کے طریقوں کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کالی بنگان کے مغربی حصے میں ایک چار دیواری والی گڑھی اور شرقی حصے میں فصیل والے شہر کے آثار بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس میں شہر کا جو نقشہ واضح ہوتا ہے، وہ بعینہ ہڑپائی شہر کی مانند شطرنج کی بساط کے نمونے

ہے۔ ایک اور نہایت اہم دریافت آتشی قربانگاہوں کی ہے، جو گڑھی کے رقبے میں پتھریں بنی ہوئی پائی گئیں، ان چولہا نما قربانگاہوں میں سے ہر ایک کے بیچ میں بچی ہوئی مٹی کا بنا ہوا ایک لنگ نکلا ہوا ہے، اس دریافت سے اس تہذیب کے لوگوں مذہبی عقاید یا میلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ قبرستان والے حصے میں کچھ قربانگاہوں نال کی طرف سر کر کے لٹائے ہوئے مردوں کے ڈھانچے ملے اور کچھ مشکوں والی طریقہ رین کے نمونے، اس حصے کی کھدائی کے دوران میں ایک ایسی قبر ملی، جس میں مردے کے پچھلے مٹی کے برتن رکھے ہوئے تھے، اور چاروں طرف کچی مٹی کی اینٹوں کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ قرین قیاس ہے کہ یہ قبر کسی سربراہ اور وہ شخص کی ہوگی۔

اس کے علاوہ ان چند سالوں میں جو دوسری اہم کھدائیاں ہوئی ہیں، ان سے ہڑپائی تہذیب پر بالخصوص اس کے پھیلاؤ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ موہن جو دڑو کے بعد اس تہذیب کے تقریباً ایک سو سے زائد مستند مقامات دریافت ہوئے ہیں اور ان میں سے کئی جگہ پر کم و بیش وسیع پیمانے پر کھدائی بھی عمل میں آئی ہے۔ ان مقاموں کا سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے، اس لیے یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں ہے۔ ابھی ابھی پچھلے دو تین سال کے دوران میں گجرات کے سرحدی علاقے کچھ ضلع میں جو وسیع کھدائی عمل میں آئی ہے، اس سے وہاں بھی ان مقامات کا سراغ ملا ہے۔ اس دریافت سے ہڑپائی لوگوں کی ہجرت یا کسی اور غرض سے آمد و رفت کے راستوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سالوں میں کچھ کے ایسے ہی ایک دوسرے مقامات کھدائی میں محکمہ آثار کے شعبہ حفاریات کی طرف سے وسیع پیمانے پر کھدائی شروع ہوئی ہے جس کا پہلا مرحلہ اپریل ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔

ہڑپائی تہذیب کا زمانہ امتداد ابھی تک ڈھائی ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح تک کا خیال کیا جاتا رہا، لیکن اس تہذیب کے مقامات کی کھدائیوں کے مختلف نتائج بالخصوص برآمد شدہ اشیاء اور آثار کی کاربن - ۱۴ کے ذریعے کی گئی تحقیق کے پیش نظر اس کا زمانہ امتداد اب تقریباً قطعی طور پر دو ہزار تین سو سال قبل مسیح سے لے کر ستر سال قبل مسیح تک کا قرار پایا ہے۔

ہستاپور، روہڑ، عالمگیر پور، سرادستی، کوسامبی، اترنچی، کھیرہ وغیرہ کی کھدائیوں کا ذکر آچکا ہے۔ پنجاب کے مشرق میں گنگا جمنہ کے میدانوں میں ایک ہزار سال قبل مسیح سے کہا پہلے، منقش بھورے غروت کی تہذیب والی جو قوم آباد ہو چکی تھی، یہاں اس کی بوزواریاں اور رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں کچھ معلومات دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ لوگ درختوں کی ٹہنیوں اور کھجور اور اس قسم کی چیزوں سے بنے ہوئے ڈھانچوں کے مکانات میں رہتے تھے۔ وہ کاشتکاری پیشہ تھے، گھوڑے اور دیگر جانور پالتے تھے، اور تانبے اور بعد میں لوہے استعمال بھی کرتے تھے۔ کھدائیوں سے اس تہذیب کے متعلق جو نتائج نکالے گئے ہیں اس سے ہندستان میں آریوں یا ان کی کسی شاخ کی آمد کے مسئلے پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ گذشتہ سطر میں دکن اور وسطی ہند میں راج جس نیرلیٹیک چالکولیتھک تہذیب کا بیان اس کے لوگوں کے بارے میں اس تہذیب کے کچھ مقاموں کی کھدائی سے یہ بتا چلا ہے اس تہذیب کے لوگ کچی مٹی یا اس کی اینٹوں کی دیواروں والے مکانات میں رہتے تھے، کاشتکاری کرتے تھے، اپنے مردوں کو دفناتے تھے، خاص کر کے نوداؤلی میں جو بستی قلعہ سوٹھویں صدی قبل از مسیح میں آباد تھی، اس کے لوگوں کے چاول کے استعمال کا قطعی ثبوت ملا ہے۔ اسی طرح نواسالی کھدائی میں تیرھویں صدی قبل از مسیح میں ریشم کے استعمال کا پتہ ہے۔ یہ یاد رہے کہ ریشم کے استعمال کے بارے میں یہ قدیم ترین شہادت ہے۔

اس عہد کے بعد کی نہایت چمکدار سطح والے غروت کی تہذیب کے کئی مقاموں میں کھدائی ہوئی، جس کا ذکر ضمناً کیا جا چکا ہے۔ میگالیتھک یعنی بڑے پتھروں والی تہذیب کے مقاموں پر کھدائی ہوئی ہے وہ ناگیور کے قریب، جو ناپانی، بلیشورم، ناگاراجن کسٹڈ، جٹ سیٹنگ میڈو، پورگم، وغیرہ ہیں۔ ان سے بھی اس تہذیب کے مختلف رخن پر کچھ نہ کچھ پڑتی ہے۔ نغان میں بلیشورم میں تدفین کی ایک انوکھی رسم پائی گئی جس کو دودھری تدفین کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ایک انسانی ڈھانچہ دوسرے ڈھانچے کے اوپر پایا گیا، شمالی ہند میں صوبہ اتر پردیش کے میرزا پور اور بنارس ضلعوں میں بھی پہلی مرتبہ میگالیتھک تہذیب بارے میں تحقیق در کھدائی ہوئی۔ لیکن ابھی تک یہاں کوئی قطعی خواہد نہیں ملے۔

تھے۔ وہ ایرانی بلجے میں فارسی بولتے تھے۔ ان بزرگ کو میں نے بھی ۱۹۳۷ء کے قریب لایا تھا۔ وہ دیکھا تھا، اس وقت ان کی عمر ۸ سال کے قریب تھی۔ وہ بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اس سے علم زیادہ ہوتا تھا، شعریات کم، بلکروں کچھ کہ باکل غائب۔ بڑے دیکھنا سننے والے کا نام اور تخلص انھیں یاد تھا فرمایا کرتے تھے کہ میرا شاگرد تو بہت ترقی کر گیا۔ اس زمانے کے لیل و نہار دیکھے، ڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر باوانگیت سنگھ بیدی تھے۔ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر منشی گنبدارام اور ٹرننگ کالج میں اودود خاں کے مدرس اعلیٰ پنڈت رلام۔ گویا کسی زبان پر کسی قوم کی اجارہ داری نہیں تھی، نہ ہمیں کسی قوم کی لسانی حیثیت ہی تھی۔

والد ٹرننگ کالج سے فارغ ہونے کے بعد جالندھر کے ضلع میں پرائمری اسکول میں اول مدرس رہے۔ ان کے ایک ہم جامعہ تھے لالہ رفیق رام شاد جو بھدوڑ (ریاست پٹیالہ) کے رہنے والے تھے۔ شعر میں والد ہی سے متاثرہ کرتے تھے۔ وہ بڑے کٹر آریہ سماجی تھے اور ایسے ہی موضوعات پر تقریریں کرتے۔ ریاست میں ان پر مقدمہ چلا، تو ان کے مکان کی تلاشی پر والد کی خط و کتابت بھی وہاں سے چھلی۔ اس شبہ میں کہ والد سیاسی تھیں، والد کے مکان کی بھی تلاشی ہوئی۔ لیکن چونکہ اطلاع پہلے مل گئی تھی، اس لیے قابل اعتراض کاغذات آپ کے شاگردوں نے اندھا دھند جلا دیے تھے۔ ان کے ایک دوست اس زمانے کا ایک مصرع سنایا کرتے ہیں، جو سودیشی تحریک سے متعلق تھا، نہ دھواؤ گاؤں، تو داروغہ امن مل کو مل کو۔ بہر حال گھر سے کچھ برآمد تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود دوسرے اسکول میں تبادلہ کر دیا گیا، جہاں اسس پاس کچھ آبادی نہیں تھی۔ والد نے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا اور ریاست حیدر میں سفیدوں کے مقام پر ایک بڈل اسکول میں ملازمت کر لی۔ وہاں سے تین سال بچہ نکالے آگئے۔ ۱۹۱۳ء سے نکودہ ہی میں مقیم ہیں۔

میں لیاں ہی میں ۸-۱۹ء میں پیدا ہوا تھا، اس لیے والد کے متبع میں عود کو ملیا نی کھنے لگا، ورنہ میری سادہ زندگی نکودہ ہی سے وابستہ رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے آخر میں

حکومت آثار ہند

ہوسکا ہے۔ دوسرے آثار میں ایک عظیم پتھر کا محل ہے جو کہا جاتا ہے کہ راجا اودین کا تھا جس کی دعوت پر ہما تمام بدھ وہاں گئے تھے۔ اس میں قلعہ بندی، محافظاتی انتظام، فصیل وغیرہ کے بھی دلچسپ آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ اسی طرح راجگیر، سراوستی، راجگھاٹ اور ویشالی کی کھدائیوں سے بھی کئی نئی باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اسی طرح شیٹھ پال گڑھ کی کھدائی میں پونہتی صدی قبل از مسیح کی قلعہ بندی، پچھلکوں وغیرہ کے جو آثار ملے ہیں، ان سے اس تباہی کی تائید ہوتی ہے کہ اس کے نواح میں دریافت شدہ اشوک اور کھاروہل کے کتبوں میں جس خوشالی اور کلنگ نگر کا ذکر ہے، وہ یہیں پر آباد تھے۔ اسی طرح اجین کی کھدائی سے ساڑھے سات سال قبل از مسیح کے عہد کے وسیع قلعہ بندی کے آثار ملے ہیں۔ نیز ایسے بھی شواہد ملے ہیں جو اس بات کے منظر ہیں کہ پہلی صدی عیسوی میں وہاں سکے بنانے کی صنعت پورے عروج پر تھی۔

حالیہ کھدائیوں سے ہندستان کے بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے اور پراکیہ میٹروپولیٹن کا ذکر ہو چکا ہے۔ صوبہ تامل ناڈو مداس میں کادییری شہم کی کھدائیوں میں مسند کی طرف نکلا ہوا رومن رسم الخط کے حرف آئی (I) کی شکل کا ایک لمبا جو تڑہ برآمد ہوا ہے، جو غالباً حکم کا کام دیتا ہوگا۔ تامل زبان کی بعض کتابوں کے بیان کے مطابق یہ مقام سیمیلان کے ابتدائی زمانے میں بندرگاہ تھا۔ اثری دریافت سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہاں سے تجارتی بیڑے مشرقی ممالک کی طرف جاتے ہوئے، اسی طرح مشرق میں مغربی بنگال سمیت تمام ملک کی کھدائی سے یہ ثابت ہوا ہے کہ روم کے ساتھ تجارت کوئے والے ہندوستانی شہروں میں یہ انتہائی مشرقی مقام ہے، اسی طرح بنگال ہی میں واقع چندین کی کھدائیوں سے بھی اسی قسم کی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مثلاً چیروتی میں ایسے کتبے ملے ہیں جن سے یہ بات پائیدار ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں راجا ششانگ کے دارالخلافت کرنے سورہ سے ملتی شہر رت مرتکا آباد تھا۔

آخر میں ان چند کھدائیوں کا بھی ذکر ضروری ہے، جہاں سے ہندستان کے قدیم فن تعمیر کے مطالعے کے لیے اہم مواد ملا ہے مثلاً مدھیہ پردیش میں ویدیشہ (بھیلہ) سے تین چار سال ہوئے دوسری صدی قبل از مسیح کی طبقاتی سطحوں میں ایک مندر کے آثار بھی پائے گئے

حکمت آثار قدیمہ

اسی طرح اتر پردیش میں بھیترگانوں کی کھدائی میں گپتا عہد کے ایک مندر کے آثار ملے ہیں۔
عقصر یہ کہ گذشتہ بیس چھپیس سال میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں، ان سے ہندستان کی قدیم
تہذیب کی تاریخ کی سلسلہ وار کڑیاں مل جاتی ہیں؛ اور ان ادوار کی تاریخ پر بھی کافی روشنی
پڑتی ہے جن سے متعلق ہماری معلومات رُبع صدی قبل بہت محدود تھیں۔

فارم نمبر ۴

ملک دام	نام لڈیٹر	دہلی	(۱) مقام اشاعت
ہندوستانی	قومیت	تمہاری	(۲) وقت اشاعت
۳۹۶ سی ڈیفنس کالونی، نئی دہلی	چتا	نظم عباس عباسی	(۳) پرنٹر کا نام
ملکان کننام علی مجلس چھتہ نواب صاحب دہلی		ہندوستانی	قومیت
ہم نامک نام و نظم عباس عباسی دونوں اس بات		۱۳۲۹ چھتہ نواب صاحب فرخشاہ دہلی	چتا
کی تصدیق کرتے ہیں کہ جو تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں		نظم عباس عباسی	(۴) پبلشر کا نام
وہ ہماری بہترین معلومات اور تفصیلات کے مطابق درست		ہندوستانی	قومیت
صحیح ہیں۔ دستخط: نامک نام و نظم عباس عباسی		۱۳۲۹ چھتہ نواب صاحب فرخشاہ دہلی	چتا



عوام دھوکا

میں بیٹوں سے سامان خریدتا ہے۔
 غلط ماپ تول کی شکایت اپنے
 کے ایکٹر ماپ تول سے کیجئے۔

ماپ تول کے اعشاری پیمانے
 گاہک کی حفاظت کرتے ہیں

دھوکہ کے پرچم ماپ تول ہی
 اگر ایک فیصد کی کمی غلطی ہو تو پرچم
 عوام کے ساتھ کھڑا دھوکہ پیا کا
 دھوکا ہوتا ہے۔

آپ اس سے بچ سکتے ہیں۔
 سرکاری نشان والے ماپ تول کے

تذکرہ غنما مہ جالسو

میں

غالب اور اس کے معاص

تذکرہ جالسو ایک مختصر فارسی تذکرہ ہے، جو ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء میں نیو امپیریل پریس واقع مدرسہ کجور، دہلی میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس میں سرورق کے علاوہ ۲۲ صفحات کے قطع کے ۱۷ صفحات ہیں۔ میں سطرئ سطر استعمال کیا گیا ہے۔ شروع کے ۱۷ صفحات میں مولف نے اپنی سرگزشت اور اپنے زمانے کے اہم واقعات درج کیے ہیں۔ ص ۱۸ سے ص ۸۸ تک مولف کا منتخب فارسی کلام حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہے۔ باقی صفحات میں اس نے اپنے عہد کے نو فارسی گو دہلوی شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب فارسی اشعار درج کیے ہیں۔ شائع شدہ ہونے کے باوجود یہ تذکرہ بہت نادر ہے۔ مولف نے سبب تالیف کے ذیل میں لکھا ہے:

خرد مندان دانشور اور دانشوران خرد پرورد پر یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اس جہاں ناپائیدار میں یادگار کی مضبوط بنیاد کتنا ہے اور اس دیکر میں نام و نشان کا ذریعہ بھی ہے۔ اس امر کی وضاحت یوں ہے کہ سیکڑوں برس ہونے کے مولا نا نظامی گنجی امیر سرور دہلوی اور صاحب الدین سعدی شیرازی اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ اگرچہ اس وقت ان کی ہڈیوں کا کوئی نشان بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے، لیکن پتہ گنج کی

۱ تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

تذکرہ غمنامہ جانسوز

”جو اہر ریزی“ محسن کی قد فشانی“ اور گلستان و بوستان کے گلستانہ ہمیشہ بہا کی خوشبو کے سبب وہ لوگ مشہور آفاق، بلکہ زندہ جاوید ہیں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ اپنی سرگزشت لکھوں تاکہ میری یادگار باقی رہے۔

مولف نے تذکرے کی وجہ قسمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں اسے چند روز حادثات اور مصدمات کا شکار ہونا پڑا تھا۔ ۹ جنوری ۱۹۰۵ء کو اس کا چھوٹا بیٹا طاعون کے عارضے سے فوت ہوا۔ دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ یکم مارچ ۱۹۰۵ء کو اس کا بڑا بیٹا بھی داغ مفارقت دے گیا۔ اس کے شب و روز نالہ و فغاں میں کشتے تھے۔ اس کا سینہ گلخن کی طرح جلتا تھا اور دل مضطرب و پریشان تھا۔ اس کی آہیں شرفشاں تھیں اور نگاہیں خونا بہ چپکان۔ بقول غالب:

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلیم من و جاں آفریں کہ جاں بلیم
چونکہ یہ مولف کی آخری سرگزشت غم و اندوہ ہے، اس لیے اس کا نام غمنامہ جانسوز رکھا ہے۔

ترتیب تذکرہ کے وقت مولف کی عمر ۴۷ برس کی تھی۔ اس تذکرے میں اس نے مارچ ۱۹۰۵ء تک کے اپنے حالات درج کیے ہیں۔ اس کی تالیف اور طباعت کا سال بھی یہی ہے۔ مولف کا قطعہ تاریخ تالیف تذکرہ یہ ہے:

ایں نامہ ز آغاز بپایاں چورسید	ابرام نمودم پے سائل دل و جان را
دوادندا بالغ و نابہ لڑباں دین	غمنامہ جانسوز بگو سید آں را
۹۰	۱۲۹۳ = ۱۹۰۵/۵۱۳۲۳

مولف نے اپنے حالات زندگی قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ حالات بجائے خود زیادہ تر نہ ہوں، لیکن ضمنی طور پر اس نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے جو چشم دید حالات و واقعات درج کیے ہیں، وہ ضرور اہم اور مفید ہیں۔

مولف کا نام کہارام متخلص بہ بہتور بن منشی شوقی رام بن منشی حبیبی رام قوم کھتری سیٹھ ہے۔ اس کا مسقط الرأس دلی تھا۔ وہ دس برس کا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں

- تذکرہ غنائہ جالندھر -

ہے اس کا قیام اپنے ماموں کے یہاں بھرتپور میں رہا۔ لیکن بھرتپور کا قیام چونکہ تحصیل علم میں مانع تھا، اس لیے وہ دہلی چلا آیا۔ یہاں اس نے پہلے مولوی نصیر الدین دہلوی مولوی ہرجان اور مولوی انور علی سے فارسی صرفت و نحو کی کتب متداولہ تا شرح ملاحامی اور نطق کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں منشی کیل رام ہشیار دہلوی سے فارسی نظم و نثر کی کتابیں مثل مینا بالار، پنج رقعہ و سنہر ظہوری و شبنم شاداب و مجمع الصنائع و قصائد عرفیہ و پران مرزا محمد علی صاحب وغیرہ پڑھیں۔ اس طرح وہ ۱۲ برس سے ۲۰ برس کی عمر تک تحصیل علم میں مصروف رہا۔ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو اپنے استاد منشی کیل رام ہشیار سے صلاح لینے لگا۔ بھرتپور نے جب عربی اور فارسی میں کچھ استعداد حاصل کر لی، تو اس کے ل میں ملازمت کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے والد منشی شوقی رام منٹو دہلی کی فوجداری میں مرشد دار تھے با وہ ان کے ساتھ کچھری جانے لگا اور سر جان مٹکاف ریجنٹ مجسٹریٹ دہلی نا پیشگاہ میں آموزگارانہ طریق سے محکم، روبکاری اور پروانہ نویسی کی مشق کرتا رہا اور بالآخر ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اسی دفتر میں باقاعدہ ملازم ہو گیا۔

ملازمت کے پہلے روز یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگام چاشت پنڈت بلدیو سنگھ داروغہ پنڈت مرادپور و پریشان مسٹر ایچ بی بی (بھیمین) مجسٹریٹ کے پاس آئے اور کہا کہ میرٹھ کی فرج سے ہندو جہل، دیول، سوار اور پیادے بادشتہ کی طرح آئے اور آتے ہی جمنپار کے سرکاری کانات کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا اور خزانہ لوٹ لیا چونکہ وہ ”باغیان بد نہاد“ تھے اس لیے ملازمان پہل مقابلہ نہ کر سکے۔ میں اس گروہ شقاوت پر وہ ”کی سرکشی اور نافرمانی کی اطلاع دینے آیا ہوں۔ اطلاع ملنے ہی مجسٹریٹ صاحب رفع فساد کے لیے جمنپار کی طرف روانہ ہوئے۔ تمام ملازمان عدالت نصف النہار تک دارالعدالت میں منتظر کرتے رہے، لیکن مجسٹریٹ صاحب واپس نہ آئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ بھیمین صاحب اور قلعہ دار مارے گئے باغی صاحبان عالی شان کے ذکور و اثاث کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہے تھے۔ شام ہوتے ہوتے اور انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ دیکھیے، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامہ: ۱۸۳ (مرتبہ خلیق احمد نظامی) ۱۸ کہنیاں دیکھیں۔

تذکرہ غنائہ مجاہدین

میرٹھ کی فوج کی بغاوت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی تھی۔

اس داروغہ میں سر جان مشکاف جان تھیلی پند کہ کراجمیری دروانہ کی راہ سے شہر سے باہر نکلے اور کچھ دیر تک پہاڑ گنج کے تھانیدار نواب معین الدین حسن خان کے یہاں چھپے رہے۔ بعد کر نواب موصوف ہبی کی رہبری میں ریاست جھڑ میں پہنچے۔ رئیس جھڑ نے باغیوں کا خوف سے سر جان مشکاف کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ سر جان مشکاف نے بھی یہاں قیام خلافت مصلحت سمجھا اور بھاگ کر انگریزی فوج کی فرو دگاہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ انگریزی فوج میں پہاڑی دھیر راج پر جمع ہوئیں۔ یہ جگہ کافی بلند اور مستحکم تھی۔ جو ہڑی دلی میں ہو جانے کی خبر امصار و دیار میں پہنچی، سوار اور پیادے افسروں سے باغی ہو کر دلی کی جا روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ دلی میں اس طرح پچاس ہزار کی سپاہ جمع ہو گئی۔ ہر صبح ایک فوج کی امید پر پہاڑی کی طرف جاتا، لیکن شام کو مایوس اور ہراس زدہ لوٹ آتا۔ اس برعکس دوسری طرف سے ”دلا دربان مبارک“ و ”تو بچیان ماہر“ گلولہ توپ و تفنگ کی بارش مفسدوں کی روح درواں کو چھین رہے تھے۔

منشی کرپا رام بھور اپنے والد اور چچا کے ساتھ حیرانی و پریشانی کے عالم میں راج گھاٹی سے نکلے اور دلیا کے کنارے کنارے چل کر پرانے قلعے تک پہنچے۔ وہاں سے شیخ قلعہ بخش پرانا قلعہ کے سپاہیوں کی حفاظت میں فرید آباد پہنچے۔ یہاں وہ ۱۲ ستمبر تک مقیم رہے۔ ۱۔ دوران میں بھور کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔

۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بھور دلی آئے۔ ۱۴ ستمبر بروز دوشنبہ انگریزی ”فوج ظفر موج“ نے فوج جھنڈے گاڑ دیے۔ فوج میں کشمیری اور کابلی دروازاں سے دلی کی فہیل کے برج تک پہنچا اور لٹا کرتی ہوئی جامع مسجد تک چلی گئیں۔ دو تین دن میں شہر باغیوں سے خالی ہو گیا۔ ۱۔ ملازمین کے سواے کوئی شخص بلا اجازت و بلا ذریعہ قربان شہر میں داخل نہیں ہو سکتا۔

۲۔ نواب عبدالرحمن خان رئیس جھڑ نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بعد فوج نے کچھ دنوں انھیں دیوان عام میں مقید رکھا اور بعد کو پھانسی دے دی (۱۸۵۷ء) کاتانیہ میں

۱۹۷ مرتبہ خلیق احمد نظامی)۔

وئی شخص دربانوں کی غفلت سے چوری چھپے داخل ہو جاتا تھا، تو اسے ضرب بیل کی سزا دی جاتی تھی۔

اکتوبر ۱۸۵۷ء کے شروع میں سرکاری ملازمان کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، فوراً حاکم ہو جائیں؛ اگر کوئی حاضر نہ ہوگا تو موردِ عتاب ہو کر خود کو تیر باد افراہ کا نشانہ بنائے گا۔ مجدد کے والد اور چچا دھڑے کے دن دلی پہنچے۔ اگلے روز علی الصبح لال قلعے میں سر جان شکاف کی آرامگاہ میں حاضر ہوئے۔ کچھ دنوں تک یہی دستور رہا کہ روزانہ صبح لال قلعے میں حاضر ہوتے اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلے آتے۔ اسی زمانے میں ”عدل پرورد“ مسٹر فلپ ہنری ایمرٹن اٹھلتا سے واپس آگئے اور انھوں نے مہر دوست، جفا دشمن، کرنیل بن صاحب کے ساتھ مل کر اس دیران شہر کی آبادانی میں بہت کوشش کی۔

دار الحکومت کے رئیسوں کے کشمکش میں پڑنے اور ہلاک ہونے کی سرگزشت اور جہاں پناہ حقائق آگاہ محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کے قلعہ و بارگاہ کے باہر خیمہ لگانے اور شاہزادگان و رئیسان والا جاہ کے خوابِ عدم کو جانے کے واقعات بہت اندوہناک ہیں، اس لیے وقائع نگار کا قلم اس اجمال کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ مجملہً اتنا کہوں گا کہ ہمایوں نژاد تیمور گورکان کے ترقی و اقبال کے ستارے کا اور دوسرے رئیسان باعز و شان کا اوج جاہ و جلال سے پستی و نیستی کی طرف آنا، روزگار ناہنجار کا یہ انقلاب اور چرخِ دوار کی یہ ستمگری دیکھنے کے قابل نہ تھی ان گرامی تباروں کی حالت دیکھ کر چشمِ جہاں میں نے اپنے چہرے پر پردہ ڈال لیا تھا۔

غنائم جانشوز ایک مختصر تذکرہ ہے۔ اس کے پہلے صفحے کو مؤلف کی سرگزشت کے بعد کے قائل سے موسوم کیا جائے، تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس صفحے میں غدد کے بارے میں کچھ اہم اور مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مؤلف انگریزی نوکر تھا۔ ”بافیان بدہناؤ“ ”مگر وہ شقاوت پرورد“ ”انگریزی طرح ظفر موج“ اور دلاورانِ مبارک و بیجاں ماہر وغیرہ ترکیبیں

اس کی ذہنی مرعوبیت اور قنوطیت کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ خوف اور ہراس نے حقیقی جرات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جہاں پناہ، حقائق آگاہ محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ اور شاہزادگان و رئیسان والا جاہ کے ترقی و اقبال اور جاہ و جلال کے ٹٹنے کی داستان درد کو وہ رد و گار

تذکرہ عثمانہ جانشین

تاہم بخار کے انقلاب اور چرخِ وقایکِ سنگمرج سے موسوم کرتا ہے لیکن اس اجمال کی تفصیل یہ نہیں جاتا۔

تذکرے کے دوسرے حصے میں مرقف نے وہی کے نو معاصر فارسی گو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ شعرا کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے دیے ہیں۔ سوانحی حالات نہایت مختصر اور بہت تشہیر ہیں؛ مراد کی فراہمی میں زیادہ کاوش نہیں کی ہے۔ اگر مرقف تھوڑی سی محنت اور تلاؤ سے کام لیتا تو معاصرین کے بارے میں قابلِ قدر معلومات فراہم کر سکتا تھا۔ البتہ مجھ پر معاصر کا ہر شعرا کا ذکر بہت احترام سے کیا ہے۔ کلام کے بارے میں تو ضیفی اور تعریفی کلمات سے کام لیا ہے، جن سے شاعر کے کلام کی بنیادی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا کہ کوشش ضرور کی گئی ہے مثلاً شیفتہ کے بارے میں لکھا ہے: ”مربع نشین چار باشی سخندان“ واقعاً اسرارِ الفاظ و معانی، نکتہ سیخ شیریں گفتار.... سخنش نہایت دلچسپ و مرغوب سخن سخانت“ (ص ۹۴)۔ صہبائی کے بارے میں لکھا ہے: ”در تحقیق الفاظ گوئے سبقت از پیشینیاں ربودہ... شروح کتب مشکوٰۃ فارسی بشرح و بسط بیاں چنان بقید تحریر آرد کہ کم استعدادین سوادِ علم ہم کما حقہ، بمضامینش پے بُردہ... نہ پے نکتہ سیخ کیٹا کہ بغیر اھی نگار از بحر معتمہ چنان دیگر شاہوار بدست آرد کہ وصفش نمی توان نمود۔“ (ص ۵۰)۔

مرزا غالب کے بارے میں لکھا ہے:

مقالاتِ دلپندش ہمہ فکر است آیین و خیالاتِ بلندش آنسوئے چرخِ بریں۔ سخن سراے

عیدیم المثل و نکتہ سیخ شیریں مقلِ برد و عرائسِ معانی را از حلیابِ اشکل جلوہ گری نمود (ص ۵۹) چونکہ نواب ضیاء الدین خان تیرہ و خٹاں، شاعر سے زیادہ سخن فہم تھے، اور اس سے بھی زیادہ تاریخ د تھے، اس لیے ان کے بارے میں لکھا ہے:

کہن داستانہ گد شغل و سر و حالاتِ سلطنتِ سلاطینِ روزگار (زبری داشت) (ص ۶۴)

مولوی امین الدین امین، صہبائی اور مولوی عبداللہ خان علوی وغیرہ شعر گوئی سے زیادہ درس و تدریس کا قاطع برہن کے جواب میں سب سے پہلی کتاب قاطع القاطع کے نام سے مولوی امین الدین امین لکھی تھی مرزا غالب نے انہی کے خلاف مقدمہ ادا حیثیت عربی دائر کیا تھا۔ امین مولوی عبداللہ خان علوی کے شاگرد

تذکرہ غنائیہ جانشوز

کے لیے مشہور تھے۔ اس لیے ان کے کلام کے بجائے ان کی علمی استعداد اور نکتہ سنجی کے بابے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔ امین الدین امین کے بارے میں لکھا ہے:

بدن و تدبیر کتب متداولہ پارسی، بین الانام مشہور... قاطع المقاطع

براسته دانش برهان قاطع و حجت است ساطع۔ (ص ۴۹)

لیکن ان اشاروں کو تنقید و تبصرہ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم یہ تذکرہ ان باتوں کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات کا حامل ہے۔ پہلی یہ کہ مولف نے معاصر شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب خود کیا ہے۔ دوسری اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس تذکرے میں مرزا غالب کے فارسی اشعار کی تشریح ملتی ہے، جو خود مرزا غالب نے مولف کو لکھ کر دی تھی۔ اس طرح مرزا غالب کی ایک نادر تحریر جو اب تک ہماری دسترس سے باہر تھی دستیاب ہو گئی ہے۔ غنائیہ جانشوز میں حسب ذیل دس فارسی گو شاعروں کا ذکر بالترتیب درج ہوا ہے:

۱) کر پارام بھور (یعنی مولف)، ۲) آذروہ، ۳) امین الدین امین، ۴) نواب مصطفیٰ خان سرتی، ۵) امام بخش صہبائی، ۶) مولوی عبداللہ خان علوی، ۷) اسد اللہ خان غالب، ۸) حکیم محمد مومن خان موسیٰ، ۹) نواب ضیا الدین خان نیر، ۱۰) منشی کیول رام ہشیار۔

مولف نے اپنے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اپنے کلام کا انتخاب بھی وافر مقدار میں شامل تذکرہ کیا ہے۔ اس میں ۱۰۵ شعروں پر مشتمل ۱۷ غزلیں، ایک فرد، ایک قطعہ اور چھ رباعیاں ہیں۔ شعرا کے حالات مختصر ہیں۔ اشعار کو چھوڑ کر حالات بجنسہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

۱) آذروہ تخلص اکمل، کلام، حاوی علوم شتی، مقتدا سے ابابو فضل و کمال، پیشوا سے اصحاب برکت و جلال، اسطو سے زماں، مولوی محمد صدر الدین خان کہ وسادہ منصب، حلیہ محمد صدوری، دہلی بذات، باصفائش نازمیداشت۔ بعد ہنگام یک ہزار و ہشتاد و پنجاہ و ہفت عیسوی اس خاکدان ظلمانی راگزاشت۔ اس اشعار پارسی از تاج انکار ایشان است۔ ہندہ شعر۔

۲) امین تخلص مولوی امین الدین، صاحب فکر متین و پارسی زبان، تمییز رشید مولوی عبدالستار، بدن و تدبیر کتب متداولہ پارسی بین الانام مشہور و بعلم و حکم دانشوری و خرد را انجور بود ۹)

تذکرہ غنائہ جالسوز

قاطع القاطع بر استعدادش برہان قاطع و حجت است ساطع۔ اس اشعار از دست (۹ شعر)
۳۔ حسرتی تخلص از اب محمد مصطفی خان، یکتا سے زمان، مریج نشین چار بالمش سخنہ انی، واقعہ
اسرار الفاظ و معانی، نکتہ سنج شیریں گفتار، از نامور این دیار بود۔ درباری درختہ نگری نمود
سخنش نہایت دلچسپ و مرغوب طابع سخن سجان است و اس اشعار از نگہرت و قبی ایشال
(۲۳ شعر)۔

۴۔ مہربانی تخلص، مولوی امام بخش، در تحقیق الفاظ گوئے سبقت از پیشینیان برودہ و عرائس
معانی را از پردہ خفا باخس وجود جلدہ گر نمودہ، شرح کتب مشککہ فارسی بشرح و بسط بسیار
چنان بقبیلہ تحریر آورده کہ کم استعدادان سواد علم ہم کما حقہ، بر مضامینش چہ برودہ۔ ہر یکے از
بحر علمش فیضیاب گردیدہ و بلا استعداد استلا بدقائق رسیدہ۔ زہے نکتہ سنج یکتا کہ لغزہ
فکر رسا از بحر معنی چنان در شاہوار بدست آورده کہ وصفش نمی توان نمود۔ اگر ترکیب ادب
نمودہ، گفتہ کہ مولانا جامی را ہم درین فن اس مایہ دستگا چہ نبود۔ دخی روشن ضمیر
باصفا کہ بجاہر ریزی ریزہ جواہر دامان ہی دستان علم را بعل و گہر انباشت و بہ قول
فیصل تنبیہ الفاظین حق و باطل را بجملے خود نگہداشت۔ با جملہ عالم دانشور و فاضل
خرد پرور بود۔ اس اشعار از تصنیفاتش منتخب نمود (۲۰ شعر)

۵۔ علوی۔ مولوی عبداللہ خان، علم و فضل را روح و رواں، گلبن گلستان فصاحت
سر و بوستان بلاغت، بر ہر اصناف سخن وارد (۹) صحت نامہ اش علل نہادان علم
درمانت و نشر و نقلش دوا المسک تفریح دل نکتہ سجان۔ شیرینی گفتارش شود در عالم انداز
و ملاحظہ اشعارش یاد ملیحان روزگار از دل فراموش ساختہ۔ در نظم و نثر یکمانہ روزگار
در بحر علم گوہر شاہوار بود۔ اس اشعار در شمار از دست (۳۳ شعر)

۶۔ مومن تخلص حکیم محمد مومن خان، رمز شناس و نکتہ دان، مہر و خشان سپہر بخندی و
اسمان معنی پروری، منظر خیالات دقیق و مصدر لکایت تحقیق، صاحب اندیشہ، سخن
و ذکا، دلش گنجینہ فصاحت و خاطرش خزینہ بلاغت بود۔ بیشتر اس توصیف اوصاف
چنانکہ ہست، نمی توان نمود۔ اس اشعار گوہر شمار از گفتار ایشالست (۲۰ شعر)

۷۔ نیر۔ نواب فیاض الدین خان، سخن سنج و مخمدان، نیر رشتان سپہر حسن گفتاری و
 ہاب ثاقب فلک راست کیشی و نیکو کرداری، کہن داستانہائے بزرگان در سروسر
 لات سلطنت سلاطین روزگار از بری داشت۔ در پاریس این اشعار از دست (۱۲ شعر)
 ۸۔ ہمشیار تخلص نشی کیول رام استادیں مستہام، مدتے گذشت کہ ایں جہاں را
 رود کردہ بر روضہ رضواں طرح اقامت انداختند۔ مجمع فضیلت و فکرت و منبع دلالت
 نطنت۔ در مجمع علوم استعداد کمال می داشتند۔ آید سخن بایں مرتبہ بود کہ بلا فکر اشعار دلپذیر
 گفتند و قصائد بینظیر بطرز عبد الواسع جلی می نگاشتند۔ حیف است کہ از انقلاب ماں
 عری دریاں و نہ از قصائد نشان۔ ہر چند تلاش آن در بدر شافتم، لیکن با وجود نگاہ
 یار بیج جانہا فتم و تدرت دراز می گذرد کہ از فیض ذات آن بزرگوار مستمند نیستم و بسبب
 ری و مجوری از زمان ممتد از افکار شاں چیز سے یاد ہم نہ اندہ۔ آتا بزمانہ تعلیم رونمے
 مدعاے نیاز کیش ابیاتے چند کہ بطرز مثنوی محل گشتی میر خجالت فی البدیہہ فرمودہ
 دند، من آہا را بنمشہ نگاہ داشتہ بودم، دریں جریدہ بہ تحریر آں می پردازم، دیدنی است
 از سیدی۔ (۸۵ شعروں پر مشتمل فارسی مثنوی درج ہے)

۹۔ غالب تخلص اسم مبارکش اسد اللہ خاں، فصیح دری زبان، شہر یار ملک
 ندانی و فراغ نمائے اقلیم شیوا بیانی، در زبان دانی پاری مشہور زماں و فصاحت و بلاغت
 نیلے سخن سنجان شیراز و شروان، نظیر نظیریش گفتن بجا و طہوری عصر خواندش روا،
 یانست باں کہ خود نغمہ سراست:

سج شیکتِ عرفی کہ بود شیرادی مشوا سیر زلالی کہ بود خوانساری
 بسوناتِ خیالہ در آئے، تا بینی رواں فروز برد و دوشہائے زتاری
 مقالاتِ دلپذیرش ہمہ فکرتِ آمین و خیالاتِ بلندش آنسوئے جریخ بریں سخن
 لئے مدیم للثال و نکتہ سنج شیریں مقال بود و عرائس معانی را از جلاب اشکال جلوہ گوی
 نمود۔ اشارش شاہد ایں حال و گفتارش توضیح ایں اجمال است۔
 مجبور نے مرزا غالب کے ۳۴ شعرا انتخاب کئے ہیں۔ دس شعر کی ایک پوری غزل

اور تین متفرق شعروں کی تشریح صبح کی ہے۔ ۱۲ شعروں کی تشریح اردو میں ہے اطلاق
 شعر کی فارسی میں۔ اس تشریح کے بارے میں بہت کچھ لکھتے ہیں:
 معنی اس غزل حضرت مصطفیٰ علیہ الرحمۃ تعلیم خود لگا خستہ من دادہ بوزند
 ہو بہو نگارش می آید۔

من بوفامردم در قیب بدرزد نیمہ لبش انگبیس و نیمہ تبرزد
 اگرچہ لغوی معنی اس کے ہیں باہر مارنا، یعنی بدر باہر اور دن مارنا۔ لیکن روزم
 میں اس کا ترجمہ ہے بھل جانا۔ اب جب یہ معلوم ہو گیا تو یوں سمجھئے کہ معشوق کے ہونٹوں
 کو میٹھا کہتے ہیں اور قند اور مصری اور شہد سے نسبت دیتے ہیں اور اللبتہ لکھی مٹھا س (ا
 عاشق ہوتی ہے۔ پس جو کتنی مصری پر میٹھے، وہ جب چاہے، بے تکلف اڑ جائے، اور
 لکھی کہ شہد پر بیٹھیں، وہ جب اڑنے کا قصد کریں گی، پرو بال اس کے شہد میں پٹ جائیگا
 اور وہ مر کر رہ جائیگی۔ پس، اب یہ کہتا ہے کہ میرے معشوق کے ہونٹ شیرینی میں میرے
 واسطے شہد ہو گئے اور در قیب کے واسطے مصری۔ یعنی وہ چاٹ کر، تکلف اٹھا کر، صبح و رات
 چلا گیا اور میں پھنس کر وہیں مر کر رہ گیا۔

در نکش بین و افتاد لغو زمش گر بہ منے افگند ہم زخم جگر زد
 زدن لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ لازم کے معنی ہندی میں لگ جانا اور متعدی
 کے معنی مارنا۔ یہاں زدن لازم ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ نمک شراب کو بھارتا ہے یعنی اگر
 شراب میں نون ڈال کر ایک آدھ دن دھوپ میں رکھیں تو اس میں سے نشہ جاتا رہتا ہے
 اور سر کہ ہو جاتا ہے۔ اور زخم پر اگر نمک ڈالیں تو وہ کٹاؤ کرتا ہے اور زخم کو بڑھاتا ہے مقصود
 شاعر کا یہ ہے کہ تو میرے معشوق کے نمک کو دیکھ اور دیکھ کہ اس کو اس کے لغو پر کتنا بھڑ
 ہے کہ اگر وہ اس نمک کو شراب میں ڈال دیتا ہے تو وہ شراب میں نہیں ملتا اور زخم جگر پر جا لگتا
 ہے یعنی اگر بھیل بھی کرشمہ کرتا ہے تو بھی وہ اپنا کام کر رہتا ہے۔

زاں بختنا زاک پر جائے دعویٰ خوست دست دے دامنے کہ او بگرد
 اس شعر کا لطف و جراتی ہے، بیانی نہیں ہے، معنی اس کے یہ ہو، کہ اسو معشتہ سے

کہ بہت نادر ہے، خون کا دعویٰ کیا کریں کہ اس کو وقتِ مرگم قتل، دامن گردانتے وقت وہ صدر پہنچا (ہے) کہ اس کا ہات ہے اور وہ دامن کہ جماعوں نے گردان کر کر پر باغدا تھا، ایسا لگا کر کہ پہنچا ہے [کہ وہ آپ اپنے دامن پر نادر خواہ جھنڈا ہے۔ پس کوئی اس سے خون کا کیا دعویٰ کرے گا۔

کیست دیں خادکر خطوط شعاعی مہر نفس ریزہ برونڈن درند
 یہ خیال ہے یعنی ایک گھر میں اس کا محبوب بیٹھا ہوا ہے اور اس نے جان لیا ہے کہ
 دن ہے، مگر بطریقِ تجاہل بھولابن کر پوچھتا ہے کہ آیا اس گھر میں ایسا کون ہے کہ ہر یعنی
 آفتاب نے اپنے سانس کے ٹکڑے فرط شوق سے دروازے کے روزن پر پھینک دیئے
 ہیں؟ خطوط شعاعی کا یعنی سورج کی کرن کا بصورت سانس کے ٹکڑوں کے ہونا ظاہر ہے۔

غیرت پروانہ ہم پرواز مبارک نالہ چہ آتش بیال مرغِ سحر زد
 پروانہ کی غیرت دن کو بھی مبارک سمجھنی چاہیے۔ پروانے کی غیرت وہ غیرت نہیں کہ
 جو پروانے میں (ہو) یا پروانے کو ہو، بلکہ وہ غیرت جو اور کو آتی ہو پروانے پر، یعنی رشک
 حاصل ہونی یہ کہ میں تو دن رات عشق میں جلتا ہوں؛ رات کو جو پروانے کو عشق میں جلتا ہوا
 دیکھتا تھا تو مجھ کو اس پر رشک آتا تھا۔ دن کو ایسا کوئی نہ تھا کہ مجھ کو اس پر رشک آوے۔
 [وہ] اب وہی غیرت اور وہی رشک جو پروانے پر شب کو تھا اب دن کو بھی مبارک ہو۔
 یعنی میرے صبح کے نالوں سے مرغِ سحر کے پروں میں آگ لگ گئی اور میں اپنی بخودی اور
 مستی میں یہ نہیں جانتا کہ یہ میرے نالے کے سبب سے ہے۔ مجھ کو [وہ] رنج اور غم
 ناز ہو گیا، جو رات کو پروانے کو دیکھ کر کھاتا تھا۔ اب مرغِ سحر کو جلتا ہوا دیکھ کر جلتا ہوں کہ
 اے یہ کون ہے، جو میری طرح جلتا ہے؟

دعویٰ اُورا بود دلیلِ بدیہی خندہ دندانِ شامِ بخشِ گہرِ رد
 بدیہی اس خشم کو کہتے ہیں جو آنکھ سے نظر آوے۔ خندہ دندانِ شامِ بخشِ گہرِ کہتے

ہیں، جو تیسرے سے بڑھ کر ہوا اور اُس میں دانت [سنسنے والے کے] دکھائی دیں، معشوق مورتوں کے حسن پر ہنسنا ہے اور ہنسنا کوئی اُس چیز پر ہے، جس کو اپنے نزدیک دلیل سمجھ لیتا ہے حاصل معنی یہ کہ میرا معشوق مورتوں کے حسن پر ہنسا، گویا اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ موتی کچھ بھی چیز نہیں۔ اب دعویٰ کے واسطے دلیل ضرور ہے۔ [سو] شاعر یہ کہتا ہے کہ میرے معشوق کے دعویٰ پر دلیل بدیہی ہے یعنی ہنسنے میں اس کے دانت نظر آئے معلوم ہوا کہ وہ حسن جلدی مورتوں میں گمان کرتے ہیں، وہ لغو ہے۔ حسن یہ ہے کہ جو معشوق کے دانتوں میں ہے۔ پس اسی دلیل کو سب نے دیکھ لیا اور چونکہ بدیہی تھی، مان لیا۔

لشکر ہوشم بزورِ می نشکستی غمزہ ساقی نخست راہ نظر زد
نظر ”فکر“ کو بھی کہتے ہیں، اور ”نگاہ“ کو بھی یہاں ”نگاہ“ کے معنی ہیں شاعر کہتا ہے کہ میں ایسا نہ تھا کہ شراب کی تاب نہ لاتا اور شراب پی کر ہوش ہوجاتا۔ مگر کیا کروں کہ پہلے غمزہ ساقی نے ”نگاہ“ کو خیر اور مطلوب کر دیا، پھر اس پر شراب پی گئی۔ بخوردی کا استعداد تو ہم کچھ ہی گیا تھا، ناچار ہوش جلتے رہے۔

برگِ طرب سا ختم و بادہ گرفتیم ق ہر چہ ز طبع نازد بیہدہ سرزد
شاخ چہ بالید، اگر ارمغان گل آورد تاک چہ نازد، اگر صلائے خمر زد
یہ دونوں خمر قطعہ بند ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ روئید گیاں بمقتضائے طبیعت خاک ہر طرف ظاہر ہوا کرتی ہیں مثلاً گتا۔ اب کچھ خاک کو اور ہوا کو بھی منظور نہیں کہ اُس کا رس نکلے اور اُس کا تند بنے۔ [یہ] آدمی کی ہوشمندی ہے کہ اُس نے اس گھاس میں سے یہ بات پیدا کی۔ پس، اسی طرح انگود ہیں اور گلاب کے پھول ہیں۔ شاخ گل کیا جانے کہ پھول میں کیا خوبی ہے اور تاک کیا جانے کہ میرے پھل میں کیا اتھر ہے، ہم نے اپنے ذوقِ قتل سے انگود کی شراب بنائی اور پھولوں کو ہر ہر رنگ سے [اپنے] کام میں لائے۔

کام نہ بخشید، گنہ چہ شمارِ غالبِ مسکین بافتات نیرد
گستاخانہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے کہ جب اس عالم میں تو نے میری داد نہ دی اور میری خواہشیں پوری نہ کیں تو بس اب معلوم ہوا کہ میں لائقِ انتفات کے نہ تھا پس جب۔

بالائق توجہ کے نہیں تو اب عالمِ عقبے میں میرے گناہوں کا مواخذہ کیا ضرور ہے؟ جب بے مطالب آپ نے ہم کو نہ دیئے تو ہمارے مٹامی کا بھی شمار نہ کیجئے۔ جلنے دیجئے، یہ التفات کی نہیں ہے۔

ت کزار بجز و قریب رنجیدن نداشت جرمِ غیر از دوست پر سیدیم در پیرین نداشت
معنی نرشتہ معصفت علیہ الرحمۃ۔ داشتن بمعنی رکھنے کے ہے، (لیکن) اہلِ مذہب "بالیقین" بھی استعمال کرتے ہیں۔ ظہوری علیہ الرحمۃ:

میرزا ف و کامل گفتہ باشم خویش را گفتہ باشم میں تقدیر خویش پیچیدن نداشت
میرے شعر میں پہلے مصرع کا داشت بمعنی "رکھنے" کے ہے اور دوسرے مصرع
داشت بمعنی "بالیقین" ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ دوست ایسا جیلہ و دھونڈا تھا کہ اس کے
یہ سے مجھ پر خفا ہو۔ چاہتا تھا کہ آدرہ ہو، مگر سبب نہیں پاتا تھا۔ تضار کچھ دنوں
بعد قریب سے معشوق کو طال ہوا۔ میری جو شامت آئی، میں نے دوست سے پوچھا
قیب نے کیا گناہ کیا، جو رائدہ درگاہ ہوا؟ معشوق اسی گستاخی کو یہاں عتاب ٹھہرا کر
یہ ہو گیا اب شاعر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے پیرسیدن مداشت، یعنی پوچھنا
بہ چاہئے تھا۔

خواندی شویں و زود فہمیدم درین پیش ازین پایم ز گرد راہ پیچیدن نداشت
معنی از معصفت۔ عاشق ایک عمر تک منتظر رہا کہ یا ر مجھ کو بلا دے، مگر اس عیار نے
بلا دیا۔ رفتہ رفتہ میں غم سے ایسا نار و ناتواں ہو گیا کہ طاقتِ رفتار نہ رہی اور گردِ راہ
میرے پاؤں الجھنے لگے۔ جب اس نے یہ جانا کاب نہ آسکیا تھا، تب بلایا۔ عاشق
ہے کہ تو نے میرے بلانے میں دیر کی (اور میں اس کی وجہ جلد سمجھ گیا کہ تو نے میرے بلانے
اس واسطے دیر کی) کہ اس سے پہلے میں ایسا ضعیف نہ تھا کہ تو بلائے اور میں آؤں۔
نا کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ زود فہمیدم پر ہے، یا پہلے سے بیمار نہ ہونے پر ہے۔ درین
دوست کی بیوفائی اور بے سبب آزار دہی اور اپنی عمر کے تلف ہونے پر۔ غالب
دالست از شہادتِ امید حور بود بر گشتنم زوین دم لعل ضرور بود

معنی از مصنف علیہ الرحمۃ۔ شاعری گوید کہ معشوقِ من گماں کردہ از شہادت
 فداست زمر اک مسلمانان از ہر شہدا احد و قسود ثابست می کنند پس این شخص از
 فدا دمی گوید کہ حیف است کہ من بمیرم و از من این گماں در خاطر معشوق ماند۔ چرا
 نشہ شدن ترک اسلام نہ کروم و کافر نہ شدم تا میں منطہ دودل دلدار نہ اندی۔ ہویا
 زدی نمی ترسد اناں می ترسد کہ دوست بد گماں شد۔ کافر مردن را بہتری داند از بد گما
 ناز کافر نہ شدن پیشی مانست۔ غالب

استدراک

یہ تذکرہ مطبوعہ ہونے کے باوجود بیحد نادر ہے۔ اس لئے ہم ڈاکٹر حکیم چند نیر
 کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس کا تعارف کرایا۔ اگلے پرچے میں ہم اس کا تفصیلی
 تذکرہ کریں گے۔ ان شاء اللہ
 ڈاکٹر نیر نے تذکرے میں سے غالب کا مکمل تذکرہ نقل کر دیا ہے۔ بھونے
 اس میں غالب کی ایک فارسی غزل کے معنی دیئے ہیں، جس سے متعلق وہ
 لکھتے ہیں :

معنی اس غزل حضرت مصنف علیہ الرحمۃ (یعنی غالب) بقلم خود
 نگاشتہ بمن دادہ بودند؛ ہو بہو جگارش می آید۔

اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غالب نے غزل کی یہ شرح غولف تذکرہ بھور کے
 لئے خاص طور پر طبع کی تھی اور غالب اب تک یہ غیر مطبوعہ رہی ہوگی۔ اسی لئے
 ڈاکٹر نیر نے لکھا ہے : اس طرح مرزا غالب کی ایک نادر تحریر جواب تک
 ہماری دسترس سے باہر تھی، دستیاب ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شرح غالب نے ایک اور مکتوب الیہ مولوی کریم علی
 کو لکھی تھی اور طبع بھی ہو چکی ہے۔ (دیکھیے : اردوئے معلیٰ، طبع لاہور ۱۹۲۲ء
 صفحہ ۳۸۹-۳۹۳) مطبوعہ شرح اور بھور کے دیئے ہوئے متن میں خفیف سا
 نقلی اختلاف ہے، نیز شعروں کی ترتیب میں بھی اختلاف ہے جہاں بھور

کے دیے ہوئے متن میں اردو کے معنی سے کمی تھی، اسے مرقم قرار دے کر مکمل کر دیا گیا ہے اور امتیاز کے لئے یہ الفاظ مرتب قلابوں کے درمیان رکھے گئے ہیں۔

میرا گمان ہے کہ مجھ کو نے اس خط کا یہ حقیقتہ نقل کر لیا اور ظاہر کیا کہ یہ شرح غالب نے بقلم خود لکھ کر انھیں دی تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری ہے کہ وہ کسی بڑے اور شہور شخص سے نسبت پیدا کرنے میں بڑائی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کا جعل بعض شخصوں نے پہلے بھی کیا ہے۔ صغیر گلگامی نے غالب سے دلی میں ملاقات کی تھی۔ اس کا حال بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ غالب نے یہ باتیں مجھ سے کہیں۔ حال آنکہ وہ باتیں غالب نے صغیر سے نہیں کی تھیں۔ غالب نے وہ سب باتیں جو میری عبدالغفور سرمد کے نام کے خطوں میں لکھی تھیں۔ سرور بادہرو میں صغیر کے نانا کے ساتھ رہتے تھے۔ صغیر نے یہ خطا ان کے پاس دیکھے اور ان کے اپنے تذکرے میں یوں نقل کر لئے، اگر یا غالب نے یہ ان سے کہی ہوں۔ نا در خطوط غالب کے مولف محمد اسماعیل رسا گیا دی نے بھی یہی کہا تھا کہ مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے جمع کر کے نئے خط بنائے اور دعویٰ کر دیا کہ غالب نے یہ ان کے پر دادا کرامت علی کے نام لکھے تھے۔ کچھ ایسی ہی بات مجھ کو نے بھی کی ہے۔

البتہ ایک آخری شعر۔

دالت ارشاد تم اُمید خور بود
بر گشتتم ز دیں دم بسمل ضرور بود
کی شرح کا حوالہ مجھے فوری طور پر نہیں ملا۔ یہ بیخ آہنگ کے آہنگ بخم میں ہونا چاہئے۔

مالک رام



آدمی کس کے سہارے زندہ ہے.....؟

زندہ رہنے کے لئے صرف روٹی ہی کافی نہیں۔ پیارا اور باہمی
 سوجھ بوجھ بھی ضروری ہے۔ زندگی سے احساسات اور خوبصورتی کا
 بھی اتنا ہی گہرا تعلق ہے، جتنا کہ روٹی کا۔ جیسا ایک فن ہے اور منصوبہ بندی
 اس کی بنیاد۔ جب ہم دوسرے معاملات میں منصوبہ بندی کی اہمیت کو
 تسلیم کرتے ہیں تو کنبہ کو محدود رکھنے کے لیے بھی اس کا سہارا کیوں نہ لیں۔
 زندگی میں پیار، تعاون، باہمی سوجھ بوجھ کے لیے اپنا بیٹے.....

خاندانی منصوبہ بندی

DAVP

غالب اور سفیر ہرات

نے اپنی زندگی میں صرف ایک طویل سفر کیا، جب انھیں اپنی خاندانی پیش کے رے کی پیردی کے لئے دکن سے کلکتے جانا پڑا۔ وہ اوسط ۱۸۲۶ء میں دکن سے ہو کر ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ مقدمے کے ابتدائی مراحل سے فرصت غالب نے کلکتے کی ادبی سرگرمیوں میں ذوق شوق سے حصہ لینا شروع کیا اور اس بار وہ مشاعروں، علمی مجادلوں اور ادبی مناقشوں میں الجھ گئے۔

زمانے میں کلکتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی راجدھانی تھا وہاں مشرق اور مغرب کے سنگم، ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ عربی اور فارسی علوم کی ترویج کی غرض سے ہندوستان پہلے گورنر جنرل دارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتے میں مدرسہ عالیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۱۸ء میں اس مدرسے کی از سر نو تشکیل ہوئی اور اسے اس عمارت میں منتقل کیا گیا، ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے ویلزلی اسکوائر کی شمالی جانب تعمیر کی گئی تھی۔

ب کی آمد سے پہلے ہی یہ مدرسہ عالیہ علمی اور ادبی مرکز بن چکا تھا۔ کلکتے کے دانشوروں ایک انجمن قائم کی تھی جس کے زیر اہتمام اس مدرسے میں ہر انگریزی مہینے کے پہلے رات کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جب غالب کلکتہ پہنچے، تو انھیں بھی ان مشاعروں میں شرکت دعوت دی گئی۔ چنانچہ یکم جون ۱۸۲۸ء کو جو مشاعرہ منعقد ہوا، انھوں نے اس میں شرکت

نامہ ہای فارسی۔ مرتبہ سید اکبر علی ترمذی (دلی ۱۹۶۹ء) مقدمہ: ۲۳

Handbook of Calcutta : Historical and Descriptive
(Calcutta 1892) p. 255

کی۔ اس کے بعد کے شاعر کے لئے ایک ریختہ کا اور ایک فلاسی کا مصرع طرح دیا
فارسی کا مصرع تھا :

دارم امید کہ کاں ہم ز میاں بر خیزد
غالب نے اسی مصرع طرح پر غزل کہی اور مشاعرے میں پڑھی جو ۶ جولائی ۱۸۲۸ء
مدرسہ عالیہ میں ہوا تھا۔ اس غزل میں ایک شعر تھا :

جزوی از عالم و از ہمہ عالم بیشم
بجو مونی کہ جاں را ر میاں بر خیزد
اس شعر میں تین اقراض کئے گئے : (۱) مصرع اولیٰ میں ہمہ عالم کی ترکیب غلط
کیونکہ عالم مفرد ہے ؛ اس کا ربط ہمہ کے ساتھ درست نہیں۔ یعنی عالم واحد
لہذا ہمہ کا لفظ واحد سے پہلے نہیں آسکتا۔ معترض نے بطور سند قتیل کا قول پیش
جن کے اہلِ کلکتہ بہت معتقد تھے۔ (۲) بیشم کے بجائے بیشتر ہونا چاہیے (۳)
زمیاں بر خیزد غیر صحیح ہے ؛ اس کی جگہ مونی زمیاں بروید ہونا چاہیے۔
ان اعتراضات کے جواب غالب نے اس سے اگلے مشاعرے میں دیئے جو ۳۱
۱۸۲۸ء کو منقذ ہوا تھا۔ ترکیب ہمہ عالم کے جوازیں غالب نے فارسی کے اس
کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے :

گر من اکودہ دامنم، چہ عجب
ہمہ عالم گو او عصمت اوت (حافظ)
یہ جہاں خرم از آئم کہ جہاں خرم از دست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست (سعدی)

۱۔ نامہ ہای فارسی غالب : ۱۰۴

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً : ۱۰۶

سرے اعتراف یعنی بیشتر کی جگہ بیش کے استعمال کے جوازیں انھوں نے یہ شعر پیش کیا:

کم از آسم کہ دید معذرتہم باید زد
بیش از آئی کہ دی جملت تقصیر مرا (ظہری)

استن اور روئیدن کے مرادف ہونے کی سندیں انھوں نے یہ شعر پڑھا:

از رخ خط مشک سود برخواست

آتش بہشت و دود برخواست

جوابات کو سن کر مداحین قاتل جید جزیرہ ہوئے اور انھوں نے غالب کے خلاف
ہے میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس ہنگامے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب بانو
بولوی محمد علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”دہسراہ شمس انگریزی یکشنبہ نخستین سخنگو یاں سخن فہماں در مدحہ سرکار
کینی فراہم شدن دے دغز ہا خواندندے دشیند دے۔ ناگاہ میفرے
کہ از طرف بادشاہ ہرات ترسہا اللہ تعالیٰ عن الکافات رسیدہ است،
در انجمن حاضر گردید و اشعار پارسی گویان ایں بقعہ شید مرا بہانگ بلند
بستود و گفت: قد بایں کلام را در ہندوستان کہ خواہد دانست؟
آچہ میگوید، در خور آنست کہ فصحا ی ایران بشنوند و خط بردارند۔ دیگر
رؤب جماعت کردہ گفت: یاراں! ایں شخص در میان شما منعظم است
و قطع نظر از شعر و شاعری عالم زبان پارسی است۔ چون طبائع
بالذات مفتون خود نمائی است، حد بردند“

اسے قد شا کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں: (۱) کیا غالب کے دوران قیام کلکتہ میں
ان کوئی سفیر ہرات تھا یا نہیں؟ (۲) اگر واقعی کوئی سفیر تھا، تو اس کا نام کیا
تھا؟

جہاں تک سیفر کے نام کا تعلق ہے، غالب نے ایک خط میں مولوی عبدالرزاق کو لکھا ہے:

تفسار اس زمانہ میں شاہزادہ کامران و زانی کا سیفر گورنمنٹ میں آیا تھا؛
کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے
اشعار پانچ سات ایسے پڑھے؛ جن میں ہمہ عالم، ہمہ روز و ہمہ جا
مرقوم تھا۔

گویا غالب کے نزدیک سیفر کا نام کفایت خاں تھا۔ کیا اس کی تصدیق ہو سکتی
قومی دفتر خانہ، نئی دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو دفاتر ہیں ان کے مطابقت
پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں حسین علی نامی ایک شخص کلکتے میں رئیس ہرات
کے فرائض انجام دے رہا تھا؛ گورنر جنرل کے دربار منعقدہ ۱۶ جولائی ۱۸۲۸ء
موجود تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس زمانے میں غالب کلکتے گئے ہیں، وہاں
سیفر ہرات فرود تھا، لیکن اس کا نام میرد احسن علی تھا، جبکہ غالب اس کا نام
خاں بتاتے ہیں۔

اس گنتی کا صل ہیں قومی دفتر خانے ہی میں محفوظ ایک "انقاب نامہ" میں ملتا
"انقاب نامہ" میں حسین علی خاں کا لقب یوں درج ہے: "سید حسین علی خاں معروف
بکفایت خاں وکیل مالی ہرات۔"

ان حقائق کے پیش نظر ثابت ہو گیا کہ کلکتے کے اس ادبی معرکے میں
مؤید سیفر ہرات کوئی فرضی شخص نہیں تھا؛ اس کا نام حسین علی خاں تھا اور لفظ
خاں۔

وفیات

راز بلگرامی سید شریف الحسن

۱۹۰۱ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ریاض الحسن بلگرامی کی کچھ زمینداری تھی۔ راز کی عربی فارسی کی کچھ تعلیم گھر پر ہوئی، اسکول میں آٹھویں درجے کے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن یہی انھوں نے ذاتی مطالعے سے پوری کی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، فارسی اور عربی دونوں میں بہت اچھی استعداد تھی، اور شعر میں خاص طور پر حافظہ اتنا اچھا تھا کہ جو اے میں سند دینے میں کبھی دقت نہیں ہوتی تھی۔

فن عروض شادال بلگرامی (ف جنوری ۱۹۴۸ء) سے حاصل کیا، لیکن شعر پر اصلاح سید وجاہت حسین بہتر تھری سے لی۔ اور طویل مشق سے خود استاد کی کا درجہ حاصل کیا۔ بلگرام کے میسوں نوجوان ان سے مشورہ کرتے تھے۔ شعر کے علاوہ نثر سے بھی مزاولت تھی۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی کے ماہنامے مہر قے میں برابر کے شریک تھے اور اس میں کبھی کبھی نثری مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے کا ایک مشہور تنقیدی مضمون شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے موازنے سے متعلق تھا جس پر کچھ بحث بعد کو نگار (لکھنؤ) میں ہوئی تھی۔

مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: حسین بیٹی، کاثر حسین، پہنچات

آخری ایام میں تاریخ بگرام مرتب کرنے ارادہ تھا، لیکن اس کے لیے جس ذہنی اور جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وہ میسر نہ ہو سکا اور کام نامکمل رہ گیا۔
کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا، بلکہ جس نے طلب کیا، اس کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ نظم، غزل، نعت، قصیدہ سب اصناف میں کہا، لیکن تلاش کرنے پر شاید ایک معقول جملہ کے لیے بھی اب بدل سکے۔

سادات بگرام کو اہل بیت سے بہت محبت رہی جو سدا مروج بھی اس سے متشبی نہیں تھے۔ چنانچہ مرثیہ خوانی سے بہت شغف تھا، بلکہ فارسی "وہ مجلس" کے پڑھنے میں تو ان کی خاص شہرت تھی۔

تبہ دق کے مرض سے ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کو بگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

طالب کشمیری، نند لال گول

پنڈت نند لال گول طالب جن کا مختصر علالت کے بعد اچانک ۱۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو سرنگری میں انتقال ہو گیا، کشمیر کے خاصے صاحبِ وجاہت طبقے کے فرو تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد گول تھا، جو ریاست کے بڑے زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ طالب کے دادا پنڈت دیوہ گول حکومت کشمیر میں دفتر دیوانی کے افسر اعلیٰ تھے۔ وہ فارسی کے منشی اور شاعر بھی تھے، دیوہ تخلص تھا۔ عربی میں بھی خاصی دستگاہ تھی اور سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کا ایک آدھ شعر بھی لانا ہے۔ افسوس، ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ باقیاتِ صالحات میں سے فارسی کی چند غزلیں رہ گئی ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ خوشنویسی اور مصوری اور نقاشی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اہل نظر سے خراجِ تحسین لے چکی ہیں، بشیر تصویریا مہندو دیو مالادہ مہرب سے متعلق ہیں۔ ان کا ۱۸۰۵ء میں سرنگری میں انتقال ہوا۔

دیہ کے والد یعنی طالب صاحب کے جد امجد اے راگھوناتھ کو ل بہت بڑے رئیس اور زمیندار اور ریاست میں وزارت اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

بذرت نند لال ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول علمی تھا، اس لیے ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں بی اے، دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں ایم اے (فارسی) پھر ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل (فارسی) اور دہلی کے ماتھ ایم، اے ایل اور ادیب فاضل (اردو) کے امتحان پنجاب یونیورسٹی سے امتیاز سے کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور سری پرتاپ گج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے، یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس سالی ماں سے سبکدوش ہو کر امرنگھ گالچ میں پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی و اردو ہو کر پلے گئے، یہاں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک کے تین برس جوں و کشمیر یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں جوں و کشمیر پول اکاڈمی سے بھی وابستہ ہو گئے۔

اس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس میں شعر گوئی کا شوق لابر تھا، ہذا یہ بھی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے کچھ دن دبیر تخلص کرتے رہے، پھر سے بدل کر لال کر لیا۔ شروع میں منشی رام سہاے متا لکھنوی (ف ۱۹۳۶ء) سے اصلاح لی، جو منشی دھار کا پرشاد افق (ف ۱۹۱۳ء) کے بھائی اور منشی بشیشور پرشاد منور، لکھنوی (ف ۱۹۰۷ء) کے چچا تھے۔ متا سے اصلاح کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ اس سال عوں نے بذرت برج موہن و تاتھیہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) کا لکھنا اختیار کیا۔

میں مرحوم نے اپنی وفات سے مدتوں پہلے انھیں فارغ اصلاح قرار دے لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سیما بکیر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے بھی شاگردی کا تعلق رہا، جی و دھنی اور سیما بک دونوں سے بیک وقت استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے

کیفی مرحوم سے تلمذ کا ایک شعر میں ذکر بھی کیا ہے :

حضرت کیفی کی شاگردی پر نازاں کیوں ہو ! میں ہوا طالب تو غشا، فیض و حانی مجھے

ان کے کلام کے مجموعے شائع ہوئے۔ (۱) اشحات التینیل یعنی کلام طالب (دہلاویں ۱۹۲۵ء)

اور (۲) مرقع انکار (دہلاویں ۱۹۵۱ء) اس کے علاوہ (۳) ترائے طالب کے عنوان سے ایک

طویل مسدس بھی شائع ہو چکا ہو۔ منشی تیرتھ رام فیروپوری نے اردو میں پرتھوی راج

چوہان کی سو انجمنی کھنٹی، طالب نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ کشمیر میں فارسی کے

ایک شاعر ہوئے ہیں پنڈت راج کول عرض لگی، وہ دبیری غلط کرتے تھے، بہت کچھ

کلام ہے۔ دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ طالب صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع

کیا۔ ایک کتاب ادب ایران میں کشمیریوں کا حصہ کے عنوان پر شائع کی تھی۔

پنڈت برج کشن کول، بخیار اور پنڈت جگموہن رینہ شوقی نے بہار کشن کشمیر کے عنوان

سے کشمیری پنڈت شعرا کا ایک تذکرہ دو جلدوں میں شائع کیا تھا لاہ آباد ۱۹۳۱-۱۹۳۲ء

طالب صاحب نے اس کے لیے شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مزین کا بہت ہاتھ

بٹایا تھا جس کا انھوں نے دیا چے میں اعتراف کیا ہے۔

طالب صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کر کے سرمایہ کلام غالب کے

عنوان سے ایک سلسلہ مضامین تاہی رسالے "فوائے ادب" (بہمنی) میں شائع کیا تھا

اسی کو مرتب کر کے کتابی شکل میں جوہر آئینہ کے نام سے چھپوایا۔ ابھی مضامین کا اچھا

خامہ ذخیرہ منشر حالت میں پڑا ہے۔

انھوں نے اٹھویں صدی کی مشہور کشمیری شاعرہ لاد عارفہ کے کلام کا اردو اور فارسی میں

ترجمہ کیا تھا۔ لاد کا کلام شیوی فلسفے پر مبنی ہے۔ طالب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ہر ضو

کی وقت کے باوجود اس میں کہیں اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یہ کتاب غیر مطلوبہ رہ گئی۔

اسہوی ایام میں وہ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ یہ غالباً ناممکن رہ گئی

وفیات

ہا ہو۔ لی جتنا مقدمہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ اسے ضائع کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کی
نت ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیگی، بلکہ آئندہ کام کر کے دالوں کے لیے خیاد
بنا بت ہوگی۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے جیسا کہ بہاؤ بخش کشمیر
انتخاب سے ظاہر ہے۔ ”مرقع افکار“ میں بھی کچھ فارسی کلام موجود ہے۔ خدا معلوم
رے فارسی کلام کی مقدار کتنی ہو بہر حال یہ بھی غیر مطبوعہ رہ گیا۔ بہت سے مضمون
فد رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔

اس علمی خدمات کے جلد دیں صدر جمہوریہ ہند نے اس سال انھیں فارسی کا انعام
ماہرہ روپے سالانہ (عطا فرمایا تھا۔ وہ ۱۲ اکتوبر اس کی سند لینے کو دلی آنے والے
اک چار پانچ دن کی مختصر علالت کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۷۱ء صبح ساٹھ سالہ بچے حرکت
ببند ہو جانے سے ماہی ملک بقا ہو گئے۔ ان کی آخری کتاب جو ہر آمینہ اہی مطبع
پس آئی تھی، یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

اے سا آرزو کہ خاک شدہ

لی نوت سے ایک صلح کل اور شریف دوست، سہرورداد شفیق استاد داد و کا ایک
نئی خادم ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

امام عباسی بلیاوی۔ قاضی محمد عثمان عباسی

ن کا شجرہ نسب میر امتی حضرت عبداللہ عباس سے ملتا ہے۔ بیخاندان چلے
باکوٹ ضلع انظم گڑھ میں مقیم تھا۔ ضلع بلیا میں یلہنوار و ڈریوے اسٹیشن سے
نی چاہیل دو ایک گاؤں پسو باری ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ چہ یا کوٹ سے نقل مکان
کے پسو باری میں آئے۔ یہاں حکومت وقت نے ان کی مناسب قدر و منزلت کا
لندہ پور علی کی قضاۃ ان کے سپرد کر دی۔

شاعری

تو نہیں کیا، لیکن زبرد قوتوں کے باوجود رکیک، عریاں، مبتذل اور فحش مضامین
باندھنے میں حضرت فصیح الملک کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا۔

ان حالات میں صرف حضرت فصیح الملک کو مورد الزام ٹھہرانا بجائے خود قابل الزام ہے۔
چوں کہ میں اس مقالے میں کہیں کہیں ان کے مضمون، اسلوب بیان اور استعمال الفاظ
پر جو فکری کڑہ لکھا، اس لیے دفعہ دخل مقدر کے لیے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج کل ہندوستان
اور پاکستان میں شاید ان کا اتنا دماغ کوئی نہ ہو جتنا میں ہوں، یہ دوسری بات ہے کہ میں
نے ان کی یا کسی اور کی تقلید کبھی نہیں کی۔

حضرت ابد الفصاحت کی شاعری کے ارکان معنی محسن تخیل اور محسن بیان خود آپ کی ذاتی
قوت ابداع و اختراع کے مرہون منت ہیں۔ اس بات میں آپ نے نہ کسی شاعر عظیم کی
مثال پیش نظر رکھی اور نہ کسی کی تقلید کی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ زبان 'روز ترے' اور
محاورے کے استعمال میں حضرت فصیح الملک کے کلام سے استفادہ کیا۔ مگر اسے تقلید
نہیں کہا جاسکتا۔ تقلید تو انداز فکر اور طرز بیان کی نقالی ہوتی ہے۔ اگر آپ اہل زبان
ہوتے، تو اتنا بھی نہ کرتے۔ بہر حال آپ نے جو استفادہ کیا، وہ اہل زبان کی سب سے زیادہ
ناگزیر تھا۔ آپ کا بیان ہے:

اگرچہ حضرت داغ کی معجز نگاری میرے لیے بہت بڑی محرک تھی، مگر
میں تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے میلان طبع کے زیر اثر ان کا انداز سخن اپنی طبیعت
میں اس قدر جذب نہیں ہو سکا، جس قدر نوح ناردی، ہجر شاہ، جہانپوری
اور دیگر بڑے شاعری نے کیا تھا۔ اس میں کوتاہی اور تفصیل کی کوئی بات نہیں۔
خالد کے ۳۶ اشعار دہلی میں سے ایک نے بھی ان کا انداز سخن کوئی قبول
نہیں کیا۔ مگر اس حقیقت کے باوجود میری ہر ذرہ میں ایسے تین چار شعر
ضرور پائے جاتے ہیں جن پر داغ کے رنگ کی چھاپ صاف نظر آتی
ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ انداز انھیں کافیضان ہے۔ چند شاکیں
ملاحظہ ہوں:

وفیات

صوت باہم بھی رہی، جو سادہ اور آواز زندگی کا خالق ہے، لیکن وہ برس ہوئے، پوری کی موت (۱۵ اگست ۱۹۶۹ء) نے اس پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن بیسودہ اپنے عزیز دوست حکیم سعید عارفین کے پاس میرٹھ شہر گئے ہوئے تھے کہ وہاں دوسرا حملہ ہوا۔ اسی میں ۲۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کو صبح ساڑھے پانچ بجے روح قفسِ حضری سے پرواز کر گئی۔ وہیں تدفینِ عمل میں آئی حکیم صاحب موصوف کے خاندانی قبرستان شاہ سلطان میں آفری خواہ محلہ خضیب پورٹی۔ یوں معلوم ہوتا ہو، گویا میرٹھ کی مٹی ہی نے انھیں وہاں کھینچ لیا تھا۔

اپنے ویسے اولادِ جسانی میں پانچ بیٹے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سعید عارف لکھنؤ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ انھیں بھی علم و ادب سے شغف ہو۔ اور سعید عارفی کے قلمی نام سے لکھتے ہیں۔

عارف نے شعر گوئی اگرچہ زمانہ طالب علمی ہی میں شروع کر دی تھی۔ لیکن اس میں باقاعدگی ۱۹۷۱ء میں آئی۔ ابتدا میں آزاد فقہوری اور حکیم سید باقر حسین شاعر ٹھہری۔ (۱۹۷۱ء) سے مشورہ رہا۔ بعد کو جگر مراد آبادی سے مستفلاً تلمذ اختیار کر لیا۔ حبیب احمد صدیقی نے بھی ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ وہ خوش فکر اور زرد گو لکھنے والے شاعر تھے، پگرافسوس کہ کلام کی تدوین سے متعلق بہت بے پروا ہے، چنانچہ کوئی مجموعہ سچ تک شائع نہیں ہوا۔ اب کے بڑے صاحبزادے سعید عارفی سے مختلف رسائلِ جمائے فروہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

منظر اکبر آبادی، شمشاد حسین صدیقی۔

منظر اردو کے مشہور شاعر جناب سیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۷۱ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں

ذیلیات

پائی۔ لیکن کمزوری صحت اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوئی، بیاب مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کانپور کے بعد اجیر ٹونڈلہ، اگرہ وغیرہ میں رہے۔ منظر کا بچپن بھی انھیں مقامات میں بسر ہوا۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں یہاں کے ریلوے ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے، لیکن ابھی بچوں کی دس بجے تک نہیں پہنچے تھے کہ بیاب دہاں سے چلے آتے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اور سب کام سہا تھ اٹھا کر اگرہ میں قصر الادب کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ پیام جاری کیا۔ منظر اپنی کمسنی کے باوجود اس ادارے سے وابستہ ہو گئے، اور یوں تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا اس کے بعد کچھ مذہبی عربی اور اردو مدرسہ عالیہ، جامع مسجد اگرہ اور مدرسہ محمدیہ اگرہ میں حاصل کی۔

قصر الادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے جن میں ہفتہ، تاج، زبانِ شاعر، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیائی خاص طور پر شہرت حاصل کی، منظر کس رنگی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً پندرہ برس تک ایڈٹ کے ایڈیٹر رہے۔

جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اس میں شعر گوئی کو بالائے مذہبیات تھی۔ یہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے لیکن زیادہ مزا دلالت نظم سے رہی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں بیاب کانپور میں انتقال ہو گیا، تو منظر صاحب اگرہ سے باک۔ چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ایک ماہنامہ 'پرچم' کے نام سے جاری کیا تھا۔ نیا واقعہ ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔ تندرستی اور بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی ضیق نفس کا عارضہ۔ لیکن اس کے باوجود بظاہر شویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اپنا ۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء شہید کیا۔

وفیات

شدید دورہ پڑا جس سے ہاگ اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اور دس منٹ بعد آفاقاً
اسے دس بجے روح نقسب عفری سے پردہ اندر لگئی۔

امی، ہادیو پرشاد

روٹی (روپی) کے ایک متوسط الحال کا ستھہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام
لی پرشاد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے شارد اور پرشاد تھے اور چھوٹے ہی ہادیو پرشاد
پرشاد ۲ جولائی ۱۸۸۸ء کو ہرودٹی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم جوہلی
اسکول لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد کنگ کالج میں داخلہ لیا۔ بی ایس سی آخری سال
تھے کہ والد چلے گئے۔ چونکہ اس کے بعد مالی حالت ٹھیک نہ رہی اس لیے تعلیم کا
لے منقطع ہو گیا۔ اب انھوں نے ضرورتاً فیض آباد کے ایک اسکول میں نوکری کر لی چندے
باروں اسکول، جیلپور میں منتقل ہو گئے، اور پھر گویا عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے
ہیں مگر تعلیم نے انھیں تدریس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے متغیر کیا،
فیض اسپنس ٹریننگ کالج، جیلپور سے سند حاصل کی، اور اس کے بعد
ورنٹ کالج ہائی اسکول میں تدریس مقرر ہو گئے۔

۱۸۸۷ء کے آخر میں تھکالی بھیا، جیلپور نے انھیں تھکاری سٹی کالج میں اور دھاروی
مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو یا فارسی میں ایم اے نہیں تھے۔ اس لیے
سٹی اپنے قواعد کی رقم سے ان کے انتخاب پر بحال طور پر معترض ہو سکتی تھی، لیکن ان کی
مقابلیت اور تجربے کے پیش نظر ناگپور یونیورسٹی کے ادباج محل و عقد نے استثنائی
پلان کے تحت کی اجازت دے دی۔ اس پر انھوں نے جنوری ۱۹۱۱ء میں سرکاری ملازمت
اتھلی دے دیا اور بقیہ عمر اسی تھکاری سٹی کالج میں گزار دی۔ اپنی گرتی صحت
بڑا سال کے باعث وہ جہاں سے ۱۹۱۵ء میں سکونداشت ہوئے۔

وفیات

پچھلے کئی برس سے ان کی صحت تسلی بخش نہ تھی۔ ان کی بڑھ کی بڑی سی کچھ نقص رہا ہو گیا تھا جس سے گردن میں بھی کمی آگئی تھی۔ مزید مصیبت یہ کہ نئی حالات بھی بہت ناخوشگوار ہو گئے۔ خانگی جادو اس سے متعلق کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا اور نوبت عدالت تک پہنچی۔ مقتدی کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اور وہ پریشان رہنے لگے۔ اسی زمانے میں ان پر ناخ کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے متوازن علم ہوتے رہے۔ آخری مارچ ۱۹۷۱ء کو ہوا اور اسی دن سہ پہر کے پانچ بجے وہ میڈیکل گارج میں جان بحق ہو گئے۔ لا ولہ فمت ہوئے۔

جیسا کہ ذکر ہوا وہ گھر کے ناموافق حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن خداداد ذہانت اور ذاتی جدوجہد سے انھوں نے یہ کمی پوری کر لی۔ سائنس کے وہ طالب علم رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں ان کی مہارت کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کئی ایچ ڈی کے طلبہ اور پروفیسران سے مشورہ کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی جس سے وہ بہت دن تک دھیر پردیش کے فارسی عربی بورڈ کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔

شعرو سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ جب شعر کہنے لگے، تو افتخار الملک مضطرب خیرو آبادی سے مشورہ کیا۔ افسوس کہ ایک نعتیہ نظم (رویت حسنہ) کے علاوہ جو جذبات کے عنوان سے شائع ہوئی تھی سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا، اتنا اطمینان ہے کہ وہ محض ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

اس نعتیہ نظم کی شان نزول یہ ہے کہ فروری ۱۹۷۲ء کو ایک شب ۵/۷ شعبان ۱۳۹۱ کو مغرب کے بعد ایک تارہ ٹوٹا اور آسمان آسمان کی روشنی سے آسمان پر نقہ محمد ہوا۔ یہ ظہارم دیش آدھ ٹھٹھے تک دکھایا گیا اور پھر تدریجاً مدھم ہوتا ہوا سوٹ گیا

وفیات

یوپی احمد حمید پرنس (سی پی) کے متعدد شہروں میں ہزاروں اشخاص نے اسے دیکھا۔
 نرمانے کے انباروں میں بھی اس کا بہت چرچا رہا تھا۔ اس سے تعلق کیم مارچ
 ۱۹۶۷ء کو جیلپور میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس کے کوائن ستارہ محمدی کے
 عنوان سے علی احمد جیلپوری نے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں سامی کی اس نظم
 رویت حسنہ کے علاوہ تین فارسی رباعیاں، ایک فارسی قطعہ اور ایک فارسی نعت
 بھی شامل ہیں۔ یہ نظم رویت حسنہ انھیں ایام میں جذبات سامی کے عنوان سے
 بھی چھاپی گئی تھی۔ یہ سندس کی شکل میں ہے۔ اس میں مترہ بند (۵۵ شعر) ہیں۔

افقر موبانی، استاد محمد حسین

محبوب الہی حضرت نظام الدین ادویا (ف ۱۳۲۵ء) کے خلیفہ حضرت نصیر الدین کھن (ف ۱۳۵۶ء)
 جرائد دہلی کے نام سے کون صاحب علم واقع نہیں ہوگا انھیں کے خلیفہ اور جانشین حضرت سید
 محمد گیسو دراز تھے (ف ۱۳۳۳ء) جن کا مدفن ظہیر گڑ میں ہو۔ ان سے لگے یہ سلسلہ طریقت چلا۔ ان
 کے خلفاء میں سے حضرت سید شاہ عبدالعظیم عرف دادامیاں اولاً بہت دن کا لپی (ضلع جالندہ)
 میں مقیم رہے اور پھر ۸۵۰ھ میں وہاں سے نقل مکان کر کے قصبہ موبان (ضلع آٹاوا) میں
 قاسم گڑ میں ہو گئے۔ یہی دادامیاں ہمارے شاعر سید محمد حسین افقر موبانی کے جدِ اعلیٰ تھے۔
 حضرت دادامیاں کی آنکھیں پستی میں فقر کے دادا مولانا شاہ غلام علی پیرزادہ عرف
 میاں جی ہوئے۔ پیری مریدی کا یہ سلسلہ رشد و ہدایت انھیں پرستہ ہو گیا۔ ان کے جانشین
 مولانا سید اکرام علی افقر موبانی کے والد تھے۔ یہ ۱۸۴۵ء میں موبان میں پیدا ہوئے انھوں
 نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والدین حضرت میاں جی سے پائی۔ وہ چاہے
 ترسبادہ نشینی جادوی رکھتے، لیکن انھوں نے یہ سلسلہ بیعت قائم نہیں رکھا اور خود
 بدعاجی حادث علی شاہ، دیوبند (ف ۱۹۰۵ء) کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

وفیات

انہوں نے قصبہ موہان اور قرب وجوار کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں پنجو ریں انتقال فرماوا اور وہیں مدفون ہیں۔ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص تھا۔ انفرادی حساب سے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا کلام دیوان کی شکل میں مرتب نہ ہو سکا۔ صرف کچھ اوراق میرے پاس موجود ہیں۔

انفصاریہ کہ انہوں نے خود بھی اطلاع دی تھی ۳۱ جولائی ۱۸۸۷ء کو اپنے وطن مالوہ بھاؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے محمد حسین کے علاوہ ان کا تاریخی نام "ظفر وادھ" بھی رکھا جس سے ۱۸۸۷ء برآمد ہوتے ہیں، ان کے بچے مختلف معاصرین آخوندک انہیں اسی تاریخی نام سے پکارتے رہے۔ انفرکی انہیں بال قصبہ آسیون (ضلع انارک) میں تھی چنانچہ ان کی ابتدائی تعلیم یہیں اپنے ماموں مولانا ضیاء الدین قادری کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے بعد یہ موہان آگئے اور اب دینیات اور دوسرے علوم رسمہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ انھوں نے مقامی اردو مڈل اسکول سے ۱۹۰۱ء میں بھر ۱۳ سال بٹل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں وہ مستقل لکھنؤ چلے آئے یہاں انھوں نے حکیم عبدالعزیز (بھوٹالی ٹولہ) سے طب کی تعلیم پائی، لیکن انھوں نے کبھی باقاعدہ مطلب نہیں کیا۔ جب فکر معاش ہوئی، تو ۱۹۰۷ء میں مطبع نوکشور میں مصحح مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک رہا۔ کئی سال بعد میرکاری ملازمت مل گئی اور وہ کورٹ آف وارڈس میں ضلعدار مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد تحصیل میں ناظر اور واصل باقی نوے برس کے عہدوں پر بھی رہے، ان کا زیادہ تر طمانہ لمبے آباد (ضلع لکھنؤ) میں گذرا۔

انفر ۱۹۱۲ء میں بھٹی چلے گئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ وہاں کے ایک سیٹھ حاجی منشی محمد حسین لکھنؤ آئے جب وہ مطبع نوکشور گئے، تو یہاں ان کی ملاقات انفر سے ہوئی۔ منشی محمد حسین کا ایک ہفتہ وار پرچہ "مفید و مذکا" تھا، وہ اس کے لیے کسی

وفیات

ایڈیٹر کی تلاش میں تھے۔ جب وہ انقرہ صاحب سے ملے تو انھیں بہٹی آنے اور وفیدہ پنگر کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ فقر نے اسے قبول کر لیا اور اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ ہو کر بمبئی چلے گئے۔ یہاں وہ مئی برس ۱۹۱۵ء تک رہے بعد رزگار کے ایڈیٹر تھے جی۔ منشی محمد حسین کے ایما پر انھوں نے ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پانچ بھی جاری کیا۔ لیکن بہٹی کی مطالبہ آج وہ انھیں اس نہیں آتی، اب وہ اکثر بنیاد رہنے لگے تھے۔ بالآخر انھوں نے تنگ آ کر ان صحافتی سرگرمیوں پر ملازمتی اور لکھنؤ کی راہ لی۔ اس سے معاش کا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے مطبعہ لکھنؤ کے قنصلین نے دستگیری کی اور یہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں وہ ڈسٹرکٹ گزٹ کے مدیر ہو کر گوندہ چلے گئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کا زمانہ تھا، ان دونوں کے خلاف حکومت کے پراگندہ کی شین نیزی سے کام کر رہی تھی، اور اس کام کے لیے سب ضلعوں سے گزٹ خالص ہونے لگے تھے۔ گوندہ گزٹ بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ گزٹ بند ہو گیا اور انقرہ صاحب لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں ان کا لطبا دادا دلے دے کے لکھنؤ چھاپہ خانہ تھا، اب کے انھیں صحافتی تجربے کے پیش نظر روزانہ اور ۵ اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

اس زمانے میں سید جالب دہلوی (فوجی ۱۹۳۰ء) لکھنؤ میں سیدم اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ انقرہ صاحب سے ان کے دید و دید کے تعلقات تھے۔ جالب کے مشورے سے انھوں نے ماہنامہ جام جہاں نما جاری کیا، اس کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۴ء میں نکلا تھا۔ اس میں لکھنؤی اسلوب بیان اور طرز سخن پر بڑی کڑی تنقید نثار ہوئی جس سے یہاں کے شعرا طلباء اٹھے اور انھوں نے فقر کے خلاف باقاعدہ مجاز بنالیا۔ انھوں نے ان کے نام لکھنے سے فائدہ سمجھ کر عزیز اردو، بیحد موبالی، اسی الدن، امید بھری

وغیرہ تو البتہ غیر جانبدار رہے، بقیہ تقریباً تمام بڑے اور چھوٹے شاعران کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن اصغر گوندوی، بچو دمودانی، اور انٹر لکھنوی جام جہاں نمل کے متعلق مضمون نگار تھے۔ جب لکھنوی شعر کی دھمکیاں میسوزا بت ہوئیں، تو متعدد حضرات نے تنگ عزت کے مقدمے دائر کر دیے۔ انقر نے ان کے ادچھے حلیوں کے آگے متحیاء نلنے سے انکار کر دیا اور ڈوٹ کر مقابلہ کیا؛ اور بالآخر مخالفوں کو ہر میدان میں شک اٹھانا پڑی۔ یہ پرچہ اپنی پوری آبن بان سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ اس کے مند ہو جانے کے بعد وہ پانچ چھ برس تک پڑھاتے رہے جہاں سے ۱۹۵۵ء میں سکے دوش ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں ان پر بدیش کی حکومت نے ان کا ایک سو دو پیہ مامز ادبی و ضیف مقرر کر دیا جو انھیں اپنی وفات تک ملتا رہا۔ توکل اور صبر و شکر انھیں ورثے میں لاتھا؛ اس لیے اس قلیل و جہر معاشرہ کہ باوجود انھوں نے کبھی شکایت کا اظہار نہیں کیا اپنے والد کی طرح وہ بھی حضرت وارث علی شاہ (دیوہ) کے مرید تھے۔ ان کے نام کے ساتھ وارثی کا اضافہ اگر مناسب سے تھا جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، انھیں معلوم ہو گا کہ وہ بالعموم ایک گبر و اتمد باندے رہتے تھے۔ یہ بھی وارثی گروہ کا امتیازی نشان ہے۔ ان کے کمرے میں عین پینک کے اوپر حضرت وارث علی شاہ کی ایک تصویر لگی رہتی تھی اگرچہ اس پر ایک پسہ پڑا رہتا تھا۔

انھوں نے اپنے پیر کی یاد ماننے کو ۱۹۵۵ء میں سالانہ طرحی مشاعرہ کی بنیاد رکھی؛ یہ مشاعرہ ایریل کو ہوا کرتا تھا۔ اسے وہ اپنی زندگی بھر باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مصرع طرح ہمیشہ ہرچ شمس سالم میں ہوتا اور قافیہ آستان۔ اس کے لیے وہ شاعروں کو دو عنوان دے دیتے تھے؛ اور ان شاعروں کے علاوہ اور کسی کو کلام پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

چونکہ وہ بہت کم درد رہنے لگے تھے اور کمزوری اور بے ہوشی بہت ہی تھی؛ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ اگرچہ

زیادہ دن جینے کے نہیں۔ چنانچہ آخری مشاعرے کے موقع پر انھوں نے اپنے احباب اور تلامذہ سے ان کے نام لے کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس مشاعرے کو آئندہ بھی جاری رکھیں۔ سالِ رواں کے مشاعرے میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ وہی ہوا۔

کبرسنی کا عالم تھا۔ ۸۴ برس کی عمر میں ہندستان کے معیارِ عمر کو دیکھنے ہوئے کم نہیں ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ بہت معذور ہو گئے۔ سالِ گذشتہ دوسرا حملہ ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب دنوں کے ہمارے ہیں، لیکن موت کا ہمارا قلبی دورہ ہوا۔ وہ ایک زمانے سے عللہ لاش لکھن (ہاموں بھانجے کی قبر کے موڑ پر) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ یہیں منگل کے دن ۲ نومبر، ۱۹۶۹ء/۱۲ رمضان ۱۳۹۱ء کو بعدِ مغرب انتقال ہوا۔ تدفین اگلے دن (۳ نومبر) بعدِ ظہر ہوئی۔ بمادِ جنازہ ان کے رشتے کے بھتیجے محمد اختر دارانی نے پڑھائی۔ پیش‌باش کے قبرستان میں قبر نصیب ہوئی۔

ابھی وہ نڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انھوں نے (۱۹۰۰ء) شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا شعر تھا:

دل غنی ہے تو مفلس کیا ہے

گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

یہ شعرا کے خاندان کے مذہبی ماحول کا ترجمان ہے جس نے ان میں یہ لکھنؤ آئے ہیں۔ حکیم ضامن علی جلال (ف ۱۹۰۰ء) اور منشی امیر اللہ تسلیم (ف مئی ۱۹۱۱ء) دو صاحبِ فن ساتھ موجود تھے۔ چونکہ فقر کو مومن (ف ۱۸۵۲ء) کے کلام کیسے شغف تھا، اس لیے انھوں نے تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ تسلیم خود نواب اصغر علی خان نسیم (ف ۱۸۷۶ء) کے شاگرد تھے جن کا مومن کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح فقر کا سلسلہ سخنِ تمبیری پشت میں مومن سے جالمتا ہے۔ اصغر گوندی (ف نومبر ۱۹۲۶ء) اور حسرت علی

دف ۱۹۵۰ء ان کے فواجہ تاش تھے۔ ۱۹۰۵ء کے آخر میں تسلیم کے شاگرد ہوئے؛
حسرت ان سے دو تین سال پہلے شاگرد ہو چکے تھے اور اصغر گوندوی دو تین سال بعد
آئے۔

ان کی کچھ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں: (۱) رسائل تصوف، پانچ حصے (لکھنؤ ۱۹۱۵ء)؛
(۲) حمید کی ڈالی (لکھنؤ ۱۹۱۷ء) (۳) سخی علی (نظمیں) (الہ آباد ۱۹۲۲ء)؛ (۴) مختصر
سوانح عمری حضرت حاجی دارت علی شاہ (لکھنؤ ۱۹۳۳ء)؛ (۵) فردوسِ معانی (بہارِ دیوان)
(لکھنؤ ۱۹۲۹ء)؛ (۶) رہنمائے شاعری حصہ اول (لکھنؤ ۱۹۶۰ء)؛ (۷) نظر گاہ (دوسرا
اتحالی دیوان) (لکھنؤ ۱۹۶۱ء)؛ (۸) رہنمائے شاعری حصہ دوم (لکھنؤ ۱۹۶۶ء) ان
میں سے دو کتابوں بنجر ۳ اور، پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپیہ انعام عطا
ہوئے۔ ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے جس سے ایک مجلد تیار ہو سکتا ہے۔ لہذا اگر
اس کے شائع ہونے کا امکان اب کم ہی ہے۔ دو زبانوں نے مصنف کی تقلید میں شاعری
اور دوستوں میں تقسیم کر دیا، اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے!

انقر کو زبان و بیان و عروض پر اہلِ قدرت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد
مک کے مختلف حصوں میں موجود ہے جن کی بدولت ان کا نام روشن رہیگا۔ گو کہ پور
یونیورسٹی کے شعبہ ادب کے استاد ڈاکٹر مسلام سندیلوی بھی ان کے شاگرد ہیں۔
جسائی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ محشر موہانی تھے۔ وہ طلب کے فارغ التحصیل تھے
اور طبیب کی حیثیت ہی سے ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ انقر
اس زمانے میں حج کو گئے مہوئے تھے، وہ ان کی غیر حاضری میں فوت ہوئے۔ انشاء اللہ
ان کی اولاد موجود ہے۔ ان کے علاوہ دولہا کمال شادی شدہ اپنے گھر والی موجود ہیں

سید عبد اللطیف (ڈاکٹر)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف بروز جمعہ ۶ صفر ۱۴۱۹ھ (۱۱ ستمبر ۱۹۹۹ء) کو کونول (تامل ناڈو) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہان گشت تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جہانیاں جہان گشت اثنا عشری امام دہم حضرت علی نقی (ف ۲۵۴) سے دسویں پشت میں تھے، لیکن فرشتہ سے قبل کی کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ملتا، نہ خود جہانیاں جہان گشت کے ملفوظات ہی میں کوئی اس طرح کا دعویٰ ہے۔ بعد کے مصنفوں نے فرشتہ کی تقلید کی ہے، لیکن ہر جگہ درمیانی کڑیوں کے ناموں میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ملتے ہیں۔ داتا گرامی اس خاندان کے جو فرد سب سے پہلے ہندوستان آئے، وہ مخدوم جہانیاں جہان گشت کے دادا سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ابن سید علی ابوالکویۃ تھے۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بخارا سے ہجرت آئے۔ یہاں سے ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہار الدین زکریا سے علوم باطنی کی تکمیل کی۔ ملتان سے اوجھ گئے۔ جو بہار پور سے ۲۸ میل دور دریائے ستلج اور جناب کے سنگم پر ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ یہ کسی زمانے میں بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ سید جلال سرخ بخاری کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوا۔ وہ اوجھ ہی میں مدفون ہیں۔

مخدوم جہانیاں جہان گشت بن سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاری کے حالات سے پہلی ول کے پختے روشن ہیں۔ وہ صاحبِ علم و قلم اور برگزیدہ مولوی تھے۔ ان کا بعمر ۷۰ سال چار شنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۸۵۷ھ (۲۳ فروری ۱۴۳۸ء) کو اوجھ ہی میں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

اس خاندان نے ہر دور میں صوفیہ کوام اور علمائے عظام پیدا کیے ہیں۔ ان کی ایک

شاخ کونول میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اسی کونولی خاں دادے کے چشم وچشم تھے۔ ان کے والد شاہ حسین انجینیئر وہاں کے مشہور عالم و صوفی تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں کونول میں رحلت کی اور خاندانی ہڑوار میں اپنے جدِ علی حضرت شاہ عبداللطیف قادری عوف یا ہرپادشاہ دت (۱۶۷۵ء) کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے بارہویں سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مقامی ہائی اسکول میں بھیج دیے گئے، یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ اس سے فارغ ہو کر علیٰ تعلیم کے لیے مداس کرسچین کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ان کے والد سید شاہ حسین ان کے کرسچین کالج میں داخلے کے خلاف تھے۔ وہ ٹھہرے پرانی وضع کے غمہ ہی آدمی انھیں اندیشہ ہوا کہ بڑا زیادہ انگریزی پڑھ کر گمراہ اور بیدین ہو جائیگا۔ لیکن سید عبداللطیف نے یہ برجستہ جواب دے کر انھیں قائل کر دیا کہ اباجان! میں تو انگریزوں کے لیے سکھینا چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے قرآن اور اسلام کی مقدس تعلیمات کو مغربی ممالک میں عام کر سکوں۔ انھوں نے بچپن کے اس وعدے کو آخر میں پورا کر دکھایا۔ کالج میں ان کا خاص تھمون اصولی متعین ادبیات اور تاریخ تھنیم ادبیات انگریزی تھا اور اس میں وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں سے اول نمائے تھے۔

اس زمانے میں نواب بگین پٹی کے بھائی میر اسد علی خان مرکزی مجلس واضح تواریخ کے رکن تھے۔ ان کی وساطت سے سید عبداللطیف صاحب، سید نواب علی چودھری سے ملے اور ان کے ذاتی سکریٹری مقرر ہو گئے۔ چونکہ سید نواب علی بھی مجلس مذکورہ کے رکن تھے، اس سے ان کا قیام اکثر دہلی میں رہتا تھا اور ان کے ہاں ملک کے علماء کی آمد

وفیات

رفت تھی۔ اس طرح سید عبداللطیف کا ان سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں سربراہیم رحمت اللہ (جسٹس) تھے۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں مہارت سے خاص طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد جب انھوں نے بمبئی کے مصافحات میں پنج گنی کے پہاڑی مقام پر مشمول طبقے کے طلبہ کے لیے ایک پبلک اسکول قائم کیا، تو انھوں نے اس کی پرنسپل کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دی۔ وہ وہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ یونیورسٹی کے مختلف معزین کے جانا اسسٹنٹ پروفیسروں کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ ہر ایک کو تین سال کی تعلیم عطا دی جائے، جس کے دوران میں انھیں نصف نغذہ شیگی، مزید برآں ہر ایک کو خرچہ کے لیے تین ہزار روپیہ قرض بھی دیا جائے جس پر ان سے سود نہیں لیا جائیگا۔ انگریزی کے شعبے سے ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا ان کے علاوہ خلیفہ عبدالکیم اور پروفیسر وحید الرحمن کا انتخاب ہوا تھا، خیال تھا کہ یہ بی اے آنرز (انگریزی) میں داخلہ لیں لیکن یہ پیش آئی کہ ریاست کے نائبہ مقررہ مقام انگلستان نے اطلاع دی

کہ تمام جگہیں پر ہو چکی ہیں، لہذا احوال داخلہ ممکن نہیں؛ اگلے برس یعنی ۱۹۲۳ء میں داخلہ ہو سکیگا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار سید شاہ حسین حسینی بہت سخت بیمار تھے اور حالت تشویش تک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ولایت کا داخلہ ایک برس کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، تو بالوسی کا اظہار تو درکنار انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ جلد، بلا ٹلی — اب میں کیونٹی سے والد کی خدمت اور تیمارداری کو سنبھالوں گا۔ لیکن جب ان کے والد کو صورت حال کی اطلاع ملی، تو انھوں نے سخت مخالفت کی اور اصرار کیا کہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ تم انگلستان جاؤ اور لندن یا آکسفورڈ

یونیورسٹیوں کے اصحاب ہمارے لو، وہ لہذا تمہارے داخلے کی کوئی ذکوئی نہیں نکال
لیٹنگے، اور انہوں نے مزید کہا کہ بھکر رہو، تمہاری داسی تک مجھے موت نہیں آئے گی
اس حکم کے آگے انہیں سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور یہ انگلستان چلے گئے۔

انگلستان میں وہ کنکر کالج (کنکر یونیورسٹی) کے صدر شعبہ انگریزی پروفیسر سرازر نیل
کولانز کے سامنے پیش ہوئے۔ سرازر نیل اور ان کے ساتھی پروفیسر عبداللطیف صاحب
کی انگریزی میں مہارت اور انگریزی ادب پر عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے
پوچھا، آپ ہی اسے (آنر) میں داخلے کی جگہ ایم اے یا پی ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری
کیوں نہیں کرتے؟ بھلا انہیں کیا خدہ ہو سکتا تھا! چنانچہ یہ براہ راست پی ایچ ڈی
کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: انگریزی ادب کے اثبات اور ادب
پر، اہل اس کی تیاری اور پیش کرنے کی معادمتین برس مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کے شروع
کی بات ہے۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں
کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شمولیت
کے لیے انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے پنا ایک ایک نمائندہ بھیجا، لیکن لندن
یونیورسٹی نے سرازر نیل گولانز کی سفارش پر دو نمائندے بھیجنے کی منظوری دی: ایک
وہ خود اور دوسرے سید عبداللطیف سال آئندہ ہندو صرفت و سیرج اسکا رتھے اور
پروفیسر نہیں بنے تھے۔ اسے اذعانہ ہو سکتا ہے کہ سرازر نیل کدلی میں ان کی کتنی
دقت تھی، اوردہ ان کی قابلیت کے کس درجہ قائل تھے۔ اسی سفر میں انہوں نے امریکا
اور نیل یونیورسٹیوں کا امریکا میں اور میک گل کینیڈا میں دورہ کیا۔

امریکا سے واپسی پر سرازر نیل نے ان سے کہا کہ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے
ہیں؟ تین سال کی قید و عام حالات میں ہے۔ مقابلے کے لیے آپ کا مواد جمع ہونے ہو،

وفیات

تو آپ اسے بھیجا کہ قلعہ کو دیکھیے، ہم آپ کا مقدار دو ہی سال میں لینے کو تیار ہیں اس پر انھوں نے دو مہینے کی نصحت لی اور شمالی کاسٹ لینڈ کے شہر سٹوٹھریفر چلے گئے۔ وہاں ٹیٹمر کرائفوں نے ایک مختصر نوٹس کی مدد سے مقالہ لکھ لیا اور لندن واپس آکر اسے پیش کر دیا۔ لیکن سالانہ جلسہ تقسیم اسٹاڈ (کافوڈکیشن) کا زمانہ ابھی دور تھا۔ بارے سربراہیل کی دس سلطنت اور اثر و رسوخ سے یہ اہم بھی سر ہو گئی، ایک غیر معمولی کافوڈکیشن کا انتظام کیا گیا جس میں انھیں مدد عطا کی گئی (۱۹۲۴ء) یوں یہ زمین برسوں بعد دوسری بری میں لپٹا کام مکمل کر کے حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔

جب یہ انجمن تان گئے ہیں تو یونیورسٹی نفاذ سے بھی ایک معاہدے پر دستخط کرانے تھے کہ واپسی پر کم از کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازمت کو پیگ، سیریزان کی خواہاں کالیک صد خرچ میں مبرا کوئے کو کاٹا جائیگا۔ چنانچہ واپس حیدر آباد پہنچے تو یہاں ۵۰۰ -

روپے کے خرید میں پر و فیہ مقرر ہو گئے۔ یونیورسٹی دس برس پورے ہوئے، انھوں نے درخواست دی کہ کچھ ملازمت سے مسکود رہش کو دیا جائے۔ انھوں نے کچھ کر میرا ارادہ مزید ملازمت کرنے کا نہیں ہیں کیونسی سے کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری سرت آئی درخواست ہج کوڈیشن حکم از کم تین صرمد ہو کہ شریفانہ بسر اوقات کے لئے کفایت کر سکے تاکہ معاشی کی تفریح میرے علمی کام کے رستے میں حاصل نہ ہو۔ یونیورسٹی کے اصحاب مجاز نے یہ درخواست منظور

کولی۔ اولاً انھوں نے پوری خواہ پر ایک سال کی خدمت منظور کی، پھر ملازمت کے

میں پانچ برس کا اضافہ کیا، تاکہ ڈکشن کی رقم کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے بھی بیش دو ڈا سو امان سے متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ جب یہ حالات نظام مروج میر عثمان علی خان (دو فردی ۱۹۶۷ء) کے علم میں آئے تو انھوں نے حکم دیا کہ چونکہ ڈاکٹر سعید عبداللطیف کا ملازمت

سے دست بردار ہونے سے متعاذت علم ہے اس کی قدر کرنا چاہیئے پس ان کیلئے پوری پانچ سو امان کی بیش منظور کی جاتی ہے (جو عام حالات میں پچیس سالہ ملازمت کے

انتظام پر دی جاتی ہے،

ترک ملازمت کے بعد ۱۹۳۷ء میں انھوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نوا برا
(ممبر ف) جاری کیا۔ اور اس زمانہ میں نظام دکن لندن کی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ضلع
کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دیں اور یہ آباد میں اطلاعات نافذ کریں، جس سے
لوگوں کو ریاست کے نظم و نسق میں شریک کیا جاسکے۔ ۱۹۳۰ء میں نظام کو یہ مشورہ کوئی
مرد قلند ہی دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب ان کے خلوص کے قائل تھے، اس لیے اگرچہ
کسی نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا لیکن ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی۔
ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہم نہیں تھیں، اگرچہ وہ درمی بکسر ذہنی اور نظریاتی سطح
پر کیونکہ انھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو تھے وہے میں جاری رہا
ضنا بڑی بوجھان خیز تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ملک کی آزادی
کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن حس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھے یہ سب کچھ
سے محلو خلاصی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر
دو سالے انگریزی میں اقلیت کیے تھے: دو، مسلم پیرن انڈیا ہندستان میں اسلامی
کلچر اور دھرم، ڈفرنٹ کلچرل نڈوان انڈیا ہندستان میں مختلف کلچرل خطے، انھوں نے
ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا تھا، بعد کو اسے ایک باقاعدہ اسکیم کی شکل دی ہوئی
جس کی رو سے ہندستان کا دستور وفاق قرار پایا تھا۔ ہر ایک وفاق خطے کے لیے پوری
اغرونی اداوی کی سفارش تھی، مرکوز میں صرف دفاع، اسود خارجہ، تجارت و درآمد
پر اعداد و موصلات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے، جو خوب اختیارات بھی دیتا تھا
خطوں کو تفویض کیے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی خاصے مورد و
مقبول ہو گئے، بلکہ جناح صاحب ان پر بہت اعتماد کرنے لگے۔ مسلم لیگ نے کسی زمانے
میں عبداللہ اردن کی صدارت میں ایک فائن کمیٹی بنائی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ

وفیات

سلم بیگ کے نظر پنے کے مطابق پاکستان اسلیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی اس کمیٹی کے رکن تھے (دوسرے اسلیم غلام رسول، مرزا رضوان اللہ، ڈاکٹر افضل حسین قادری، پیر علی محمد راستہ دی تھے)

اپنی وفاقی اسلیم کے متعلق ان کی فریقین کے رہائے خط و کتابت رہی۔ بالآخر کانڈہی جی نے سرسرد جی نائیڈو کی وساطت سے انھیں بی بی آنے اور کانگریس اور گج کیٹی کے ایکس سے ملنے کی دعوت دی۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ اس پر یہ بی بی پنچے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے شب ۸ اگست کے جس جلسے میں ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور کی تھی (اور جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے اخبار صراط کے پہلے ہی صفحے میں کیا ہے) ڈاکٹر سید عبداللطیف نہ صرف اس میں موجود تھے بلکہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ شہنشین پر بھی تھے۔ اسی رات کے بعد علی احتیاج: سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ اگر مسلم لیگ یا ہندی نواب بھی گفت و شنید کا روادہ کھلا تھا، لیکن سرطرح (۲۸ ستمبر ۱۹۴۲ء) نے جو روئے نیا لیا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اس سے اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد نظربانی اور ذہنی سطح پر بھی کل ہند صحابیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب انھوں نے اپنی ناک توجہ حیدرآباد کے مسائل پر مرکوز کر دی، اسی مقدمہ سے انھوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک اور انگریزی ہفتہ وار کیلبر (Clarion) نام کا کھلا یہ پرچہ تین برس تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۹۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجلس اتحاد المسلمین اور مولوی قاسم رضوی (د ف جنوری ۱۹۴۰ء) کی عاقبت نااندیشی کے باعث حیدرآباد کی فضا بہت کدو رہ رہی تھی۔ رہی ہی کسٹری لائی علی (۲۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء) کی وزارت خطی نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح حیدرآباد کے قائدوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ وہ جب

رہے پر جا رہے ہیں، وہ تباہی کے غارتگر ہیں جتنا ہے جس سے ریاست حیدر آباد اور نظام دکن دونوں لیا میٹ ہو جائینگے۔ لیکن رضوی تقار خاں نے طیفی طوطی کی صدا کسی نے نہ سنی۔ نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اور اسی کی پیشگوئی انھوں نے کیہ جن کے آخری شمارے کے ادارے میں کی تھی۔

حیدر آباد کے انصاف کے مجددہ اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک لطیفہ غیبی کے نتیجے میں انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال پھر دن سکون اور آرام کے لیے پنج گنی چلے گئے۔ وہاں سے واپس حیدر آباد آئے۔ تو ان کے من کو زوں سے ایک دندہ پیچا کہ وہ آئیں اور عثمانیہ کالج، کولوں کی ہسپتال سمجھالیں۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں یہاں کا انتظام اہل سقا اور مضیقین کو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ چشم بد دور کالج بند ہو جائیگا۔ وفد کے اراکین ان کے ملنے والے تھے اور مقصد نیک ان کے اصرار کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک درباری اس کالج کے پرنسپل رہے۔ جب ایک معقول جانشین کا انتظام ہو گیا۔ تو مستعفی ہو کر حیدر آباد چلے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں کونوں سے واپسی کے بعد انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر انسٹی ٹیوٹ آف انڈیولوجی اور ایتھنولوجی اسٹڈیز، اکادمی آف اسلامک سٹڈیز کی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد کی وساطت اور سفارش پر انھیں اس کام کے لیے مرکوزی ادارہ آف ہرا پر دیش حکومت نے مالی امداد بھی دی۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے تقریباً ۴۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے مجددہ مولانا آزاد کے بہت قریب آگئے، اگرچہ وہ انھیں آزادی ملک سے بہت پہلے سے اچھی طرح جانتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے شاہکار ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں اور اس کیلئے انھیں دعوت

وفیات

دی کہ وہ ان کے پاس آکر دلی میں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا بیشتر زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ جس دن مولانا کی رحلت ہوئی ہے وہ یہیں کوٹھی میں موجود تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات مولانا آزاد کی کہ وہاں ہوئی۔ میں ۱۹۵۴ء میں مصر سے آیا، تو حسب معمول مولانا کی خدمت میں بھی سلام کو حاضر ہوا۔ مجھے اس بات کا فہم حاصل ہے کہ وہ خود ہمیں دوسرے یاد فرما سیتے تھے۔ ان کے سکرٹری محمد اعلیٰ خان مرحوم مجھے ٹیلیفون سے مطلع کر دیتے کہ کل صبح آجائیے، وقت دہی فجر سے پہلے کا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا اور دو تین گھنٹے مختلف موضوعات پر خوب گپ رہتی۔ بالعموم ناشتے کے بعد میں اجازت لیتا کہ اب ان کی دوسری شخصی مصروفیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن رخصت ہو رہا تھا، مولانا آزاد ہمیں ساتھ کر کے کدو دانے تک آتے۔ وہ عازر کھولا، تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گزر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا۔ اس پر مولانا نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ امک رام صاحب کو جانتے ہونگے! انھوں نے جواب نفی میں دیا۔ مولانا نے تعارف کرایا اور واپس کمرے میں چلے گئے، اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

ایک دن کہنے لگے، میں تو خود آپ کی تلاش میں تھا۔ بات یہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب 'مہرت اور اسلامی تعلیم' کا انگریزی ترجمہ اپنے انٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کروں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا، بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا! میں نے ہامی بھر لی۔ اس پر انھوں نے جناب عبدالعلی سے اس کا ترجمہ کروایا اور دوسرا ان 'اسلام' کے عنوان سے اپنے انٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر دیا (حیدر آباد ۱۹۵۹ء)۔ ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں ان کے مکان پر حیدر آباد میں ہوئی۔ میں غالب صدیقی تو ریات میں شرکت کے لیے جناب عابد علی خان کا ملایا ہوا گیا تھا۔ مگر

وفیات

قیام بھی مختصر صرت وہی دن کا تھا، لیکن ناممکن تھا کہ ابن طہطاہی چنانچہ ایک دوست کے عہد حاضر ہوا۔ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس موقع پر ایک لطیف ہو گیا۔ بلنے کیسے دکن کی قوموں کا ذکر پھر دگیا۔ میں نے کہا یہ لوگ تو اناڑی ہیں۔ وہ لہذا چونکے اور دریافت کیا کہ کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے تو انھوں نے یہاں کی غیر آریہ اقوام کو (اُن - آریہ) کہنا شروع کیا، جس سے رفتہ رفتہ لفظ نایراد نیرتہ بنے۔ اورد والوں نے ہی کو بھاء کہنا اناڑی بنالیا اور مٹی اس کے ہوئے، وہ شخص جو کسی خاص فن میں ذائقہ نہ ہو۔ سنس پڑے اور کہا آپ کی باتج کی واد دیتا ہوں، لیکن خیال رکھیے، کوئی سن نہ لے۔

انسوس کو مولانا آزاد کی مدنی یہ وہ ترجمان القرآن کا ترجمہ مکمل نہ کر سیکے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور البقرہ کے متین اور حاشی کا ترجمہ وہ کو چلے تھے کہ مولانا چلے بیٹھے۔ یہ حصہ انھوں نے دیکھ لیا تھا اور اس پر صاف کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کام اس کے بعد بھی جاری رکھا اور اسے ۱۹۶۱ء میں تین جلدوں میں نکال کر لیا۔ ان میں سے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور تیسری زیر طبع ہے۔

ترجمان القرآن صرت پہلے بابادوں کے ترجمے اور غنیمی حاشی پر مشتمل ہے، مولانا ایسے مکمل کو ہی نہیں سکے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب اسے انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، تو انھیں اپنا وہ وعدہ یاد آیا جو انھوں نے تعلیم کے آغاز میں اپنے والد سے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے غور کم کر لیا کہ جس طرح مٹی ہو پورے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر دینا چاہیے۔ ان کے ہندوستانی اور لاد پی دوستوں نے بھی ان سے اس کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر بقیہ ۱۲ بابوں کے ترجمے کے ترجمے کا اصاد بھیاد۔ اسے بھی شائع کر دیا تجھے میں اس کا اصول یہ تھا کہ اصلی تین کی روح نمایاں ہو، نہ کہ محض مرادفات الفاظ دکھ دیے جائیں۔ ان کا ترجمہ سب کے سامنے ہے، اور صاحب نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں

نک اس میں کامیاب رہے ہیں
اوپر جن کتبوں کا ذکر ہوا ہے ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ممکن
فہرست درج ذیل ہے۔

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1924)
2. Ghali - A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1927)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue - Plan of Federal Constitution of India. Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India - edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1937)
11. Prophecy of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought - A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1958)
14. Bases of Islamic Culture (1959)
15. Madras University Lectures : Principles of Islamic Culture (1961)
16. Was the Prophet of Islam Unlettered ? (1964)
17. The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)
18. The Call of the Quran (1966)
19. Faith and Action — The Quranic View (1967)
20. The Unity of Man — The Quranic View (1968)
21. Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad—a rendering into English in three volumes Vol. I (1962). Vol II (1967). Vol. III under print)
22. Al-Quran rendered into English (1969)
23. The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)

ان میں سے نمبر ۱، ۲، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔

اردو دان معلقوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہیگا، جو انہوں نے

غالب کے عز ان سے انگریزی میں لکھا تھا (حیدر آباد ۱۹۱۲ء) بعد کو اس کا سید محمد علی
 زمینی لکھا ہوا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا (حیدر آباد ۱۹۳۲ء)۔ یہ صحیح معنی میں مطالعہ
 غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کوئی
 نکتہ چینی کی۔ اردو میں غیر جانبدارانہ اور عروسی تنقید کا یوں بھی نقد ان تھا اور بدقسمت
 سے اب تک ہے، اور غالب سے متعلق مبالغہ آمیز خیالات تو ہمارے ذہنوں پر بطرح
 مسلط تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری (دست و مہر ۱۹۱۸ء) نے اس سلسلے میں کچھ ایسے
 بلند بانگ دعوادی کیے تھے کہ جو سمجھے وہ بھی اور جو نہ سمجھے وہ بھی گنگ ہو کر رہ گئے۔
 ڈاکٹر بخوری کے مطالعے اور وحدت نظر اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی ذہانت سے
 انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ "محاسن کلام غالب" بن انھوں نے غالب
 سے زیادہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس مضمون پر نظر ثانی بھی
 نہیں کر سکے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے تو ان میں
 توازن آجاتا اور وہ غالب کی حقیقی عظمت پر عبور رکھتے اور اسے ہم سے قابل قبول
 طریقے پر روشناس کراتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی محقر کتاب غالب میں اسی افراط و
 تفریط میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دوسری کام کو شیش ظالم کے
 اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ ان کے لیے انھوں نے سر اکبر حیدری کی دوستی
 سے نسخہ حمید یہ کی اصل یعنی نسخہ بھوپال حاصل کیا اور پورے کلام کو مرتبہ کو کے بجا پانا
 شروع کر دیا۔ اس کے ۱۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس طبع میں جہاں یہ چھپ
 رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطلوبہ کاغذات اور ان کا تیار کردہ اصلی نسخہ بھی جل کر رہ گئے
 ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس افونٹ کا کھاد شے کے بعد دوبارہ ایسے مرتبہ کرنے کی گنجش
 ہمت نہیں تھی! یوں یہ مفید کام ادھور اڑ گیا۔ خوش قسمتی سے مطلوبہ تھے کے نسخے
 کسی ملج تکین کاظمی مرحوم دست ۱۹۶۱ء کے ہاتھ لگ گئے تھے جو انھوں نے مولانا

وفیات

علی خان عشی کو بھیج دیے اور انھوں نے دیوان کا نسخہ عرش مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہر حال الفضل المتقدم کے اصول کے مطابق ڈاکٹر لطیف ہمارے شکر کے مستحق ہیں کہ دیوان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول و تب کو دیے جس سے ان کے پسروں کو روشنی ملی اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی ان ہی علمی خدمات کے اعتراف میں ابھی ہمارا سال پانچواں مہینہ (۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء) کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔

پانچ چار سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ پہلے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ بائیں آنکھ پر عمل کرنا ہی ناکام رہا اور بائیں آنکھ بالکل بیکار ہو کر رہ گئی۔ دوسری کی بینائی بھی بہت کم تھی اور وہ مدد کے بغیر پلے پھرنے لگتا۔ جو کچھ دیکھتا۔ اس کے اوجو انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔ قرآن کا ترجمہ انھوں نے اسی زمانے میں مکمل کیا۔ پہلے اٹھارہ پاروں کے متن کا ترجمہ تو ترجمان القرآن کے ساتھ پورا ہو ہی چکا تھا، اب انہیں کے لیے باقی بارہ پاروں کا ترجمہ درکار تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے اگرچہ اس کے حوت شناس ضرور تھے۔ انھوں نے طریقہ کاریہ اختیار کیا کہ تین چار معادن ساتھ لیے۔ ایک قرآن کی آیت پڑھتا، دوسرا اس کے مختلف ترجمے (اردو۔ فارسی۔ انگریزی) پڑھتا، کبھی کبھی وضاحت کے لیے بعض اہم تفسیروں کا متعلقہ حصہ بھی پڑھا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا ترجمہ لکھوا دیتے، جو ان کے نزدیک اصل کی روح کے قریب ترین تھا۔ وہ ترجمے سے زیادہ ترجمانی کے قائل تھے۔ اگر کوئی موجودہ ترجمہ یا ترکیب ان کے معیار پر پوری اترتی تو انھیں ان معنوں کو لفظ بلفظ اپنے ہاں لے لینے میں کسی عار نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اصلی مقصود یہ تھا کہ ایک اور مطالعہ کے قاری کی سمجھ میں آجائے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔

ودیات

پچھلے سال ڈیڑھ سے انھیں حلق کے کینسر کی شکایت تھی۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن اب خوراک تک گلے سے نہیں اترتی تھی۔ سیال چیزوں پر کوئی کہاں تک جی سکتا ہے جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب آخری مرحلہ بہت دور نہیں ہے، تو پھر ماہ قبل انھوں نے کونول میں اپنے جیو علیٰ حضرت سید عبد اللطیف یا ہوادشاہ کے مزار کے جوار میں اپنی قبر کھدائی، گھس نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی ساری عمر حیدر آباد میں بسر ہوئی، یہاں کے بھی آپ پر حقوق ہیں، آپ نے کونول کو حیدر آباد پر ترجیح کیوں دی، تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

افلک باندہ ایم، یارب نیک بودہ ایم
بار آجا میر دیم خواہ کہ آن شہراست

اپنی بیماری کے آخری ایام میں وفات سے کوئی ایک مہینہ پہلے انھوں نے ڈاکٹر سید عبد اللطیف قرآنک امینڈ آف کچرل اسٹڈیز ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا، جس میں صرف تین چار مسطرک ہیں:

ملکہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف ولد حضرت سید شاہ حسین صاحب مرحوم عمر ۸۰ سال، پیشہ وظیفہ باب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ساکن ۷۴ آغا پورہ حیدر آباد بہ نسبت ہوش و دواس، اُس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر مجھے قرآنی اور دیگر مذہبی امور سے بہ، ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کرنا ہوں اور اپنی تمام مکتبوں کے حق تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالہ کیا ہوں۔

اس کے خواجہات کے لیے میں برابر دیر کا عطیہ بھی اپنی جیب سے دیا اور اپنی جملہ تصنیفات کا حق اشاعت بھی ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر سید محمد اقبال مرحوم کس زمانے میں ایک ادارہ اسلامیات کے لیے قائم کرنا چاہتے تھے، اور جیسا کہ پودھی محمد شفیع (م۔ش) نے ڈاکٹر سید عبد اللطیف کو ایک خط میں لکھا تھا، اقبال مرحوم اس کی

وفیات

صدارت کیلئے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دینے والے تھے۔ ادارے کی تاسیس سے قبل اقبال رحلت فرمائے۔ بہر حال ان کے کام کی تکمیل ڈاکٹر عبداللطیف نے کر دی۔ اپنا زندگی میں بھی ادارہ کے ذریعے سے اور مرنے کے بعد کے لیے یہ 'فرآنی ٹریسٹ' قائم کر کے۔ خدا بخیرے اس کے کارکنوں کو اسی خلوص اور تندہی سے کام کی توفیق ملے، جو اللہ دونوں مرحوموں کی خواہش تھی۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۶۱ء رمضان ۱۳۹۱ھ) ساڑھے پانچ بجے صبح اپنی قیام گاہ پر جان حان آفرید کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخری لمحے تک بجا رہے، بلکہ ان کے ارد گرد لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے؛ انھوں نے خود کہا کہ اب کوئی سورۃ یسین کی تلاوت کرے؛ اور اس کے بعد پورے مکان سے اپنے سائل حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

للاہلوت ہم سے۔ لیکن ان کی اولاد معنوی اتنی ہے، بالخصوص ان کا انگریزی ترجمہ قرآن کہ اس سے مستفیض ہونے والے ہمیشہ انھیں دعا سے خیر سے یاد رکھیں گے۔ اسی دن یعنی ۲ نومبر سپر کورم بچہ معطر جانی، رکیٹ کی مسجد الاکنہ میں نماز جنازہ ہوئی، جس کی امامت مولانا ابوالوفائے لکھی۔ اس کے بعد میت بکری لکھی، جہاں ان کی وصیت کے مطابق اگلے دن ۵ نومبر بعد نماز جمعہ عقیقہ میں آئی۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ

مہر، مولانا غلام رسول

۱۶ نومبر ۱۹۶۱ء کو مولانا غلام رسول مہر کا حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

نئی نسل کے خصوصاً وہ لوگ جو آج پچیس کے پچیس میں ہیں، انھوں نے یہ ایک سطری خبر پڑھی یا سن لی ہوگی۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول تہر کون تھے اور انھوں نے اردو

محانت کی نصیبی اور علم و ادب کی شہرت کی خبر ہو گئی تھی !

مولانا غلام رسول ہر ۱۲ ہجری ۱۸۹۷ء کو جالندھر سے کوئی چار میل دور، ایک چھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک اور گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلے لیا یہاں انھوں نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اب وہ لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کیا۔ وہ اہل انٹر کے درجے میں تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ء میں اپنا مشہور آفاق ہفتہ وار اہلال کلکتہ سے جاری کیا۔ ہر صاحب اس سے پہلے شعر کہنے لگے تھے اور مذہبی اور سیاسی مطالبے میں خاص طور پر یکتائی کیستے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اہلال کے خریدار بن گئے اور یہ پوچھ مسلسل ان کے مطالبے میں رہنے لگا۔

مولانا آزاد نے اہلال کے ذریعے سے ملک کی عام سیاسی بیداری میں عموماً اور مسلمانان ہند کی تاریخ میں خصوصاً جو اہم روں کو اکٹھا کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی کا جو سبق دیا تھا۔ وہ اس وقت تک اس ملک میں اسلامی سیاست کا اصل اصول بننا ہوا تھا۔ اس کے خلاف پہلی آواز مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند کی۔ ان کا اسلوب تحریر اور اپنے نظریات کی تائید میں قدم قدم پر نقل و حرکت سے استدلال ایسا برجستہ اور بدیع تھا کہ اس نے گویا ہنگامہ لگادی۔ فوجانہ طبقہ اہلال پر دیوانہ وار زہرینہ ہو گیا۔ غلام رسول ہر بھی اہلال اور صاحب اہلال کے والدین شہید بن گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی تعمیر کے لیے ایک جماعت حزب اللہ بنائی تھی اور اس کے اور اکیں کی تربیت کے لیے دارالارشاد قائم کیا تھا۔ غلام رسول ہر بھی جو شہید اور دارالارشاد کے رکن بن گئے۔ ان تمام اراکین کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ ہر صاحب نے مولانا آزاد سے جو قتل اپنی نوجوانی میں قائم کیا تھا، اسے اپنے آخری دم تک نباہا۔ اس دوران میں کیسے کیسے سیاسی زلزلے اور تقریباتی جھلکے نہیں ہوئے لیکن

وفیات

ان کے پاسے ارادت بھی نہیں ڈھنگا تے۔ وہ مولانا کے عاشق تھے اور بھی ان کا نام حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ کے اخافے کے بغیر نہیں لیتے تھے۔

ہر صاحب لے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کر لیا، تو انھیں حیدر آباد (دکن) میں ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں پایگاہ و فارانامہ اریس انسپکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اتحادی قوتوں کا ترکی کے حالات مدعیہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت تشویش کا باعث رہا تھا۔ ہر صاحب نے حیدرآباد کے بعض دوستوں کے مشورے سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، "دسلطنت" اس کا نام تجویز ہوا اور انھوں نے اجراء کے لیے درخواست دے دی۔

اوپر مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ چونکہ بہادر علی شاہ بدیشی دوسری صوبائی حکومتیں پہلے سے ان کے اپنے ہاں داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں، اور سب راستے مسدود یا کڑوا دیے گئے اور تین چار مہینے بعد ہمیں ان کی نظر بندی کا حکم صادر ہو گیا۔ ان کے کلکتے سے نکلنے پر حکومت نے ان کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی اور ان کے تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ انھیں میں "محب اللہ" کے اراکین کا رجسٹر بھی تھا جس میں من سبیلہ اور اصحاب کے ہر صاحب کا نام بھی درج تھا۔ یہ سب لوگ حکومت کی نظر میں مشتبہ اور خطرناک قرار پائے اور ان سے متعلق پوچھ گچھ ہونے لگی۔ شدہ شدہ ہر صاحب کا کھوج بھی نکلا، اور پلوٹ مل کہ ان دونوں یہ حیدرآباد میں ہیں اور ایک اخبار سلطنت نکالنے کے لیے ان کی وکیلریشن کی درخواست زیر غور ہے حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار الملائہ کی کے اخراجات سے جزیہ پروردہ ہی تھی، بھلا ان کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی چنانچہ ان کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس سے تھوڑے دن بعد ہی ۱۹۲۰ء میں ہر صاحب حیدرآباد سے وطن واپس آئے۔

مولانا خضر علی خان نے زمبندار کو اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار سے روزانہ بنایا تھا۔ ظفر علی

وفیات

خان اردو صحافت کا ایک اور نورخشندہ نام ہے۔ ان کا اخبار زندہ اور گویا اردو صحافت کی درگاہ تھا۔ بھلا جس اخبار میں مختلف اوقات میں عبداللہ العلوی و وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتحپوری، غلام رسول ہر، عبدالجبار سالک، جواہر حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان سیکش، نصر اللہ خان عزیز نے کام کیا ہو اور وہاں سے الگ ہونے کے بعد زندگی بھر کامیاب صحافتی فرائض انجام دیے ہوں ان اخبار کو صحافت کی درگاہ کے سرائے اور کس نام سے یاد کیا جائیگا؟ اور ان اصحاب میں سے کس کا نام اردو صحافت میں فرائض کی جاکتا ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ ظفر علی خان بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ وہ انگریز سیاست کے مخالف تھے جس نہیں پھنس گئے ہوتے، اردو نوجوانوں سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اور دھنا سمجھنا بنائے رہتے، تو آج اردو کا دامن کیسے کیسے گلے سے لگا رہا ہے رنگ سے منظر اور رنگبوی ہوتا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حسرت موہانی اور مولانا محمد علی پڑا اور شاید کسی حد تک مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہے کہ ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر! ۱۹۲۰ء میں مولانا ظفر علی خان نے اردو کو عبدالجبار سالک کو دیندار میں آنے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اس وقت مولوی سید ممتاز علی (احیاء علی تاج کے والد) کے رسالوں تہذیب نسوان اور بچوں کے ایڈیٹر تھے۔ سالک کو انکار کرتے دینی اردو زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ چھوڑے ہی دن جودان کا نام سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپنے لگا اور وہ اس کے ادارے بن گئے۔ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کا زمانہ ہائی تحریک آزادی کے آغاز کا زمانہ تھا اور شباب کا بھی۔ عدم تعاون کی تحریک پورے زور سے چل رہی تھی۔ حکومت بھی اپنے یو۔سے لاد ٹھکرے اس کے مقابلے پر بکھڑی ہو گئی تھی۔ ادھر کسی نے حکومت کے خلاف کوئی بات بھی یا نہیں، اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ پنجاب میں روزنامہ زمیندار خاص طور پر حکومت کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ ظفر علی خان گرفتار ہوئے، ان کے بیٹے انور علی خان گرفتار ہوئے، یہی اب سالک صاحب کے

وفیات

ساتھ چیں آئے انھوں نے ایک اور بہ نکھا، جو حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا جنانچہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔

ہر صاحب میدان آباد سے واپس آکر خلافت تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے اور اس کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نکالنے کی بھی فکر میں تھے۔ سالک بک جیل چلے جانے کے بعد زمیندار کے فیچر ہر صاحب کے دست تھے، ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آئیے لاہور زمیندار کی باگ ڈور سنبھالیں۔ انھوں نے بھی خیال کیا کہ ان ذاتی اخبار نکالنے سے پہلے کسی دوسرے پرچے میں کچھ تجربہ حاصل ہو جائے، تو یہ مفید رہیگا۔ جنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں ہر صاحب زمیندار کے ایڈیٹر بن گئے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے۔ پکڑو حکمران کا لڑنا تھا، اور زمیندار تو خاص طور پر مقرب سرکار تھا، ممکن ہے حکومت نے اپنے کل پرزوں کے ذریعے سے کچھ دباؤ ڈالا ہو۔ بہر حال ہر صاحب کے خاندان کے بزرگ لاہور آئے اور انھوں نے امراد کیا کہ وہ زمیندار کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیں اور واپسی اپنے وطن چلیں۔ ہر سر تسلیم خم ہوئے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد ہی حکومت نے زمیندار کی مالی ضمانت ضبط کر لی، جس پر دعاوی طور پر، اس کی اشاعت بالکل بند ہو گئی۔

تین چار مہینے بعد زمیندار پھر جاری ہو گیا۔ اب کے اخبار کے کوٹا دھرتا ہر صاحب کے گاؤں پہنچے اور ان کے خاندان والوں کو قاتل معقول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر ہر صاحب دوبارہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سالک صاحب کی قید کاٹ کر رہا ہوئے اور آکر ان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر و سالک کا یہ قرآن السعدین لازماً زمیندار کا ذخیرہ ہی، اور دعائیات کا بھی لازمی دور ثابت ہوا۔ ہر کے بھید، تین دلیل اداروں کی اور سالک کے افکار و حوادث میں ہمارے تمام قوی حقائق پر طنز و مزاح کے انداز میں متبرے کی دھوم مچ گئی۔ بہت لوگوں نے ان کی نقل کی۔ مگر وہ بات کہاں ہو رہی تھی کہ کسی!

وفیات

مارچ ۱۹۲۰ء کے آخر میں ہر سال کے لئے وجہ نمیندار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا
اخبار کے بشیر علی نے بھی ان کا ساتھ دیا، ان میں ادا، تہی شعبے اور کاتب تک سب
شامل تھے۔ شروع میں ان کا پیمانہ اخبار جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن
علی نے آجانے سے وہ مجبور ہو گئے کہ اس کے روزنامہ کا مسئلہ تھا۔ اب ان کے لیے اخبار
نکلانے کے سوائے کوئی چارہ کار نہ رہا، چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۲۰ء کو روزنامہ انقلاب جاری
ہوا۔ جن اصحاب کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود
اعتراف کرتے ہیں کہ انقلاب نے صحافتی معیار سے کتر کھی کوئی بات نہیں کی۔

تھر نے دیپ اور مرلی ایشیا کے بشیر مالک کے سفر کیے تھے۔ اور وہاں کے کئی اکابر سے
ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر
تھی جو ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔
۱۹۲۰ء میں آدای آئی۔ ملک تعمیر ہو گیا۔ ملک کی جگہ دو دو ملک وجود میں آئے، ہر دو
سال کے لیے دیکھا کہ تبدیلیاں شدہ حالات آدای صحافت کے لیے سازگار نہیں۔ اگر ہم چاہیں
کہ اپنی آزادی راے سے بھی قائم رہیں اور حکومت بھی ہم سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔
چونکہ آزادی صمیمہ ان کے نزدیک خوشنودی حکومت سے عزیز تر تھی، انہوں نے انقلاب
کا قریبی دینے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے بند ہو
گیا۔ ایک کامیاب بلاثر دروغ، نسخہ مند اخبار، کو اصول کی خاطر بند کر دینے کی ایسی
دور رس نایاب ہی نہیں مل سکتی۔

اس کے بعد ہر صاحب نے براہ راست سیاست سے ہٹ کر تعلق رکھا۔
کتاب کے غالب پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے غالب
کے سب سے زیادہ سہمیں غوروں کے تقیسات کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ اس سے
نہایت غائب کی پوری سیر بخبری سے آگئی ہے۔ یہ کتاب ان کے غالب سے متعلق
ایک نئے پروگرام کا حصہ تھی۔ جو ان کی اور اور مرگروں کے باعث ادھر وادھر گیا۔

لیکن اہل نظر مجھ سے اتفاق کرینگے کہ جو کچھ ہو گیا، وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ پچھلے ۲۵ برس میں غالب پر بہت کام ہوا ہے اور اس کی بعض اچھی سوانحیں موجود ہیں۔ آئی ہیں۔ اس کے باوجود ہر کی 'غالب' کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی اور غالب کا کوئی سنجیدہ طالب علم اس کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں بہت بعد کو انہوں نے اردو خطوط غالب بھی دو جلدوں میں مرتب کیے تھے ان کے ساتھ مکتوب الیہم کے حالات اور مفید حواشی کا اضافہ کیا جس سے ان کا افادہ وسیع تر ہو گیا۔

صوفیہ سے دستکش ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر لیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں حضرت سید احمد شہید ماسے بریلو کے حالات جمع کرنا شروع کیے تھے۔ اب فرصت تیار ہوئی، تو انہوں نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی۔ ۸ سال کی محنت، مشاقت اور تلاش و تحقیق کے بعد اسے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے انہوں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کون کون سے کنوئیں نہیں جھانکے۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک کے بقیہ السیف افراد کو ریاست ٹونک میں پناہ ملی تھی۔ ان اصحاب کے باعث تحریک سے متعلق بہت قلمی لٹریچر ٹونک کے سرکاری کتابخانے میں جمع ہو گیا تھا۔ ہر صاحب اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے مولانا آزاد نے وہاں سے منگو کر انھیں دیا تھا۔

بعد کو انہوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی جمع کر کے 'سرگزشت مجاہدین' کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ۱۹۵۷ء کے شہرہ نگار ماسے کے کوٹہ، انقلاب، ۱۹۷۷ء کے نام سے شائع کیے۔

غالب کے بعد ان کا دوسرا دلچسپ موضوع اقبال تھا۔ ان کے اقبال کے ساتھ بہت زیادہ کے تعلقات تھے، بلکہ ساتھ لکھ کر کام کرنے کے مواقع بھی ملے تھے جب ۱۹۳۱ء میں اقبال دہری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے، تو ہر بھی ان کے ساتھ

وفیات

تھے۔ واپس ہر سببوں و دونوں پرپ کے مختلف مالک کی سیر کرتے ہوئے ایک ساتھ مؤثر اسلامی، پرکشم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہر صاحب کہا کہ تھے کہ اقبال کا خضر نصف یا ایک تہائی کلام شائع ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں یا شعروں پر شائع نہیں کیے یا کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے معیار سے فرد تر تھے یا ان کے عام طرز فکر سے میل نہیں کھاتے تھے چونکہ ہر تہ تو ان کے ساتھ رہے تھے، اس لیے اس طرح کا وافر کلام ان کے پاس جمع تھا۔ وہ اسے توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم اب اس ذخیرے کا کیا خضر ہوتا ہے! انھوں نے بانگ درا، ابان، جبریل، ضرب کلیم، مجموعوں کے مطالب و معانی سے حلق مستقل مصنفات چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کی سوانح سے متعلق بھی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ادب پر خاصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا جوت نہ بولے، کوئی بچا اس کتاب میں ہوگی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخ اسلام پر رہی۔ عجیب بہرہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کر نابینا، سوانح ہو کر تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر۔ غرض کوئی میلان ہو، وہ کسی قسم کی گتیا بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی کہی اور جب بھی کہی۔ ایسی کہ سننے والے کو اس سے شرم محسوس ہوئی، نہ خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث مذمت۔

صحت کی طرف سے کبھی شکایت نہیں کی۔ سرخ و سفید رنگ، بلند بالا، ورزشی متناسب جسم۔ وہ اپنی عادات میں بہت باقاعدہ تھے۔ سلم ناؤی میں ان کا اپنا مکانی تھا۔ ہر یہاں سے بہت قریب جو کوئی سردی ہر موسم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد نکل پڑتے۔ ہنر کے کتاب کے کتاب کے کوئی ذیل چلے جاتے اس طرح بعد از کم و بیش چار میل کا اوڑھ تھا۔ واپس آکر رشتہ کرتے اور اس کے بعد کام کی میز پر بیٹھ جاتے چار بجے تک

وفیات

رشتہ خزانہ کا شکر رہتا یہاں سے اٹھتے تو دفعہ ہر کا کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر قبل لڑکے تین بچے دوبارہ مطالعے کی میز پر بیٹھ جاتے اور پھر بچہ تک مشغول رہتے۔ پھر شام کی سیر اور اس سے واپسی کے بعد کا وقت احباب کے لیے وقف تھا۔ یادہ ان کے وہاں آجاتے یا یہ کسی کے وہاں چلے جاتے۔ بات کا کھانا کھا کر جلد سو جانے کے عادی تھے۔

ایسی منظم زندگی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ موت اچانک ہوئی۔ شگل کے دن ۱۶ نومبر ۱۹۶۱ء (۲۶ رمضان ۱۳۹۱ھ) کو علی الصبح حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن سپہر کو مسلم ناؤن ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ راضی مراد بگو کے قطعہ تاریخ کے آخری مصرعے سے عیسوی تاریخ تکلفی ہے یہ ہے:

فراق قدس دو قار و وطن غلام رسول

۱۹۶۱ء میں ان کی شادی ہوئی لیکن چار پانچ سال بعد یہ یکم دوسرے سال بچے اپنی یاگا رجسٹرڈ انجمن میں انتقال فرم گئے۔ دوسرے بچے انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۶۹ء میں کیا اس خاتون سے ان کے رہنے پہلے ہوئے۔ وفات کے وقت ان کے گیارہ بچے

موجود تھے۔ چھ بیٹے (عبد السلام، اسلم، فاروق، شاہین، اکرم، جادید سلطان، طارق، احمد سلیم) اور پانچ بیٹیاں۔ پانچ بڑے بیٹے برسرِ روزگار ہیں، سب کے چھوٹے عبدالسلیم بی اس کے کھلم ہیں جنہ بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر بار کی ہیں، دہ ہونز ناگنندہ ہیں۔

میرے ان کے ۱۹۶۱ء سے درمیان تعلقات تھے۔ ۵۵ برس تھوڑی مدت نہیں ہوئی۔ غالباً سوسن کے انتقال پر کہا تھا کہ ہم ایک دہ برس سے جانتے تھے، حضرت، ہرگز کا کو دشمن ہی نہیں ملتا، دوست کا کیا ذکر! میں ہر کے لیے کیا کہوں۔ میں نے انھیں ہرگز میں دیکھا۔ نیکی اور شرافت کا نمونہ، دست پروری اور وضع داری کی مثال:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

وفیات

سیدین خواجہ غلام السیدین

ان کا سلسلہ نسب حضرت مولیٰ کریم معلم کے مشہور صحابی حضرت ابوالقوب انصاریؒ تک پہنچتا ہے۔ یہ اور وہ شاعری کے مجدد خواجہ الطاف حسین حالی (ف ۱۹۱۳ء) یکجہی تھے۔ مولانا حالی نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی بہرویؒ، عہد غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷ء) میں ہندوستان نے حکومت وقت نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ جاگیر و روپائی پت کی قضاۃ کے علاوہ انھیں منڈی میں مختلف اجناس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ سارا جاہ و مال بہت مدت سے ختم ہو چکا تھا اور سیدین کے باپ و اواسٹک خاندانی نیک نامی اور عرف و شرف کے سوا اس میں سے کچھ نہ پہنچا۔

سیدین کے دادا خواجہ غلام عباس کا نکاح مولانا حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے غلام حسین، غلام انگلیس، غلام السبطین، سب سے بڑے غلام الحسین کا بلنگہ عالم دین اور مصنف تھے۔ انھوں نے ہر برطانیہ کی سپینر کی شہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ: فلسفہ و تعلیم کے عنوان سے اردو میں کیا تھا۔ میں نے اپنی ملا علی کے زمانے میں ان کے بعض مذہبی رسالے اور ایک آدھ مناقبے کی کتاب دیکھی تھی۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں لاہور انتقال کیا۔

سب سے چھوٹے خواجہ غلام السبطین تجارت اور ملازمت کرتے رہے۔ جلدی زبان کے نامور افسانہ نگار اور ناول نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انھیں کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں رحلت کی۔

خواجہ غلام انگلیس صحیح معنوں میں فخر خاندان تھے۔ وہ ۱۸۷۲ء میں بانی پت میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں وہ حالی کے ساتھ دلی آئے۔ پانچ برس بعد

وفیات

جہاں گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ نبی زاد تھا، جب انھوں نے 'انظر فی الآثار' کے عنوان سے کوئی ۲۰ صفحات کا مضمون حیدرآباد کے مشہور ماہنامے 'حسن' میں چھپنے کو بھیجا۔ یہ مضمون حسن کے معیار کے مطابق قابل انعام ٹھہرا اور انھیں ایک اشرفی انعام میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۹ء میں ایم اے اور کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا، اور چار سال بعد ۱۸۹۲ء میں (بھروسہ ۲۰ برس) بی اے اور پھر ۱۸۹۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۸۹۶ء کے شروع میں وہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ وہاں وہ پانچ برس سے کچھ زیادہ رہے۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے اور میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ شاہ ایدور ڈھمکم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہربائی نس سرافاٹا کی زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ غلام الثقلین نے "اصلاح تمدن" (سوشل ریفارم) سے متعلق ایک تقریر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے اپنی سرگرمیوں میں اس موضوع کا اضافہ کر دیا، اور اس کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے خواجہ غلام الثقلین ہی کو اس کا سیکرٹری بنا دیا۔ انھوں نے پورے خلوص سے اس شعبے کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنا مشہور رسالہ 'معراج' جاری کیا جو پہلے ماہنامہ اور بعد کو ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مشوروں کے ذریعے کیے، تقریریں کیں، نیز اس تحریک کے مقاصد کی تشریح کے لیے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام 'مضامین اصلاح و ترقی' تھا۔ یہ بیشتر مفت تقسیم کی گئی تھی۔

وہ اعتقاداً شیعہ تھے اور شیعہ کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں سنی شیعہ فرقوں کے اختلاف اور کشمکش سے بہت رنج تھا۔ انھوں نے بساط پیر دونوں گروہوں میں صلح صفائی اور یکجہتی کی نصیحتیں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے علمائے کرام نے انھیں اپنے تعاون سے محروم رکھا۔

وفیات

۱۹۰۹ء کے انتخاب میں وہ صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان تھے جو ان سے کہیں زیادہ بااثر و درخشاں تھے؛ لہذا وہ ہار گئے۔ لیکن وہ اس سے حوصلہ نہیں ہارے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور اب کے اپنے مقابلے میں خان بہادر سید آل نبی ویل وٹس آگرہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے مگر ان کے نام کے ساتھ آنریریل لکھا جاتا ہے؛ یہ اسی انتخابی کامیابی کا نتیجہ ہے۔ لیکن افسوس اب ان کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اگر وہ احتیاط کرتے اور مناسب طریقے پر علاج ہوتا، تو شاید تندرستی بجاں ہو جاتی۔ لیکن ایمان کی حرارت اور قوم کی زلزلہ حالی کی اصلاح کا جذبہ انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کثرت کار لیے لیے اندرون و بیرون ملک سفروں کی کوفت، اور ذمہ داری تشویش نے انہیں قبل از وقت موت کے منہ میں ڈھکیں راجسم ان کی روح کا ساتھ دے سکا، اور تندی صہلے سے یہ آبگینہ پھل گیا۔ بروز جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۶ء ان کے دس بیٹے اس مجاہد قوم کا حرکت قلب بند ہو جانے سے پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ لگے دن اٹھ اور عید گاہ کے متصل درگاہ پیر حیدر میں سپرد خاک ہوئے۔ صرف ۳۳ برس کی عمر پائی۔

بھلا یہ کوئی مرنے کی عمر تھی!

ان کا نکاح مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین (ف ۱۹۳۲ء) کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے؛ ممتاز فاطمہ، غلام السیدین، سیدہ خاتون، اظہر عباس، مصداق فاطمہ۔ ممتاز فاطمہ کا نکاح سید سخن زیدی سے ہوا تھا۔ سیدہ خاتون کا عین عنقوان شباب میں ۱۹۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ حالی کے مختصر مجموعہ سخن جو اس وقت جاری ہیں ایک چھوٹی سی مثنوی ان سے متعلق ملتی ہے۔ سیدین کی کتاب آندھی میں چراغ میں بھی ایک مضمون ان سے متعلق موجود ہے۔ خواجہ اظہر عباس ابھی چار برس ہوئے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اللہ کو پیار سے ہوئے۔ مصداق فاطمہ

وفیات

مہینہ ادیب و مصنف علامہ عابد حسین کے نام سے مشہور و معروف ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

خواجہ غلام امین الدین، جنہیں ان کے سب احباب 'میدین' کے نام سے جانتے ہیں، مرحوم خواجہ غلام اظہار علی کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے دن پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تربیت اپنے والد اور نانادوڑھالی کی لکڑیانی میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید ختم کیا، اس کے ساتھ علم تجوید و قرأت کا ناقصہ مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ اس سال اپنی یونیورسٹی سے بی اے کے واحد طالب علم تھے، اس امتحان میں وہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یوپی کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر مسٹر میکسٹری تھے، وہ ان کے نتیجے اور خاص طور پر انگریزی میں غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سناراش پر حکومت نے انھیں وظیفہ عطا کیا اور یہ ولایت چلے گئے۔ وہاں ایڈریو یونیورسٹی سے چھ تعلیم و تدریس کی سند ڈیپلوما اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال کے آخر میں وہ مہندسان واپس آئے۔

وہ اسی پراہلی علی گڑھ ٹرننگ کالج میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تھوڑے دن بعد حبیب الرحمن صاحب صدر شعبہ کہیں باہر گئے اور یہ ان کی جگہ پر لگ گئے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں انھیں کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ترقی کر کے پرنسپل ہو گئے۔ اتنی عمر میں شاید ہی کوئی اور پرنسپل بننا ہو۔ وہ اس کالج میں ۱۹۳۸ء تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست کشمیر کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ مدیر محکمہ تعلیم کے عہدے پر ہال چلے گئے۔ کشمیر میں وہ ۱۹۴۵ء تک رہے۔ اب ان کی ماہر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں شہرت ہر جہلی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست راجپوت نے انھیں اپنے ہال بلایا۔ وہ

ذیات

دوبیس تک راجپور میں میٹر تعلیم رہے۔ آزاد دی ملک پر جب ریاست جمہوریہ مندرجہ ذیل
ہونے والی تھی، تو ان کا عہدہ بھی تحقیق میں آگیا۔ جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ یہاں سے
سبکدوش ہوئے تو حکومت ممبئی نے اسی عہدے پر انھیں اپنے اہل مقرّر کر دیا۔
انھوں نے صوبہ ممبئی کے تعلیمی نظم و نسق میں ایسی خوشگوار اصلاحات کیں کہ شدہ شدہ حکومت
مہند تک ان کی خبر نہ تھی۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء
میں ملاکر مرکزی وزارت تعلیم میں میٹر اور جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس
زمانے میں سیکرٹری کزنار چند تھے ۱۹۵۲ء میں ان کے بعد پروفیسر ہالوں کیرن راف گسٹ
(۱۹۶۹ء) سیکرٹری ہو کر آئے، تو سیدین ایڈیشنل سیکرٹری مقرر ہوئے اور تین سال بعد ان کے
مستعفی ہونے پر ۱۹۵۷ء میں سیکرٹری بن گئے۔ یہیں سے ۱۹۶۱ء میں پنشن پر سرکاری ملازمت
سے سبکدوش ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی، تو حکومت کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے
اہل دوبارہ بلا لیا۔ لیکن اب احوال دو مرتبہ تھا۔ حکومت کے کل ہند کے انھیں اپنے بھائی
کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سیدین کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ مسائل
سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۲ء کے شروع میں مستعفی ہو گئے۔

اسی ملازمت کے دوران میں (۱۹۵۸ء) وہ دعوتی پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی
نیو یارک گئے تھے۔ اب جو ملازمت کا جو اگلے سے اترا، تو بیرون ملک کی مختلف
یونیورسٹیوں نے اپنے اہل مدعو کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ دسکالٹن یونیورسٹی
لامپا (۱۹۶۲ء - ۱۹۶۳ء)۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء کا ایک سال ہوائی
یونیورسٹی میں گذرا۔ یہاں وہ مرکز برائے شرق و غرب میں سینئر سکالرش کر گئے تھے۔
ہوائی ہی سے ۱۹۶۴ء میں وہ شان فورڈ یونیورسٹی گئے اور اسی سال کے آخر میں وہاں
سے واپس آئے، تو یہاں حکومت مہنہ ایک تعلیمی کمیشن کی تشکیل کا منصوبہ بن چکی
تھی؛ انھیں بھی اس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ وہ اس عہدے پر دوبیس سال (۱۹۶۶ء تک)
رہے۔ کمیشن کا ختم ہوا، تو یہاں دلی میں ایک سرکاری تعلیمی اور انتظامی محالہ

وفیات

کے ادارے کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۶۹ء میں الگ ہو گئے۔
۱۹۷۰ء میں شکاگو یونیورسٹی نے دنیا بھر سے آٹھ ماہرین تعلیم کا انتخاب کر کے انھیں
اقتیادی خدمات کا تعین دیا تھا۔ ہندستان کو اس بات پر فخر کہ آجاسیہ کہ ان آٹھ میں
سے ایک ذات تیدین صاحب کی تھی۔ وہ شکاگو سے جون ۱۹۷۰ء میں وطن لوٹے تھے۔
اگر ہم گنوائیں کہ وہ یہاں ہندستان میں اور بیرونی ممالک میں کون کونسی یونیورسٹیوں
اور اداروں کی منتقل یا عالمکے رکن رہے، تو یہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ
حقیقت ہو کہ ہمارے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں تیدین
صاحب کا ہاتھ رہا ہو۔ انھوں نے پس پردہ رہ کر خاموشی سے اس میدان میں جو
خدمات سر انجام دی ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ملک سے باہر جس ادارے
سے وہ بہت دن تک وابستہ رہے، وہ یونکو ہے۔ وہ اس کی مرکزی سرگرمیوں سے
مختلف منظر پر منسلک رہے اور اس کی طرف سے انھوں نے بعض ممالک کا دورہ

بھی کیا۔
تیدین صاحب کو اردو دارالانگریزی۔ دونوں زبانوں پر یکساں قلمت حاصل تھی۔
(یوں وہ فارسی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے تھے) ان کی اردو نثر بڑی جا
اور سگفتہ ہو۔ بظاہر ایسی سہل متنوع کہ قاری خیال کرے کہ ایسی نثر لکھ لینا کیا مشکل
ہے، لیکن گھنے بیٹھے، تو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہو۔
تقریر کے علاوہ وہ تقریر کے بھی مہر میدان تھے، اور ان کی یہ صلاحیت کا ملاحظہ ادا
تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ ان کی ۱۹۱۶ء کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جو
انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ کے مرتد پر اسٹیج پر
میں کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی اور اس کنفرس کے زمانے میں یہ تقریر انھوں
نے اس اطمینان اور وقار سے کی تھی کہ سننے والے بہت دن تک اس کا چرچا کرتے
ہے خوش قسمتی سے مجھے اپنی زندگی میں بعض بڑے بلند پایہ اور طبع انسان مقرر

ذیات

کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں بلا خوف و تردید، پورے دوقد سے کہہ سکتا ہوں کہ قدس ربان، لہجے کی منانیت، انداز و اسلوب خطاب، موضوع کے مالہ و اعلیہ سے پوری واقفیت، دلائل کی قوت، اپنے نقطہ نظر کی وضاحت، سامع کی تشفی اور اطمینان۔

غرض ان تمام باتوں میں جو کسی اچھی اور کامیاب تقریر کا مایہ الاتیاد ہیں، تیدین کسی سے کم نہیں تھے۔ گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا بلکہ یہاں ہلکا سا مزاح کا پہلو سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے۔ نرم لہجے میں، دلق سے، اپنا عندیہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق انھوں نے درشتے میں پایا۔ ان کے خاندان نے علم و ادب کی ترقی و ترویج اور قوم کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت میں جو نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، اور یہاں ان سے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہ سکتی ہے۔ تیدین نہ صرف ان اقدار عالیہ کے دارث تھے، بلکہ

انھوں نے اپنی زندگی کو اپنے لغز روگردار کو ہر معمول کے مطابق ڈھال کر اپنے ہم عصروں کے سامنے عمل نمونہ پیش کیا۔ ان کا موضوع سخن تعلیم تھا۔ وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعہ سے اپنے عہد کے نوجوانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کربادھرتا بننے والے تھے سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا مستحق کون ہے اور کئی شخص کو اس لفظ ”اچھا“ کا مصداق بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ تیدین کا مطلع نظر بھی ساری عمر ہی رہا۔

وہ اقبال کے عاشق تھے، ہر اقبال کا بیشتر کلام انھیں یاد تھا۔ وہ تقریر و تقریر میں بلکہ عام گفتگو میں بھی عموماً اقبال کے اشعار، تہلال یا موضوع کی وضاحت کے لیے استہوال کرتے تھے۔ انھوں نے اقبال کا تعلیمی فلسفہ کے عنوان سے ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی تھی۔

یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا

وفیات

ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ اس موضوع پر آج تک یہ واحد کتاب ہے۔
ان کی بیشتر کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ اردو میں مندرجہ ذیل
عنوانات ہیں :

روح تہذیب (دلی ۱۹۳۲ء)؛ اصول تعلیم (سندھستانی اکادمی، الد آباد ۱۹۴۹ء)؛
علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (۱۹۳۵ء) قومی سیرت کی تشکیل (۱۹۳۸ء)؛ شہیدِ وفا
بدایوں (۱۹۳۲ء)؛ آندھی میں چراغ (دلی ۱۹۴۲ء)؛ ذہن انسانی کا ارتقاء (نظام نیکی، دلی
یونیورسٹی ۱۹۶۶ء)؛ زبان، زندگی اور تعلیم (انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۷۷ء)؛

آندھی میں چراغ پر انھیں ۱۹۶۴ء میں ساجتہ اکادمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ آخری کتاب
زبان، زندگی اور تعلیم، زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔
یہ ان کی وفات کے کوئی ہفتہ بعد شائع ہوئی۔ انگریزی کی چھوٹی بڑی کتابوں اور
رسالوں کی تعداد ۲۰۰ ہے۔

ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۳ء میں
انھیں ڈاکٹریٹ ڈگری پیش کی تھی۔ ان کے احباب نے ایک مجموعہ مضامین
لبنان اور خان الفت ان کی ساتھویں سالگرہ پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ان کی نذر کیا تھا، اس
کے مرتب ڈاکٹر سید عابد حسین ہیں اور یہ کتاب صدر جمہوریہ مندر ڈاکٹر سرد پنی رادھا کرشنن
کے ہاتھوں پیش کی گئی تھی۔ حکومت ہند نے ۱۹۶۶ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی
نوازا کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ وہ ہنود سلسلہٴ لازمت سہی میں تھے کہ انھیں
دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہیں ۱۹۷۵ء میں پہلا دورہ پڑا۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے
اپنی سرگرمیوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں کی جسب معمول اپنے کام کاج میں لگے رہے بلکہ
بے تری اور بوائی سفر بھی کرتے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء ہی میں وہ یونسکو کے کام سے عراق گئے
وہاں تک بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں ان آیام میں بغداد میں مقیم تھا۔ میری ان سے پہلی

وفیات

لاحات وہیں بغداد میں ہوئی۔ ان گزشتہ مہینہ میں بائیس برس میں ہمارے تعلقات میں بہت گہرائی آگئی تھی۔ ان کی وفات سے میں ایک ہریان دوست سے محروم ہو گیا۔ رحمانہ تعالیٰ۔ جبکہ مکہ چکا ہوں، ۱۹۶۳ء میں وہ دسکان میں تھے۔ وہ ان کی رفیقہ حیات کا انتقال ہو گیا (۷ جنوری ۱۹۶۳ء)۔ اس کا ان کی صحت پر بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ وہ اپنی قوتِ ارادی سے مردانہ کام میں بٹے رہے۔ لیکن یہ ابرو واقع ہو کہ اس حادثے سے ان کا دل بچ گیا تھا۔ دل کا درد شدید حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ میں ہوا جہاں وہ سلم پونیورسٹی کے طلبہ تقسیم اسناد میں شرکت کے لیے گئے تھے اس کے بعد متواتر ٹھونکے تھوٹے وقفے سے کچے کچے کھلے ہوتے رہے۔ تیسرا شدید حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو سینے میں درد کی شکایت کی حسب دستور ان کے معالج اچھل اچھے ساتھ اسپتال لے گئے۔ اگلے دن (۱۹ دسمبر) کوئی سوا تین بجے اس کا یہ نیک بزدل اپنے خانقہ کے حضور حاضر ہو گیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ تین بجے تک وہ جانے لے آتے تھے اور انھیں مختلف ہدایتیں دیتے رہے تھے۔ تجیز و تکفین ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہوئی۔ نمازِ جنازہ مولانا سید علی صاحب دہش امام مسجد پنجہ شریف، کشمیری گیٹ، نے پڑھائی، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے؛

آسمانِ تربت پر تیری عنبر نشانی کرس!

نواب کلب علی خان (دف ۱۸۸۸ء) والی راجپور کے ایک دیہی مشیر علی خان تھے۔ سیدین کی شادی انھیں کی صاحبزادی عینہ جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں (دہنو، بقیس، سیدہ، ذکیہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔

مرتب
مالک رام

شمارہ ۲	۶۱۹۷۲	جلد ۶
۲	ملاحظات	لک رام اکثر محمد عمر، جامعہ ملیہ اسلامیہ
۳	اردو ادب کا سماجی پس منظر	نئی دہلی
۹۷	پریم چند۔ ماضی اور حال کا ادیب	بنیہ سجاد ظہیر، نئی دہلی
۱۰۹	وفیات	لک رام

ندہ سالانہ (مع محصول رجسٹری ڈاک) ۱۵ روپے اس شمارے کی قیمت
برساک : ۲ پونڈ انگریزی یا ۷ ڈالر امریکی ۵ روپے

پرنٹر و پبلشر نل جاس جاسی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر دفتر ملی مجلس
۱۳۲۹ چھتہ نواب صاحب فرشتخانہ دہلی ۷ سے شائع کیا۔

ملاحظات

یہ تحریر کا سال رواں (۱۹۷۲ء) کا دوسرا شمارہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس سال تحریر کی اشاعت بہت ببقاعدہ رہی۔ اس کے اسباب کچھ میرے ذاتی ہیں، اور کچھ خوبی تقدیر کا نتیجہ۔ جو اصحاب کتابوں کی اشاعت کا کچھ علم رکھتے ہیں، انہیں بتانے کی ضرورت نہیں اور جنہیں اس کا علم نہیں ہے، انہیں بتانے کا فائدہ نہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم واقعی مجبور اور بے بس ہو کے رہ گئے۔

پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ سال کے آخر تک پرچے کی اشاعت اپنے معمول پر آجائے۔ تیسری تاہی کا پرچہ بھی کم و بیش تیار ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگا۔ سال کا آخری پرچہ سیدی نمبر ہوگا جو ان کی برسی (دسمبر ۱۹۷۲ء) کے موقع پر شائع کیا جائیگا۔

ملک نام

اردو ادب کا سماجی پس منظر (۲) عام طرز زندگی

اردو شاعری میں عام طور پر اردو غنویوں میں خصوصیت کے ساتھ ہندستان کی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ان غنویوں میں ہندستانی سماج کی جو تصویر ملتی ہے، اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان غنویوں کی تمام نغما خالصتہ ہندستانی ہے۔ قصوں میں نام عموماً فرضی ہوتے ہیں، لیکن سماجی حالات کے بیان میں مصنف اپنے گرد و پیش کے ماحول ہی کی آئینہ داری کرتا ہے، خواہ قصوں کے کردار بھلا کرسی، جہنمی ملک کے ہوں، اس لیے کہ جس سوسائٹی کا مصنف نے مشاہدہ نہیں کیا، اس کی عکاسی کرنا اصولِ نفسیات کے خلاف ہے اور عملاً ناممکن۔ اس لیے جن قصوں میں مقامات کے نام غیر ہندی ہیں، ان میں بھی دراصل ہندستانی سماج ہی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے غنوی سحر ابیان (میر حسن)، زہر عشق، عشق، پھول (ابن نشاظمی)، اور گلشنِ عشق (نصرتی) کے تفصیلی مطالعے سے اس عہد کے ہندستانی سماج کو جا بجا سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً میر حسن دہلوی نے خہزاردہ بینظیر کی سواری کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ مجسمہ مغل بادشاہوں کے جلوس کی تصویر کشی ہے۔ سونے چاندی کے زیورات، عمارتوں سے سجے ہوئے ہاتھیوں کی قطاریں، پالکیاں، نالکیاں، رختیں، آئینہ بندی، سازندوں اور کھانڈ کی تاش کی پگڑیاں، شہنائیوں کی صدائیں وغیرہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرین شہر کو دل کے آئینہ بند
سواری کا ہول لطف جس سے دل چنچ

اردو ادب کا سماجی پس منظر

زلیں تھا سواری کا باہر ہجوم
 برابر برابر کھڑے تھے سوار
 سنہری رو پہلی تھیں عماریاں
 چمکتے ہوئے باد لے کے نشان
 ہزار سند ہی اطراف میں پاکی
 کہا روں کی زریفت کی گرتیاں
 بندھیں پگڑیاں تاش کی سراپہ
 وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے
 وہ ماہی مراتب، وہ سروروں
 وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما
 وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی
 بجاتے ہوئے شادیاں تمام
 سوار و پیادہ صغیر و کبیر
 وہ نذریں کہ جس نے تھیں ٹھنیا
 ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار
 سجے اور سجائے سبھی خاص و عام
 طرق کے طرق اور پرے کے پرے
 مریضے کہ مازوں سے کوتل سمند
 وہ نیلوں کی اور میگڈ بر کی شان
 چلے پایہ تخت کے ہو قریب
 سواری کے آگے چلے اہتمام
 نقیب اور جلو مار اور چوہدار
 اسی اپنے معمول و دستور سے
 ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب سے پہلے
 ہزاروں ہی تھیں ہاتھوں کی قطار
 شب و روز کی سی طر حاریاں
 سواروں کے غٹ اور بالوں کی شان
 بھلا بور کی جگمگی نا لکی
 اور ان کے بے پاؤں کی ٹہرتیاں
 چکا چوندھ میں جس سے آدے نظر
 جھلک جس کی ہر قدم پر پڑے
 وہ نوبت کہ دو لہا کا جیسے سماں
 سہانی وہ نوبت کی اس میں صدا
 قدم با قدم بالباس زری
 چلے آگے آگے ملے شاد کام
 جلو میں تمامی امیر و وزیر
 شہ و شاہزادے کو گنڈ رانیاں
 چلے سب قرینے سے باندھے قطار
 بالباس زری میں ملش تمام
 ادھر کچھ، ادھر کچھ، درے کچھ پرے
 کہ غریب میں روح القدس سے دو چند
 جھلکتے وہ مقیش کے سائبان
 بدستور شاہانہ پننے جریب
 لیے سونے روپے کے ماحے تمام
 یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار
 ادب سے، اخلاقت سے، کامد سے

یلو نو جوانو! بڑے جانیو
 دو جانب سے بائیں لیے آئیو
 بڑے جائیں آگے سے چلتے قدم
 بڑے عمر و دولت قدم با قدم
 غرض اس طرح سے سواری چلی
 کہے تو کہ باد بہاری چلی
 تماشا نیوں کا جدا تھا، ہجوم
 کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی ہوم
 لگا قلعے سے شہر کی حد ملک
 دوکانوں پہ تھی بادلے کی چمک
 منڈھے کھتے تمامی سے دیوار عدد
 کیا تھا زبس شہر آئینہ بند
 رعیت کی کثرت، ہجوم سپاہ
 گزرتی تھی حرکت حرکت کے ہر جانگاہ
 ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مردوں
 ہر اک سطح تھی جوز میں چمن

شاہی محل کے ساز و سامان کا ذکر میر حسن نے اس موقع پر کیا ہے، جب شہزادی بدینہ زرا اپنے باغ کی عمارت میں شہزادہ بیٹھنے کے بیٹھنے کا ساز و سامان لگواتی ہے۔ میر حسن نے اس موقع پر ہندوستانی گھروں کے اندرونی ساز و سامان کا جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ متوسط درجے کے عمارتوں کا ہے:

خواصوں کو گھر کو دیا انتظام
 تمامی کے پروے لگائے تمام
 بچھا فرش اور کرچہ کھٹ کو صاف
 مرقع کا اس پر اڑھا کر غلاف
 دوزخس کے دستے جو آفاق میں
 نہ نکلیں سوا کر چنے طاق میں
 ولایت کے میوے دھرے ہر طرف
 کہ لے جا دے بوان کی گل پر شرف
 دھرے نکلنے خاص ایوان میں
 ہوا ہو گئی عطر دالان میں
 دھریں کشتیاں ایک طرف بشار
 چنی اک طرف ڈالیوں کی قطار
 اچار دمرتے دھرے خوشنما
 وہ باہر کے دالان میں جا بجا
 چمک کرٹ کے پاس اک منڈ بچھا
 اداس پر تمامی کے تکیے لگا
 چمکیر میں بنا اور رکھ پا ندان
 قرینے سے اس میں رکھے ہار پان

ادعاب کا سماجی پس منظر

کئی عطسردان داں مرتجع دھرے
سرم نے جملہ دھری اک کتاب
دھری اک بیاض اور شکب چمن
قلمدان بھی اک نزاکت بھرا
دھرا اک طرت گنجفہ خوش تراش
بجھی ایک چوکی پڑا تو رہ پوش
مراجی دسافر شراب و کباب
پکڑا تھ مسند پہ کھینچا اُسے
اری ظالم، اک دم تو تو بیٹھ جا
غرض رفتہ رفتہ وہ مدہوش ہو
بادشاہانِ دہلی کی بود و باش اور قلعہ معلیٰ کی طرزِ زندگی کا میر حسن نے ان اشعار میں نقشہ پیش کیا ہے:

کہوں قلعہ کی اس کی میں کیا شکوہ
وہ دولت سراخانہ نور تھا
ہمیشہ خوشی، رات دن سپہ بانہ
سدا عیش و عشرت سدا راگ رنگ
کہاں تک کہوں اس کا جاہ و حشم
سدا ماہز دیوں سے محبت اُسے
ہزاروں پری پیکر اس کے غلام
اسی طرح مہجور نے نواب سعادت علی خاں کی بزمِ عشرت کا ان اشعار میں ذکر کیا ہے
اور عالم بزم کا اوس کی کہوں کیا
زباں بھی اب لگی کرنے ہے گفت

۳ ایضاً: ۱۶، ۱۷ نیز دیکھیے کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۵۱۶-۵۲۰، ۵۲۱-۵۲۳

۴ دیوانِ مہجورِ دہلی: ۲۳۳-۲۳۴

اردو ادب کا سماجی پس منظر

کہیں ہے خوشنوا طبلوں کی آواز کہیں بکتی ہے دن اور رات نوبت
 کہیں ہے بھگتیوں کے خل بھگت کا مزا کرتی ہے کہیں بھانڈوں کی سنگت
 کہیں ہیں غول چرنے والیوں کے توان میں ہے عجب ہی ڈھب کی محبت
 کہیں جو طایفوں کے غٹ کھڑے ہیں الگ ہی سب سے پھرتی ہے کھڑی گت
 کوئی ناچے ہے مہر اور کوئی دہاں کوئی گائے خیال اور کوئی دھرت
 کوئی گاتی ہے بیڑہ کر ٹھہری ترانہ

ہدایت نے ایک قصیدے میں نواب آصف الدولہ کی بزمِ عشرت کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور جگہ
 نواب تاج الدولہ میرک حسین خان کی بزم کا بیان ملتا ہے۔
 اٹھارھویں صدی کے امیروں کی زندگی بے حد تعیش پسندانہ تھی۔ انہیں شراب اور رقص و
 سرود سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاباں نے سنوئی درمدرج استاد خود حشمت و عمدۃ الملک میں امیر
 خان انجام کے رگ رگ کا ان اشعار میں ذکر کیا ہے:

ہمیشہ اسے عشق سے کام تھا سدا اس کو شغلِ مے و جام تھا
 کروں بزم کا اس کی میں کیا بیاں سراپا خدائی کا جلوہ تھا و ان
 وہ دیوانخانے میں جب بیٹھتا تو دے دے پرورد دے بلا
 چپ و راست پر امن و روبو کھڑے رہتے آبانہ مدد کر ہاتھ کو
 صفت اس کے دیوانخانے کی گر لکھوں میں تو کاغذ ہے ایتا کہ مصر
 کہ ایوان در ایوان جہاں اور تھا زمین اور تھی، آسماں اور تھا
 اس ایوان میں غنہ نشین ایک تھا جو تختِ معلق کہوں، ہے بجا
 کروں اس کی رفعت کا میں کیا بیاں معالیٰ تھا وہ عقل سے بھی مکان
 شکوہ و بلندی میں تھا آسماں کہ توں قزح اس کا تھا سیا بیاں
 تیرا بیاں حوضِ لبریز تھا اگر رشک کوثر کہوں، ہے بجا

۶ ایضاً: ۲۳۹-۲۲۸

۵ کلیاتِ ہدایت: ۲۹۹، ۳۰۱

۸ ایضاً: ۲۶۳-۲۶۶

۷ دیوانِ تاباں: ۲۵۸-۲۶۰

سدا سخن میں اس کے رہتا تھا رنگ سدا تھی نوائے دُست و نئے وچنگ
 کلا دنت و قوال سب مل کے وہاں بوسیقی استاد تھے بیگمناں
 جو قوال قول و غزخاں تھا وہاں عرب محو، مدہوش ایراں تھا وہاں
 کوئی پیڑ و دریت کو گانا تھا وہاں ترانے سے دل کو لمبھاتا تھا وہاں
 کوئی کر کے آغا زسا توں کرلا دکھاتا بتدریج ہر ایک مقام
 عجب مل کے ساندے سے ہوتا تھا رنگ کہ تھی وہاں فلاطون کی بھی عقل جگ
 کہیں باجے تھے استار و منہ چنگ کہیں خنجر کی اور کہیں جلتزنگ
 کہیں نہ کہیں تھا جلا جسل کا شعور بجاتا تھا قانون کو کوئی زور
 سدا سن کے تنہو کی وہاں نوا رنگِ جاں کا تھا چاک کرنا بجا
 غرض راگ سازوں کا یہاں تک تھا ٹھو کہ پہنچے ہے کب شورِ یوم النہور
 کہیں رقص کرتے تھے مرطعتاں کہیں دید کرتے تھے ساعر کشاں
 یہ سب خوب رویاں ہندی نژاد نمکسار زاد و نمکسار زاد
 خوشی ہو کے آتے تھے جب قص میں انھیں دیکھ آتے تھے سب قص میں
 زبیں عالم آب بھی تھا سدا سمجھی مست و مدہوش تھے جا بجا
 غرض کیا کہوں بزم اس کی کی بات کہ اندر کا بھی وہاں کھلا تھا
 اس طرح انھوں نے لکھنؤ کی ایک شاہی حرم دلہن جان کی مدح میں قصیدہ کہا ہے، اور اس
 کی محفلِ رقص و سرود کا بڑا دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے۔
 میر حسن نے شہسوی سحر الیسان میں شاہی خاندان کی مستورات کا سراپا اور علیہ اس انداز سے
 بیان کیا ہے کہ اس سے محل کی زندگی اور وہاں کی عیش و عشرت کی فضا سامنے آ جاتی ہے:

کروں اس کی پوشاک کا کیا بیان لفظ ایک پشواںِ آپ رواں
 زبیں موقیہ کی تھی سخاوت کل کہے تو، وہ بیٹی تھی موتی میں گل
 اور اک دھڑھنی جوں مہیا یا حباب جسے دیکھ شبنم کو آدے حجاب

صباحِ صفا اس میں جھلکی ہوئی پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی
گرمیاں میں اک نغمہ الماس کا ستارہ سا مہتاب کے پاس کا
وہ کرتی، وہ انگبیا جو ہر نگار نیا باغ اور ابتلا کی بہار
وہ چھب تنہی اور اس کی گرتی کا چاک ترا تے کی انگلیا کسی ٹھیک ٹھاک
جھلک پایا جامہ کی ڈامن سے یوں کہ روشن ہونا نوس میں شمع جوں
صفائی یہ پوشاک کی دیکھو نظر سوچ میں ہے کہ میسلی نہ ہو

زلیورات

وہ ترکیب اور چاند سادہ بدن وہ بار دپہ ڈھلکے ہوئے نور زن
جڑاؤ وہ بالے کے ہالے کا رشک وہ موتی کے مالے کے عاشق کا رشک
وہ موتی کا دولٹا وہ موتی کا ہار سدا اشک، عہدیدہ جس پر شمار
لگا دھلک کی پچھلاست رٹا سراسر گلے حسن اس کے پڑا
جڑاؤ دمکتی وہ چنپا کلی رہے جس سے الماس کو بیگلی
تلے اس کے موتی لگے گرد گل کہ جو شبنم آلود ہو برگ گل
جہانگیر یوں کا کردن کیا بیاں کہ اٹھتی تھی ہاتھوں سے جس کی نفا
جواہر سے مینے کی ہیکل جڑی کمرادر کو لے کے نیچے پڑی
فقط موتیوں کی پڑی پائے زیب کہ جس کے قدم سے گہر پائے زیب
سرا پا اگر ہوزبان میسراتن سرا پا میں اس کے کردن کیا سخن
دُر گوشت جب اس کا تانبہ ہو صدف کا دل صاف شرمندہ ہو
وہ دستِ حنا بستہ خوبی کا باب شفق میں ہو جوں پنجہ آفتاب
مفرق جواہر سے اک جفت کفش نہ وہ جفت پا، بلکہ پا جفت کفش
گلے میں پڑا نیرہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نور عالم کا ایک

طرحدار اک سر پہ پھینا سجا تمامی کا چٹکا کر سے بندھا
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں جو گرتی ہے میلی تو محرم نہیں

شہزادی بدر منیر کا سنگار

بہا دھو کے اس روز ایسے بنی کہ دودن کی سچ مچ ہو جیسے بنی
وہ کھڑے کا عالم، وہ کنگھی کا نگ شبِ ماہ جو دیکھ کر جس کو دنگ
وہ مٹی وہ اس کے لب لعلِ فام سوادِ دیارِ بدخشاں کی شام
وہ آنکھوں کا عالم، وہ کاجلِ غضب کہے تو پڑی نرگستاں میں شب
ستمِ تیں پر سرمے کی تحریر سی کھینچی ہاتھ کا فر کے شمشیر سی
لکھو تادہ پانوں کا مٹی کے ساتھ کہ جوں دامنِ شبِ شفق کے ہوا تھ

اسی طرح شہزادی بدر منیر کے لباس اور زیورات کی جو تفصیل دی ہے، اس میں عورتوں کے لباس کے تمام اجزاء اور زیور دین میں مانگ بھرنے، ٹیکے، بالے، ہیرے کے ٹکے، چنپا کلی، مالامال کی دھمک کی، الماس کی ہیکل، موتی کے مالے، سمجھند، نورتن، زمرود کی پہونچی، دستبند، پازیر، آوازہ دار، مینا کے چھتے، معطر پیرہن۔ ان سب چیزوں کا ذکر ہے۔ محلوں اور بڑی بڑی حویلیوں میں ملازموں کی بھرمار ہوتی تھی۔ مردانے اور زنانے کے نوکر الگ الگ ہوتے۔ میر حس نے زنا خانے کی خواہوں اور لونڈیوں کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے بالعموم ان ملازم عورتوں کے نام پھولوں پر رکھے جاتے تھے۔ صاحبِ خانہ کی حیثیت کے مطابق ان کا رہنا سہنا بھی ان کے رتبے کے مطابق جیگر می اور خوش باشی کا تھا؛

دوا دانیان اور مغلانیان پھوس ہر طرف اس میں جلوہ گاہیں
خواہوں کا اور لونڈیوں کا، جھوم محل کی وہ چلیں وہ آپس کی دھوم
تکلف کے پہنچے پھریں سب لباس رہیں رات دن شاہزادے کے پاس
کنیز ان مہر و کی ہر طرف مندریل چنبیلی کوئی اور کوئی راے بیل

اردعاب کا سماجی پس منظر

رنگیلی کوئی اور کوئی شیا ادب
 کوئی کیتلی اور کوئی گلاب
 کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی
 ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں
 کہیں اپنے پیچہ سنو اسے کوئی
 کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
 بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے
 دکھا دے کوئی گو کھر دموڑ موڑ
 اداسے کوئی بیٹھی حقتہ پیہ
 کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے
 کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر
 کسی کو کوئی دھول مارے کہیں
 کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
 مقابلہ کوئی کھول مستی لگائے
 ام النساء کا جو گن بننا اور پھر سے اپنی اصلی صورت اور لباس اختیار کرنے کا ذکر ہے،
 جلانے کو عاشق کے دکھلا بھین
 تمام کا سببات اس پر لگا
 گلے کی صفائی وہ گرتی کاچاک
 وہ پا جامہ سبز کھنوا اب اور
 کوئی چٹ لگن اور کوئی کامو پ
 کوئی مہرتن اور کوئی ماہتاب
 کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی
 پھر میں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں
 اری اور بسی بکھ پکا رے کوئی
 تہا تے کہیں اور کہیں گالیاں
 کہیں ہولے ری اور کہیں داچھڑے
 کہیں سوت بوٹے کہیں تار توڑ
 دم دوستی کوئی بھر بھر جیہ
 کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلاے
 کوئی اپنی مینا پر رکھے نظر
 کوئی جان کو اپنی وارے کہیں
 اداسے کہیں بیٹھی کنگھی کرے
 بسوں پر دھڑکی کوئی اپنے جملائے
 لیا سرخ لاہی کا جوڑا پہن
 طلا کی طرح سے دیا دگر لگا
 تراتے کی انجیا کسی ٹھیک ٹھاک
 ڈوپٹہ بنا رس کا سورج کے طور

ہزاروں کے زیورات و لباس

ہندوستان میں بادشاہ، غبارے اور امیر زادے بھی زیورات اور عورتوں کے سے کپڑے پہنتے تھے۔

نے شنوی محرابیان میں ایک شہزادے کے تن پران زیورہات کا ذکر کیا ہے:

جواہر سرا سر پہنایا اُسے جواہر کا دریا بنایا اُسے
 کڑے کنگن اور کلغی اور نوزن کیا ایک سے ایک، زریب بدن
 مرقع کا سر پہچ جوں موج آب منور بشکل رخ آفتاب
 وہ موتی کے ملے، بعد زریب خیز کہیں جس کو آرام جاں، دل کا ہیں
 ایک۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

گلے میں پڑا نیشہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
 تمامی کی سنباط جلوہ کناں کہ جوں عکس مدبر آب رواں
 طرہ دار اک سر پہچینا سما تمامی کا پٹکا کر سے بندھا

طوائفوں اور پیشہ ور عورتوں کا سراپا^{۱۸}

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے وہ پاؤں کے گنگنہر دھچکتے ہوئے
 وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں پیر کا نہ دھنتے کا ہر آن میں
 وہ گنگننا، وہ بڑھنا، اداؤں کے ماتھ دکھانا، وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ماتھ
 دکھانا کبھی اپنی چھب مسکرا کبھی اپنی انگیا کو لینا چھپا
 کسی کے چمکتے ہوئے نور تن کسی کے وہ مکھڑے پہنتے کی چھین
 وہ دانتوں کی مٹی، وہ گلبرگ تر شفقت میں عیاں جیسے شام دگر
 دوپٹے کو کرنا کبھی منہ کی اوٹ کہ پردے میں ہو جائے دل لوٹا لوٹ
 عام ہندوستانی رقا صاؤں کے نقشے کے بعد میر حسن نے شہزادی بدر منیر کی رقا صہ عیش بائی کا تذکرہ یوں کیا ہے:

اری، ہے کوئی یاں، ذرا جیو مری عیش بائی کو لے آئیو
 ایضاً: ۵۹، ۶۰ ۵۹
 ایضاً: ۲۶-۲۷ ۱۸

وہ آنے لگی کافر اس آن سے کہ جلنے لگا جی مسلمان سے
عجب چال سے وہ چلی نازیں کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں
وہ خلقت کی گری وہ ڈھن پنا نشے میں بھیمو کا سا چہرہ بنا
لشیں منہ پہ چھوٹی ہوئیں سرسبز کہ بدلی ہو جوں مر کے ابھرو دھڑ
وہ بن پونچھے ہوئوں کی سستی غضب کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی شب
فقط کان میں ایک آلا پڑا کہے تو کہ تھا مر کے آلا پڑا
وہ پتہ آواز اگر لئی، وہ نرگس کا مار وہ کنو اب کے بند روئے آزار
بند صاعہ جوڑا پڑی زرد شان کمر کی چمک اور رنگ کی وہ چال
وہ شب نیم کی انگلیا بنی تنگ چست کناروں پہ عینا بنت کا درست
وہ اٹھی ہوئی چین پشہرازی وہ مسکی ہوئی چوٹی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے وہ پاؤں میں سونے کے دو در کڑے
چلی داں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

۲۰ و ابانِ حرم کی مستورات کی بد چلی اور امر کی بیگمات کا کردار

رنگیاں کو کہ ساری آفت ہیں بیگمیں اور بھی تیا مت ہیں
کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں کون اس میں ہے جو چہنال نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ ہم سے دونی تماشا بین ہیں یہ

۱ ایک تعمیر دار زانی پوشاک جس کے دامن گھٹنوں سے بہت نیچے ہوتے تھے۔ اس کی شکل ایسی ہوتی ہے، جیسے کسی شلو کے نیچے لہنگا جڑ دیا جائے۔ ایک زمانے میں پیشواؤں اور پشواؤں مسلمان عورتیں پہنتا کرتی تھیں۔ اس کے بعد اس کا استعمال گھٹنوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ رنگیاں، ڈونیاں اور بھانڈ بھی ناچتے وقت پیشواؤں پہنتے تھے۔ اودھ کے قصبوں میں مسلمان ناائیں بالعموم سرخ پیشوا پہنتی تھیں۔ اب کچھ فرقہ سے پوشاک تقریباً بالکل ترک ہو گئی ہے۔ دیوان ناز: ۲۰۵-۲۰۶ء (۱۵)

۲ طوق: "نریب عشق" ماخوذ از "اردو ٹٹوی شمالی ہند میں"، ۴۳

بازار

تروں و سطی کے بازار اس عہد کی تہذیب و معاشرت، اور عام طرز زندگی کی عکاسی کرتے تھے۔ مختصراً ان بازاروں سے عوام کی اقتصادی حالت کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان بازاروں میں قم خاں تھے جہاں شعرا اور ادباء جمع ہوتے اور شعر خوانی کا ہنگامہ برپا ہوتا تھا۔ ان بازاروں میں ہر کے رقص ہوتے اور تماشا نیوں کے مجھے لگتے۔ یہاں نجوی اپنی دکانیں سجاتے، جہاں ان کے گروہ کا جمع رہتا۔ یہ بازار تہذیبی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بازار کا منظر ملاحظہ ہو:

اس بازار میں بڑے ہنگامے ہیں... عجب جلسہ ہے، ڈھولک بج رہی ہے شعر خوانی کا ہنگامہ، مطلع، اشعار، خمسے، رباعیات، پڑھ رہے ہیں۔ بعض جل کر کہتے ہیں: میا، کیا خاموش ہو؟ میا، آتش صاحب کا داسوخت پڑھو، شعر سے شعر لڑے، اب چودھویں کو مشاعرہ ہوگا۔ استاد مراد بخش آئینگے۔ حسن خان فیض آبادی سے تکرار پڑی ہے۔ بڑی یاد کر کے آیا ہے، بابا باو پہر پڑھتا ہے۔ ہمیں چار دن کی یاد ہے۔ شیخ گھسیٹا ہمارا استاد ہے۔“

فیض آباد کا بازار

میر حسن نے اپنی شہنوی گلزارِ ارم میں فیض آباد کے بازار کی چہل پہل اور خرید و فروخت گرم بازاری کا بڑا پچسپ منظر پیش کیا ہے۔ ایک طرف جوہری، بزار، صراف اور ملا بیٹھے ہیں۔ ان کے دالان آوازیں دے دے کر گاہکوں کو اپنی طرف ملتفت کر دے۔ کپڑوں کی دکانوں میں کناری، گوٹے اور مسلسل کے کپڑے سجے رکھے ہیں۔ کہیں تر بنانے کے انار لگے ہیں۔ کہیں مالین کھڑی، پھولوں کے ہار فروخت کر رہی ہیں۔ کوئی موتیا پھول بیچ رہا ہے، کوئی آوازیں لگا رہا ہے کہ گنے کی گٹھیریاں ہیں، مصری کی ڈلیاں ڈ

کوئی فرنی اور فالودے کو زد میں رکھے فروخت کر رہا ہے۔ کہیں میوہ فروش، کہیں خوائے والے کہیں نمکین اور چنے والے، کوئی سونٹھ کھٹائی، کوئی پٹی، کوئی خطائی، کوئی چاٹ بیچ رہا ہے۔ ایک طرف کھانے کی دکانیں ہیں، جن میں خشک، سالن باہر نکلا رکھا ہے۔ کہیں کبابی ہیں، کہیں شیرمال، روٹیوں، دودھ اور ملائی والے حلوائی ہیں۔ پھلوں اور پاجن، کھیر، ریوڑی بک رہی ہے۔ کہیں گھاس فروخت کرنے والے ہیں۔ کہیں تھوہ کی دکانیں، کہیں علاقہ بند، موچی، آئینہ ساز وغیرہ۔ غرض کہ ہر پیشہ ور آوازیں لگا لگا کر گھریوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ ان بازاروں میں رقص و سرود کے اجتماع ہوتے تھے۔ کبوتر باز اور عیاش طبع لوگ، وہاں موجود ہوتے تھے۔ میر حسن کا بیان ۲۳ ہے:

کہیں بن ٹھن کے لونڈے ہی کھڑے ہیں	انہوں کے گرد عاشق جا اڑے ہیں
کہیں ہیں زبڈیاں ہی ماہ پارہ	انہوں کا کرتا ہے کوئی نظارہ
پھر دین کھترانیاں سنتوں کے ہراہ	کہیں ہندو بچے بھرتے پھرتے آہ
کہیں گھڑ کوئی پیتا ہے باہم	لگا تا ہے چرس ہی کا کوئی دم
اڑاتے طوطیاں لے ہاتھ اپنے	مدے پھرتے ہیں لے کر ساتھ اپنے
کوئی سیٹی سے زیں چہ چکرے ہے	کوئی دم منہ سے طوطی کا بھرے ہے
ضلع بوے سے کوئی، کوئی پھکڑ	کہیں ٹھٹھا، کہیں ہے، دھول تھڑ
کہیں سکھیاں، کہیں کھنڈ اور جلت ہے	ادھر ہے سانگ اور ادھر سنگت ہے
کھڑا کوئی کہیں پونجی بجا دے	کوئی لونڈے کو آگے سے بجا دے
روایچے کوئی، کوئی کرے کھیل	لیے بیٹھا ہے سانڈے کا کوئی تیل
کوئی کھوے کتابیں سود توں کو	دکھا دے نیک و بد کی صورتوں کو
زبس ہے عیش و عشرت کا وہاں مانڈ	کہیں ناچیں ہیں کشمیری، کہیں بھانڈ
کبوتر کے کہیں شوقین ہیں جمع	کہ جوں پروانے ہو دیں بر سر شمع
غرض موجود ہے سب جنس دنیا	کہیں بلبل، کہیں ہے لال مینا

کہیں انڈے پچک اور سر لڑے ہیں یدر بیضا لیے مہر و کھڑے ہیں،
نقطہ نور و زبرد کیا برس کے برس اسی تفسیر بیضاوی کا ہے درس
کسی کا کوئی وہاں مانع نہیں ہے کہیں ہے نقل اور قصا کہیں ہے
بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را بکسے کارے نباشد

دہلی کے چوک کا بازار

چوک نامی بازار شمالی ہندستان کے ہر بڑے شہر میں تھے، لیکن دہلی کا ”چاندنی چوک“ اپنی خواہش اور دکشی کے لیے بہت مشہور تھا۔ دور دور سے لوگ اس بازار کو دیکھنے آتے تھے۔ درگاہ قلی خان نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پرند بھی اس پر گرے پڑتے تھے۔ میر حسن نے اس بازار کیوں ذکر کیا ہے؟

یہ دھچپ بازار تھا چوک کا کہ ٹھہرے جہاں پر وہیں دل لگا
جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے کہے تو کہ تھتے تھے گلزار کے
وہ پختہ مکافوں کے دیوار دور سپیدی پہ جس کی نہ ٹھہرے نظر
صفہ پر جو اس کی نظر کر گئے اسے دیکھ کر سنگ مرمر گئے

اس دور کی اردو شاعری میں دہلی کے دوسرے بازاروں کا ذکر بھی ہے، لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی۔

چاؤڑی کا بازار

’چاؤڑی‘ مرہٹی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں گھاڑ، پولیس چوکی۔ مرہٹوں کے دور اقتدار میں اس بازار میں پولیس چوکی تھی۔ حوض قاضی سے جامع مسجد کی طرف جانے والی سڑک پر یہ بازار آج بھی موجود ہے۔ سودا کے ایک شعبہ میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ اس نے کوتوال کی ہجو میں لکھا ہے کہ عین تھانے کے راستے میں بھی رہنری کی وارداتیں ہوتی ہیں؟

۲۴ ایضاً: ۱۵-۱۶؛ نیز کلیات سودا: ۳۶۶ ۲۵ کلیات سودا: ۱، ۱۱: ۳۷۸

اردو ادب کا سماجی پس منظر

دیکھیں ہم نے جو راہ چاؤڑی کی ہشتم ہے رہزنی تلاؤڑی کی

یہ بھی شاہانِ مغلیہ کی دلی میں ایک اہم بازار تھا۔ اس کا محل وقوع وہ تھا، جہاں اب پریگنڈ کے نام سے ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ یہاں پہلے پانچ بڑے بڑے محلے اور بازار تھے جن میں بیگم بازار، اردو بازار، خاص بازار زیادہ مشہور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۸۶ء میں ان علاقوں کے کرخندار باغیوں کے لیے اسکو ڈھالتے تھے اس لیے انگریزوں نے سارے علاقہ کو مسما کر کے اسے زمین کے برابر کر دیا۔ ان بازاروں کے انہدام کا ذکر غالب کے خطوط میں بھی بہت جگہ ملتا ہے۔ سودا لکھتے ہیں :

خاص بازار کا جو سنیہ بیان اون نے نزدیک کے کاٹ ٹالے کا

گڈڑی کا بازار

لفظ گڈڑی غالباً گڈری کی تحریف ہے۔ گڈری کو اردو میں ٹھنڈی سڑک اور آج کل کی اصطلاح میں ال روڈ کہتے ہیں۔ قریباً ہر شہر میں گڈری بازار موجود تھے جہاں لوگ سرشام سیر کو جایا کرتے تھے۔ معنی نے کہا ہے :

ہوتا ہے سرشام تماشا گڈری کا

دہلی کے اس بازار میں غالباً اس زمانے میں خاص طور پر کبوتر فروخت ہوتے تھے جیسا کہ سودا کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

وہ تو کچی کا ہرگز ہم کو لکھے نہ نامہ گڈڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گوئے

اردو بازار

دلی میں جامع مسجد پر آج بھی اردو بازار موجود ہے، لیکن اسے شاہانِ مغلیہ کے عہد کے اردو بازار

سے کوئی علاقہ نہیں بدلتی میونسپلٹی نے انگریزوں کے زمانے میں اسے یہ نام دے دیا تھا۔ اصل اردو بازار لال قلعے سے متصل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تیکم بانا ماروا خاص بازار کی طرح یہ بھی سمار کر دیا گیا تھا اردو بازار کا یہ نام قلعے کی رعایت سے تھا جسے اردوے معلیٰ کہا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں اس بازار میں کتب فروشوں کی دکانیں ہیں؛

میسو اور سفیر نے یہ سب کا نام اردو بازار ہی گیا ہے تمام

حقہ نوشی

اردو شاعری میں حقہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ حاتم نے حقہ نوشی پر ایک مثنوی لکھی تھی جس کا ذکر کہیں کر چکا ہوں۔ میر حسن کی مثنویوں میں بھی حقہ نوشی کے حوالے ملتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر طبقے کی عورتوں میں بھی حقہ پیا جاتا تھا۔ مثلاً شہزادیوں کے حقہ پینے کے ذکر میں کہتے ہیں:

خوام ایک حقہ لیے تھی کھڑی کہ لالے کی پتی تھی اس میں پڑی
وہ شیشے کا حقہ، مربع کا کام مطلق زری کا وہ نیچہ تمام
وے ایک اس پر پڑا تھا جو بیچ یہ سب اس کے آگے تھے گویا کر بیچ
لب نازک اوپر وہ منہال دھر نکالے تھی پردے سے دودھ جگر

پھر خواصوں اور نوٹوں کا یوں ذکر ہوا ہے:

ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیے دم دوستی کوئی بھر بھر جیے
اور عام عورتوں کی حقہ نوشی کے بیان میں کہتے ہیں:

کوئی شربت کوئی ساتو بنا کسی کو کوئی حقہ ہی پلاتا
مجھے حقہ سے کب تھا سرگھرا نہ بھاتا تھا کسی کا منہ لگانا

اس باب میں دوسرے شعرا کے ہاں بھی کچھ کم تذکرہ نہیں ہے:

۲۸ دیوان فاکر: ۲۱۵ . ۲۹ مجموعہ مثنویات میر حسن: ۸۰

۳۰ ایضاً: ۳۱

۳۱ ایضاً: ۱۳۷، ۱۳۸

معدوب کا سماجی پس منظر

- ۳۲: شوقِ بنِ دل میں نہیں دم مار سکتے آہِ گرم
- شب دھواں حقے سے بچھے، جب چلم پر پڑا آگ
ترے اے غنچِ لب، دم کے انروس چلم میں ہو گیا ہے گلِ تماکو
فاکر لائی: پُر تکلف حقے اور منہاں دیکھیں ہیں جہاں
صاف لڑکے دلربا کھاتے ہیں جاگر بچہ واں
۳۳: مصطفیٰ! جو دم حقہ کا دوں، بولسکے میں حقّا نہیں پیتا
بھر و جلدی سے کر سنا نہیں پیتا
۳۴: انشا: سرد آزا دکئی حقہ کش انیونی نے
بیچے ایک ادھی کو اور کوٹے لئے ڈھاک کے مول
حقے سے حقے، چلموں سے چلمیں بھی لڑیاں
بچوں سے نیچے، گرا گڑوں سے گرا گڑی لڑی
۳۵: نصیر: کوئی کہتا یہ نئے قلبیاں کو
فریادِ دفعاں میں، دیکھ، سرگرم نہ ہو
دمِ مشق کا کیا بھرے ہے، اے سوختہ جاں!
آتی ہے ابھی منہ سے ترے دُور کی بو
۳۶: شیخ محمد بخش مہجور: حقہ تازہ کر کے تو بھر دیکھو
اور کہیں جو کچھ، سودہ کر دیکھو
۳۷: نظیر اکبر آبادی نے ایک پوری نظم ”حقہ“ کے عنوان سے لکھی ہے:
جب سے حقہ لبِ جان بخش کا ہر لڑ کیا
تب سے حقِ حق کیا کہ تو کی سی کچھ آدنا ہے
۳۸: دیوانہ آبرو: ۱۵۹/۱۰-۱
۳۹: دیوانہ مصطفیٰ، ۲: ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴
۴۰: ایضاً: ۳۰۶، نیز تذکرۂ ہنسکا: ۳۱
۴۱: دیوانہ مہجور (طبعی): ۳۱
۴۲: کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۹۰۲-۹۰۳

نظر: ۳۹ پی کے قلیان اپنا ہر دم غیر کو اس نے دیا
میرے ہاتھ آیا تو کوئی بعد اس حدت کے گھٹ

پان

پان کے موضوع پر اردو شاعری میں بیشتر اشعار ملتے ہیں اور عورتوں اور مردوں میں ماحول پر پان کھانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ ان اشعار میں لوازمات پان کے بھی اشارے ملتے ہیں چنانچہ اشعار ملاحظہ ہوں:

آبرو: تمہارے لب کی سرخی لعل کی مانند اہلی ہے
اگر تم پان، اے پیارے! نہ کھاؤ گے، تو کیا ہوگا
شکر ناجی: غیرت میں دل شفق کا چرنا ہوا ہے پھٹ کر
تیرے لبوں کے ادھر دیکھا جو رنگ پان کا
جو کوئی جامہ زبوں کو لگا لینے کی دھن رکھے
تو پاس اپنے اہلاچی، پان سپاری کے دھن کھٹے
ماقم: چنگیر دپان دان دچو گھڑی سب گل دپان دپاری سے بھرے تبتا
میرزا: خط منہ پہ آئے جانناں خوبی پہ جان دیگا
ناچار عاشقوں کو زخمت کے پان دیگا
معصی: سرخی پان کا عالم دھن تنگ میں دیکھ غنیمت محل میں کیا جس نے گلستاں پیا

- | | | | |
|----|---------------------------|----|----------------------------|
| ۳۹ | دیوان نظر چارم: ۳۵ | ۴۰ | دیوان آبرو: ۹، ۴۹، ۵۷، ۱۵۷ |
| ۴۱ | دیوان شکر ناجی: ۶ | ۴۲ | ایضاً: ۳۳۲، نیز ۲۳، ۳۳ |
| | ۶۶، ۶۹، ۸۲، ۲۲۲، ۲۹۲، ۳۲۵ | | |
| ۴۳ | دیوان زادہ: ۴۰۵ | ۴۴ | کلیات میر: ۴۴، نیز ۷۹، ۶۱ |
| | ۱۱۵، ۲۲۹ | | |
| ۴۵ | دیوان معصی: ۶، ۷، ۱۷ | | |

اردو ادب کا سماجی پس منظر

انشا: پان جو ہاتھ سے کل غیر کے تو لے کھلایا
 پی کے لو ہو کو غرض گھونٹ رہے ہیں ہاتھ
 میں نے دیکھی ہے اس کے کانوں میں گنگ
 کیوں نہ خوش آوے مجھ کو پان میں گنگ
 میرن، ٹھکڑا وہ پانوں کا مٹی کے ساتھ
 کہ جوں دامن شب شفقت کے ہیں ہاتھ
 کوئی مور چھل لیے، کوئی پیکر دن
 کوئی لے چنگیواہ کوئی ہار پان
 دے میں غم سے بے برگ، دنوا تھا
 مجھے تو پان دتے سے کیا تھا
 منگاتا تھا میں جس خاطر کبھی پان
 اُسے کر یاد جاتی تھی میری جان
 کسی کے ساتھ پانوں کی پٹاری
 بھرا ٹھوے میں کتھا ارد سپاری

ہم ہندستان کی مروجہ سواریوں کا تفصیلی ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف ان سواریوں کا ذکر ہو گا جن کی نشاندہی اردو ادب میں پائی جاتی ہے:

بہل

بہلا دئے کوچی کے شاید عزم اردھر کا

دل لے پٹے ہیں پیارے تیری بہل کے کیئے

بہل دگاڑی میں سب چلیں نسواں

کوچہ و بازار میں بہا چیں چال

بہن درخت میں بھری ہیں سب عجات

۴۷ ایضاً: ۱۹۹

۴۶ کلیاتِ نثر: ۲۰۶، ۳۴، ۷۷، ۷۸

۴۹ ایضاً: ۸۰

۴۸ مجموعہ شذریاتِ میر حسن: ۶۷

۵۱ ایضاً: ۱۳۸

۵۱ ایضاً: ۱۳۷

۵۳ دیوان شاکر ناجی: ۲۲۵

۵۲ ایضاً: ۱۵۷

۵۵ ایضاً: ۲۱۷، کلیاتِ میر: ۹۵۹

۵۴ دیوانِ فائز: ۲۱۵

پالکی

اردو کے شاعروں نے بالعموم اپنے مرتبوں کی پالکیوں کی تعریف میں تعصیدے لکھے ہیں ۱۱
اس بارے میں متفرق اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

محمد قاسم قاسم نے نواب نامدار خان کی سواری کی پالکی کی تعریف میں یہ قطعہ کہا تھا: ۵۶
نواب پالکی میں تیری ہے وہ ندق برق

چشم ستارہ خیو ہو جس کے خیال سے

اس لطف سے ملائی کا کہا ہے بانس پر کہا

فرحی یکے ہیں مہر کی گویا ہلال سے

ہدایت خان ہدایت نے نواب تاج الدولہ میرک حسین خان کی پالکی کی تعریف یوں ۵۷
کی ہے:

عجائب سبز رنگ وہ پالکی تھی

مقطع زیب میں جوں نالکی تھی

کہ جس کی صن و خوبی دیکھتاؤں

کہا روں کے اس کے پاؤں

ہلالی دیکھ اس کے بانس کا خم

بلندا فلک کا غفلت سے قدم

کہا اس پالکی کے باد پاتے

ہنر میں جلد چلنے کے بلا تے

شکرناہی: گلابا ہے اگر فیرو اس کی سواری میں

پھوڑے پالکی کہنے کو ہے حاضر جلوں کو ۵۸

سودا: ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے

جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے ۵۹

انشاء: اپنے گھوڑے پر چڑھا کر یہ نہیں سمجھتی تھی

مگر چوہا لردار ہے پھر پالکی کی پالکی ۶۰

۵۶ عیار اشعار ۱۹۲۵ء ص ۵۷ کلیات ہدایت: ۲۸۱ ۵۸ دیوان شکرناہی: ۴۰

۵۹ کلیات سودا: ۱۰۱ ۶۰ کلیات انشاء: ۱۶۳

احد عذاب کا سماجی پس منظر

تذکرہ آبادی:

وہ بالکی بنی تھی سنہی جوں نکلے جہاں رہے جس کی ہوتے تھے مرنے پڑنے
لانا لکی پہ موت نے جب کر لیا سوار پھر وہ نہ بالکی، نہ وہ جہاں رہا نہ کھار

ڈولی

انشاء اس پری زاد کے جی مدتے کہا یوں جس نے
میری ڈولی میں لگا دیکھو مہرا پر دے
کچھ نہیں معلوم، پوچھو، کونسا سیلا ہے آج؟
جاتیاں ہیں جو کچھ کچھ ڈولیوں پہ ڈولیاں
سننا جاتا ہے جی اپنا دو گانا، اس گھڑی
گھر سے جانے کو منگاتی جس گھڑی ڈولی پہ تو
اڑیں سے ہو دے وہ ڈولی میں جب سوار
لپٹا تے کیوں نہ دیکھ کے مہرا ازار بند

نالکی

معصی نے شہزادہ سلیمان شکوہ کی نالکی کی تعریف ان اشعار میں کی ہے
ہے نالکی جو سواری کی تیری، اے ممدوح!
ہنگ تخت سلیمان بہر طرف سیار
میں اس کے قہر زریں کی کیا کرد تعریف
کہ چرخ کھاتے ہے نت جس پہ گنبد نقد

۶۱ کلیات تذکرہ آبادی، ۵۳۷ ۶۲ کلیات انشاء، ۲۱

۶۲ ایضاً: ۲۰۱ ۶۳ ایضاً: ۲۰۴

۶۵ دیوان معصی ششم: ۱۵۱، کلیات سودا، ۳۷۱

اصحاب کا سماجی پس منظر

دورِ دنگی اوس کی ہے ازبکہ شکلِ محرابی
 کریں ہیں سجدہ اوسے دیکھ کافر و دیندار
 دونوں اوس کے جو ہیں دوش پر کہا روں کے
 تمام لطف و ترمیم برنگِ دستِ نگار
 انشاء گھٹا ٹوپ اس پری کی ناکی کا کچھ ہوا اچھا
 توپاٹ اس میں لے کر چادرِ مہتاب کا جوڑا
 تو بھی ہے ایک شہزادہ چاہیے تیرے لیے
 مورچیل دو ہوں مہما کے اور مستحقِ ناکی

بیل گاڑی

چلا گاڑی میں یوں آیا میں ناچار قفس میں جس طرح صید گرفتار
 بیل گاڑی کا ڈھانچا نو ہے کی ایک سلاخ پر رکھا ہوتا تھا جو دھری کہلاتا تھا۔ انشاء نے
 ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے:
 چودھری جی! چلے وہ کیا گاڑی کبھی پہیوں میں جو دھری نہ گئے
 وہ گاڑیاں جو دھریں تھیں گھوڑوں سے بیشتر
 ناگدہی اُن کے ہاتھی کے پاٹھے سے خوبتر
 پہیا قضا کے ہاتھ سے جب اٹتا آن کر
 گاڑی اُدھراٹ گئی، مالک گمراہ دھراٹ

۶۷ کلیات انشاء: ۲۶

۶۶ دیوانِ معنی، ۲: ۹

۶۸ ایضاً: ۱۶۳

۶۹ تنویاتِ میر حسن دہلوی: ۱۳۶

۷۰ کلیات انشاء: ۲۱۱

۷۱ کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۵۳۷ نیز دیکھیے کلیات میر: ۹۵۹

ہنڈول

دوا: لی ز ڈولی انہیں، جو تھے صاحبِ چنڈول^{۷۲}
بیٹے کے پھر پاس وہ اک ڈولی کے بغیر کہا دیکھوں میں، لا، ہاتھ دے^{۷۳}

رتھ

الکناجی: جو لڑکا سیر میں ہمراہ ہو گھر میں نہ آوے دے^{۷۴}
تو جانے دے زنا نہ ایک ٹھلا رتھ میں دل پہلا
نز: پہل درتھ میں بھری ہیں سب عورات
آشنا ساتھ اپنے کرتے ہیں با ست^{۷۵}
معنی: گذروں ہوں جو آگے سے میں اس رتھ (کے)
منہ اپنا لگا دیوے ہے چمن کے برابر^{۷۶}
طیر اکبر آبادی:

تھیں وہ رتھیں کہ بیٹھتے تھے جن میں پھیل پھیل
بچتے تھے رنگ اور تھے کلس ان کے جوں شہیل
رتھ بان نے اجل کے جوہں کر لیا دیل
پھر کس کی چھتری، پیچھے کہاں، اور کہاں کے یل^{۷۷}

بانہ

بھو، آئی یہاں سے میانہ
۷۸ کلیات سودا، ۱۱، ۳۷۱ ۷۹ ۱۱، ۳۹۲ ۸۰ اپنے سوار کر لے آنا
۷۷ دیوان فائزہ، ۲۱۷ ۷۸ دیوان معصی، ۲۷: ۲۴ (دب)
۷۹ کلیاتِ نکیر اکبر آبادی، ۵۳۷ ۸۰ دیوان معصی، ۵: ۱۲۱ (الغ)

اشعار کا سماجی پس منظر

نظیر اکبر آبادی نے ذیل کے اشعار میں تمام قسم کی ساریوں کا ذکر کر دیا ہے:

ہاتھی جو تھے پہاڑ کی مانند تن سیاہ
جن پر کہیں عماریاں رخشندہ رشک ماہ
ہو دود کی بھی چمک پہ نظر ہتی نہ تھی نگاہ
کس عیش سے چڑھے ہوئے پھرتے تھے واہ وا
گھڑ بھل، فیل بھل، شتر بھل، راہوار
ہر لد کی بھل، بکری بھل، گھنٹے گھنٹرو دلو
مالک چڑھا جو موت کی ڈولی پہ ایک بار
پھر پہلیاں، نہ بھل، نہ جھنکار، نہ پکار
میان، محنت اور وہ چند دل، بگھیاں
وہ بیسیں، وہ پوچھے، وہ چلے خوش نشا
مالک ہوا اجل کے جو کھڑے کھڑے پرداں
بوچا گیا، نہ ساتھ میا نہ گیا، میاں!
چمکڑے، لڑھے، رہکے، شتر بھل اور چمچر
ٹٹو، حمار، بھینسے، وہ لانے کے گورخ
مالک چلا جو مرگے کے انکے کو چھیر کر
بھبھنا گیا نہ ساتھ نہ ٹٹو، نہ گاؤرخ

گھریلو ساز و سامان

گھروں کے دروازوں پر بالعموم پردے یا چقین ڈالی جاتی تھیں،
دیچھ انشا کو ایک حور شراد ہے کھڑی دون کو حق کی ادھ لگی

۷۹ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۵۲۶-۵۳۸

۸۰ کلیات انشا: ۱۴۳

اردو ادب کا سماجی پس منظر

ہے یہ دالان بری حکم جو پو توں میں ایک رو پہرا لگے، اور ایک سنہرا بھٹا^{۸۱}
 دالان کے فرش پر چاندنی، قالین اور چادر بچھائے جاتے تھے،
 مسند و فرش اگر نہیں تو عبث کیوں ہے لموں
 آج قالین ہے آخر تو لے گا گل مسین^{۸۲}
 جس گھر میں تیرے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
 وہاں چادر مہتاب ہے مکھڑی کا سا جالا^{۸۳}

مسند

دالان یا دولت خانے کا وہ ادب کا مقام جہاں مالک خانہ بیٹھا کرتا تھا:
 پھولوں کی سیج پر سے جو بیدار غاٹھے
 مسند پہ ناز کی جوتیوری چڑھا کے بیٹھے^{۸۴}

تہ خانے اور خس خانے

ہندستان میں چونکہ سخت گرمی پڑتی ہے، اس لیے یہاں کے باشندے اکثر اپنے مکانوں میں
 تہ خانوں کا اہتمام کرتے تھے اور اہل ثروت موسم گرما میں خس خانوں میں دن گزارتے تھے،
 آمارہ پڑے پھرتے ہیں کیوں دھوپ میں، صاحب!
 تہ خانہ میں سو رہیے نا، چلتی ہے مہا گرم^{۸۵}
 ہیں مڑگاں اس نمطِ دام بہر کی ٹٹیاں
 جس طرح گرمی میں چھڑکی جائیں خس کی ٹٹیاں
 باس سخا نہ میں خس کی کیا بھلا باقی رہے
 جب کہ روگرداں ہوں پھر لگے برس کی ٹٹیاں^{۸۶}

۸۱ ایضاً: ۲۱ ۸۲ دیوان شاکر ناجی: ۱۶۴ ۸۳ کلیات میر: ۱۳۹

۸۴ ایضاً: ۳۶۹ ۸۵ کلیات انشا: ۸۴ ۸۶ ایضاً: ۸۸

خسٹانے ہیں مچھڑ کے ہوئے اور عطر شاں ہیں

پنکھا

غربا عام طور پر گرمیوں میں ہاتھ کے یا چمٹ کے پنکھے استعمال کرتے تھے۔ برسات کی آواز کے عنوان والی نظم میں نظیر کہتے ہیں:

پنکھے کوئی پکڑے، کوئی کھوے، کوئی کھڑا بند

دم رک کے گھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

نظیر نے ”پنکھ“ کے عنوان سے ایک پوری نظم لکھی ہے:

کیا موسم گرمی میں نمودار ہے پنکھا خوبوں کے پسینوں کا خمدار ہے پنکھا

گلرو کا ہر اک جا پہ طلبگار ہے پنکھا اب پاس سرے یار کے ہر بار ہے پنکھا

گرمی سے نصبت کی بڑا پار ہے پنکھا

غسل کے لوازمات

پیروں کا میل جھانویں سے صاف کیا جاتا تھا۔۔۔ لوگ بالعموم چکی پر بیٹھ کر ہاتے تھے،
پلیسٹک ٹیکری ایک ڈھونڈ کے لارے جس سے

اپنی رگڑا کر دیں میں پانٹو کی ایڑی..... اتنا

شیخ جیو صاحب ہیں جو نہایتے مشک سے بیٹھے چوک پر

۹۱
مونڈی مانڈی چندیا پر کیا خوب تر بڑے بڑے ہیں

۸۷ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۶۵۲ ۸۸ ایضاً: ۵۶۳

۸۹ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کلیات نظیر اکبر آبادی: ۵۷۰-۵۷۲، ۸۵۰-۸۵۱

۹۰ کلیات انشا: ۱۸۷

۹۱ ایضاً : ۸۸

گھسریلو برتن

کہا نا پکانے اور کھانے کے برتن عام طور پر کابری، دیگیوں، دیگیوں، کڑا ہیوں، ہنڈیوں، قابلو پر مشتمل تھے:

مہمان میرا مت ہو بخوان فلک پہ بگڑ	خالی یہ مہر دم کی دونوں کابیاں بگڑ
مدد منی دیگ ہے شکم اس کا	نفس اڑ دھا ہے دم اس کا
راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی	جاٹ جاتا ہے دیگیوں تک بھی
گوشت ہانڈی بھر ہے خشک میں	ہنڈیاں گویا تھیں اس کی خشک میں
نڈلے دیکھ کر وہ تاب پلاؤ	منہ ہے منہ بیٹا گرہ کھاوے کھاؤ

آفتاب: لوٹا

منہ ہاتھ دھونے کے لیے لڑنے کا استعمال ہوتا تھا:^{۹۷}
منہ دھونے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب

کہا دیگا آفتاب کوئی خود سر آفتاب

اٹھارویں صدی میں مٹی کے برتن بھی کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے "کوہا برتن" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں گولی، شکا، شلیا، لوٹا، کوزہ، جھوڑا، دھیو کا ذکر کیا ہے۔ اس کا پہلا بند ہے:

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی	جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
بلوند پانی کی ان میں جب کھنکی	کیا وہ پیاری صدا سے سن کی

۹۳ ایضاً: ۳۳، نیز کلیات: ۲۰۰

۹۵ ایضاً:

۹۷ ایضاً: ۶۳۷

۹۲ کلیات سیر: ۱۰۱

۹۴ کلیات سیر: ۸۳۷

۹۶ ایضاً:

۹۸ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۵۷۲ - ۵۷۴

اردو ادب کا سماجی پس منظر

تازگی جی کی اور تری تن کی

دواہ کیا بات کو رے برتن کی

سونے بچھانے اور ٹھننے کا سامان

پلنگ

تم نے پلنگ اور بچھایا تو کیا ہوا تم جانتے ہو مجھ کو کہ میں ہوں پلنگ نہ عرض^{۹۹}
اک خلق وادخراں۔ تہہ قالے در پے آج کچھ چارپائیاں ہیں دھری، کچھ پلنگ نہ رخ
پلنگ کون چھوٹا غالی گھوٹا میں جب اٹھ گیا مینا چترکاری لگی کھانے بہن کوں گھر ہوا مینا

چارپائی

چارپائی وہ لگا، بھاند کے آئی کس راہ ایسی دیوار بڑی سے۔ اجڑ، بیرات غلط^{۱۰۲}
مصطفیٰ نے ”در بخو چارپائی“ کے نام سے ایک شغوی لکھی ہے، جس میں چارپائی کی خرابیاں بیان کی ہیں:

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے گود ہے، یا کنواں، یا کھائی ہے
پتی، پاپے تناسم ناہموار اور بانوں کی جمبول جیسے کہ غار
کچے دوا کچے ہے بسکہ وہ یکسر نعش گروں کو رشک ہے جس پر
کیوں نہ دل داغ غم سے ہو بے تنگ کہ درندے ہوئے ہیں مثل پلنگ
ڈھانچ ہے اس کا بسکہ اکول جلون کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چول

۹۹ کلیات انشا: ۶۸ نیز ۲۰۰/۷۷

میر حسن: ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۷

۱۰۲ کلیات انشا: ۱۹۷ نیز دیوان مصطفیٰ، ۶: ۱۴۷

۱۰۳ کلیات مصطفیٰ (مرتبہ نثار احمد فاروقی)، ۱: ۲۲۳، ۲۲۴ نیز دیکھیے کلیات میر: ۸۱۶

امداد اب کا سماجی پس نظر

پایے ہیں کہنگی سے زرد سیاہ سبردون کا بھی حال پھر چہ تباہ
 بسکہ ہے ڈھلڈھلی دھچ دھچر چول کو روز چا چہ پچس
 اس کی کتا ہوں جس دم ادواتن اک ندا اس گھڑی تو جائے ہے تن
 لیک جس وقت اس پہ پاؤ دھرا جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا
 بانٹ کی اس کی کیا کرمل تعریف تھا وہ بافسدہ بسکذات شریف
 چیدر کھے ہزار بانوں میں گر ہیں ہیں بیشمار بانوں میں
 گر گدیے کا اس پہ ہو بستر تو بھی جھستی ہیں پھانسیں جو نشتر
 آکے جب رات اس پہ سوتا ہوں کر کے ضامن کو یاد کرتا ہوں
 یہ وہی ناتواں پلنگ گڑھی ہے جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے
 نہ چھپر کھٹ سے اس کی نسل ملے زکھٹوں کی قسم کوئی کہے
 بسکہ ہے تنگ گیر اس کا بانو اس پہ سیٹے پڑیں ہیں کاٹھ میں پاؤ
 نیچے اد نیچے اس کے ہیں پایے ہیں معطل زمین پہ پروائے
 بسکہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا مارے غصے کے میں نہیں سوتا

پیر کھٹ

پلنگ جس کے چاروں پایوں میں اد پر کی طرف کبھی ڈنڈے اٹھا کر چھت کا چوکھٹا بنا
 جاتا ہے امد اس پر مسہری وغیرہ تان لیتے ہیں:

اتنی رچی ہوئی تھی یہ پردوں میں کس کی باس
 یوں میں نے مگر کے شب جو چھپر کھٹ غصے کیا

موسم سرما کا اور صحن چماون

لحاف اور رضائی

جاڑے میں کیا مزہ ہوا وہ تو سمٹ رہے ہیں
 اور کھول کر رضائی، ہم بھی لپیٹ رہے ہیں^{۱۰۵}
 کھینچ لے، کاش وہ پری، اپنے مجھ لیٹ میں
 یا کہ بلا سے پھینک دے دامن کوہ قاف میں^{۱۰۶}
 معصیٰ نے شہزادہ سلیمان شکوہ کی خدمت میں ایک قطعہ "در مدح و طلب لباسِ سرا" لکھ کر موسمِ سرا کے لباس کی فرمائش کی تھی:^{۱۰۷}
 نہ اس کو کمیس ملے نہ لہادہ نہ پیٹو
 نہ کوئی رضائی بھی میلی سی نہ چروانی شال
 بجائے تو شک اک بوریہ ہے فرشِ پلنگ
 ہے اس کے نیچے کچھی برتنوں گھوڑ کی پرال
 بوختِ خواب ہے پوششِ خان کی جاگہ
 خسریدہ ہاری کی دورندہ غسال

شال، دوشالہ، اور کجیل

گر پڑا جو دوشالہ بھی پڑا چلون پر ٹانگ جو تم نے دیا تھا، سونہ ٹھہرا پرفہ^{۱۰۸}
 ۷ کہیں ہے شال بات ایسا، جو جاڑی تک بند لگئے^{۱۰۹}

۱۰۵ کلیات، انشا: ۱۹۵، نیز ایضاً: ۱۹۱، ۲۰۰، ۲۰۸

۱۰۶ ایضاً: ۹۱ ۱۰۷ دیوان معصیٰ، ۶: ۵۵۱-۵۵۲

۱۰۸ کلیات انشا: ۲۱ ۱۰۹ ایضاً: ۲۳، نیز ایضاً: ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۲

امداد پہ کامیابی پس نظر

سرد مہری کر بکھلے گلو نے اور دھڑی امیر بہار نے بھی شال

کبیل

تھے جو کبیل پوش ان کے سامنے کیا تنگہ

صاحب شال دسمرد و قائم و سخاں کا

تکیہ

تکیہ تیرے سر ہانے کا سو مجھ کے فحش زکیوں ہوں میں

آتی ہے وہ زور باس سحرے سے اس فلاف میں

اس پر تکیہ کیا تو تھا لیکن رات دن ہم تھے اور بستر تھا

اشیائے خورد و نوش

کلیا

ایک طرح کی غیر روٹی

کسی حسین کا ایک منہ تو تھا ہی کلیا رچاڑ اور ہوئی اسب کاں پٹیٹے

کمال کلچے سے پھرتوے سے سیاہ کاسہ سر ہے جیسے اوندھا کرنا

ہنجیری

ایک قسم کی میٹھی چیز تھی جس کو میوے اور بجوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ یہ میوے اور بھج گئی اور شکر

کلیات: انشا: ۲۷۰

کلیات: میر: ۸۶

کلیات: سن: ۷۰: نو (عنا) ۱۱۸۱-۱۲۷۷ ۱۱۳ کلیات: میر: ۲۷۰: نیز (عنا) ۳۱۳-۳۱۵

کلیات: میر: ۸۳۳

کلیات: (ک): ۱۶۱

کے ساتھ بھول کر مہدیے یا سوچی میں ملا دیے جاتے تھے۔^{۱۱۷}
کیا پختہ پوری سیلی سیلی ا جی جو کہ ہونٹوں میں مگر بھری نہ لگے

سموسا

ہے ایک تمناعت کو فقط نا ان جویں بس
درکار نہیں ادن کے تکلف کے سمو سے^{۱۱۸}
اردو ادب میں اس عہد کے ہر قسم کے کھانوں، مٹھائیوں، حلویوں، روٹیوں اور اچاروں کا مجموعہ ملتا ہے۔^{۱۱۹} مونگ پھلی اور پنیر اور ساگ کے ذکر کے دو تین شعر سنیں:
نرماہٹ اور نگلیوں کی ان کی نہ پوچھو مجھ سے
ہے صاف داں تو عالم اک مونگ کی پھلی کا^{۱۲۰}
کھانے والی جو تھی مصفیٰ چنے کی ساگ

۱۱۶ ہفت تماشاً: ۱۵۲ ۱۱۷ کلیات انشا: ۲۱۱

۱۱۸ ایضاً: ۱۸۲

۱۱۹ مجموعہ ثنویات میر حسن: گولیاں، اندر سے، بیڑے، برنی، لونڈے، حبشی طوں وغیرہ

۱۲۰ (۱۵۰-۱۵۱)؛ ثنائی کباب (دیوان آبرو: ۵۹)؛ بسنی روٹی (کلیات سودا، ۱: ۳۶۴)

مسود کی دال اور جو کی روٹی (ایضاً، ۱: ۳۶۶)؛ گوشت میں چنے کی دال (ایضاً: ۳۶۶)

۳۸۲-۳۸۵، ۳۸۷، ۳۹۲)؛ گڑ اور طلیبی (دیوان فاکر: ۱۸۱)؛ پڑا (ایضاً: ۲۱۰)

حلوا اسوہن (دیوان شاکر ناجی: ۶۴)؛ نان خطائی (ایضاً: ۲۲۴)؛ امرتی (ایضاً: ۶۴)

؛ طیر مال (ایضاً: ۲۹۹)؛ بلاؤ، مربا، اچار (دیوان زادہ: ۳۴۹)؛ گنگلا (دیوان غلام)

۹۰، ۹۰، ۳، ۳، ۳، ۵۰)؛ موٹھ مٹر (ایضاً: ۵۱۲)؛ نیز کلیات نظیر کبر کبلی: ۶۰

؛ روٹی، نان اور غنی روٹی (کلیات میر: ۸۳۳-۸۳۴)؛ دیوان فاکر ناجی: ۲۲۴)؛

(ایضاً: ۵۹)؛ مجموعہ ثنویات میر حسن: ۱۴۹-۱۵۰)

۱۲۰ کلیات انشا: ۱۸۵ ۱۱۹ دیوان مصفیٰ، ۶: ۴۵۲

دلِ عاشق کباب اور خط پر پہنے کی پٹیری وہ

۱۳۲ بنا ہے اب مزے کی عافری وہ نان بائی کا

خاگینا

اڑے اور پیاز میں مسالہ ملا کر اسے بھوننا جاتا تھا۔ اسے خاگینا کہتے تھے،

۱۳۳ نہ دھڑی جوڑ خاگینا پکا یا کہ ہے مرغی کا کام اڑے کو سینا

تہوہ نوشی

اٹھارویں صدی میں تہوہ نوشی کا عام رواج تھا۔ تقریباً تیس کے موقعوں پر پان کی طرح تہوہ سے بھی مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ حاتم نے تہوہ پر ایک شبنوی لکھی ہے،

انہیں روح و جان و راحتِ دل جلیسِ بزم و رونقِ بخشِ محفل
برائے حرمت افزائے تواضع تواضع اس کی ہے جائے تواضع
سجوں کے ہاتھ مجلس میں پیالہ چمن سا کھل رہا یکدست لالہ
جہاں دیکھو، تہاں ہر آن تہوہ ہے بزمِ عیش کا سامان تہوہ
قبولِ بارگاہِ بادشاہان شکوہ دستِ صاحبِ دستگاہان
جہاں میں زندگی، حاتمِ اودوم ہے ادھر تہوہ، ادھر حقّے کا دم ہے
ہے سب زنجوں میں تہوہ کا عجیب کبھی طائرس گنگا ہے ہے شیرنگ
مجھے ہر دن یہ چاروں جام بس ہیں دو پیالہ صبح اور دو پیالہ شام بس ہیں
نہیں ہوتا بجز اشرف کے یار رہے ہے صحبتِ پاجی سے ہزار

ضامی ہند کے بازاروں میں تہوہ کی دکانیں ہوتی تھیں۔ فیض آباد کے بازار کا ذکر کرتے ہوئے میر حسن نے لکھا ہے،

۱۳۳	۱۳۳	۱۳۳	۱۳۳
۱۳۴	۱۳۴	۱۳۴	۱۳۴
۱۳۵	۱۳۵	۱۳۵	۱۳۵
۱۳۶	۱۳۶	۱۳۶	۱۳۶

جہاں تھوہرے سدا دسپیارے ڈن بھائی بیٹھے ہیں نیچے دکان چن
ذکر میر کے آخر میں میر نے لکھنؤ میں دارن ہسٹنلز گورنر جنرل کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔
اس عہد کے کھانوں کے نام گنا تے ہیں۔ اس زمانے میں ایسی کتابیں بھی تالیف ہو
ہیں، جن میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں درج تھیں۔ ایسی ایک کتاب "خوان نعمت"
فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے انیسویں صدی کے شروع میں چھپی تھی۔ اس میں پختہ چرٹہ
متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔

دھویوں کا پیشہ

دھو بی ناندیں کپڑے ڈال کر دھوتے تھے، اور دریا پر دھویوں کے مخصوص گھاٹ تھے
جو دھو بی گھاٹ کہلاتے تھے۔ وہ وہاں کپڑے دھوتے تھے۔ انٹانے ذیل کے اشعار
میں دھویوں کا ذکر کیا ہے:

ع جو گھر سے گاؤں سپردہ کپڑوں کو ناندھ میں سندھ ساندھ نکلا

نہ سطر دیں کی کسی نے سنی تو وہ ناچار

شروع دھویوں کی طرح کھنڈ کرتے ہیں

آپ کے گھان کی کیا تعریف کیجے واہ واہ!

کوئی دھو بی گھاٹ پر جس روپ گمانا ہو کھنڈ

مردوں سے متعلق رسومات

بہتم مسلم افراد کے ہاں کسی شخص کی وفات کے موقع پر تیسرے دن تیجا، دسویں دن دہم، اور
چالیسویں دن چہلم کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اردو شاعری میں ان رسموں کا ذکر ملتا ہے:
سودا، کہیں بیاہ کا دیکھا ہے معمول کہ شہر کی چوکنی کو تیجے کے ہوں بھول

۱۲۶ کلیات، اشعار: ۱۸، ۱۰۳، ۱۹۴

۱۲۷ کلیات، سودا، ۲، ۲۲۰، ۱۸۰

شاگردِ ناجی، ۱۳۸

چہریاں میں ناز کی توکس کو بسمل کر بیٹھا ہے

نہ پڑھیے فاتحہ کیرنگ عاشق کا یہ تھا ہے

ظفر، ۱۳۹ نہ ہونے پایا چہلم بھی شہیدِ ناز کا تیرے

ستمگر! آفریں کہیے تیرے مہندی لگانے پر

عام طور پر مزارِ دل پر گل اور مہندی چڑھانے جاتے تھے۔

مصطفیٰ میرے مزار پر رکھ دیکھو گلِ دہندی

کہ میں شہید ہوں اس پنجبرہمنائی کا

بھول چڑھانے دے لائے گو فریاد پرالا

کشتہ نازِ نہاں کی تیرے، تبرِ شے بھول گئے

ظفر اکبر آبادی،

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھ پر کے سوار

کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، دوتے ہیں فلندار سب آدمی ہی کرتے ہیں سوئے کا کاجا

اردوہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

رنڈ سالہ

بیہ عورتوں کو ایک خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا ہے جو ہندوستانی زبان میں رنڈ سالہ کہلاتا تھا۔

مصطفیٰ، ۱۳۲ رنڈ سالہ لائے اس کو شبِ عقد کی صبح

سامان یہ ہو حسین کی دختر کے واسطے

عطا چادر اور مے لگی بیٹی سیں نواے

۱۳۶-
سودا:

۱۳۹ دیوان ظفر، ۱: ۱۱۶

۱۳۸ دیوان شاگردِ ناجی، ۲: ۲۱۵

۶۸۵ کلیات ظفر اکبر آبادی، ۱: ۱۳۱

۱۳۸ دیوان مصطفیٰ، ۲: ۱۵۱ (الف)، ایضاً، ۶: ۲۲۳

۱۳۳ کلیات سودا، ۲: ۱۹

۱۳۲ دیوان مصطفیٰ، ۶: ۵۴۳

رسم و رواج

ہر ملک کا ادب اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بھی پیدائش، شادی بیاہ، موت وغیرہ سے متعلق رسوم کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اردو ادب کس حد تک اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

ولادت

اگر بادشاہوں اور امیروں کے ہاں بچے کی ولادت کی امید ہوتی، تو رٹالوں اور نجومیوں کو بلا کر ولادت کے لیے وقتِ سعید دریا فت کیا جاتا۔ اگر ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا، تو نقارہ اور دوسرے موسیقے کے ساز بجا کر با توپ داغ کر اعلان کیا جاتا، غزب اور دیہاتیوں کے ہاں اس موقع پر تبا کی نقالی استعمال کی جاتی تھی۔ میر حسن دہلوی نے ایک بادشاہ کے ہاں تولدِ لہر کے اعلان کا یوں ذکر کیا ہے:

بلا تے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھو
نئی تو دمی شاہ کو اس نمط دے اہلِ تنجیم کو بھیجے خط
نجومی در تال اور برہمن غرض یاد تھا جن کا ٹھکانا صعب کاخن

میر حسن نے رٹالوں اور نجومیوں کے فنِ اختر شناسی اور طالع شناسی کی تفصیل لکھی ہے اور اس فن کی اصطلاحوں کو بیان کیا ہے:

یہ سن کر وہ رٹال طالع شناس لگے کھینچنے زائچے بے قیاس
دوسری تختی آگے بیا قرص ہاتھ لگا دھبہ ناولاد کا اس کے ساتھ
جو پھینکیں، تو شکلیں کئی بیٹھیں مل کئی شکل سے دل گیا ان کا کھل
بیاض اپنی دیکھی جو اس رٹل کی تو ایک ایک نقطہ ہے فرد خوشی
ننک و زوج کی شکل میں ہے فرح پیا کرے وصل کا تو قدح
نجومی بھی کہنے لگے در جواب کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب
نخوست کے دن سب گئے ہیں نکل عمل اپنا سب کر چکا ہے زحل

اردو ادب کا سماجی پس منظر

ستارے نے طالع نے بدلے ہیں طور
نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بھار
جسم پتراشاہ کا دیکھ کر
کہارام جی کی ہے تجھ پر دیا
مہاراج کے ہونگے مقصد شتاب
نصیبوں نے کی آپ کے یاوری
مقرر ترے جا ہیے ہو پسر
دلپسر کی خوشیاں

کردن نعمت تہنیت کو شروع
گئے نو مہینے جب اس پر گند
خواصوں نے خواجہ سراؤں نے جا
مبارک تجھے اے شہر نیکبخت
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا
کہ نوبت خوشی کی بجا دیں تمام
یہ خزدہ جو پہونچا تو نقاچی
بناٹھاٹھ نقار خانے کا سب
غلاف ان پر بانات کے ٹانگ
بجے شادیلے جو داں اس گھڑی
بہم مل کے بیٹھے جو شہنشاہ نواز
لگے لینے ادبچیں خوشی سے نئی
گھوڑوں میں نوبت کی خیل میں
ترمئی اور قرانے شادی کے دم

کہ اک نیک اختر کرے ہے طلوع
تولد ہوا شہ کے گھر میں پسر
کئی نذریں گذرانیاں ادا کیا
کہ پیدا ہوا دار سیف تاج و تخت
کہ نقار خانے میں دد حکم جا
خبر سن کے یہ شاد ہوں خاص دعاء
لگا ہر جگہ بادلہ اور زری
مہیا کر اسباب پیش و طرب
شتابی سے نقاروں کو سینک ساگ
ہوئی گرد و پیش آکے خلقت گھڑی
بنا منہ سے پھر کی گھا اس پر ساز
اٹا ناگھا بیجنہ اور گھڑی
گھر سننے والوں کو کہتی تھی سن
لگے بھرنے زین اند کمرچ میں بچم

بھائی اور بھگتیوں کا قصہ و سرود

کیا بھائی اور بھگتیوں نے بھوم
ہوئی آہے آہے مبارک کی دھوم
لگا کچنی چونہ میزنی تمام
کہاں تک میں لوں نزل کا رعد کنا
جہاں تک کہ سا زندے تھے سا نک
دھنی دست کے اور آواز کے
جہاں تک کہ تھے گانک اور بھکار
گمے گلنے اور ناچنے ایک بار
زرد نثار کرنا

دیے شاہ نے شاہزادوں کے ناؤں
مٹایں کو اور پیر زادوں کو گاؤں
خراصوں کو، فوجوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیے
خوشی میں کیا یاں تلک زرنشار
جسے ایک دیا تھا، بخشے ہزار
چھٹی

دلالت کے چھٹے دن چھٹی کی رسم ادا ہوتی تھی۔ میر حسن دہلوی کا بیان ہے:
چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دن عید اور رات تھی شب بھرات
معنی: محل میں ہوئی جو چھٹی کی خوشی
لب بام پر کو سن عشرت بجا
جواہل طرب تھے سو آئے تمام
ہر ایک نے جدا اپنا بھگیا
ظایا بہت سادہاں سیم وند
جو معمول تھا، وہ سبوں کو ملنا
۱۳۶

چھوچھک

نمود کے لیے جو سامان تخیال ہے آتا تھا، وہ چھوچھک کہلاتا تھا۔ اس میں کپڑوں کے علاوہ گنگ
اور چادل کی بودیاں بھی ہوتی تھیں۔ شاہ عالم ثانی نے اس رسم کا ذکر کیا ہے:

نندہ میوس ہیگ جان کے نالی اور نا نا جیا ہلائے
جان چھٹی، مل چادسوں کچھڑی نوبت چاہی اوتلائے
۱۳۸

۱۳۵ مجموعہ مستویات: ۲۰-۲۶، نیز نادریات: شاہی۔ منگل چاگنا: ۹۵-۱۰۲، ۱۰۳-۱۰۴، ۱۰۵-۱۰۶، ۱۰۷-۱۰۸، ۱۰۹-۱۱۰، ۱۱۱-۱۱۲، ۱۱۳-۱۱۴، ۱۱۵-۱۱۶، ۱۱۷-۱۱۸، ۱۱۹-۱۲۰، ۱۲۱-۱۲۲، ۱۲۳-۱۲۴، ۱۲۵-۱۲۶، ۱۲۷-۱۲۸، ۱۲۹-۱۳۰، ۱۳۱-۱۳۲، ۱۳۳-۱۳۴، ۱۳۵-۱۳۶، ۱۳۷-۱۳۸، ۱۳۹-۱۴۰، ۱۴۱-۱۴۲، ۱۴۳-۱۴۴، ۱۴۵-۱۴۶، ۱۴۷-۱۴۸، ۱۴۹-۱۵۰، ۱۵۱-۱۵۲، ۱۵۳-۱۵۴، ۱۵۵-۱۵۶، ۱۵۷-۱۵۸، ۱۵۹-۱۶۰، ۱۶۱-۱۶۲، ۱۶۳-۱۶۴، ۱۶۵-۱۶۶، ۱۶۷-۱۶۸، ۱۶۹-۱۷۰، ۱۷۱-۱۷۲، ۱۷۳-۱۷۴، ۱۷۵-۱۷۶، ۱۷۷-۱۷۸، ۱۷۹-۱۸۰، ۱۸۱-۱۸۲، ۱۸۳-۱۸۴، ۱۸۵-۱۸۶، ۱۸۷-۱۸۸، ۱۸۹-۱۹۰، ۱۹۱-۱۹۲، ۱۹۳-۱۹۴، ۱۹۵-۱۹۶، ۱۹۷-۱۹۸، ۱۹۹-۲۰۰، ۲۰۱-۲۰۲، ۲۰۳-۲۰۴، ۲۰۵-۲۰۶، ۲۰۷-۲۰۸، ۲۰۹-۲۱۰، ۲۱۱-۲۱۲، ۲۱۳-۲۱۴، ۲۱۵-۲۱۶، ۲۱۷-۲۱۸، ۲۱۹-۲۲۰، ۲۲۱-۲۲۲، ۲۲۳-۲۲۴، ۲۲۵-۲۲۶، ۲۲۷-۲۲۸، ۲۲۹-۲۳۰، ۲۳۱-۲۳۲، ۲۳۳-۲۳۴، ۲۳۵-۲۳۶، ۲۳۷-۲۳۸، ۲۳۹-۲۴۰، ۲۴۱-۲۴۲، ۲۴۳-۲۴۴، ۲۴۵-۲۴۶، ۲۴۷-۲۴۸، ۲۴۹-۲۵۰، ۲۵۱-۲۵۲، ۲۵۳-۲۵۴، ۲۵۵-۲۵۶، ۲۵۷-۲۵۸، ۲۵۹-۲۶۰، ۲۶۱-۲۶۲، ۲۶۳-۲۶۴، ۲۶۵-۲۶۶، ۲۶۷-۲۶۸، ۲۶۹-۲۷۰، ۲۷۱-۲۷۲، ۲۷۳-۲۷۴، ۲۷۵-۲۷۶، ۲۷۷-۲۷۸، ۲۷۹-۲۸۰، ۲۸۱-۲۸۲، ۲۸۳-۲۸۴، ۲۸۵-۲۸۶، ۲۸۷-۲۸۸، ۲۸۹-۲۹۰، ۲۹۱-۲۹۲، ۲۹۳-۲۹۴، ۲۹۵-۲۹۶، ۲۹۷-۲۹۸، ۲۹۹-۳۰۰، ۳۰۱-۳۰۲، ۳۰۳-۳۰۴، ۳۰۵-۳۰۶، ۳۰۷-۳۰۸، ۳۰۹-۳۱۰، ۳۱۱-۳۱۲، ۳۱۳-۳۱۴، ۳۱۵-۳۱۶، ۳۱۷-۳۱۸، ۳۱۹-۳۲۰، ۳۲۱-۳۲۲، ۳۲۳-۳۲۴، ۳۲۵-۳۲۶، ۳۲۷-۳۲۸، ۳۲۹-۳۳۰، ۳۳۱-۳۳۲، ۳۳۳-۳۳۴، ۳۳۵-۳۳۶، ۳۳۷-۳۳۸، ۳۳۹-۳۴۰، ۳۴۱-۳۴۲، ۳۴۳-۳۴۴، ۳۴۵-۳۴۶، ۳۴۷-۳۴۸، ۳۴۹-۳۵۰، ۳۵۱-۳۵۲، ۳۵۳-۳۵۴، ۳۵۵-۳۵۶، ۳۵۷-۳۵۸، ۳۵۹-۳۶۰، ۳۶۱-۳۶۲، ۳۶۳-۳۶۴، ۳۶۵-۳۶۶، ۳۶۷-۳۶۸، ۳۶۹-۳۷۰، ۳۷۱-۳۷۲، ۳۷۳-۳۷۴، ۳۷۵-۳۷۶، ۳۷۷-۳۷۸، ۳۷۹-۳۸۰، ۳۸۱-۳۸۲، ۳۸۳-۳۸۴، ۳۸۵-۳۸۶، ۳۸۷-۳۸۸، ۳۸۹-۳۹۰، ۳۹۱-۳۹۲، ۳۹۳-۳۹۴، ۳۹۵-۳۹۶، ۳۹۷-۳۹۸، ۳۹۹-۴۰۰، ۴۰۱-۴۰۲، ۴۰۳-۴۰۴، ۴۰۵-۴۰۶، ۴۰۷-۴۰۸، ۴۰۹-۴۱۰، ۴۱۱-۴۱۲، ۴۱۳-۴۱۴، ۴۱۵-۴۱۶، ۴۱۷-۴۱۸، ۴۱۹-۴۲۰، ۴۲۱-۴۲۲، ۴۲۳-۴۲۴، ۴۲۵-۴۲۶، ۴۲۷-۴۲۸، ۴۲۹-۴۳۰، ۴۳۱-۴۳۲، ۴۳۳-۴۳۴، ۴۳۵-۴۳۶، ۴۳۷-۴۳۸، ۴۳۹-۴۴۰، ۴۴۱-۴۴۲، ۴۴۳-۴۴۴، ۴۴۵-۴۴۶، ۴۴۷-۴۴۸، ۴۴۹-۴۵۰، ۴۵۱-۴۵۲، ۴۵۳-۴۵۴، ۴۵۵-۴۵۶، ۴۵۷-۴۵۸، ۴۵۹-۴۶۰، ۴۶۱-۴۶۲، ۴۶۳-۴۶۴، ۴۶۵-۴۶۶، ۴۶۷-۴۶۸، ۴۶۹-۴۷۰، ۴۷۱-۴۷۲، ۴۷۳-۴۷۴، ۴۷۵-۴۷۶، ۴۷۷-۴۷۸، ۴۷۹-۴۸۰، ۴۸۱-۴۸۲، ۴۸۳-۴۸۴، ۴۸۵-۴۸۶، ۴۸۷-۴۸۸، ۴۸۹-۴۹۰، ۴۹۱-۴۹۲، ۴۹۳-۴۹۴، ۴۹۵-۴۹۶، ۴۹۷-۴۹۸، ۴۹۹-۵۰۰، ۵۰۱-۵۰۲، ۵۰۳-۵۰۴، ۵۰۵-۵۰۶، ۵۰۷-۵۰۸، ۵۰۹-۵۱۰، ۵۱۱-۵۱۲، ۵۱۳-۵۱۴، ۵۱۵-۵۱۶، ۵۱۷-۵۱۸، ۵۱۹-۵۲۰، ۵۲۱-۵۲۲، ۵۲۳-۵۲۴، ۵۲۵-۵۲۶، ۵۲۷-۵۲۸، ۵۲۹-۵۳۰، ۵۳۱-۵۳۲، ۵۳۳-۵۳۴، ۵۳۵-۵۳۶، ۵۳۷-۵۳۸، ۵۳۹-۵۴۰، ۵۴۱-۵۴۲، ۵۴۳-۵۴۴، ۵۴۵-۵۴۶، ۵۴۷-۵۴۸، ۵۴۹-۵۵۰، ۵۵۱-۵۵۲، ۵۵۳-۵۵۴، ۵۵۵-۵۵۶، ۵۵۷-۵۵۸، ۵۵۹-۵۶۰، ۵۶۱-۵۶۲، ۵۶۳-۵۶۴، ۵۶۵-۵۶۶، ۵۶۷-۵۶۸، ۵۶۹-۵۷۰، ۵۷۱-۵۷۲، ۵۷۳-۵۷۴، ۵۷۵-۵۷۶، ۵۷۷-۵۷۸، ۵۷۹-۵۸۰، ۵۸۱-۵۸۲، ۵۸۳-۵۸۴، ۵۸۵-۵۸۶، ۵۸۷-۵۸۸، ۵۸۹-۵۹۰، ۵۹۱-۵۹۲، ۵۹۳-۵۹۴، ۵۹۵-۵۹۶، ۵۹۷-۵۹۸، ۵۹۹-۶۰۰، ۶۰۱-۶۰۲، ۶۰۳-۶۰۴، ۶۰۵-۶۰۶، ۶۰۷-۶۰۸، ۶۰۹-۶۱۰، ۶۱۱-۶۱۲، ۶۱۳-۶۱۴، ۶۱۵-۶۱۶، ۶۱۷-۶۱۸، ۶۱۹-۶۲۰، ۶۲۱-۶۲۲، ۶۲۳-۶۲۴، ۶۲۵-۶۲۶، ۶۲۷-۶۲۸، ۶۲۹-۶۳۰، ۶۳۱-۶۳۲، ۶۳۳-۶۳۴، ۶۳۵-۶۳۶، ۶۳۷-۶۳۸، ۶۳۹-۶۴۰، ۶۴۱-۶۴۲، ۶۴۳-۶۴۴، ۶۴۵-۶۴۶، ۶۴۷-۶۴۸، ۶۴۹-۶۵۰، ۶۵۱-۶۵۲، ۶۵۳-۶۵۴، ۶۵۵-۶۵۶، ۶۵۷-۶۵۸، ۶۵۹-۶۶۰، ۶۶۱-۶۶۲، ۶۶۳-۶۶۴، ۶۶۵-۶۶۶، ۶۶۷-۶۶۸، ۶۶۹-۶۷۰، ۶۷۱-۶۷۲، ۶۷۳-۶۷۴، ۶۷۵-۶۷۶، ۶۷۷-۶۷۸، ۶۷۹-۶۸۰، ۶۸۱-۶۸۲، ۶۸۳-۶۸۴، ۶۸۵-۶۸۶، ۶۸۷-۶۸۸، ۶۸۹-۶۹۰، ۶۹۱-۶۹۲، ۶۹۳-۶۹۴، ۶۹۵-۶۹۶، ۶۹۷-۶۹۸، ۶۹۹-۷۰۰، ۷۰۱-۷۰۲، ۷۰۳-۷۰۴، ۷۰۵-۷۰۶، ۷۰۷-۷۰۸، ۷۰۹-۷۱۰، ۷۱۱-۷۱۲، ۷۱۳-۷۱۴، ۷۱۵-۷۱۶، ۷۱۷-۷۱۸، ۷۱۹-۷۲۰، ۷۲۱-۷۲۲، ۷۲۳-۷۲۴، ۷۲۵-۷۲۶، ۷۲۷-۷۲۸، ۷۲۹-۷۳۰، ۷۳۱-۷۳۲، ۷۳۳-۷۳۴، ۷۳۵-۷۳۶، ۷۳۷-۷۳۸، ۷۳۹-۷۴۰، ۷۴۱-۷۴۲، ۷۴۳-۷۴۴، ۷۴۵-۷۴۶، ۷۴۷-۷۴۸، ۷۴۹-۷۵۰، ۷۵۱-۷۵۲، ۷۵۳-۷۵۴، ۷۵۵-۷۵۶، ۷۵۷-۷۵۸، ۷۵۹-۷۶۰، ۷۶۱-۷۶۲، ۷۶۳-۷۶۴، ۷۶۵-۷۶۶، ۷۶۷-۷۶۸، ۷۶۹-۷۷۰، ۷۷۱-۷۷۲، ۷۷۳-۷۷۴، ۷۷۵-۷۷۶، ۷۷۷-۷۷۸، ۷۷۹-۷۸۰، ۷۸۱-۷۸۲، ۷۸۳-۷۸۴، ۷۸۵-۷۸۶، ۷۸۷-۷۸۸، ۷۸۹-۷۹۰، ۷۹۱-۷۹۲، ۷۹۳-۷۹۴، ۷۹۵-۷۹۶، ۷۹۷-۷۹۸، ۷۹۹-۸۰۰، ۸۰۱-۸۰۲، ۸۰۳-۸۰۴، ۸۰۵-۸۰۶، ۸۰۷-۸۰۸، ۸۰۹-۸۱۰، ۸۱۱-۸۱۲، ۸۱۳-۸۱۴، ۸۱۵-۸۱۶، ۸۱۷-۸۱۸، ۸۱۹-۸۲۰، ۸۲۱-۸۲۲، ۸۲۳-۸۲۴، ۸۲۵-۸۲۶، ۸۲۷-۸۲۸، ۸۲۹-۸۳۰، ۸۳۱-۸۳۲، ۸۳۳-۸۳۴، ۸۳۵-۸۳۶، ۸۳۷-۸۳۸، ۸۳۹-۸۴۰، ۸۴۱-۸۴۲، ۸۴۳-۸۴۴، ۸۴۵-۸۴۶، ۸۴۷-۸۴۸، ۸۴۹-۸۵۰، ۸۵۱-۸۵۲، ۸۵۳-۸۵۴، ۸۵۵-۸۵۶، ۸۵۷-۸۵۸، ۸۵۹-۸۶۰، ۸۶۱-۸۶۲، ۸۶۳-۸۶۴، ۸۶۵-۸۶۶، ۸۶۷-۸۶۸، ۸۶۹-۸۷۰، ۸۷۱-۸۷۲، ۸۷۳-۸۷۴، ۸۷۵-۸۷۶، ۸۷۷-۸۷۸، ۸۷۹-۸۸۰، ۸۸۱-۸۸۲، ۸۸۳-۸۸۴، ۸۸۵-۸۸۶، ۸۸۷-۸۸۸، ۸۸۹-۸۹۰، ۸۹۱-۸۹۲، ۸۹۳-۸۹۴، ۸۹۵-۸۹۶، ۸۹۷-۸۹۸، ۸۹۹-۹۰۰، ۹۰۱-۹۰۲، ۹۰۳-۹۰۴، ۹۰۵-۹۰۶، ۹۰۷-۹۰۸، ۹۰۹-۹۱۰، ۹۱۱-۹۱۲، ۹۱۳-۹۱۴، ۹۱۵-۹۱۶، ۹۱۷-۹۱۸، ۹۱۹-۹۲۰، ۹۲۱-۹۲۲، ۹۲۳-۹۲۴، ۹۲۵-۹۲۶، ۹۲۷-۹۲۸، ۹۲۹-۹۳۰، ۹۳۱-۹۳۲، ۹۳۳-۹۳۴، ۹۳۵-۹۳۶، ۹۳۷-۹۳۸، ۹۳۹-۹۴۰، ۹۴۱-۹۴۲، ۹۴۳-۹۴۴، ۹۴۵-۹۴۶، ۹۴۷-۹۴۸، ۹۴۹-۹۵۰، ۹۵۱-۹۵۲، ۹۵۳-۹۵۴، ۹۵۵-۹۵۶، ۹۵۷-۹۵۸، ۹۵۹-۹۶۰، ۹۶۱-۹۶۲، ۹۶۳-۹۶۴، ۹۶۵-۹۶۶، ۹۶۷-۹۶۸، ۹۶۹-۹۷۰، ۹۷۱-۹۷۲، ۹۷۳-۹۷۴، ۹۷۵-۹۷۶، ۹۷۷-۹۷۸، ۹۷۹-۹۸۰، ۹۸۱-۹۸۲، ۹۸۳-۹۸۴، ۹۸۵-۹۸۶، ۹۸۷-۹۸۸، ۹۸۹-۹۹۰، ۹۹۱-۹۹۲، ۹۹۳-۹۹۴، ۹۹۵-۹۹۶، ۹۹۷-۹۹۸، ۹۹۹-۱۰۰۰، ۱۰۰۱-۱۰۰۲، ۱۰۰۳-۱۰۰۴، ۱۰۰۵-۱۰۰۶، ۱۰۰۷-۱۰۰۸، ۱۰۰۹-۱۰۱۰، ۱۰۱۱-۱۰۱۲، ۱۰۱۳-۱۰۱۴، ۱۰۱۵-۱۰۱۶، ۱۰۱۷-۱۰۱۸، ۱۰۱۹-۱۰۲۰، ۱۰۲۱-۱۰۲۲، ۱۰۲۳-۱۰۲۴، ۱۰۲۵-۱۰۲۶، ۱۰۲۷-۱۰۲۸، ۱۰۲۹-۱۰۳۰، ۱۰۳۱-۱۰۳۲، ۱۰۳۳-۱۰۳۴، ۱۰۳۵-۱۰۳۶، ۱۰۳۷-۱۰۳۸، ۱۰۳۹-۱۰۴۰، ۱۰۴۱-۱۰۴۲، ۱۰۴۳-۱۰۴۴، ۱۰۴۵-۱۰۴۶، ۱۰۴۷-۱۰۴۸، ۱۰۴۹-۱۰۵۰، ۱۰۵۱-۱۰۵۲، ۱۰۵۳-۱۰۵۴، ۱۰۵۵-۱۰۵۶، ۱۰۵۷-۱۰۵۸، ۱۰۵۹-۱۰۶۰، ۱۰۶۱-۱۰۶۲، ۱۰۶۳-۱۰۶۴، ۱۰۶۵-۱۰۶۶، ۱۰۶۷-۱۰۶۸، ۱۰۶۹-۱۰۷۰، ۱۰۷۱-۱۰۷۲، ۱۰۷۳-۱۰۷۴، ۱۰۷۵-۱۰۷۶، ۱۰۷۷-۱۰۷۸، ۱۰۷۹-۱۰۸۰، ۱۰۸۱-۱۰۸۲، ۱۰۸۳-۱۰۸۴، ۱۰۸۵-۱۰۸۶، ۱۰۸۷-۱۰۸۸، ۱۰۸۹-۱۰۹۰، ۱۰۹۱-۱۰۹۲، ۱۰۹۳-۱۰۹۴، ۱۰۹۵-۱۰۹۶، ۱۰۹۷-۱۰۹۸، ۱۰۹۹-۱۱۰۰، ۱۱۰۱-۱۱۰۲، ۱۱۰۳-۱۱۰۴، ۱۱۰۵-۱۱۰۶، ۱۱۰۷-۱۱۰۸، ۱۱۰۹-۱۱۱۰، ۱۱۱۱-۱۱۱۲، ۱۱۱۳-۱۱۱۴، ۱۱۱۵-۱۱۱۶، ۱۱۱۷-۱۱۱۸، ۱۱۱۹-۱۱۲۰، ۱۱۲۱-۱۱۲۲، ۱۱۲۳-۱۱۲۴، ۱۱۲۵-۱۱۲۶، ۱۱۲۷-۱۱۲۸، ۱۱۲۹-۱۱۳۰، ۱۱۳۱-۱۱۳۲، ۱۱۳۳-۱۱۳۴، ۱۱۳۵-۱۱۳۶، ۱۱۳۷-۱۱۳۸، ۱۱۳۹-۱۱۴۰، ۱۱۴۱-۱۱۴۲، ۱۱۴۳-۱۱۴۴، ۱۱۴۵-۱۱۴۶، ۱۱۴۷-۱۱۴۸، ۱۱۴۹-۱۱۵۰، ۱۱۵۱-۱۱۵۲، ۱۱۵۳-۱۱۵۴، ۱۱۵۵-۱۱۵۶، ۱۱۵۷-۱۱۵۸، ۱۱۵۹-۱۱۶۰، ۱۱۶۱-۱۱۶۲، ۱۱۶۳-۱۱۶۴، ۱۱۶۵-۱۱۶۶، ۱۱۶۷-۱۱۶۸، ۱۱۶۹-۱۱۷۰، ۱۱۷۱-۱۱۷۲، ۱۱۷۳-۱۱۷۴، ۱۱۷۵-۱۱۷۶، ۱۱۷۷-۱۱۷۸، ۱۱۷۹-۱۱۸۰، ۱۱۸۱-۱۱۸۲، ۱۱۸۳-۱۱۸۴، ۱۱۸۵-۱۱۸۶، ۱۱۸۷-۱۱۸۸، ۱۱۸۹-۱۱۹۰، ۱۱۹۱-۱۱۹۲، ۱۱۹۳-۱۱۹۴، ۱۱۹۵-۱۱۹۶، ۱۱۹۷-۱۱۹۸، ۱۱۹۹-۱۲۰۰، ۱۲۰۱-۱۲۰۲، ۱۲۰۳-۱۲۰۴، ۱۲۰۵-۱۲۰۶، ۱۲۰۷-۱۲۰۸، ۱۲۰۹-۱۲۱۰، ۱۲۱۱-۱۲۱۲، ۱۲۱۳-۱۲۱۴، ۱۲۱۵-۱۲۱۶، ۱۲۱۷-۱۲۱۸، ۱۲۱۹-۱۲۲۰، ۱۲۲۱-۱۲۲۲، ۱۲۲۳-۱۲۲۴، ۱۲۲۵-۱۲۲۶، ۱۲۲۷-۱۲۲۸، ۱۲۲۹-۱۲۳۰، ۱۲۳۱-۱۲۳۲، ۱۲۳۳-۱۲۳۴، ۱۲۳۵-۱۲۳۶، ۱۲۳۷-۱۲۳۸، ۱۲۳۹-۱۲۴۰، ۱۲۴۱-۱۲۴۲، ۱۲۴۳-۱۲۴۴، ۱۲۴۵-۱۲۴۶، ۱۲۴۷-۱۲۴۸، ۱۲۴۹-۱۲۵۰، ۱۲۵۱-۱۲۵۲، ۱۲۵۳-۱۲۵۴، ۱۲۵۵-۱۲۵۶، ۱۲۵۷-۱۲۵۸، ۱۲۵۹-۱۲۶۰، ۱۲۶۱-۱۲۶۲، ۱۲۶۳-۱۲۶۴، ۱۲۶۵-۱۲۶۶، ۱۲۶۷-۱۲۶۸، ۱۲۶۹-۱۲۷۰، ۱۲۷۱-۱۲۷۲، ۱۲۷۳-۱۲۷۴، ۱۲۷۵-۱۲۷۶، ۱۲۷۷-۱۲۷۸، ۱۲۷۹-۱۲۸۰، ۱۲۸۱-۱۲۸۲، ۱۲۸۳-۱۲۸۴، ۱۲۸۵-۱۲۸۶، ۱۲۸۷-۱۲۸۸، ۱۲۸۹-۱۲۹۰، ۱۲۹۱-۱۲۹۲، ۱۲۹۳-۱۲۹۴، ۱۲۹۵-۱۲۹۶، ۱۲۹۷-۱۲۹۸، ۱۲۹۹-۱۳۰۰، ۱۳۰۱-۱۳۰۲، ۱۳۰۳-۱۳۰۴، ۱۳۰۵-۱۳۰۶، ۱۳۰۷-۱۳۰۸، ۱۳۰۹-۱۳۱۰، ۱۳۱۱-۱۳۱۲، ۱۳۱۳-۱۳۱۴، ۱۳۱۵-۱۳۱۶، ۱۳۱۷-۱۳۱۸، ۱۳۱۹-۱۳۲۰، ۱۳۲۱-۱۳۲۲، ۱۳۲۳-۱۳۲۴، ۱۳۲۵-۱۳۲۶، ۱۳۲۷-۱۳۲۸، ۱۳۲۹-۱۳۳۰، ۱۳۳۱-۱۳۳۲، ۱۳۳۳-۱۳۳۴، ۱۳۳۵-۱۳۳۶، ۱۳۳۷-۱۳۳۸، ۱۳۳۹-۱۳۴۰، ۱۳۴۱-۱۳۴۲، ۱۳۴۳-۱۳۴۴، ۱۳۴۵-۱۳۴۶، ۱۳۴۷-۱۳۴۸، ۱۳۴۹-۱۳۵۰، ۱۳۵۱-۱۳۵۲، ۱۳۵۳-۱۳۵۴، ۱۳۵۵-۱۳۵۶، ۱۳۵۷-۱۳۵۸، ۱۳۵۹-۱۳۶۰، ۱۳۶۱-۱۳۶۲، ۱۳۶۳-۱۳۶۴، ۱۳۶۵-۱۳۶۶، ۱۳۶۷-۱۳۶۸، ۱۳۶۹-۱۳۷۰، ۱۳۷۱-۱۳۷۲، ۱۳۷۳-۱۳۷۴، ۱۳۷۵-۱۳۷۶، ۱۳۷۷-۱۳۷۸، ۱۳۷۹-۱۳۸۰، ۱۳۸۱-۱۳۸۲، ۱۳۸۳-۱۳۸۴، ۱۳۸۵-۱۳۸۶، ۱۳۸۷-۱۳۸۸، ۱۳۸۹-۱۳۹۰، ۱۳۹۱-۱۳۹۲، ۱۳۹۳-۱۳۹۴، ۱۳۹۵-۱۳۹۶، ۱۳۹۷-۱۳۹۸، ۱۳۹۹-۱۴۰۰، ۱۴۰۱-۱۴۰۲، ۱۴۰۳-۱۴۰۴، ۱۴۰۵-۱۴۰۶، ۱۴۰۷-۱۴۰۸، ۱۴۰۹-۱۴۱۰، ۱۴۱۱-۱۴۱۲، ۱۴۱۳-۱۴۱۴، ۱۴۱۵-۱۴۱۶، ۱۴۱۷-۱۴۱۸، ۱۴۱۹-۱۴۲۰، ۱۴۲۱-۱۴۲۲، ۱۴۲۳-۱۴۲۴، ۱۴۲۵-۱۴۲۶، ۱۴۲۷-۱۴۲۸، ۱۴۲۹-۱۴۳۰، ۱۴۳۱-۱۴۳۲، ۱۴۳۳-۱۴۳۴، ۱۴۳۵-۱۴۳۶، ۱۴۳۷-۱۴۳۸، ۱۴۳۹-۱۴۴۰، ۱۴۴۱-۱۴۴۲، ۱۴۴۳-۱۴۴۴، ۱۴۴۵-۱۴۴۶، ۱۴۴۷-۱۴۴۸، ۱۴۴۹-۱۴۵۰، ۱۴۵۱-۱۴۵۲، ۱۴۵۳-۱۴۵۴، ۱۴۵۵-۱۴۵۶، ۱۴۵۷-۱۴۵۸، ۱۴۵۹-۱۴۶۰، ۱۴۶۱-۱۴۶۲، ۱۴۶۳-۱۴۶۴، ۱۴۶۵-۱۴۶۶، ۱۴۶۷-۱۴۶۸، ۱۴۶۹-۱۴۷۰، ۱۴۷۱-۱۴۷۲، ۱۴۷۳-۱۴۷۴، ۱۴۷۵-۱۴۷۶، ۱۴۷۷-۱۴۷۸، ۱۴۷۹-۱۴۸۰، ۱۴۸۱-۱۴۸۲، ۱۴۸۳-۱۴۸۴، ۱۴۸۵-۱۴۸۶، ۱۴۸۷-۱۴۸۸، ۱۴۸۹-۱۴۹۰، ۱۴۹۱-۱۴۹۲، ۱۴۹۳-۱۴۹۴، ۱۴۹۵-۱۴۹۶، ۱۴۹۷-۱۴۹۸، ۱

گھٹی

شریت ہے مجھ زہرِ غم جو کہ میری گھٹی جو بنی روزِ تولد، سودہ رسم سے ۱۳۹
زچہ کوتارا دکھانا

شاہ عالم ثانی نے اس رسم کا یوں ذکر کیا ہے:

کادت منگل چارگنی ن ناخی نکمین دھن وار دیو ہے

دادی، پھوپھی خوشحال پھوپھی من انگ سمات نہ پھول گیو ہے

تاریہ دکھائے کے لیت بلائیں، سو مندر بچ بنو دیو ہے

۱۴۰ اکبر شاہ کے نند بھیسو، سب کے گھر بچ آنت بھیسو ہے

بہادر شاہ ظفر کے محل میں شہزادے کی ولادت کے موقع پر مرگ دہرن، انے کی رسم کا شاہ نے غیر نے ذکر کیا ہے:

دہیں پھر شاہ نے یہ رسم کی داں پھیر کھٹ پر قدم رکھ، جو کے شاداں

اوا کر جسو: باسم اللہ مارا کمان دتیرے کر مرگ مارا

نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر فلک پر کہکشاں کی جیسے تھو ۱۴۱

ساگرہ یا برس گانٹھ

۱۴۲ برس گانٹھ جس ساں، من کی ہوئی دل بستان کی گرہ کھل گئی

ہر سال بادشاہوں، نوابوں اور امیروں کی ساگرہ کا جشن منایا جاتا تھا اور درباری شعور تہنیت نامے پیش کرتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی ساگرہ کے جشن پر انشائیہ ایک تہنیت نامہ لکھا تھا جس کا پہلا شعر تھا:

مجلس آراستہ ہے ساگرہ کی اکس کے

۱۴۳ جس کی ہر لحظ دعا دینے میں ہے سب کوٹ

۱۴۰ نادر شاہی: ۱۱۲

۱۳۹ کلیات: خودا، ۱۸۵

۱۴۲ مجموعہ فتویات میر حسن: ۲۶

۱۴۱ رسوم دہلی: ۵۸

۱۴۳ کلیات: انش: ۲۶۹؛ نادر شاہی: ۱۱۰، ۱۰۵؛ تعابیر و دذ: ۸۹-۹۳

نواب شجاع الدولہ کی سالگرہ پر سودا نے یہ قطعہ لکھا تھا:

رہے ملک پر درخشاں مگر ہر نامیزان ہر ایک سالگرہ میں تو موتیوں سے مٹے
گنہگار ہے جواب اقبال بخت میں تیرے الہی تا بدیم حشر یہ گرہ نہ کھیلے
عروج ہو تیرے اعدا کا یوں تنزل میں کہ جسے مہر کی تابش سے کوہِ قاف گھٹے
اس موقع کے ایک دوسرے قطعے کا آغاز ہے: ۱۳۴

بیشمار تیرے عمر سال، عالم کے عروجِ دہر کی چاہ ہے بالِ بال گرہ
سودا نے نواب، احمد خان، والی ذبح آباد، اور نواب آصف الدولہ کی سالگرہوں کے موقع پر:
بہمِ قلم لکھے تھے۔ ۱۳۵

بچے کی ابتدائی پرورش

ڈیڑھ سال کی عمر تک بچے کو پلٹے میں سٹلایا جاتا تھا۔ یہ پالنا چھوچھک میں ننھیاں سے آتا تھا۔
بیگم جان کے پیر بھبر، سن سودا سے گود کھلاوت نانا

۱۳۶
لورن سے، چرم، جھلاوت پالنا، نانی جیسے بڑی کچھ مانا

دودھ بڑھانا

بچے غالباً ماں کا دودھ پراسال کی عمر تک پیتے تھے۔ اس کے بعد رضاعت کا ناز ختم کر دیا جاتا تھا:
وہ گل جب کہ چلتے برس میں لگا بڑھایا گیا دودھ اس ماہ کا ۱۳۷
اس موقع پر چٹن منایا جاتا تھا:

ہوئی تھی جو کچھ پہن شادی کی دھوم اسی طرح سے پھر ہوا داں ہجوم
طوائف دہی اور دہی راگ درنگ ہوئی بلکہ دو فی خوشی کی کی ترنگ ۱۳۸

۱۳۴ کلیات سودا، ۱۲، ۵-۶

۱۳۵ ایضاً: ۶: حوالوں کے لیے دیکھیے۔ نادر ایٹ شامی: ۱۱۰، ۱۰۴، ۱۰۲، ۹۲، ۹۱

۱۳۶ نادر ایٹ شامی: ۶۵، ۱۱۳، ۱۱۶ نیز کلیات نظیرہ ۴۳، ۷

جی بھلائے، دھوپ چائے اور خوب کھلونے مگراتے ہر کن بھلائے پالنے میں وہ ایسے سودا دھڑکیا تے

۱۳۷ بمسودہ شہنویات: ۲۷ ۱۳۸ ایضاً

بسم اللہ خوانی

جب بچے کی تعلیم کی ابتدا ہوتی تھی تو اس موقع پر خوشیاں سنائی جاتی تھیں اور کچھ رسوم بھی ادا ہوتی تھیں جو خالص ہندوستانی تھیں۔ شادی بیاہ کی طرح موقع پر بھی بچے کے مہندی لگائی جاتی تھی۔ نیا جوتا زیب تن کیا جاتا، سر پر سہرا باندھتے، گلے میں بدھی ڈالتے، کان کے پاس گوشوارہ یا طرہ لٹکاتے، اور اسے دلہا بناتے، نوبت، بختی اور ساعت سے بعد میں بسم اللہ خوانی کی رسم ادا ہوتی۔

آج مہندی لگاؤ کو اکبر شاہ پیرا لایو

۱۴۹
اتھیں رنگیلی مہندی بسم اللہ کی جیسا بیکم گھر چلاو

برن برن کی آرائش بنائے لئے مرزا نوبت دھر

۱۵۰
آج مہندی بسم اللہ کی صبح ساعت کی یکم جاں گھر

رتجگہ

ہندوستانی سوتیلی خوشی کی تقریروں میں رات بھر جاگتیں اور مختلف رسمیں ادا کرتی تھیں۔ رتجگہ کے پانچ موقعے تھے۔ چھٹی، دودھ چھڑائی، ساگرہ، بسم اللہ خوانی اور بیاہ۔ شاہ عام ثانی نے اکبر شاہانی کی ساگرہ کے موقع پر رتجگہ کا ذکر یوں کیا ہے:

گادت منگل چار سبے تیر، آپس میں مل رات جگائی

باجت تال، چھپنگ، کچھا و ج، گائے گنی نوچھا و ملائی

لاکھوں سال ہلاں ہلاں سوں، راج کر دیکھوں کھدائی

۱۵۱
اکبر شاہ کی ساگرہ، شاہ عالم کو سب دیت بدھائی

نیا زکری سب پیروں کی، اب جی کی مراد سب بھرائی

۱۵۲
فرنا ری مل ہاس ہلاں سوں، اللہ دیاں کی رتجگائی

۱۵۳
تمام اہل محلہ ہیں بے خور و بیخواب
یر ترنگا تو نہیں، کب تلک جگا دیگا

۱۴۹ نادوات شاہی، ۱۵۰ ایضاً: ۱۱۰

۱۵۱ نادوات شاہی، ۱۵۲ ایضاً: ۱۱۹

۱۵۳ اردوئے معلیٰ (سندھ نمبر)، ۱۱۸۰؛ نیز کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۴۱

رتجگا یا صحنک

ظفر: رات کو سو رتجگا دن کو پرو صحنک ہم شہا دھوم یہ خام و سحر آج بھی ہلکلی ہی ہو
 باعثِ صحت تیری روز ہے دن صید کا کیوں کر خوش ہو لہذا آج بھی ہلکلی ہی ہو
 گھر میں مہیا تیرے اڑ پے نذر و نیاز لعل دگرہم وزر، آج بھی ہو، کل بھی ہو

شادی کی رسمیں

شادی کی رسموں میں سب سے پہلی رسم سنگتی کی ہوتی تھی۔ سود نے اپنے مرثیوں میں حضرت قاسم کے
 کے بیانات میں شادی بیاہ کی رسموں کو ذکر کیا ہے،

غرض: ر دقت، سنگتی، فاشان اس مشہ کو آیا تھا

رشتہ کی تلاش

کئی جوانی وہ بوڑھیاں تھیں، جسودا جی نے انھیں بلایا
 کسی کو ایدھر کسی کو اودھر، سگائی ڈھونڈھن کہیں پہنچا

جو بھیہ تھا اپنے من کے بھیر سوان سبھوں کے تئیں جتایا

ہندوؤں کے بر خلاف مسلمانوں میں رشتے کا پیغام لڑکے والے بھیجتے تھے۔

لڑکے کو دیکھنے رسم

نقل ہے ایک شخص کی نسبت ٹھہری ایک جا پر جب بعد رغبت
 رسم ہے دیکھنے کی، اے یارو! ہر جگہ ہیں بولاتے دولہا کو

سگائی

ٹھہراؤ سگائی گور کی سبھ ساعت سے تم اس کے گھر

۱۵۶ کلیات سودا، ۲: ۱۶۰

۱۵۵ دیوان ظفر، ۱۱۱: ۱۳

۱۵۷ کلیات ظفر، ۷۵۲: ۷۸۱

۱۵۸ مجموعہ شعریات، نیرت رجمینا بینظیر کا مسعود شاہ کو خواستگاری میں بندھنیر کے۔ اور جو

۱۵۹ دیوان مہجور، ۱۵

۱۱۹-۱۲۱

۱۶۰ کلیات ظفر، ۷۸۱

اردو ادب کا سماجی پس منظر

مگائی کے بعد شادی کا مرحلہ آتا تھا۔ اس کی متعدد درجہ میں تھیں۔ ان میں مختلف خطوں اور طبقوں کے لحاظ سے کچھ اختلاف بھی تھا، لیکن زیادہ اہم مندرجہ ذیل تھیں:

شادی کی لگن دھرنا

جب طرفین تیار کر لیتے، تو شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی، یہ لگن دھرنا کہلاتی تھی:

دھرنا لگن اس بیاہ کا زہن سار نہ مانوں

کردار فلک میں نہ سمجھتا ہوں تو جانوں

گرداس کے کھڑے پیٹے ہیں سب سینہ درانوں

بھڑاس دھرا خون کا ہے نام لگن دھرنا^{۱۶۱}

اس دن لڑکی والے ایک تھال میں کچھ اشیاء کے ساتھ لڑکے والوں کے ہاں ایک پلا رقعہ بھیجتے تھے جس میں نکاح کی تاریخ لکھی ہوتی تھی۔^{۱۶۲}

تب راجہ نے ہر پٹت سے داں لگن مہورت کی پوچھی

سب جو ۷۰ ماہ پہننے کی سبھ ساعت ہے اور نیک گھڑی

۱۰۔ ٹھہرا بیاہنے کا، شبھ ساعت شادی لگن دھری

تب راجہ نے شیو شکر کو اس بات کی پٹری لکھ بھیجی^{۱۶۳}

اک اچھی سی تاریخ ٹھہرا پیئے دیا حکم ہم نے تمہیں آئیئے

ملا شگینوں کو پتا سال و سن مقرر کیا نیک ساعت کا دن

نظر بیتاب ہو جب شمعرو سیں نہ بت اٹھ جائے

۱۳۔ کہ جیل جاتے ہیں مشاطے لگن کی بات پھیرے پر^{۱۶۴}

۱۶۱ کلیات سودا ۱۳۳۱، نیز دیکھیے: ۱۷۰، ایضاً: ۱۹۰، ۲۰۸، ۲۹۰، ۱۳۱، ۱۹۹، نیز دیوان آبرو

۲۳۱، مجموعہ شہزاد میر حسن کے ۱۳۱۱ (دھری آج اس شعر کی لگن)

۱۶۲ مجموعہ شہزاد ۱۳۱۱

۱۶۳ کلیات نظیر: ۷۸۲

۱۶۴ دیوان شاگر ناجی، ۱۱۲

کنگن

دولہا کے ہاتھ میں کنگن باندھا جاتا تھا،

باندھا کنگن تیرے سکہ کرنے کو کیا میں جانے تھی کہ یوں بھینچا گیا
شاخ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا زرد جوڑے پہ بست اپنا دکھا گیا

مائیو بٹھانا

کوئی دولہن، چھٹ اس دولہن کے، تعقل نے لا کنگن کی رات

مائیو بدے دولہا کے اٹم میں لا بٹھلائی ہے

ساجتی

کاٹا ہوا وہ سربقا جو ساجتی کا جتاوا گردن کا خط زخم تھامنے کا کلاوا

دولہن نے لیے آستین دولہائی چٹھاوا ساجتی کا یہ دستور ہے کہ کس کے وطن

مستحرامیں کس کی آئی یہ ساجتی کہ رات کو

جھک جھک پڑی خوشی سے ہر یک کام میں کی شتا

سونے کے تھے درخت نئے لاکھوں ان کے ساتھ

گوٹوں کے پھل تھے تاروں کے پھول، ادا کر کے شتا

منہدی

جو خزان کردولہن کے لیے منہدی کا آیا

تھا خسرو خسرو پورہ کاخوں اس میں جہاں

دولہا کا لہو ہاتھوں میں دولہن نے لگایا

یہ رنگ ہے شادی میں زمانے کے چلن

۱۶۶ کلیات سودا، ۱۲، ۱۶۵

۱۶۵ قصائد نذوق، ۶۹

۱۶۷ ایضاً، ۲، ۴۴، ۱۶۰، ۳۱۹؛ نیز دیکھیے نادرست شاہیں، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۴

۱۶۸ کلیات انشا، ۴۵؛ نیز دیکھیے قصائد نذوق مرتبہ سرسلیمان، لکھنؤ ۱۹۳۷، ۴۴

۱۶۹ کلیات سودا، ۲، ۴۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۲۰۸، ۲۱۹، ۲۶۲

آج مہندی سرزرا اکبر شاہ پیارے بنے کی، دیکھ کیسی نیکی بن آئی
اچھی جگہ لگات روشتائی رنگا رنگ کی، سب گئی گائے بجائے دیت بدھائی

نوشتہ کے مہندی رچانا اور دان دینا۔

راے ری مائی اگائے بجائے اندیسوں رجھاؤ

اکبر شاہ کی مہندی انیک جتن سوں رچاؤ

لے ری سکھی، چلو مہندی دیکھنے پیارے بننے کی انوشی

سب گئی مل دیو بیاہک دان پا بھر سوٹھی دان، پا بھر موٹھی

شہبانا گانا

سر دقت دو بھاگے ہاتھوں میں مہندی رچائی جاتی تھی، ڈومیاں جو گیت گایا کرتی تھیں، وہ شہبانا
کہلاتا تھا۔

سہلے یہ ڈومیاں گاتی ہیں لے کر جب دھول

شیخ جی! تم بھی سمجھتے ہو کچھ اُن سہلوں کے بول

برات

برات کی روایت سے قبل دو لہا کو نہلا دھلا کر، بری کے کپڑے زیب تن کر کے، زیورات پہنا کر، کئی
رسمیں ادا کی جاتی تھیں، جن کا ذکر پہلے مفصل کیا جا چکا ہے مثلاً منڈوے کے تلے دو لہا کو نہلانا، تیل
چڑھانا، گنگن باندھنا، زرد رنگ کا لباس پہنانا، سہرا باندھنا، گلے میں بارگجرے ڈالنا، کاندھے پر

۱۴۰ تاواریت شاہی ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱

شال ڈالتا، اور زیورات وغیرہ پہنا تا نظیر اکبر آبادی نے ایک دولہا کا علیہ ان اشعار میں بیان کیا ہے

اس وقت خوشی سے مندر پر شیو بیٹھے بن کریں دولہا
کچھ پان ک لالی، مہندی اور آنکھوں نیچے لگا کھسرا

ہر تار چمکتا چیرے کا اور تار سنہرے کا باگلا
اس تار زری کے چیرے پر جوں مہر چمکتا گلٹ دھرا

ہر کان مریض کنڈن تھے اور نگہ پر سونے کا سہرا
وہ سہرا کچھ پر یوں چمکے جوں سورج ہو دے کرن بھرا

وہ موتی ملے گلے جھلکیں اور ان میں لعلوں کی مالا
وہ بانک جڑاؤ بازو پہا اور کنگنا پہنے جھمک رہا

جب بیٹھے شیویں دولہا بن، تب پر یوں کاواں نالچ ہوا
وہ سرنا سرنا بھانجہ بچے، نقارے گونجے، شور مچا

برات کا منظر

جہاز ہوتی، تب شیو شکر خوشوقتی سے سوار ہوئے
سب آگے پیچھے دولہا کے دلشا دہراتی ساتھ چلے

فانوسیں رنگین، جھلکیاں اور جھانڈ بڑی دکائی کے
ہر آن جٹاؤ چنور ڈھلیں اور سیس کے اوپر چتر پرے

وہ پریاں ناچیں تختوں پر، پوشاکیں، کہنے، جھمک رہے
نقارے، نوبت، طبل، نشان، الغوزے بجتے، اور ڈفل

(بقیہ پہلے صفحے کا) کس کا یہ بیاہ تھا، جو موتیوں کے سہرو کی ابتک جھڑتی ہیں، دامان سحر سے ٹپلا

۱۳۵۹ء دیوان شاہ گمان ۲۲۰، ۲۵؛ دیوان آبرو ۱۹۶؛ آتش و ذوق ۵۰، ۵۳

۱۴۴ کلیات سودا ۲۶، ۱۶۵؛ دیوان شاہ گمان ۸۵

۱۴۸ کلیات سودا ۱۲، ۵۲

۱۴۹ کلیات ہدایت ۳۲۳؛ دیوان شاہ گمان ۵۸؛ کلیات نظیر اکبر آبادی ۹۲، ۹۰-۹۱

اردو ادب کا سماجی پس منظر

ہر عزت میں دھن میں ہیں کی، اور کرنا ترنی جہاں بڑے
 کر دھوئے دھوئے دھوئے باج رہے اندیشے بکتے کر کر پڑے
 مردنگ، مندیے تال بکین اور سارے گھنگھرو بھی جھنکے
 وہ ڈھول دھما دھم شور کریں، اور جھپٹے بھی جھیم جھیم کرتے
 وہ جھاڑ مشعلیں، پنشنائے، سب روشن اونچے شعلوں کے
 وہ صحرا جھمکا کو سوں تک اور ابرا جالی جا پہونچے
 وہ گھوڑے، میلنے، گھوڑ بھلیں، رتھ اونچے پیسے ڈھلتے تھے
 سب باجے بکتے جاتے تھے اور ہولے ہولے ملنے تھے
 جس آن برات آئی وہ پر یہ خولی ٹھہری زیب بھری
 وہ پر یاں ناچیں تختوں پر جھنکار میں مار جھیروں کی
 وہ ڈنکے لگتے دھوئے پر دھن کرنا سرنائی اونچی
 دردازے، کوٹھے، گونج رہے، آواز سہانی ان کی تھی
 کل زیب براتی چار طرف اور بیچ سواری دودھائی
 سب چھٹے چھٹے کوٹھوں پر، داں دیکھیں زینت اور خوبی
 وہ آئی تھی جو ساتھ لدی اور آتش بازی تھی چمکتی
 مہتاب، انار اور پھل پھول ہوائی خوب کڑی
 اک پہر تلک دروازے پروان پھول رہی پھلوا رہی سی
 سب ہاتھی گھوڑے بیل اچھلیں غل شور بہا اور دھوم مچی
 وہ طبل بکین اور ڈولے بھی نقارے، تاشے اور ترنی
 وہ دہل جھلی کے باج رہے اور گھر میں آواز گئی
 جب راجہ کے دروازے پر ہوئی آن برات اس لمحہ کھڑی
 سب باجے، ہاجے، دیر تلک اور چھوٹی آتش بازی بھی

اربعاد کا سماجی پرتل

جب سہمی آئے ملنے کو، اور سہلا دے کی ٹھہری
اس وقت بلا یاد دلہا کو تو ہو دے زیب مندی بھی
جب دو دلہا ڈیوڑھی پہن گئے، تہہ نکلیں سندھو چری
لے آئیں مندر میں دلہا کو، تو ہر دے نیت مندی بھی

برائیتوں کا قیام پذیر ہونا

کچھ جناسے کے بیچ گئے، کچھ جلیبیٹے دالانوں میں
کچھ آنگن میں، کچھ بیٹک میں، کچھ بیٹھے بالائے انوں میں
کچھ آن پرانے ڈیوڑھی میں، مشغول خوشی کی باتوں میں
کچھ باہر آکر بیٹھ گئے، کچھ بیٹھے رختا اور میاںوں میں
ہر ٹھوڑکیں کرنا مشرنا، اور ترنی طبل بھی محلوں میں
ہر جانب دھونے باج رہے، نقارے بجتے کوچوں میں
اور باجین نویت، جھانچہ پڑی، اس شادی کی گولیاں
کچھ بات نہ سمجھ کان دھری، ان باجوں میں، ان دھونوں میں
کچھ میانے، رختا اور گھڑ بھلیں، لا آں کھڑکیں لہلیں
کچھ گھوڑے اچھے، بیل لڑے، کچھ باقی جھوٹے گلیوں میں
جب جگہ نہ پائی تھی ہیں، کچھ توڑے شہر سوادوں میں
داں ڈیرے، تنبوتان لیے، اور بیٹھے خوش ان ڈیروں میں
وہ تھے داں جن میں طورا وہ نہ کل فرحت کے آہنگ چمکے
غل شور ہوئے، اور ناچ ہوئے، اور لگا ہوا دھون چمکے
برائیتوں کے لیے خورد و نوش کی اشیاء
جب راجہ نے حکم کیا، تیاری ہو اب بھوجن کی
مٹاوا کے میدان لاکھوں میں، اور میرے دھری، اور ڈنگری

لہذا ادب کا سماجی پس منظر

ملوائی ہزاروں آبیٹے، کرگرم کڑھائے، رکھ تعالٰی
کر کھائے سترے دودھ منگا اور ڈالی چینی شکر تری
پھر ڈالا خوب گلاب اس میں اور ڈالیں ٹولیاں مٹی کی
انبار لگائے پیروں کے، اور ڈھیر گلابی ادھر برقی
پھر لٹو بھی تیار کیے، دے قنار ہت بادام گری
براق مکد اور خرے بھی خوش رنگ امرتی، بیرلی
وہ خوب جلیبی اور کھجلی، وہ گھیور بالوسائی بھی
سب اتنے داں تیار ہوئے، جو ٹھوڑے رکھنے کو پائی

بھیرے

جب ساعت آئی پھیروں کو، تب ٹھہری اس جا یہ خوبی
گھر بیچ بلا یاد لکھا کو اور پھیروں کی تیاری کی
کچھ بیٹے لوگ ادھر ادھر سب اپنے من کے بیچ خوشی
جو فرس مقرر ہے، اس پر آبیٹے دو لکھا دو لکھ بھی
جب دو لکھا دو لکھ مل بیٹھے، تب ریت ہوئی گٹھ جوڑیکا
وہ پنڈت آئے، ہرم کیا، سب لاکر اس کی چیرکھی
سب پنڈت بیٹھے بید پر عین، کوئی بیٹھا ڈالے شکر گھی
گنیش کی پوجا کر کے داں، پھر بلو جا کی ٹوگن ہوں کی
پھر حال جو اہر نیگلس، لیں جلد سوا سی اور نیگی
اور لے لے نیگ دعائیں دیں، سب دو لکھا دو لکھ کو نیگی
سجود ساعت، نیک مہورت سے وہ دو لکھا دو لکھ کو نیگی

اس طور سے پھر لے مل آپس میں، ہے ریت جو ہوئی پھیروں

جب پھیرے چار ہوئے آکر کل عیش و طرب کی دھوا مچی
ہر چار طرف چمکی، جمبو، خوشحالی، خوبی، خوشوقتی

جہیز

بس آن ہوئے شیو چلنے کو، تب لا کر یہ اسباب دھوے
 پوشاکیں رنگین زیب بھریں، ہر تار پڑا جن کا بھلے
 زریور کے داں ڈھیر لگے، جو باہر ہودے گنتی سے
 وہ موتی، ہیرے انمولے، وہ نعل، زمررد کے ڈبے
 وہ کسے نئے نئے چاندی کے، وہ تھال کٹڈے سونے کے
 وہ فرش سنہرے نقش بھرے، جو پختے مخلوں بچ پڑے
 وہ چیرے خوب لباسوں کے، اور گنتی میں بھی بہتیرے
 وہ چیریاں اچھی صورت کی، سر پاؤں تلک زیور بھرے
 وہ کھل جھول جھلکتی کے، انباری جن پر اور ہودے
 وہ گھوڑے گلگوں مثل ہوا، زرد دوزی جن پر زین بندھے
 چند دل جھلکتے وہ جن پر بات زدی کے تھے ہر دے
 رتھ بیلیں اور گھوڑ بھلیں وہ سب ٹاٹھ چلتے جن کے تیر
 وہ رنگین جمال دار رتھیں وہ بیل بہت جن کے اونچے
 یہ ٹھاٹھ رکھا دروازے پہ اور بغدادی بوجھ اٹھانیکے
 تھے جتنے شادی بیاہ نعمت سامان جو داں تیار ہوئے
 ہر ٹھاٹھ کے داں دروازے پہ ہر جانب سوا بنا ہوئے

رخصتی

جب شیونے داں یہ حکم کیا تیاری ہو اب چلنے کی
 اور آپ مندر کے پیچ گئے تو ہودے بد اوں دولہن کی
 یہ بات بد اکی سنتے ہی داں گور اکی ماں یوں بولی
 سب طور تم اس کے مالک ہو یہ چیری میں نے تم کو دی

اودا بہ کا سماجی پس منظر

میں اس کا بہت ہی رکھیو خوشی مت میلا کیسیو اس کا جی
یہ پیاری ہے من کی میرے اور روشنی میری آنکھوں کی
یوں کہہ کر بولی گویا سے مل مجھ سے میری پاربتی
جب گورا پیاری دوڑ گئے واں اپنی ماں کے آلیشی
واں ماں بھی روتی دیکھ اسے اور روئیں جتنی تھیں گھر کی
ماں دیکھ کے روتی گورا کو کر پیار بہت یوں کہتی تھی
تو آنکھیں رو رو لال نہ کر میں تیرے مکھ کی بلہاری
کچھ اپنے من کے بچا نہ لائیں تجھ کو جلد بلاؤں گی
پھر آخرواں اس روتی کو کر پیار بہت سا گھڑی گھڑی
چنڈول منگا کر ڈیوڑھی پر واں سب نے روتی بھٹلائی
بچ پوچھو تو ماں باپ کے تئیں ہے بیٹی سے یار پیار بہت
جس وقت وہ بیاہی جاتی ہے جب ہوتے ہیں لاچار بہت

پسی برات

جب ڈیوڑھی سے چنڈول اٹھا دوڑا نہ پر سو خوشی سے
نوجھو اور اتنی ک اسپر کل موتی پھول زری بکھرے
سواری دو لہا کی آگے چنڈول دو لہن کا تھا پیچھے
وہ باجے لائے ساتھ جو تھے سب ہر دم پیچھے ساتھ چلے
اسباب دیے جو راجہ نے تھے اس کے جلتے اونٹ لدے
وہ جتنے حیرا چیری تھے سب رتھ اور میافوں میں بیٹھے
وہ ہاتھی گھوڑے ہر جانب انباری زین بھٹکتے تھے
اس دیس کے رہنے والے بھی سب دیکھنے نکلے گھر گھر سے
ہر کوٹھے کو ٹھے بھڑنگی اود سے رستے لوگ بھرے
غل شور خوشی کا چار طرف سب دیکھیں واں وہ تھا ٹھہرے

جہیز

جس آن ہوئے شیو چلنے کو، تب لا کر یہ اسباب دھرے
 پوشاکیں رنگین زیب بھریں، ہر تار پڑا جن کا بھلے
 زرد زور کے داں ڈھیر لگے، جو باہر ہو دے گنتی سے
 وہ موتی، ہیرے انمولے، وہ لعل، زمرہ کے ڈبے
 وہ کسے نئے نئے چاندی کے، وہ تھال کٹھنے سونے کے
 وہ فرش سنہرے نقش بھرے، جو بچتے محلوں بیچ پڑے
 وہ چیرے خوب لباسوں کے، ادھر گنتی میں بھی بہتیرے
 وہ چیریاں اچھی صورت کی، سر پاؤں تلک زید بھرے
 وہ کجلی جھول جھلکتی کے، انباری جن پر اوپر ہو دے
 وہ گھوڑے گلگوں مثل ہوا، زرد دوزی جن پر زین بندھے
 چنڈول جھلکتے وہ جن پر بانات زری کے تھے پردے
 رتھ پھیں اور گھڑ بھلیں وہ سب ٹاٹھ چکتے جن کے تیر
 وہ رنگین جمال دار رتھیں وہ میل بہت جن کے اونچے
 یہ ٹاٹھ رکھا دروازے پہا اور بغری بوجھ اٹھا نیکے
 تھے جتنے شادی بیاہ نمت سامان جو داں تیار ہوئے
 ہر ٹاٹھ کے داں دروازے پر ہر جانب سوا بنا ہوئے

رخصتی

جب شیونے داں یہ حکم کیا تیاری ہو اب چلنے کی
 اور آپ مندر کے بیچ گئے تو پھوڑے بجاواں دولہن کی
 یہ بات بد کی سنتے ہی داں گور کی ماں یوں بولی
 سب طور تم اس کے مالک ہو یہ چیری میرے تم کوئی

اردو ادب کا سماجی پس منظر

میں اس کا بہت ہی رکھیو خوشی مت میلا کیونکہ اس کا جی
یہ پیادہ ہے من کی میرے اور روشنی میری آنکھوں کی
یوں کہکر بولی گویا سے مل مجھ سے میری پار تہی
جب گورا پیاری دوڑ گئے واں اپنی ماں کے آلیشی
واں ماں بھی روتی دیکھ اسے اور روئیں جتنی تھیں گھر کی
ماں دیکھ کے روتی گویا کو کر پیار بہت یوں کہتی تھی
تو آنکھیں رو رو لال نہ کر میں تیرے مکھ کی بلہاری
کچھ اپنے سن کے بچہ نہ لائیں تب کو جلد بلاؤں گی
پھر آخر واں اس روتی کو کر پیار بہت سا گھڑی گھڑی
چنڈول منڈا کر ڈیوڑھی پر واں سب نے روتی بٹھلائی
بچ پوچھو تو ماں باپ کے تئیں ہے بیٹی سے یا پیار بہت
جس وقت وہ بیاہی جاتی ہے جب ہونے ہیں لاچار بہت

والیسی برات

جب ڈیوڑھی سے چنڈول اٹھا دوڑے ہر سو خوشی سے
نوجوان دانتی کی اسپرکل موتی پھول زری بکھرے
سواری دو لہا کی آگے چنڈول دو لہن کا تھا پیچھے
وہ باپے لائے ساتھ جو تھے سب ہر دم پیچھے ساتھ چلے
اسباب دیے جو راجہ نے تھے اس کے جلتے اونٹ لدے
وہ جتنے چیرا جیری تھے سب رتھا اور میاںوں میں بیٹھے
وہ ہاتھی گھوڑے ہر جانب انباری زین جھکتے تھے
اس دیس کے رہنے والے بھی صوب دیکھنے نکلے گھر گھر سے
ہر کوٹھے کو ٹھے بھیڑ لگی اندر سے رستے لوگ بھرے
غل شود خوشی کا چار طرف سب دیکھیں واں وہ تھا شہر مہرے

اردو ادب کا سماجی پس منظر

جس طرح خوشی سے بہا ہنسنے کو شیوہ آئے گھر میں راجہ کے

پھر ویسی ہی خوشوقتی سے کیلاش کے اوپر جا پہنچے

برات کی روانگی سے قبل دولہا کو گھوڑی پر چڑھایا جاتا تھا۔ لہذا گھوڑی پر چڑھنا ایک محاورہ بن گیا۔ انشا کا بیان ہے:

پوتوں بھلنا تجھ، اور دودھوں نہنا ناہون نصیب

بیاہ ہو سونے کے سہرے سے، تیری عمر دراز

گودے دولہا کے نگہ ہاتھ دولہن جو گوری

نقرے گھوڑے کے نصیبوں سے مل گھوڑی نور

سری رام نے برات کی رات، سچ دھج اور رقص و سرود کا یوں ذکر کیا ہے:

رقص و غیاگرانِ باد و نوا و سرودِ مطربانِ خوش اما سرہ نقابے دل انجمنِ انجمنِ بزمِ سرود

کو بہ نغمہ مبارکبادی سرود کیا۔ مدارست پان دالانچی و عطریات سے مشامِ ارباب

محفلِ معطر ہوا۔ جلوسِ برات بہزادانِ خوری و انبساط ہوا۔ گلکاری کی ٹیشیاں

قطر در قطار، آرائشی گلدستوں پر بہار، تختِ رداں پر مرجینانِ رقص کناں

سب سے آگے نوبت، نقارہ، نشانِ دور وید سرود چرغاں۔ روشن چوکی والی شہنائی

میں مبارکبادی کی غزلیں سناتے آتش بازی منامی گلہاے رنگین آتش بازی کی

دکھاتے جالتے تھے۔

میر تقی میر نے آصف الدولہ کی شادی کی برات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

برائے تفصیل ملاحظہ ہو کلیاتِ نظیر کبر بادی: ۷۷۸-۷۹۲؛ نیز دیکھیے مجموعہ مثنویات

میر حسن، ۱۲۷۔ دیوان شاہ کمال، ۸۶۴۔ معجمِ جواہر، ۳۹۔ الف، ۴۰۔ ب۔ تعبانہ ذوق

۷۰-۸۳ کلیاتِ انشا، ۱۹۵؛ کلیاتِ سودا، ۱۷۳-۳۷۳

۱۸۱ دقائقِ سری نام: ۱۸۱ دیکھیے کلیاتِ میر: ۷۸۰-۷۸۸۔ الف

کے لڑکے کی شادی کے موقع پر برات کے لیے دیکھیے دیوان شاہ کمال، ۸۶۴-۸۶۳؛

اور ہنظیر کی برات کے منظر کے لیے مجموعہ مثنویات: ۱۲۲-۱۲۳

رقص و سرود کی محفل

جو دھ رپت، وہ محفل میں گارنائے تو خوشحال خان کو دیوانہ بنائے
 سمان رقص کا ہے یہ اس کے بندھا دلِ غلق ہے ہو رہا مہبت ملا
 وہ اس طرح کی پہنے پنہوار ہے بڑھاتی جو سوناز و انداز ہے
 جو بار بھی ہر اس کی کیجے نظر تو ہے مارے کپڑوں سے بار کیتر
 پہن پایجا مر کے اس کے تلے جو دیکھے تو قدموں سے جا سرے
 وہ دکھلائی دے جائے بنداز ہوسیاب ساں دیکھ دل بے قرار
 دوپٹا بنارس کا وہ ددڑ خا جو اوڑھے ہے اس پر عجیب ہنسیا
 کسی جا شجاعت خان اور ان کے باپ رہے ہے محمد خاں اور وہاں الاپ
 سمان ان کے گانے کا ہے یہ بندھا مشائخ ہیں سب و جد میں جا کجا
 کہیں لوندے کتھک کے ہیں گاریے اوٹھا ہاتھ ہیں بھاؤ بتلا رہے^{۱۸۳}

دھنگا نا

شاہ عالم ثانی، دیکھن نکسین مہدی اکبر شاہ کی سب ناری بنی پر یاں
 سب بدھن مل دو ار روک کھڑیں، لے ہاتھوں میں چڑیاں^{۱۸۴}

سودا: ریت و رسم میں دی جان بنے نے تس پر

دیکھنا اسن کو بتو کا نہ ملا بھر کے نظر

نیگ میں جا کے دھنگا گانے کے دینا اپنا

^{۱۸۵} لینے دالوں نے کہا خرم و شاداں ہو کر

انشاء: نو عروساں چین کا دیکھیے گا اغتلاط

^{۱۸۶} چل رہی ہیں خوب سی بھولوں کی چڑیاں باغ میں

۱۸۳ دیوان شاہ کمال: ۸۵۳-۸۵۵ ۱۸۴ نادرات شاہی: ۱۱۵

۱۸۵ کلیات سودا: ۲۶، ۱۶۵، ۱۹۸، ۳۶۳؛ گنج اسرار: ۲۱۰ (رب)

۱۸۶ کلیات انشا: ۱۰۶

تو مجھے کچھ نہ ہو معلوم مگر اتنا کچھ

چھڑی پھولوں کی کوئی جیسے کہ سمدھن مارے

۱۸۷

سمدھنوں کی آپس میں گالی گلوچ

میرمن دہلی، اترنے کی واں سمدھنوں کی بھین

گلوں میں پنہا ناوہ ہنس ہنس کے ہا

دکھاناوہ بن بن کے اپنا بناؤ

تہاتے، ہنسی، شور وغل، تالیا

سہانی سہانی نئی گالیاں

نظیر اکبر آبادی :- سمدھن کے موضوع پر نظیر نے پوری ایک نظم لکھی ہے۔ اس کے چند شعور یکھے:

کردن کس منہ سے، اے یارو! بیاں میں شان سمدھن کی

لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

کمر نازک، مشکتی چال، آنکھیں شوق، تن گورا

نظر چنیل، ادا اچیل، یہ ہے پہچان سمدھن کی

سنہری تاشن کا لہنگا، روپہلی گوٹ کی انگلیا

چمکتا حسن جو بن کا، جمعکتی آن سمدھن کی

ملائی ساٹم، سینہ معقٹا، خوشنما ساقیں

مفازا نوکا آیینہ، ملائم ران سمدھن کی

۱۸۷

اخلاقی اعتبار سے اٹھارھویں صدی کا زمانہ کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ اورنگ زیب

کے انتقال کے بعد اخلاقی قدروں کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ جہاندار شاہ کے زمانے

میں یہ حال تھا کہ بادشاہ لال کنور کی آغوش میں ہوا اور کوئی مصاحب اتفاقہ چلا

آئے، تو بادشاہ مسکرا کر سر جھکا لیتا تھا۔ شرم اور غیرت اٹھ چکی تھی۔ شاہی محل میں اب

۱۸۷ ایضاً: ۱۵۳

۱۸۸ مجموعہ شعریات میر حسن (۱۲۵۱) نیز دیکھیے ناولات شاہی (۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹)

۱۸۹ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۹۱۲-۹۱۳-۱۵۷

اردو ادب کا سماجی پس منظر

خاندانی بیگمات کم اور طوائفیں زیادہ تھیں۔ اس لئے شادی بیاہ کے موقع پر نہایت ہیودہ مذاق اور فحش نکالیاں ایک دوسرے کو دسی جاتیں۔ بلکہ سمدھی سمدھن ایک دوسرے کے نام لے کر اس قسم کی نکالیاں دیتے۔ نادرات شاہی اس قسم کی لغویات سے بھرپور ہے اور اس زمانے کے ابتدائی تصویروں سے۔ لیکن واضح رہے کہ اس عہد میں سطحی جزو ادب تھا۔

شاد عالم آفتاب^{۱۹} : سمدھن ملک زمانی نے کہوئے رات پکار

سمدھی! بس کر، اب مجھے پھولن گیند نہ مار

سمدھن صاحب محل جب بولی، کیوں تم کو چھوڑا

وہیں ہاتھ سمدھی نے پکڑا منہ میں ڈالا پیڑا

سمدھن! تیری تنگ بہت ہے سندر سگندر تو تھی

انگری جات نہیں ہے وائیں، ایسی لال انگوٹھی

دولہن کا سنگار

وہ مہندی سوہانی، وہ پھولوں کی باں	میں دہلوی امر دس وہ گہنا، سوہا لباس
نئے لکے آئیں میں دنوں کے بھاگ ^{۱۹}	لا شرعے جوڑے پہ عطر سہاگ
کہ جوں دودھ کے بعد شلہ ہوصاف	کجوری وہ چوٹی زری کامرباوت
تو آنے لگی خون کی اس میں بائیں ^{۱۹}	عروسانہ اس نے کیا جو لباس
پہرایا کس نے یہ عطر سہاگ پانی پر ^{۱۹}	سنفنی! ہر ایک موقع میں دولہن کی بوجو آتی ہے

زیورات

مصنفی نے ایک مسلم عورت کی حکایت بیان کیا ہے جس کی شادی کسی منسل سے ہوئی تھی۔ اس میں اس نے دولہن کے سنگار کا یوں ذکر کیا ہے۔

کانوں میں جڑا تو اس کے بالا
ہو جیسے رستارہ دار ہا لا

۱۹۰ نادر ات شاہی ۵۲۱

۱۹۱ مجموعہ مثنویات میر حسن: ۱۳۶، دیوان ظفر: ۱۶۵۱۲

۱۹۲ دیوان مصنفی: ۱۰۰، ۷۴

۱۱۲ ایضاً: ۱۱۸

نتھناک میں پالہ قمر تھے یا قلم حسن کے بھنور تھے
 کانوں میں وہ بالیاں طلائی کرتی تھیں ادا سے کچ ادائی
 بازو پہ کسا ہوا وہ بھمند تھی جس کی پری بھی آرزو مند
 الماس کے کڑے طلائیوں میں حل کردہ قمر صفائیوں میں
 ہاتھوں میں وہ پور پور چمکے تھے جن سے بخوں لپاں محلے
 جنگو وہ گل میں ماہ پارہ جوں ماہ کے پاس ہر ستارہ
 الماس کی انور بسی وہ سادہ موتی کوئی ہوئے جوں پیادہ
 پاؤں میں وہ موتیوں کے پازیب ہو جاوے پری کو جیسے آسیب
 پھر ترس پہ کڑے غضب وہ خوار ہو جن کی کھٹک سے فتنہ بیدار^{۱۹۲}

سہاگ اور گھوڑیاں گانا

ادھر تو یہ رنگ تھا ادھ یہ راگ محل میں اُدھر گھوڑیاں اور سہاگ
 وہ گھر گھر سے شادی مبارک، وہ دھول وہ ٹوٹے سلونے وہ میٹھے سے بول^{۱۹۳}

ڈومنیوں کا مبارکباد گانا

شادی مبارک، آگے لگے گانے غریب ہر اگنی خوشی سے ہریک اس چمن کی ہل
 بول اٹھیں بن کے ڈونیاں سالی قریاں صاحب ایس دلائے دودھا دلہن کی بیل^{۱۹۴}
 شیخ جی کا جب ہر اسبڑا کی پوتے سے نکاح ڈومنی گائے بدھادو ایسا ہریا لہ بنا^{۱۹۵}

دو لہن والوں کے ہاں کی رونق

جب آئی وہ دو لہن کے گھر پر برات

کہوں داں کے عالم کی کیا تم سے بات^{۱۹۸}

۱۹۲ ایضاً، ۱۱۶۱۵ (الف دب) دو لہن کے زبیرات میں نتھ کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ

کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ دیکھیے کلیاتِ سودر ۲۰۱، ۲۰۲، ۱۰۲، ۱۷۵

۱۹۶ کلیاتِ انظار ۸۲۱

۱۹۵ مجموعہ مثنویات: ۱۳۵

۱۹۸ مجموعہ مثنویاتِ میر حسن ۱۲۳-۵

۱۹۷ ویران معنی، ۳۴۱، ۲ (ب)

امداد بکاسا ہی پس نظر

جب باد نے جھاڑی خار و خشک اور بادل پانی چھڑکائے
 بانات قناتیں شمیائے دل بادل تنہو تنوائے
 ٹیکرے جمال موتی کے، کنواریاں مشہر جھلکائے
 گل فرش حریر اور دیبا کے، خوشترنگ چلتے پھٹتے
 مقیش زری کے لمبے بھی پھر جاگہ جاگہ ٹٹکائے
 گل قطر و گلاب اور پانی دھری، کستوری منبر کھٹکائے
 پھر تھال ہلاکچ لوگوں کے، پھر خوب طرح سے چٹکائے
 جگر دھریں سوزیب بھریں، اور طرہ ہار بھی کندھوں کے

لاح اور پھیرے

رواجی رشتہ قائم کرنے کے لئے مسلمانوں میں نکاح اور ہندوؤں میں پھیرے کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں
 ان کے بعد برائیوں میں ہار، پان، شربت پلانے اور خاصداں نذر کرنے کی رسمیں ادا ہوتی تھیں
 ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان پلا سب کو شربت دیے خاصداں
 ان کے بعد سہرے پڑھے جاتے تھے۔ یہ رسم خالص ہندوستانی تھی۔ سہرے لکھنے کی ابتدا مانسویں
 ای کے نصف اول سے ہوتی ہے سہرے دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک روایتی، جنہیں ڈونیاں
 فوشی کے موقع پر لگاتی تھیں، دوسرے وہ سہرے جو شاعر دو لہا کی شان میں لکھا کرتے تھے۔
 میں یا تو وہ خود پڑھتے تھے یا ارباب نشاط سے گواتے تھے۔ اس سلسلے میں ذوق اور غالب کے
 ہرے قابل ذکر ہیں۔

اور شاہ ظفر: ظفر نے اپنے لڑکے کی شادی کے موقع پر یہ سہرا لکھا تھا:

گرتا اس مرغ پہ کیا جلوہ خالی سہرا	آئی ہے دیکھنے ساری خدائی سہرا
شکر اللہ کہ اللہ نے دکھایا یہ دن	دیا اس کے مرغ تاباں پہ دکھائی سہرا
سیم وزد کرتا مہ سے ہے چہ نثار	دیکھ کر چاند سے کھڑے پہلائی سہرا

۱ کیا ہی ظفر ۸۴۱ھ

۲ مجروح شہزادی میر حسن: ۱۲۶۰؛ دیوان شاہ کمال: ۸۶۳؛ دیوان معنی: ۵۴۳

آفریں کرتے تیرے معنی روشن پہ ظفر یہ اگر سنتے پہائی و سنائی سبہا
اس کے بعد دولہا کو زنا خانے میں بلایا جاتا ہے وہاں مختلف قسم کی رسمیں مل میں آتیں، جو
توصیحات پر تھی۔

پہلا یوں وہ دولہا دولہن کی طرف اڑے جیسے ببل ہمن کی طرف
وہاں تک پہنچتے ہوئے یہ کہوں ہوئے ڈھلے لاکھوں بہر شگون
مصحف آرسی

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال دھرا بیچ میں سر پہ آچل کو ڈال
وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم وہ آپس میں دولہا دولہن کی رسوم
گھوڑا بنانے کی رسم
زنا خانے کی دیگر رسموں کے علاوہ ایک رسم یہ تھی کہ دولہا کو گھوڑا بنا کر اور اس پر زین
دولہن کو اس پر سوار کرتے تھے۔

زین میری کا دکھا س عمر میں ہے یوں بھرنا
پیر سے آپ کو جوں پیر کا گھوڑا کرنا
بیابا کے زرد دھسا سر اوپر دھرتا
زین پر ہو گئی گردن تری جھک کر ہرنا
شکل غوغیر ہے ، داڑھی تری چوکھڑ ہے

رخصتی

اس موقع پر دولہن کے عزیز قریب اور سہیلیاں اور بھولیاں اس سے مل کر روتی ہیں۔
سمرا کا وہ ہونا وہ ڈونے کا وقت وہ دولہن کی رخصت، وہ روتے نکلتے

۲۰۱ دیوان ظفر، ۳: ۱۹-۲۰؛ دیوان شاہ کمال، ۹۶۴؛ قصائد ذوق، ۷۱

۲۰۲ براۓ تفصیل دیکھیے مجموعہ شہنشاہ میر حسن، ۱۲۶-۱۲۷؛ نیز دیکھیے کلیات نظیر گبر آبادی، ۱۰۳۷-۱۰۳۸

۲۰۳ مجموعہ شہنشاہ میر حسن، ۱۲۶-۱۲۷؛ دیوان شاہ کمال، ۹۶۴؛ کلیات سودا، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲

۲۰۴ کلیات سودا، ۱۰۷

اربعادب کا سماجی پس منظر

کھڑے سب کا لاچار منہ دیکھنا کر یا رب! یہ کیا ہے جہاں پیکھنا
 وہ دولہن کا رورو کے ہونا جدا وہ ماں باپ کا اور رونا جدا
 چنڈول، ڈولی یا پالکی پر بٹھا کر دولہن کو رخصت کیا جاتا تھا۔ یہ رسم آج تک مروج ہے،
 وہ دولہا کا دولہن کو گودنی اٹھا بٹھانا مہمانے میں آخر کو لا
 چلے لے کے چنڈول جس دم کہاں کیا دوطرف سے زراس پر نثار
 کھڑے تھے جو داں چٹم کو تکیے سوموتی انگوٹوں نے نچھا در کیے^{۲۰۶}
 جب ڈیوڑھی سے چنڈول اٹھا دروازے پر سو خولی سے
 فوجیا در اتنی کی اس پر کل موتی پھول زری بکھرے^{۲۰۷}
 برائے ہی شان و شوکت سے واپس آتی تھی۔ دولہا کے گھر میں چند رسمیں بھی عمل میں آتی تھیں،
 غرض اس طرح جب وہ دلہن کو بیاہ لے آیا جہاں اس کی تھی عیش گاہ
 ہوتی وہ جو ہوتی ہے رسم و رسم سونپا ہر مہنتی یہ بھی در کا روضہ^{۲۰۸}
 چوتھی

شادی کے چوتھے دن دولہن کے گھر میں ایک رسم ہوتی تھی، جو چوتھی کہلاتی تھی۔ اس دن دولہن شوہر
 کے ساتھ اپنے والدین کے گھر جاتی اور اس کے ہمراہ اس کے سسران کی عورتیں ہوتیں۔ اس موقع
 پر رنگ کھیلا جاتا تھا، جسے ہولی کہیلتے تھے،

یوں جو ہم سب کو آج رنگ میں لال ہنستی ہے دیکھو دیکھ بوڑھی بامثال دکلا،
 اور جونا زک مزاج کوئی ہوئی کھیلتی تھی عبسیر بھر جھولی
 ادر کوئی کسی پہ ڈال کے رنگ کہنتی تھی ۴۷ بوا! نہ ہولی تنگ
 ہولی کے کھیلتے ہیں اب اس دم میں تو تنگ گئی، مجھے علی کی قسم

۲۰۵ مجموعہ شریات، ۱۲۷؛ کلیات فقیر: ۷۱-۷۲

۲۰۶ ایضاً: ۱۲۸؛ کلیات فقیر (جب ڈیوڑھی): ۷۳

۲۰۷ کلیات فقیر: ۷۲-۷۳

۲۰۸ ایضاً: ۱۲۸-۱۲۷؛ کلیات: ۷۲

اصول کا سماجی پس منظر

کوئی کسی کے غلام منہ پر مل کہتی تھی، ہوتی جان آج غسل
 اور جس سے لگی تھی جس کو لاگ اور سے اس رنگ کھیتی تھی چاک^{۲۰۹}
 اٹھایا اس دھوم میں لگتے ہاتھ پریراد کا سیاہ چوتھی کے ساتھ^{۲۱۰}
 نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم ”مہادیو کا بیاہ“ اور کھنیا جی کی شادی^{۲۱۱} میں شادی کی رسموں کا تفصیل
 ذکر کیا ہے۔ غلام اظہر بیگ اظہر نے اپنی شہزادی گنج اسرار میں بھی شادی کی رسومات کا صنف
 ذکر کیا ہے۔ یہ شہزادی دکنی اردو میں ہے۔^{۲۱۲}

زیورات

جسم کے مختلف حصوں کی آرائش کا جذبہ عورتوں میں قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ جمیلہ برج بھوشن لکھنویہ^{۲۱۳}
 خوبصورتی اور زیورات سے فطری لگاؤ، انسان اور خدا، دونوں میں یکساں طور
 پر پایا جاتا ہے۔ حسن اور خوبصورتی کے روحانی تصور است کا تاریخی میں جسمانی اور
 باطنی ربط تصور است گہرا تعلق رہا ہے۔ اور خوبصورتی کی علامتوں کی ابتدائی
 جڑیں اصلیت اور وجود کی خوبصورتی میں برابر ہیں۔

ہندستان میں زیورات کے استعمال کو ایک مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا کیونکہ انہیں کو سہاگ
 کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس نقطہ نظر سے ہندو اور مسلمان عورتوں میں زیورات کی یکساں اہمیت
 تھی۔ شادی شدہ ہندو عورت، پر ایک نہ ایک زیور پہننا لازم تھا۔ لیکن مسلمان عورتیں قیمتی تہ
 اور نگینے کو نظر سے محفوظ رہنے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ مسلمان عام طور پر انگوٹھیوں میں

۲۰۹ دیوان مہجور: ۱۷-۱۸

۲۱۰ مجموعہ وثائق، ۱۲۸ کلیات سور، ۲: ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸

قرآنی آیات کندہ کر کر پھینتے تھے۔ بعض اوقات ہندو بھی منتر وغیرہ کو کندہ کر لیتے تھے۔^{۲۱۵}

ابتداء میں دنیا سے اسلام سے آنے والے مسلمان اپنے زہد و تقویٰ یا افلاس کی وجہ سے سونے اور چاندی کے زیورات استعمال نہیں کرتے تھے، بالخصوص مرد۔ لیکن شدہ شدہ جب ان کے پاس دولت آئی اور وہ ہندوستانی تہذیب میں گھل مل گئے، تو وہ احتراز جاتا رہا۔ البتہ وہ ہندو جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اپنے روایتی اور قدیم زیورات اس کے بعد بھی استعمال کرتے رہے۔ اسی لیے ہندوستانی اور بیرونی مسلمانوں کے آپسی میل جول کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی زیورات کا استعمال عام ہو گیا۔ مغل بادشاہ: صنعت و حرفت کے بڑے مرئی تھے۔ دستکاروں اور بالخصوص سناروں کے فن کو ان کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ ابوالفضل کا بیان ہے:^{۲۱۶}

ہر شخص ان نیکوہ زیورات کو مادہ یا جڑ اذ بخواتے ہیں اور طرح طرح سے پہنتے ہیں زیور سازی کے مجاہد کیا بیان کروں۔ ان کی نزاکت اور ہنرمندی۔ یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک تولہ سونے کے زیور کی اجرت دس تولہ تک دی جاتی ہے۔ جہاں پناہنے اور نئی نئی وضع کے زیورات ایجاد کیے ہیں۔

بملا ہندوستانی عورت قدیم الایام سے اپنی آرایش اور اپنے اوپر بھاری اور وزنی زیورات لانے کی خواہشمند رہی ہے۔ مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں متداول رسموں پر پوری طرح سے عمل ہوتا رہا۔ ہندستان میں آنے والے تمام سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ زیورمت ان کے دلوں کی خوشی تھی اگر تہمتی سے کوئی عورت میوہ ہو جاتی، تو اسے تمام زیورات سے محروم ہونا پڑتا تھا۔^{۲۱۷} سجان رائے بھٹنڈاری کا بیان ہے:^{۲۲۰}

دوران کہ پس از شوہر خود زندہ می ماند، بمقتضائے وفاداری و عیادت و دستی از لذات خوردن و آشامیدن و تمتعات لباس خوش و زیور پوشیدن خود را بازمی دارند

اپنے شوہروں کے انتقال کے بعد مسلمان عورتوں میں بھی یہی عمل پایا جاتا تھا اور وہ زندگی کی تمام خوشیوں

۱۲۶ آئین اکبری دارود ترجمہ ۲۱: ۲۸۵ ۲۱۷

۲۰۸ منوچی، ۳: ۴۴

۲۱۹ منوچی، ۳: ۴۰ ۲۲۰ خلاصۃ التواریخ: ۲۶

جی حاصل نہیں رہی کم از کم عربوں اور ایرانیوں میں تختہ کے استعمال کے لیے کوئی ثبوت دستیاب نہیں
تا۔

انگریز کے عہد میں ایک نئے زلیو، جہانگیر سی (پتھروں سے جڑاؤ پہنچی) کی ایجاد ہوئی جو کلائیوں میں
ہی جاتی تھی۔ ۲۲۵ اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک ان کی تعداد بڑھ کر ۵۵۰۰ تک پہنچ گئی، اور ان
سے بہت سے ایسے زیور رکھے، جو عہدِ مغلیہ میں ایجاد ہوئے اور ان کو فارسی نام دے دیا گیا تھا۔
تمام زیورات مسلمان عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ اردو ادب
ان زیورات کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

زبسی: یہ زیور عورتوں کے سینے پر لٹکتا رہتا ہے۔ ارد میں اسے دھمکڑی بھی کہتے ہیں۔

دو لڑا، مالا، بدھی، اُربسی (الف) ریہ ن باری (ب) گہنے کے سمبھنسی ۲۲۶

الماس کی اُربسی وہ سادہ موتی کون ہوے جوں پیادہ دکدا، ۲۲۷

گلے میں اُردبسی اب نعل ٹکڑوں کے مت پہنڑ ۲۲۸

ستم ہے اُربسی لڑے پڑی دن رات چھائی پر ۲۲۹

صحفی: ہیرے میں اس کے پے پیر بیضا کی روشنی

ہو کیونکہ اُربسی کے ترے ہسر آفتاب

نوٹ: ایک گمنگھرودار زیور جسے ہندوستان کی عورتیں پیر کے بخوٹے میں پہنا کرتی ہیں۔

دہی سراسری، چنپا کلی، دہی گہنے دہ ٹیکا بنیے، دہی جھیکے، اور دہی انوٹ ۲۳۰

تو بیڑوں میں ہیکل کے کیا بقیہ اس کو پردیں کی جو ہاتھ آئے شب اُٹی پائل کی انوٹ ۲۳۱

صحفی: پشتِ پاپن وہ لڑکت کر فلش کے ڈسے جھکِ گل کو زکرے پاؤں کا اپنا انوٹ

۲۲۰

۲۲۶ دیوالہ فائز: ۲۰۶ (الف) ریہ ن = رات باری مبارے

۲۲ دیوانِ مصحفی، ۵: ۱۱۴ (الف) ۲۲۸ مجموعہ مغلز، ۱: ۱۲۶

۲۲۰ ایضاً، ۱: ۳۸۹ ۲۳۰ کلیاتِ انشا، ۲۶۱

۲۲۰ دیوانِ مصحفی، ۵: ۲۸ (ب)

انگوٹھی یا انگشتری: ہاتھوں کی انگلیوں کا زیور۔

دل چملا چاہے، تو پہن انگشتری زیب دے ہاتھوں کے تئیں رنگ پری
ضعف اگر خوش رنگ واسلوب ہے تو انگوٹھی بیچ رکھنا خوب ہے ۲۳۲
انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی

جنھوں کی آن پہنچی، لڑ موندے وہ ایک چمچ پر ۲۳۳
یا انگوٹھی کی گہڑی ہے وہ نزاکت سے بھرے

جس پہ قریاں کیے سینکڑوں بکتے ارگن ۲۳۴
یاں نگین لعل کی انگشتری ہے کس کو طبع

۲۳۵ فقر کا ہر گز نہیں آتا ہے زیر رنگ دست

آرسی: ایک، چاندی یا سونے کی سادہ یا مینا کا انگوٹھی کا نام ہے جس میں چھوٹا سا گول آئینہ جڑا ہے
ہے اندر سے عورتیں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں اسی غرض سے پہنتی ہیں کہ ہر وقت اپنا سنگار دیکھ
کرتی رہیں۔

۲۳۶ آبرو: رہے ہے تیس دن خڑگاں کے سنکھ کلیجا آہنی ہے آرسی کا
یکرو: چور دیاؤ تو دل میرا دکھاؤ سنتا ہے شوخ خواہاں آرسی کا ۲۳۷
میرا آرسی کے گھر میں شرم سے میر کم ہی وہ بمیٹال آتا ہے ۲۳۸
دیکھ اس دہن کو ہر دم اسے آرسی کو یوں ہی

۲۳۹ خوبی کا در کسو کے منہ پر بھی دار ملے ہے

۲۳۲ دیوان آبرو (ضمیمہ): ۷

۲۳۳ کلیات انشا: ۲۶۶، ۱۶۵، ۱۶۶، مجموعہ نغز: ۱۲، ۲۶۱

۲۳۴ دیوان شاکر ناجی: ۱۰۲، کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۰۳، ۱۸۲، ۲۱۵

۲۳۵ کلیات سودا: ۱۱، ۴۵ ۲۳۶ دیوان آبرو: ۳

۲۳۷ دیوان یکرو: ۲ ۲۳۸ کلیات میرا: ۱۷۸، ۱۸۱

۲۳۹ ایضاً: ۱۸۲

اردو ادب کا سماجی پس منظر

دہاں آرسی ہے، وہ ہے، یہاں سنگ ہے، چھاتی ہے

۲۴۰ گزرے ہے جو کچھ ہم پر سوس کی بلا جانے
پتھر سے توڑنے کے قابل ہے اُرسی تو

۲۴۱ پر کیا کریں کہ پیار سے! منتیرا دیریاں ہے
سودا: بان کھا کھا کے اُرسی کے بیچ اپنے ہونٹوں کو دیکھتا ہے لال
معصی: اُرسی ہاتھ سے ایک دم نہیں چھٹتی ہرگز

۲۴۲ کتنا خود رفتہ ہے وہ شوق بھی خود بینی پر
اُرسی میں جب سے دیکھا کرے ہے کپکو

۲۴۳ کر نہیں سکتا کوئی اس کا نظارہ دوسرا
میر حسن دہلوی: کوئی اُرسی اپنے اُگھے دھرے ۱۰۱۵ سے کہیں بیٹھی کچھ بھی کرے
انجو ٹٹے کی لے سامنے اُرسی ۱۰۱۶ وہ صورت کو دیکھا اپنی گلزاری
اجی دیکھو گے جب تم اُرسی مصحف دہاں انشا: ۱۰۱۷
جرات: اپنی صورت کا جو اس نے دوسرا دیکھا تو بس

جہانولی ہر دم نئی اک اُرسی کے ساتھ ہے
نفر: کبھی جو چہرہ اپنا اُرسی میں دیکھا تو وہ غمور سمجھا وہ کنکنا چاہ کنکنا میں

۲۴۱ ایضاً: ۱۹۱ ۲۴۲ ایضاً: ۱۹۳

۲۴۳ کلیات سودا: ۱، ۹۲، ۱۱۸، ۲۰۴ ۲۴۳ دیوان معصی، ۵: ۷۷، ۷۸، ۱۳۰ (دب)

۲۴۴ ایضاً: ۷۷، ۹۰ (الف)، ۱۳۴ (الف)، ۱۳۵ (الف)، ایضاً: ۸۰، ۹۶، ایضاً: ۱۲۰، ۹۸

(دب)، ایضاً: ۵۷، ۱۳۰ (الف)، ۷۷، ۷۸ (دب)

۲۴۵ مجموعہ شذوئات میر حسن: ۱، ۳۱، ۱۱۱، ۱۲۲، ۱۲۶

۲۴۶ ایضاً: ۱۲۵، نیز دیکھیے مجموعہ نفر: ۱۱، ۱۶

۲۴۷ کلیات انشا: ۲۴، ۱۳۹، ۱۴۹، ۳۷۰، کلیات نظیر اکبر آبادی: ۷۷، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹

۲۴۸ دیوان نفر: ۲، ۱۸۲، ۳۳۶

تظیر اکبر آبادی: (ادھر جگنو، ادھر کچھ بالیں میں جلوہ گر ہوئی، دس ۲۵۵)
 کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اچھلتا ہے
 کوئی بندوں سے مل کر کان کی نرمیوں میں ملتا ہے
 لہٹ کر دھککتی میں کوئی سینہ پر چھلتا ہے

کوئی جھمکوں میں جھولے ہے، کوئی بالی میں ہلتا ہے
 بھلی: عورتوں کے کان کا ایک طللی زبور، جو سادہ یا جڑاؤ ہوتا ہے،
 میرا بجلی وہ ہر ایک زینت گوشہ تھی برق برائے خرمین ہوش
 تظیر: نہ جھمکیں کس طرح کانوں میں اس کے حُسن کے جھمکے
 ادھر جھمکا، ادھر بندھا، ادھر بجلی کا بالا ہے ۲۶۴
 ظفر: گونج بالی کی مرے دل میں جیسے ہے جس طرح ۲۶۵

نیش کتر دم میں ہے کاہے کو اس منوں کی تلاش ۲۶۵
 دکھاتا کان کا بالا جو تور خسار پر اپنے
 ترے حلقہ بگوشوں میں میرا ہالہ نشیں ہوتا ۲۶۶
 سودا: منہ سے نقاب اٹھتے ہی حلقہ بگوش ہو گئے
 خال کے، خط کے، زلف کے، بال کے گونج کا گونج ۲۶۷
 بندہ: آدیزہ/گوشوارہ کی تم کا ایک مراحمی دار گینہ ہوتا ہے؛ یہ بھی کان میں پہنا جاتا ہے،
 رنگین: بندہ جو کان میں ہے، تو بالافروہ ہے ہر بات میں فرض کہ چھالافروہ ہے
 افشا: بندہ اپنی کے یوں تو نہ پھر وزیر آسماں
 ایسا نہ ہو کہ زہرہ گردوں ٹپک پڑے ۲۶۸

۲۶۳ کلیات تظیر اکبر آبادی: ۱۵۱

۲۶۵ دیوان ظفر، ۱۱، ۱۳۱؛ ایضاً، ۲، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸

کچھ دے اپنی نشانی مجھے بُندا، بالا

۲۷۹

توڑا، زنجیر۔ قول کا چمکا ہوا معنی

ہے ظلم اوس پر سی پر ہم فحش نہ ہو دیں جس کے

PL.

یہ جھکے، بندھے، بالے، توڑے، کڑے، چھوڑے ہوں

معصی: کوئی کیوں نہ گریاں جاگ کرے، اب، دیکھ کے چھپ کو اس جُست کی

۲۷۱
بندے کا جھگڑنا ہمارے خدا، چولی کی مسک پھر ویسی ہے

•

۲۷۲
انگلیا کی بھرپور، گولٹوں کی جھمک، بندوں کی کڑواہٹ ایسی ہے

مُلاقا: ایک زیرہ کا نام ہے جو عورتیں دیوارِ مینی میں پہنتی ہیں،

حائم: چاند سے تارے کا ہوتا ہے کجھو جو اتفاق

۲۶۲

اس طرح منہ پر ترے پیارے جھمکتا ہے بلاق

مصحفی، عالم سادگی کے وصف میں نے جو کچھ، توناک سے

PLN

اس نے اتار کر وہیں اپنا بلاق رکھ دیا۔

گر بلاق اس کے کا موتی نکھتے فرد آجائے یاد

YLD

جہاں نقطہ اک، درمکنوں قلم سے گر پڑے

شاکر ناجی: اب چہرے کی زخموں کو ڈر کے اتارے میں بولے

164

۱۷۹
ناک رکھی حسن کی پیارے جوتیں پہنی بلاق

کیا ہے بقیہ را افسوس نکتور دی سین ناجی کل

PCLL

یہ ہوتی نہیں بلکہ اس کی میری ہانک لائی ہے

٢٦٩ ايضا : ٥٠

٢٤٠ ايضاً : ٩٨

٢٤١ ديوان مصفى، م: ٤٨، ايضاً، ه: ١٠١ (الف)، ايضاً، ا: ١٥٤، ديوان فائز، ٢٠٦؛

کلیات نظیر کبر بادی: ۱۷۸، ۱۰۳، ۱۱۵، ۱۵۹، ۱۷۷، ۲۵۵، ۲۵۸، مجموعہ نقوش: ۸۸

۲۷۲ کلیات نظریہ کبریا کادی: ۲۵۸۱ . ۲۷۳ مجموعہ نغزہ: ۱۷۱۱

٢٤٣ ديوان مصفى ٣: ٥ (الف) ٢٤٥ ايضا ١: ٤ (الف)

۲۷۲ و ۲۷۳

ظفر: مجاہد کا تری ہے یہ موتی کہ قائم اٹتا ہے یہ پارا ۲۷۸

عجب ہیں صورت سے لے رہا ہے تو یہ لڑکے کی طرح ۲۷۸
بیسرو ایک طلائی زیور، اسے بھی عورتیں ناک میں پہنتی ہیں۔

۲۷۹
وہیں ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام دھرموتی
جہیں پر موتی اور بیسرو موتی، مانگ پر موتی

بانک: ایک قسم کے چمکے کا نام ہے،

جو دیکھا میں نے ان مہندی بھرے ہاتھوں کا ہل جانا

۲۸۰
انگوٹھی، بانک، چمکے، آرسی کا پھر نظر آنا

پور: چاندی یا سونے کے پھول، ایک قسم کا زیور، پائی کے چھوٹے چھوٹے گھنگھری
شوخ پر اپنے زرد تھے، اس کے برن بھی زرد تھے

۲۸۱
توڑے، اکڑے، دہر تھے، چمکے بھی پور پور تھے

بججند یا بازو بند، عورتوں کے بازو کا ایک زیور

۲۸۲
وہ بججند بازو کے، اور نورتن کہ جو گل سے ہوشاخ زیب تن

۲۸۳
حافظی بازو بند کی جوڑی بھاری دیکھت کی تول کی تھوڑی

۲۸۴
بازو پہ کا ہوا وہ بججند تھی جس کی پری بھی آرزو مند

۲۸۵
یک طرفہ دست بند بازو بند حلقہ غم میں تھے مسیر کند

بھول آئے ہو کہاں، بچے کو کہو، بازو بند

۲۸۶
آتے خالی ہیں آج نظر تھارے بازو

۲۷۸ دیوان ظفر، ۲: ۲۵۱ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۷۵

۲۸۰ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۱۵ ۲۸۱ ایضاً: ۳۱۱

۲۸۲ مجروحہ شہنشاہت میر حسن: ۶۹ ۲۸۳ تذکرہ مجمع التتخاب:

۲۸۴ دیوان مصطفیٰ، ۵: ۱۱۷ (الف) ۲۸۵ ایضاً، ۵: ۱۲۰ (الف)

۲۸۶ دیوان ظفر، ۴: ۱۲۲

مصاب لاسمانی ہنر

بیتا: ماتھے کا ناز زریہ جو ہر کی قسم کا ہوتا ہے اس کا کڑو لہنوں کو پہناتے ہیں:
جرات: اس مُبندے کے ہم بندے ہیں، وہ بالاسب کو دے بالا
موتی سے ساری مانگ بھری، بیسے کی جھک پھری ہے
باہو:

۲۸۷ باہو پہنچی دکنگن، پچلڑی سرسوں تھی پاگ جواہر میں جڑی

بدھی:

۲۸۸ دولڑا، مالا بدھی، اُربسی رین باری میں گھنے کے پھنی

ہوئی پیر ہن سے بھی خوشدلی، کلی دل کی اور بہت کھلی
۲۸۹ کبھی طرے سے، کبھی گھرے سے، کبھی بدھی سے، کبھی ہارے سے

پہنچی: ہاتھوں کا ایک زریہ، جو نقرئی یا طلائی سادی یا جلاؤ ہوتی ہے۔

۲۹۰ وہ پہنچی زمرود کی اور دست بند نراکت میں تھی شاخ گل سے دھند
پہنچیاں داچڑے، اور کان کی بالی بیدار

۲۹۱ نورتن ایسی ہی گھنے کی جڑ اورٹ خاص

۲۹۲ ہلکی پہنچی سے چمکتا ہے ہاتھ نازک اس کا ہے اس قدر پہنچا

۲۹۳ باہو پہنچی دکنگن، پچلڑی سرسوں تھی پاگ جواہر میں جڑی

۲۹۴ گوہر، لہرینت، ڈاکٹ ملکہ کیمت اور ایک پہنچی کے دریافت خودار کے گیند

نق لڑا، دولڑا، اور ستلڑا، مختلف قسم کی گلے کی زنجیروں کے نام ہیں جس میں دو دو پانچ پانچ، سات سات لڑیاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ خالص موتیوں کے بھی ہوتے ہیں۔

۲۸۷ دیوان فائز، ۲۸۸ ایضاً: ۲۰۶

۲۸۹ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۶۶، ۱۰۴، ۹۰، مجموعہ نقر، ۱۵، ۱۲

۲۹۰ مجموعہ شہزادہ مرصع: ۶۹، ۲۹۱ اردوئے معلیٰ (سوزنبر) ۳۱۰

۲۹۲ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۱، ۱۴۵، ۲۱۵، ۲۵۹

۲۹۳ دیوان فائز، ۲۰۶ ۲۹۴ کلیات الفا: ۶۶

اردو ادب کا سماجی پس منظر

دہ موتی کا دھڑا، دہ موتی کا ہار سدا رشکِ خمیدہ جس پر نثار
لگاؤ مٹا دیکھی پکڑا، ہٹا دیا سراسر گلے حسن اس کے پڑا^{۲۹۵}
باہو پہنچی دس گن، پکڑی سرسوں تھی پاگ بجوا ہر میو جڑی^{۲۹۶}
چمک: پیر کا ایک زیورہ

بیاں کیوں کر کروں ان میں رفتار کروں تقریر کیا بچن کی جھنکار^{۲۹۷}
پازیب یا پاپیل: پازیب پاؤں میں پہننے کے ایک زیورہ کا نام ہے۔ چاندی یا سونے کی بنی
ہوتی ہے۔ چونکہ اس زیورہ میں گھنگھروں کے ہوتے ہیں، اس لیے رفتار کے وقت آواز پیدا ہوتی
ہے۔

نقطہ موتیوں کی پڑی پائے زیب کہ جس کے قدم سے گہر پائے زیب^{۲۹۸}
وہ لعلوں کی پازیب کا دیزوار سدا اشکِ خونی ہو جس پر نثار^{۲۹۹}
پائوں میں دہ موتیوں کی پازیب ہو جاوے پری کو جس سے آسیب^{۳۰۰}
خوشنما تھا اس کے پگ میں پائیب ایڑی نارنگی، دہ لہو سے تھے سیب^{۳۰۱}
پازیب موتیوں کی جو زیب پاہلی ہے ہر دیں پر خندِ فلک ہے راتوں کو جھپٹا کا^{۳۰۲}
رنگین: کھڑے پازیب پاؤں کے گل سے زیب گردن کے واسطے تل سے^{۳۰۳}
قہر آوے نہ بھلا ہو دے جب ہے پردہ دشوخی

جس کی چلون ہی سے پازیب کی چھن چھن مارے^{۳۰۴}
کڑے، پازیب، توڑے جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں
تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں^{۳۰۵}

۲۹۵	مجموعہ شہزادہ میر حسن، ۵۶	۲۹۶	دیوان فائز، ۳۶؛ مجموعہ نغمہ، ۱۱۱
۲۹۷	دیوان فائز، ۲۰۲	۲۹۸	مجموعہ شہزادہ میر حسن، ۱۵۷
۲۹۹	ایضاً، ۶۹	۳۰۰	دیوان معنی، ۱۲۵، ۱۲۶ (دب)
۳۰۱	دیوان فائز، ۲۰۶	۳۰۲	دیوان معنی، ۶۱، ۵۶ (دب)
۳۰۳	تذکرہ مجمع الانتخاب:	۳۰۴	کلیات انشا، ۱۵۵
۳۰۵	کلیات نظیر اکبر آبادی، ۲۵۵		

ادب کا سماجی پس منظر

۳۰۶ وہ کافر دیکھی، جی دیکھ جے سو بار قیامت کا لہرے
 پازیب، کڑیے، پائل، گھنگری، کڑیاں، چھپیلی، مجھوئے تارے
 جرات، جی چلا جائے ہے پازیب کی جھنکار کے ساتھ
 فتنہ، حشر ہے اس شوخ کی رفتار کے ساتھ
 معصوم، اول منسم، اگر می رفتا غضب ہے

اس پر تری پازیب کی جھنکار غضب ہے
 تعویذ، ایک زیور طلائی یا نقرئی کا جو بالعموم بازو پر باندھا جاتا ہے اور سرگردوں کا بھی سنگار
 ہے۔

۳۰۷ فقط تعویذ دریائی کا خوش رنگ - بندھا بازوئیں اور کھینچا ہوا تنگ
 تعویذوں میں ہیکل کے کیا تعبیر اس کو

۳۰۸ پروں کے جو ہاتھ آئے شب ادن کے پاؤں کی نوٹ
 گلے میں چاہیں کیا جگوسیم تعویذ لگتے ہیں تری ہیکل کے تاکر تعویذ
 ۳۰۹ تعویذ باتھ بازو کے تجویز باندھ
 ۳۱۰

قیامت ہے جھمک بازو کے تعویذ طلائی کی
 ۳۱۱ عصا رحمن کون قائم کیا بانی ہے یہ لڑکا
 اور اس جوڑے میں با صد خوشائی جھلکتا ہے جو تعویذ طلائی
 ۳۱۲

۳۰۷ ایضاً، ۲۵۹ مجموعہ شہزادیت، ص ۱۵۶

۳۰۸ دیوان معصوم، ۵: ۲۸ (ب)، ۲۹: ۱ (الف)، ۱۲۰: ۱ (الف)

۳۰۹ ایضاً، ۱۲: ۲۳ (ب)

۳۱۰ دیوان اکبر (ضمیمہ)، ۵۰

۳۱۱ دیوان خاکرنا جی، ۱۳: نیز دیکھیے کلیات ہمت، ۱۱: دیوان زادہ حاتم، ۳۳: ۳۴

کلیات نظیر اکبر (پادشہ)، ۱۸۰: ۹۰

۳۱۲ کلیات قاسم، ۱۲۹: کلیات انفا، ۵۰

۳۱۳ ہاتھ میں پہنچی غصیب، بازو پہ بھیند غصیب

سر پہ تعویذ برسی، پانوں میں تعویذ کڑا

ڈرتا ہے نزاکت سے مراد دل، ارے کہہ دو

۳۱۴ تعویذ نہ یوں بازوؤں پر کھینچے کے باندھے

توڑا! چاندی یا سونے کی زنجیر سی ہوتی ہے، جو عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں۔ توڑا گمراہ کا بھی ایک زہید ہوتا تھا۔ یہ بھی زنجیر بنا ہوتا تھا۔ توڑا کسی زمانے میں ہاتھوں میں بھی پہنا جاتا رہا ہے اور ممکن ہے، لکس کے بعض حصوں میں اب بھی اس کا رواج ہو۔

صنم کے ناز نہیں پاؤں میں کیا ہی خوب توڑے ہیں

۳۱۵ گویا اللہ نے اپنے یدِ قدرت سے جوڑے ہیں

وہ توڑے ہاتھ میں تاروں کے باریک

۳۱۶ کہ بن دیکھے جہاں ہو جس کے تار بیک

مرے ہے جو بازو میں ایک نیل سا

۳۱۷ سوتیرے ہے پاؤں کا توڑا لگا

یدِ دست برد خوب نہیں، اس سے کیا حصول

۳۱۸ توڑا جو تیرے ہاتھ کا دلدار توڑے

باؤں میں سونے کے توڑے بھی رہیں

۳۱۹ کیا مضا لکھ ہے اگر دین

۳۱۳ مجموعہ نفز، ۸۸: ۱۱

۳۱۴ دیوان نفز، ۲۱۲: ۳۲۸، ایضاً، ۳۶: ۱۳

۳۱۵ مجموعہ نفز، ۲۰۱: ۲۱۶ مجموعہ شغویات، میر حسن، ۵۶: ۵۷

۳۱۷ کلیات انفا، ۱۷: ۱۵۶، ۱۶۱، ۹۵

۳۱۸ دیوان مصطفیٰ، ۲۶: ۲۶۲

۳۱۹ دیوان اکبر (مجموعہ)، ۵۱: ۵۲ دیکھیے کلیات قطب گبر کاوی، ۱۵۹: ۱۶۰، ۱۶۱: ۱۶۲

معدن ادب کا سماجی پس منظر

۳۳۰ اب رنگ جو ہے ہاں مستی کا ہے جھمکتا توڑا بھی پڑا چمکے ہے جگنوں بھی دکھتا
 بالابھی چمکتا ہے، جگنو بھی دکھتا ہے بڑھی کی لپٹ، تیس رو تعویذ کی ہیکل ہے
 جگنی کو دیکھ جیب پہ کرنی کی ہریش منڈلاتا ہے اپنے گریاں میں آفتاب
 جوشن: ایک لہری یا طلائی، سادہ یا جڑاؤ زبرد جو عورتیں بازوؤں پر باندھتی ہیں۔
 کیا یہ عکس دام کم ہے جوشن سے خلاصے

جھمکا: کان کا ایک زیور۔

۳۳۱ ماتم، اس جھمکے سے تو کیا رات کو، اے رشک ماہ! روشنائی شمع کی جلوے نے تیرے مات کی
 اٹھا سر کے بالوں سے لنگ، جھمکے سے اُجھا تو کیا
 ۳۳۵ اب لگا جھکومتا نے یہ نگوڑا تعویذ
 اے ظالم! اس پری پر ہم فتنہ ہوں جس کے

۳۳۶ یہ جھمکے، مجھ سے، بالے، توڑے، کڑے، چمکے ہیں
 دو ہی سراسری چنپاکی، وہ ہی گہنیں

۳۳۷ وہ ٹیکہ بیٹے، وہ ہی جھمکے، اور وہی انوٹ
 معنی، جو کہ وہ جو جگمگاتے تھے سراسر افسوس کو ہلاتے تھے
 ۳۳۹ میر: چشمک ہے نہیں تازے شہوے یا کی کے ہیں

جھمکے سے دکھا دے کر عالم کو گلا رکھا

۳۳۰-۳۳۱ کلیات نظیر اکبر آبادی ۱۵۹، ۲۵۵، ۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۰

۳۳۲ دریاں ٹفر، ۱۲: ۷۷ ۳۳۳ مجموعہ نغمہ، ۱۱: ۹۵

۳۳۴ مجموعہ نغمہ، ۱۱: ۱۹۳، ۱۸۸، ۱۵۹

۳۳۵ کلیات انشا، ۵۰: ۳۳۶ ایضاً: ۹۵

۳۳۷ ایضاً: ۲۶۱ ۳۳۸ (پروہ معنی، ۱۵: ۱۴۰) (الف)

۳۳۹ کلیات میر، ۵۳

اردو ادب کا سماجی پس منظر

نظیر اکبر آبادی: اس کان کے جھکے کی تنگ دیکھ لی شاید
 ہر خوشہ اسی تاک میں رہتا ہے غیب کا
 ۳۴۰
 سدھ لے گئی بالے کی جھمک، صبر کرن بھول، ادھر قتل کو بندے
 ۳۴۱
 بالے کی گئی جھوک لگا سہیل میں اک بھول، دل لے گئے جھمکے
 یہ جھمکیں کس طرح کانوں میں اس کے حسن کے جھمکے
 ۳۴۲
 ادھر جھمکا، ادھر مہندا، ادھر بجلی کا بالا ہے
 جھمکے جھمکے وہ تریاکے کرن بھول، وہ بھول
 ۳۴۳
 بندے بالے پری، سوتی پری، اور کان پری
 اس کے جھمکے کی تنگ سے جو ملا بالا ہے
 دل میرا جھوک سے دلوں کی ترو بالا ہے
 فہر جھمکوں کی جھمک، تہں پھغیب ہے بالا
 ۳۴۴
 اب کوئی آن میں سب غلطی ترو بالا ہے
 جہانگیری: ایک جڑاؤ زلیو کا نام ہے دراصل یہ بھاری قسم کی چوڑی کا نام ہے، جسے
 عورتیں ہاتھوں میں پہنتی ہیں۔
 ۳۴۵
 جہانگیریوں کا کردن کیا بیاں کہ اوٹھتی تھی ہاتھوں سے جہ کے نفل
 چھڑے: ایک قسم کے پاؤں کے کڑے، پیروں کی چوڑیاں۔
 ۳۴۶
 فقط پاؤں میں سونے کے کڑے ہیں تکلف کچھ نہیں، ان میں چھڑے ہیں
 ۳۴۷
 وہ مہندی کا عالم، وہ توڑے چھڑے وہ پاؤں میں سونے کے دودھ کڑے
 ۳۴۸
 اے ظلم! اس پری پر ہم غش نہ ہو دیں جس کے
 یہ جھمکے، بندے، بالے، توڑے، کڑے، چھڑے ہیں

۳۴۳-۳۴۴ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۶، ۱۸۷، ۱۵۹، ۱۶۸، ۱۸۷، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۵۹

۳۴۵ مجبور شویات میرسن: ۱۵۵، ۱۵۶

۲۸۵، ۲۸۵، ۹۱۰

۳۴۶ ایضاً: ۱۸۲، ۱۵۵ ۳۴۷ ایضاً: ۱۸۲، ۱۵۵ ۳۴۸ کلیات انفا: ۹۵

اصناف کا سماجی بین نظر

۳۴۹ نہ چھڑے اور نہ کڑے نظر آئے مجھ کو

اک صفائی سی فقط کر گئی انگار مجھے

۳۵۰ بدن میں جائے زرخش، سراپا جس پندیب آمد

کڑے بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، نون، ہیکل

ارادہ ہے کہیں جہاں آج جانے کا

۳۵۱ وہ پہننے کو جو بائے، چھڑے، نکالتے ہیں

چھلّا: چاندی، سونے یا کسی اندھات کا گیند کے بغیر حلقہ جو ہاتھ اند پاتوں کی انگلیوں میں پہنا جاتا ہے۔

۳۵۲ میر حسن: جواہر کے چھلے بھرے پود پود ندی کی مٹی جیسے مغل پہ تورا

افشا: چھلے ہرا انگلیوں کی پرروں میں، مہندی وہ شوخ

۳۵۳ کر نہ عباسی کی چٹٹ میں بھی ایسی ہوسمٹ

ہیں جو یہ سادہ دپر کا سے بیٹے، سو مجھے

۳۵۴ قول کا چھلّا اگر دیوین تو چھل سکتے ہیں

سونے کا چھلّا حور کا پر ہی فقط نہیں

۳۵۵ اک زرد پولی میں بھی تورا اسبند باندھ

معصی: چھلے قول کے وہ کر بند کیوں کر کھولے

۳۵۶ جب یاد نہو دے اس کے نہیں گراں کا

۳۴۹ دیوان معصی، ۶: ۳۳۳، ۳۳۴

۳۵۰ کلیات نظیر اکبر آبادی، ۱۰۳؛ دیوان محمود غفر، ۱: ۸۷

۳۵۱ دیوان غفر، ۲: ۹۰

۳۵۲ محمود ثنائیت میر حسن: ۸۲؛ نیز دیکھیے: ۱۶۹، ۱۸۰، ۱۸۶، ۱۵۶

۳۵۳ کلیات افشا: ۲۴۸ ۳۵۴ ایضاً: ۱۶۴، ۱۶۸

۳۵۵ ایضاً: ۱۱۷ ۳۵۶ دیوان معصی، ۵: ۶ (ب)

- کس دستِ خائبہ کے چٹوں کے یہ گل ہیں
 ۳۵۷ جھٹتے ہیں گل ان سے عینِ نذرِ پیکر کے
 ہاتھوں میں وہ پور پور چھٹے تھے جن سے بخوں طہاں چھٹے
 ۳۵۸ انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت، آج گرہوتی
 جھٹوں کی آن پہنچی، لڑھکے سے ایک چھٹے پر
 نظیر اکبر آبادی: ہالی کو ہلا، ہم سے کتنوں کو دیا چھٹے
 چھٹوں سے بھی بھیا جانے کس کس کو چھٹے نہ توکا
 بدن پر جامہ زرکش، سراپا جس پر زیب آدر
 ۳۵۹ کوڑے، بندے، چھٹے، انگوٹھی، توڑنا، مہل
 ماں تو ہاں حوروں کے گھنے کے بہت ہونگے نفاں
 ۳۶۰ ان پرینادوں کے چھٹوں کی نشانی پھر کہاں
 چھٹے غیروں پاس، تو وہ خاتمِ زراے نگار
 ۳۶۱ ہے ہمارے پاس بھی اب تک نشانی آپ کی
 وہ پہونچے، جن میں پہونچی سو نیاز و محبت سے پہونچی
 ۳۶۲ اور ان پوروں کے ملنے سے بڑی ہے شان چھٹوں کی
 جو دیکھا میں نے ان مہندی بھرے ہاتھوں کا ہل جانا
 ۳۶۳ انگوٹھی، بانک، چھٹے، آرسی کا پھر نظر آنا
 ظفر: اس آرزو میں کہ اس کے پاؤں کے چھٹے کوئی مجھے بنا دے
 ۳۶۴ اِدھر تو ہے سیم ماہِ خالص، اُدھر ریا کتابِ خالص

۳۵۷ ایضاً ۵: ۱۰ (ب) ۳۵۷ ایضاً ۵: ۱۰ (الف)

۳۵۸ دیوان شاکر ناجی: ۱۰۲

۳۵۹-۳۶۵ کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۱۰۳، ۱۱۹، ۱۵۲، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۹

یہ دیکھیے دیوانِ مصطفیٰ (انجمن ترقی اردو) ۶: ۱۳۵ (الف) ۳۵۷ دیوانِ ظفر: ۳۵

ادب کا سماجی پس منظر

ہاتھ رخسار تلے دھو کے نہ سو یا کیجیے

144

۴۹۷ رہتے عارض پہ ہیں چھتوں کے نشاں بھون

۳۶۸ پیودانی، کاٹھ کا ایک، زیور تہیں میں مٹی کے چار دانے لگے ہوتے ہیں۔

جڑاؤ ہوڑی ایک چودانیوں کی اور اک جوڑی حکمتی نوٹوں کی

ایک طرف کانوں کی دہ چودائیں پڑی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں

رنگین، سادی چودانیاں بنائیں چار اور گھنٹا بہت کیا تیار

چنپھا کھلی: طلائی خواہ فقری، سادہ یا جڑاؤ، گلے کا ایک زیور، جس کے دانے چنپھا کے پھول کی کھلی کے مشابہ ہوتے ہیں۔

121

جسٹر اور مکتی وہ چنپیا کالی رہی جس سے الماس کو بیگلی

تیلے اس کے موتی لکے گرد گل کہ جوں شبہم آلودہ ہو برگ گل

چنپا کلی کو دیکھ گئے ہاتھ پاؤں پھول

5

بالے کے جھونک سب مرے ارمان لے گئے

انشاء پھیل ڈلک سے ساعدہ نازک بدن کی پیل ۳۷۳

15

چنپاکی سے آن بھڑی نورتن کی بیسٹ

۳۷۴ دہ سراسری، چنپاکی، دہی گینے

iii

روٹیکا، بنیے، درسی جھکے، اور دیسی انورٹ

بکھ چنپا اُٹلی کو خود روتی سر پہنکتے تھے مانگ کے موتی

۳۶۷ دیوان نظری: ۲، ۵۴، ۵۵، ۶۳، ۸۸، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۳، ۱۱۴

۳۶۸ مجموعہ مثنویات میر حسن: ۱۵۱۴۵۵۶۹۶۵۶

7-8/1974

۳۶۹ دیوان مصطفی، ۵: ۴۰ (الف)

۲-۱ مجموعی مشنات برص: ۶۹،۵۶ ۳۷۲ مجموعی رنڈ: ۲۰۳،۱۶

۳۴۲ کلمات انشا: ۸۶ ۳۴۳ ایضاً: ۲۶۱

٣٤٥ ديوان بعضي، ٥: ١٠٠ (دالغ)

شاگرد ناجی، دلبری حسن کا زیور ہے جو ناجی، ہو بنلاؤ
 ۳۷۶ دل اگلتا نہیں چنپاکی اور مالوں میں
 اب تجھ سے میں ایک کوڑی بھی نہیں مانگی
 ۳۷۷ ہاں کھول تجھے اپنی میں چنپاکی روٹی
 چوڑی، چوڑیاں سونے یا چاندی دونوں قسم کی ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ یہ کانچے، خواہ بلوہ
 اور لاکھ سے بھی بنائی جاتی ہیں۔ یہ کلائی میں پہنی جاتی ہیں۔
 ۳۷۸ رنگین، گہر میں ایسی چوڑیاں دس ہیں کہ ہاتھوں میں آئیاں بھنس بھنس
 کیا کہوں عالم اس کی چوڑی کا گنڈ لی مارے ہو جیسے کالا ناگ
 نفرا ایک تو آفت تیری گوری کلائی گول ہے
 ۳۷۹ اور پھر اس میں غصب چڑی ملائی گول ہے
 چندن ہار دھنکے کا ایک زیور۔ اس میں چاند پڑے ہوتے تھے۔
 ۳۸۰ بنایا یہ نورتن چندن ہار جگنو، چمپا کی، کرن پھول، اے بیارا
 چاندہ پیشانی پر پہننے کا ایک زیور۔
 ۳۸۱ لعل خاتم بنا تھا ہوس کے حزمیں
 چھٹی، فقری دھلائی اور جڑاؤ ایک زیور کا نام ہے، جو ہاتھ میں چوڑیوں کے درمیان پہن
 جاتا ہے۔

چوڑیوں میں حسن بھرتی ہیں جڑاؤ چھتیاں
 یا نگین عشق جڑتی ہیں جڑاؤ چھتیاں
 چھتیاں ہیں جڑاؤ ہاتوں میں
 دکشی کی ادا ہے ہاتوں میں
 دیوان شاگرد ناجی: ۱۶۹ ۳۷۸
 تھکے مجمع الانتخاب: ۳۷۸
 دیوان ظفر، ۱۶۹: ۳۷۹
 دیوان حسرت (قلمی): ۱۷۱: ۳۸۰ (ب)
 دیوان معنی، ۱۵۱: ۳۸۱ (الف)، ۱۷۱: ۳۸۱ (الف)

امدادیہ کا سماجی پس منظر

چھاگل: چاندی کا زیور جو پیروں میں پہنا جاتا ہے، اس میں گھنگروں کے ہونے ہیں۔
میر: چھاگل کے وہ گھنگروں کی آواز عشاق کے دل پہ برق انداز
حمایل: چھوٹی تقطیع کا قرآن شریف جسے نفرتی یا طلاء کی پتروں میں منڈھوا کر گلے میں
ڈالتے ہیں۔

رنگ عاشقی نہو کیوں رشک سے اصغر، جب ہوں
۳۸۲
پھول گیندے کے تھے وہاں زیب حمایل دھچار
۳۸۳
پھول بن کر تجھ میں اے گل کی حمایل رہ گیا

خلخال: - پازیب، پیر کا ایک زیور۔
۳۸۴
وہ جو پاؤں کی ادس کی تھی خخال سوکھ کر ہو گئی تھی رشک ہلال
اگر خخال پائے یار کی ہم کو صد آئے
۳۸۵
نکل آدینکے پیش از عشر ہم مضطر ہوئے

دست بند: موتی کی لڑیاں، جن کو عورتیں ہاتھوں میں پہنتی ہیں۔
۳۸۶
وہ پہونچی زمر زنگی اور دست بند نراکتیں تھی شاخ گل سے دھند
دیر گوش: کان کی ٹوئیں ایک چھوٹا سا حلقہ مثل بالی کے ہوتا ہے، اس میں ایک موتی پڑا
ہوتا ہے۔

۳۸۷
دیر گوش جب اس کا تابندہ ہو صدف کا دل صاف شرمندہ ہو
۳۸۸
میر: رخسار کے پاس دو دیر گوش ہے پہلوے ماہ میں مستند
انفا: ہے یوں دیر گوش اس کی زلف کے حلقے میں
۳۸۹
ہبتاب میں کالے کا جس طرح سے من نکلا

۳۸۲	دیوان معصی، ۱۵: ۲۸ (ب)	۳۸۳	مجموعہ نفز، ۱: ۱۶۸
۳۸۴	دیوان معصی، ۱۵: ۱۴۷ (الف)	۳۸۵	ایضاً، ۱۴۹: ۱۴۷ (الف)
۳۸۶	مجموعہ شہنویات میر حسن، ۶۹	۳۸۷	ایضاً، ۵۷
۳۸۸	فرہنگ زیوریت (قلمی)، ۹۲: ۱	۳۸۹	کلیات انفا، ۱۳۷

اردو ادب کا سماجی پس منظر

اس درِ گوش پہ تھی زلف جو کندلی مارے
 ۳۹۰ سانپ کے من کی اگر کہیے، تو بچتی ہے نہ پٹ
 جہاندار، نظر پرے ہے جو آدینہ گہر جب سے

صدف سے چشم کی بت سے گہنشاں میں
 دھک دھکی: ایک جڑاؤ زیور، جو آرایش پسند عورتیں سینے کے اوپر آدیناں کرتی ہیں۔
 وہ چھاتی پہ الماس کی دھک دھکی رہے آنکھ سودج کی جس پر جھکی
 مصحفی: نظر پڑی ہے جو سینے پہ دھک دھکی اس کی

بھڑک رہے ہیں دل اہل درد سینوں میں
 جرات: دھک دھکی اس کے کلیجے سے لگی ہے، ظالم

ہمدرد! چھاتی پہ رکھ دو میرے تھوڑے پتھر
 دھک دھکی چاندی، جگنو بھی ستاروں کی مثال

۳۹۲
 عطر داں طرف، وہ توڑے بھی درخشان پری

لپٹ کر دھک دھکی میں کوئی سینہ پر چلتا ہے
 ۳۹۳ کوئی جھمکوں میں جھولے ہیں، کوئی بالی میں ہفتا

رام جھول: عورتوں کے پاؤں میں پہننے کا ایک نقرتی زیور۔
 انشا: مشوق حسین بھی ہو گئے رام اس بت نے جو رام جھول پہنے
 زنجیر: ایک نقرتی یا طلائے گلے میں پہننے کا زیور۔

۳۹۴
 گلے میں پتلی ایک سونے کی زنجیر
 ۳۹۵ چھاتی پہ تلکتی نہیں زنجیر طلا کی
 کہ جوں موج ہوا گل کی گلو گیسر
 چاندی کے ورق پر ہے یہ قمر طلائے

۳۹۰ ایبنا، ۲۳۷، ۳۰۱ نیز دیکھیے، دیوان اکبر، ۲۰۹؛ اردوئے معلیٰ (سند زبر)، ۳۶؛ دیوان جہاندار، ۱۹

۳۹۱ مجموعہ شہنشاہ میر حسن، ۵۶، ۶۹ کلیات نظیر اکبر آبادی، ۱۵۹

۳۹۲ مجموعہ شہنشاہ میر حسن، ۲۵۵ ۳۹۳ مجموعہ شہنشاہ میر حسن، ۱۵۶

۱۹۵ دیوان مصحفی، ۸۰: ۴

اردو طالب کا سماجی پس منظر

کنگن، دست برنخن۔ کلائی کا زیور، اسے چھپے دندیاں بھی کہتے ہیں۔
 جیسے کنگن گیا تھا ہاتھ سے چھوٹ موتیوں کی بڑی تھنی مالا ٹوٹا^{۲۰۱}
 باہو دہنچی، دستگن، بچہ لڑی سرسوں تھی پاگ جواہر میں جڑی^{۲۰۲}
 مچن مچن مچن ہاتھ بچہ کنگن چن چن کریں پاؤں بچہ... پیچن^{۲۰۳}
 فیروزی، ایک قسم کا کان کا زیور تھا۔ آئین اکبری میں اس زیور کا نام نہیں ملتا۔ گمان غالب ہے
 کہ یہ بعد میں ایجاد ہوا۔

صدف درختے گر آدینہ گوہر سے وہ کان
 پہنی فیروزی تو ٹنگ اور بھی سنگین ہوئے^{۲۰۴}
 عقدِ گوہر

تیرے کانوں میں دیکھا ہے میں جب سے عقدِ گوہر کو^{۲۰۵}
 میری نظروں سے پیارے گر گیا ہے خوشہ انجم کا
 علی بند، ملائی یا تقرنی زیور جو شیعہ حضرات لوگوں کی کلائیوں میں باندھتے ہیں۔^{۲۰۶}
 مصطفیٰ، مارا ہے آج علی بند نے مجھے دو انگلیاں بھی کم نہیں کچھ ذوالفقار
 قول کا چھلا، وہ چھلا جو بطور مہدیادداشت کے واسطے عاشق اور معشوق ایک دوسرے کو
 دیتے ہیں۔ اس چھلے کی ساخت اس طرز پر ہوتی ہے کہ آنسو نیچے کا حصہ اس طرح ملا ہوا ہوتا
 ہے، گویا کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے کر قول کر رہا ہے۔ یہی چھلا اکثر باہم لیا دیا جاتا ہے۔
 انشا، ان انگلیوں میں قول کے چھلے لٹھڑے والند، تم تو سخت چھلے نظر پڑے
 مصطفیٰ، چھلے کو قول کے وہ کر بند کیوں کے کھولے
 جب یاد نہ ہو اس کے تئیں گراں کا

- | | | | |
|-----|-------------------------|-----|--------------------------|
| ۲۰۱ | دلیان خانزادہ، ۲۰۶ | ۲۰۱ | مصطفیٰ، ۱۶: ۱ (الف) |
| ۲۰۲ | دلیان مصطفیٰ، ۲: ۷۸ (ب) | ۲۰۲ | ایضاً: ۲۱۹ |
| ۲۰۳ | | ۲۰۳ | دلیان مصطفیٰ، ۵: ۱ (الف) |
| ۲۰۴ | | ۲۰۴ | دلیان نظریہ، ۲: ۱۸۱، ۱۸۲ |

کرن پھول : کان کا ایک زیور

میر حسن : وہ آنکھوں کی مستی وہ مڑگاں کی نوک

کرن پھول کی اور بالے کی جھوک

معصی : تھے کرن پھول وہ جو مثل چراغ غم فرقت میں ہو گئے تھے داغ
چشم نرگس بھی جھپیں دیکھ کے شرمائے ہے

کیا کرن پھول ہیں کانوں کے پیارے زور

فائز : مڑکی دنتہ ، مانگ ، ٹیکا ، کان پھول دیکھ کر گئی سدھ سکل تن من کی بھول
نظیر : سدھ لے گئی بالے کی جھمک ، صبر کرن پھول اور عقل کو بندے

بالے کی گئی جھوک لگا سینہ میں اک پھول ، دل لے گئے جھمکے

ہزار گل کی بہا ریں نہ ہو سکیں تھمر تمہارے ایک کرن پھول کی بہا کے ساتھ
جھمکے جھمکے وہ انہر یا کے کرن پھول وہ پھول

بندے بالے پری موتی پری اور کان پری

کان کا موتی ، بالا اور بابیوں کے ساتھ موتی آدینزاں کیے جلتے تھے۔

بوسے رخسار کا وعدہ کیا کس نے وفا !

۴۰۷ کان کا موتی تلک تیرے لگتا ہی رہا

کان کا موتی تیرے ہلتا جواے مہ پارہ تھا

۴۰۸ مشنری اس کا تلک یا سب سے سیارہ تھا

کانوں میں یہ نہیں ہیں اس رخک ماہ کے موتی

۴۰۹ تارے سے ہیں چمکتے اپنے نظر تلے دو

۴۰۷ دیوان معصی : ۳۱ : ۷۸ (ب)

۴۰۸ مجموعہ نظریات : ۱ : ۳۲۹ ، اردو سے معنی (سوزنبر) : ۷۵۷ ، ۲۶۸ ؛ دیوان شکر : ۱۸۲

۷۵۱ ، ۱۹ ؛ دیوان فائز : ۱۸۲

۴۰۹ کلیات سودا : ۱ : ۷۷ ، ۷۷ ؛ دیوان نظریات : ۲۲۶

کرتا : بچوں اور عورتوں کے ہاتھ یا پاؤں میں پہننے کا سونے چاندی کا حلقہ جو سادہ اور چمکاؤ بھی ہوتا ہے۔ دست بربن، پابربن :

میرسن: وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کرے

جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے
طلائی کڑے اور کفک کا وہ رنگ

سنہری شفق جس کو ہر دیکھ دنگ
دہ الماسی کڑے پائوں میں موٹے
کہ جن کے ہاتھ دل عاشق کا ٹوٹے
دہ مہندی، اور کڑے وہ گھر کر کے
انار میں گلاب دن کی دہ بھجور کے
انشا: اے، نہ آواز سنا دیں مجھے دنگ اگر

اپنے پاؤں کے کڑوے کو تو بھجاسکتے ہیں
نیلے ڈومے تو بھجی ڈال اپنے دونوں پاؤں کے

کیا بھلا سوئے، کڑے، سونے کے توڑے ہو گئے
کل ایک گھر میں خوب سے چھوٹے بڑے لڑے

ہاتھوں سے ہاتھ اور کڑے سے کڑے لڑے

معصیٰ! الما سی کر طے کلائیوں میں حل کردہ قمر صفائیوں میں

تختے کڑے ہاتھ کے جوہر نہ ما پیس کر کھا گئی تھی وہ ہیرا^{۷۱۲}

زمینیں: سنہری ہاتھوں کے واسطے دھڑکتی

سادہ کاری سی خوب اس نے گھڑے

۴۱۰ مجموعہ فتویٰ تیسیر حسن : (۳۱، ۳۲)، ۸۲، ۸۵، ۱۵۵

۱۳۹۰، ۱۳۸۹، ۱۳۸۸، ۱۳۸۷، ۱۳۸۶، ۱۳۸۵، ۱۳۸۴، ۱۳۸۳، ۱۳۸۲، ۱۳۸۱، ۱۳۸۰

۴۳ دیوان مصطفی، ۵: ۱۱۷ (الف)، ۷: ۱۱۸ (ب)، ۸: ۱۲۰ (الف)، ۹: ۱۲۱ (ب)؛ أيضاً، ۶: ۴۳-۴۴

مجموع انتخاب نیز دیجیہ کلیات نظیر کبرائی : ۱۱۳۰۰۱۱۵۰۱۱۷۰۱۱۸۰۱۱۹۰۱۲۰۱۲۱۰۱۲۲۰۱۲۳۰۱۲۴۰۱۲۵۰۱۲۶۰۱۲۷۰۱۲۸۰۱۲۹۰۱۳۰۰۱۳۱۰۱۳۲۰۱۳۳۰۱۳۴۰۱۳۵۰۱۳۶۰۱۳۷۰۱۳۸۰۱۳۹۰۱۴۰۰۱۴۱۰۱۴۲۰۱۴۳۰۱۴۴۰۱۴۵۰۱۴۶۰۱۴۷۰۱۴۸۰۱۴۹۰۱۵۰۰۱۵۱۰۱۵۲۰۱۵۳۰۱۵۴۰۱۵۵۰۱۵۶۰۱۵۷۰۱۵۸۰۱۵۹۰۱۶۰۰۱۶۱۰۱۶۲۰۱۶۳۰۱۶۴۰۱۶۵۰۱۶۶۰۱۶۷۰۱۶۸۰۱۶۹۰۱۷۰۰۱۷۱۰۱۷۲۰۱۷۳۰۱۷۴۰۱۷۵۰۱۷۶۰۱۷۷۰۱۷۸۰۱۷۹۰۱۸۰۰۱۸۱۰۱۸۲۰۱۸۳۰۱۸۴۰۱۸۵۰۱۸۶۰۱۸۷۰۱۸۸۰۱۸۹۰۱۹۰۰۱۹۱۰۱۹۲۰۱۹۳۰۱۹۴۰۱۹۵۰۱۹۶۰۱۹۷۰۱۹۸۰۱۹۹۰۲۰۰۰۲۰۱۰۲۰۲۰۲۰۳۰۲۰۴۰۲۰۵۰۲۰۶۰۲۰۷۰۲۰۸۰۲۰۹۰۲۱۰۰۲۱۱۰۲۱۲۰۲۱۳۰۲۱۴۰۲۱۵۰۲۱۶۰۲۱۷۰۲۱۸۰۲۱۹۰۲۲۰۰۲۲۱۰۲۲۲۰۲۲۳۰۲۲۴۰۲۲۵۰۲۲۶۰۲۲۷۰۲۲۸۰۲۲۹۰۲۳۰۰۲۳۱۰۲۳۲۰۲۳۳۰۲۳۴۰۲۳۵۰۲۳۶۰۲۳۷۰۲۳۸۰۲۳۹۰۲۴۰۰۲۴۱۰۲۴۲۰۲۴۳۰۲۴۴۰۲۴۵۰۲۴۶۰۲۴۷۰۲۴۸۰۲۴۹۰۲۵۰۰۲۵۱۰۲۵۲۰۲۵۳۰۲۵۴۰۲۵۵۰۲۵۶۰۲۵۷۰۲۵۸۰۲۵۹۰۲۶۰۰۲۶۱۰۲۶۲۰۲۶۳۰۲۶۴۰۲۶۵۰۲۶۶۰۲۶۷۰۲۶۸۰۲۶۹۰۲۷۰۰۲۷۱۰۲۷۲۰۲۷۳۰۲۷۴۰۲۷۵۰۲۷۶۰۲۷۷۰۲۷۸۰۲۷۹۰۲۸۰۰۲۸۱۰۲۸۲۰۲۸۳۰۲۸۴۰۲۸۵۰۲۸۶۰۲۸۷۰۲۸۸۰۲۸۹۰۲۹۰۰۲۹۱۰۲۹۲۰۲۹۳۰۲۹۴۰۲۹۵۰۲۹۶۰۲۹۷۰۲۹۸۰۲۹۹۰۳۰۰۰۳۰۱۰۳۰۲۰۳۰۳۰۴۰۳۰۵۰۳۰۶۰۳۰۷۰۳۰۸۰۳۰۹۰۳۱۰۰۳۱۱۰۳۱۲۰۳۱۳۰۳۱۴۰۳۱۵۰۳۱۶۰۳۱۷۰۳۱۸۰۳۱۹۰۳۲۰۰۳۲۱۰۳۲۲۰۳۲۳۰۳۲۴۰۳۲۵۰۳۲۶۰۳۲۷۰۳۲۸۰۳۲۹۰۳۳۰۰۳۳۱۰۳۳۲۰۳۳۳۰۳۳۴۰۳۳۵۰۳۳۶۰۳۳۷۰۳۳۸۰۳۳۹۰۳۴۰۰۳۴۱۰۳۴۲۰۳۴۳۰۳۴۴۰۳۴۵۰۳۴۶۰۳۴۷۰۳۴۸۰۳۴۹۰۳۵۰۰۳۵۱۰۳۵۲۰۳۵۳۰۳۵۴۰۳۵۵۰۳۵۶۰۳۵۷۰۳۵۸۰۳۵۹۰۳۶۰۰۳۶۱۰۳۶۲۰۳۶۳۰۳۶۴۰۳۶۵۰۳۶۶۰۳۶۷۰۳۶۸۰۳۶۹۰۳۷۰۰۳۷۱۰۳۷۲۰۳۷۳۰۳۷۴۰۳۷۵۰۳۷۶۰۳۷۷۰۳۷۸۰۳۷۹۰۳۸۰۰۳۸۱۰۳۸۲۰۳۸۳۰۳۸۴۰۳۸۵۰۳۸۶۰۳۸۷۰۳۸۸۰۳۸۹۰۳۹۰۰۳۹۱۰۳۹۲۰۳۹۳۰۳۹۴۰۳۹۵۰۳۹۶۰۳۹۷۰۳۹۸۰۳۹۹۰۴۰۰۰۴۰۱۰۴۰۲۰۴۰۳۰۴۰۴۰۴۰۵۰۴۰۶۰۴۰۷۰۴۰۸۰۴۰۹۰۴۱۰۰۴۱۱۰۴۱۲۰۴۱۳۰۴۱۴۰۴۱۵۰۴۱۶۰۴۱۷۰۴۱۸۰۴۱۹۰۴۲۰۰۴۲۱۰۴۲۲۰۴۲۳۰۴۲۴۰۴۲۵۰۴۲۶۰۴۲۷۰۴۲۸۰۴۲۹۰۴۳۰۰۴۳۱۰۴۳۲۰۴۳۳۰۴۳۴۰۴۳۵۰۴۳۶۰۴۳۷۰۴۳۸۰۴۳۹۰۴۴۰۰۴۴۱۰۴۴۲۰۴۴۳۰۴۴۴۰۴۴۵۰۴۴۶۰۴۴۷۰۴۴۸۰۴۴۹۰۴۵۰۰۴۵۱۰۴۵۲۰۴۵۳۰۴۵۴۰۴۵۵۰۴۵۶۰۴۵۷۰۴۵۸۰۴۵۹۰۴۶۰۰۴۶۱۰۴۶۲۰۴۶۳۰۴۶۴۰۴۶۵۰۴۶۶۰۴۶۷۰۴۶۸۰۴۶۹۰۴۷۰۰۴۷۱۰۴۷۲۰۴۷۳۰۴۷۴۰۴۷۵۰۴۷۶۰۴۷۷۰۴۷۸۰۴۷۹۰۴۸۰۰۴۸۱۰۴۸۲۰۴۸۳۰۴۸۴۰۴۸۵۰۴۸۶۰۴۸۷۰۴۸۸۰۴۸۹۰۴۹۰۰۴۹۱۰۴۹۲۰۴۹۳۰۴۹۴۰۴۹۵۰۴۹۶۰۴۹۷۰۴۹۸۰۴۹۹۰۵۰۰۰۵۰۱۰۵۰۲۰۵۰۳۰۵۰۴۰۵۰۵۰۵۰۶۰۵۰۷۰۵۰۸۰۵۰۹۰۵۱۰۰۵۱۱۰۵۱۲۰۵۱۳۰۵۱۴۰۵۱۵۰۵۱۶۰۵۱۷۰۵۱۸۰۵۱۹۰۵۲۰۰۵۲۱۰۵۲۲۰۵۲۳۰۵۲۴۰۵۲۵۰۵۲۶۰۵۲۷۰۵۲۸۰۵۲۹۰۵۳۰۰۵۳۱۰۵۳۲۰۵۳۳۰۵۳۴۰۵۳۵۰۵۳۶۰۵۳۷۰۵۳۸۰۵۳۹۰۵۴۰۰۵۴۱۰۵۴۲۰۵۴۳۰۵۴۴۰۵۴۵۰۵۴۶۰۵۴۷۰۵۴۸۰۵۴۹۰۵۵۰۰۵۵۱۰۵۵۲۰۵۵۳۰۵۵۴۰۵۵۵۰۵۵۶۰۵۵۷۰۵۵۸۰۵۵۹۰۵۶۰۰۵۶۱۰۵۶۲۰۵۶۳۰۵۶۴۰۵۶۵۰۵۶۶۰۵۶۷۰۵۶۸۰۵۶۹۰۵۷۰۰۵۷۱۰۵۷۲۰۵۷۳۰۵۷۴۰۵۷۵۰۵۷۶۰۵۷۷۰۵۷۸۰۵۷۹۰۵۸۰۰۵۸۱۰۵۸۲۰۵۸۳۰۵۸۴۰۵۸۵۰۵۸۶۰۵۸۷۰۵۸۸۰۵۸۹۰۵۹۰۰۵۹۱۰۵۹۲۰۵۹۳۰۵۹۴۰۵۹۵۰۵۹۶۰۵۹۷۰۵۹۸۰۵۹۹۰۶۰۰۰۶۰۱۰۶۰۲۰۶۰۳۰۶۰۴۰۶۰۵۰۶۰۶۰۶۰۷۰۶۰۸۰۶۰۹۰۶۱۰۰۶۱۱۰۶۱۲۰۶۱۳۰۶۱۴۰۶۱۵۰۶۱۶۰۶۱۷۰۶۱۸۰۶۱۹۰۶۲۰۰۶۲۱۰۶۲۲۰۶۲۳۰۶۲۴۰

اردو ادب کا سماجی پس منظر

میر ہاتھوں میں جبراًڑ کڑے تھے تار سے خنجر میدان میں جڑے تھے
 نظیر تھی پہنچے دونوں ہاتھوں میں کافر جو کڑے گنگا جمنی
 ۴۱۴ کچھ شوق کٹوں کی جھنکار میں کچھ جھکے چوڑی باہوں کی
 ۴۱۵ وہ کافر صبح، جی دیکھ جسے سوار قیامت کا لڑے
 پازیب، کڑے، پائل، گنگر، کڑیاں، چٹریاں، گجر، تھوڑے
 ۴۱۶ ظفر، کرتی مضطر ہے دل سدا ان کی پہن کر پاتوں میں کڑے نہ پھرو
 کیل، ایک زیور جو لوگ کی شکل کا ہوتا ہے، اور عورتیں ناک میں پہنتی ہیں،
 معصی، کیل ہیرے کی کس کی ناک میں ہے مبرے دل میں گڑی جو کیل ہی ہے
 گوکھرو، ایک غار دار زیور۔ یہ لٹہ کا زیور ہے۔ بعض لوگ اسے جھپے دتیاں یا لنگن بھی کہتے
 ہیں؛

شیخ خادم علی کبیر علی خادم، چھاتی پر اس کی یاد میں پیرتا ہے سانپ سا
 ۴۱۷ ہے گوکھرو کی لہر جو اس کے سینہ بند پر
 سوزا دیکھ کے لہرائے یہ دل کہتا ہے گوکھرو اور دہنت کی یہ بناوٹ خاصی
 گنگر، ایک قسم کے بجنے والے گھنگے کا نام جسے اکثر ناچنے والے اپنے پردوں میں باندھتے ہیں
 یا عورتیں پہنتی ہیں، پازیب وغیرہ اور جڑے میں بھی نصب کیے جاتے ہیں، تاکہ چلتے دھت
 خوب آواز دیں۔

گھنگر و جودم نزع لگا بولنے ہمد! ۴۱۸
 اس تارِ نفس پر مجھے طنزور کی سوچی ۴۱۹

۴۱۴ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۵۸-۲۵۹

۴۱۵ ایضاً: ۲۵۹ ۴۱۶ دیوان ظفر، ۲: ۱۰۷

۴۱۷ مجموعہ نظیر، ۱: ۲۳۲

۴۱۸ اردوئے معلیٰ (سوزنبر)، ۳: ۱۳؛ نیر دیوان شاگر ناجی، ۱۱۵؛ مجموعہ غنویات میر حسن، ۱۵۵

۴۱۹ مجموعہ نظیر، ۲: ۱۱۳

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے وہ بالوں کے گھنگر دھمکتے ہوئے
گوشتوارہ: کان کا آدیزہ۔

گوشتوارے کا گہر مر جائے ہو کر بیقرار

دیکھ تجھ رخ کی صفائی کوں سدا پلٹے ہے کان^{۲۲۱}

مکھ پر یہ گوشتوارہ موتی کا جلوہ گر جیسے ظن باہم سواہ و مشتری کا^{۲۲۲}

لچھا: ہاتھ اور پیروں کے بھی لچھے ہوتے ہیں۔ ایک پتھار یعنی ایسا بھی ہوتا ہے جسناؤں
عورتیں ساعدیسمیں پہنتی ہیں۔ لچھے سادہ اور پرکار دونوں قسم کے ہوتے تھے۔

وہ مختولوں کے لچھے ان میں پرکار چمک سے جن کی شرمندہ ہو گلازار^{۲۲۳}

وہ زنجیروں کے پاؤں بیچ لچھے قیامت دل کے شبنم گتے تھے اچھے^{۲۲۴}

لچھے ہیں یہ ریشم کے، نہ یہ خطِ خواہی ہے مہر بھی اک عالم نیرنگ میں کھڑا^{۲۲۵}

لونگ: عام طور پر عورتیں کانوں کے چھیدوں میں اس زمانے میں لونگ پہنتی ہیں، جب وہ
اور زیور نہیں پہنتیں کہ کہیں وہ چھید بھرنے جائیں۔ ویسے لونگ ناک کے ایک زیور کا بھی
نام ہے، جو لونگ کے مشابہ ہوتا ہے۔

میں نے دیکھی ہے اس کے کان میں لونگ^{۲۲۶}

مُرکی: کان کی پھولدار سونے کی کیل جسے عورتیں کانوں میں پہنتی ہیں، اس کو دیچی یا گوکھو بھی
کہتے ہیں۔

میر: خوش آب ہیں تیرے کانوں کی مُرکیاں کیا خوب

صدف سے ہونگے نہ ایسے درخشاں پیدا

۲۲۸ مجموعہ شغلیات میر حسن: ۳۲ دیوان شاکر ناجی: ۱۸۲

۲۲۲ کلیات سودا: ۱۱۲، ۱۱۱

۲۲۳ یعنی مختولوں کے لچھے معیش و ضو کے پھندے

۲۲۴ مجموعہ شغلیات میر حسن: ۱۵۵ ۲۲۵ ایضاً: ۱۵۶

۲۲۶ کلیات انصاف: ۱۸۱ ۲۲۷ کلیات انصاف: ۱۹۹

جرات، صبح کا تارا بجل ہو دیکھ مجھ بندے کی تنگ

۲۲۸

دیکھ سو سوچ یہ جسطا آدمیاں تھرتھرتے ہے

۲۲۹

فانز، مڑکی دنتہ، مانگ، ٹیکہ، کان پھول دیکھو گئی سہ سہاگل تن من کی بھول

مگر کان کا طلائی یا لٹری زلیو جو مگر مجھ کی شکل کا ہوتا ہے۔ اسے ادبہ گوش بھی کہتے ہیں

خور سے دیکھا، تو کیا کیا دل کی پھلی کے، نظیر!

گھات میں رہتے ہیں بالے کے مگر دونوں طرف

۲۳۰

مالا، موتی یا سونے کا ہار، سگ، ہوا رید۔ اہل دہلی موت بولنے ہیں۔

۲۳۱

وہ موتی کے مالے نکلتے ہوئے رہیں دل جہاں سر پکیتے ہوئے

۲۳۲

دو دلا، ملا دہی، اُرسی رین باری میں گھنے کے پھٹی

موتی کی لڑی، نظم گہر۔ عقد لالی، موتیوں کی مالا، کان کا نانا زلیو۔

معصی: تم نے حسن اپنے کو چو چند کیا، نام خدا!

موتیوں کی لڑی کان میں ڈالی، کیا خوب!

مانگ کے موتی: سر کی مانگ کے درمیان، موتیوں کا زلیو۔

انفا: موتیوں سے جو بھری مانگ وہ دیکھی اس کی

۲۳۳

سیر سے تاروں بھری دلت کی جی جالتے ہٹ

معصی، عاشق سے یہ کہتے ہیں تیرے مانگ کے موتی

۲۳۴

زینبہ بیک ملک گھر ہو گئی یہ شب

نظیر! رہیں ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و سحر موتی

۲۳۵

جیہیں پر موتی، اور میریں موتی، مانگ پر موتی

۲۲۹ ایضاً: ۲۰۶

۲۲۸ دیوان فاکز: ۲۰۶ (طاشیر ۲)

۲۳۱ مجموعہ غنویات میر حسن: ۶۸

۲۳۰ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۹۹

۲۳۲ کلیات انفا: ۲۸

۲۳۲ دیوان فاکز: ۲۰۶

۲۳۵ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۵۵

۲۳۴ دیوان معصی: ۲۰۶ (دب)

امداد کا سماجی پس منظر

میرزا، بھری ناگ موتی سے جلوہ گناں نمایاں شب تیرو میں کہکشاں^{۴۳۶}
 ظفر، بھری جو موتیوں سے اس نے ناگ، حیف، ظفر!
^{۴۳۷} نہ ترے گوہرِ مژگانی در افشاں سے بھری
 نتھ، ناک کا ایک زربود۔ چاندی یا سونے کا ملکہ جو سہاگ کے دن سہاگینیں پہنا کرتی ہیں۔
 نتھ کے ملکہ کا دیکھ کر عالم ناک میں آ رہا ہے اپنا دم^{۴۳۸}
 معصی، ملکہ میں نتھ کے چنے جو ہی موتیوں کے بچ
^{۴۳۹} یہ بوند کس کے خونِ جگر کی ہے، کیا کہوں
 نتھ ناک میں ہارے مرتھے یا قلزمِ حسن کے بھنڈے تھے
 حسن کی آرائش، ایسی بھی تو نہ آساں سمجھو
^{۴۴۰} لاکھ نتھ ٹوٹیں جب اس کے کان کا بالا بنا
 کسی کے چمکتے ہوئے نورتن کسی کے دم مکتھڑے پہ نتھ کی بھین^{۴۴۱}
 لوگنا، عورتوں کے بازوؤں کا ایک زربود۔ اس میں نو لگینے ہوتے ہیں۔
^{۴۴۲} جڑاؤ جوڑی اک چوڑا نیوں کی ادراک جوڑی چمکتی نو لگوں کی
 نورتن، ایک قسم کا جڑاؤ زربود۔ اس میں نوجواہر کے لوگ ہوتے ہیں جیسے ہیرا، پتلا، ہلکا،
 لعینا، پکھراج، موتی، لعل، مرجان، زمری، فیروزہ وغیرہ۔ اس کو امیرزا دیاں اور عیسات بازو
 پر پہنتی تھیں۔

-
- | | |
|-----|--|
| ۴۳۶ | مجموعہ غزلیات میر حسن: ۶۸ |
| ۴۳۷ | دلیان ظفر، ۲: ۳۱۹ |
| ۴۳۸ | مجموعہ غزلیات: ۲: ۲۷۱، ۲۷۷ |
| ۴۳۹ | دلیان معصی، ۱: ۷۵، ۷۶ |
| ۴۴۰ | ایضاً، ۱: ۷۵، ۷۶ (الف)؛ ۱۸۸ (ب)؛ ۱۸۹ (ج)؛ ۱۹۰ (د)؛ ۱۹۱ (هـ)؛ ۱۹۲ (و)؛ ۱۹۳ (ز)؛ ۱۹۴ (ح)؛ ۱۹۵ (ط)؛ ۱۹۶ (ی)؛ ۱۹۷ (ک)؛ ۱۹۸ (گ)؛ ۱۹۹ (خ)؛ ۲۰۰ (د)؛ ۲۰۱ (ذ)؛ ۲۰۲ (ر)؛ ۲۰۳ (ز)؛ ۲۰۴ (س)؛ ۲۰۵ (ح)؛ ۲۰۶ (ط)؛ ۲۰۷ (ی)؛ ۲۰۸ (ک)؛ ۲۰۹ (گ)؛ ۲۱۰ (خ)؛ ۲۱۱ (د)؛ ۲۱۲ (ذ)؛ ۲۱۳ (ر)؛ ۲۱۴ (ز)؛ ۲۱۵ (س)؛ ۲۱۶ (ح)؛ ۲۱۷ (ط)؛ ۲۱۸ (ی)؛ ۲۱۹ (ک)؛ ۲۲۰ (گ)؛ ۲۲۱ (خ)؛ ۲۲۲ (د)؛ ۲۲۳ (ذ)؛ ۲۲۴ (ر)؛ ۲۲۵ (ز)؛ ۲۲۶ (س)؛ ۲۲۷ (ح)؛ ۲۲۸ (ط)؛ ۲۲۹ (ی)؛ ۲۳۰ (ک)؛ ۲۳۱ (گ)؛ ۲۳۲ (خ)؛ ۲۳۳ (د)؛ ۲۳۴ (ذ)؛ ۲۳۵ (ر)؛ ۲۳۶ (ز)؛ ۲۳۷ (س)؛ ۲۳۸ (ح)؛ ۲۳۹ (ط)؛ ۲۴۰ (ی)؛ ۲۴۱ (ک)؛ ۲۴۲ (گ)؛ ۲۴۳ (خ)؛ ۲۴۴ (د)؛ ۲۴۵ (ذ)؛ ۲۴۶ (ر)؛ ۲۴۷ (ز)؛ ۲۴۸ (س)؛ ۲۴۹ (ح)؛ ۲۵۰ (ط)؛ ۲۵۱ (ی)؛ ۲۵۲ (ک)؛ ۲۵۳ (گ)؛ ۲۵۴ (خ)؛ ۲۵۵ (د)؛ ۲۵۶ (ذ)؛ ۲۵۷ (ر)؛ ۲۵۸ (ز)؛ ۲۵۹ (س)؛ ۲۶۰ (ح)؛ ۲۶۱ (ط)؛ ۲۶۲ (ی)؛ ۲۶۳ (ک)؛ ۲۶۴ (گ)؛ ۲۶۵ (خ)؛ ۲۶۶ (د)؛ ۲۶۷ (ذ)؛ ۲۶۸ (ر)؛ ۲۶۹ (ز)؛ ۲۷۰ (س)؛ ۲۷۱ (ح)؛ ۲۷۲ (ط)؛ ۲۷۳ (ی)؛ ۲۷۴ (ک)؛ ۲۷۵ (گ)؛ ۲۷۶ (خ)؛ ۲۷۷ (د)؛ ۲۷۸ (ذ)؛ ۲۷۹ (ر)؛ ۲۸۰ (ز)؛ ۲۸۱ (س)؛ ۲۸۲ (ح)؛ ۲۸۳ (ط)؛ ۲۸۴ (ی)؛ ۲۸۵ (ک)؛ ۲۸۶ (گ)؛ ۲۸۷ (خ)؛ ۲۸۸ (د)؛ ۲۸۹ (ذ)؛ ۲۹۰ (ر)؛ ۲۹۱ (ز)؛ ۲۹۲ (س)؛ ۲۹۳ (ح)؛ ۲۹۴ (ط)؛ ۲۹۵ (ی)؛ ۲۹۶ (ک)؛ ۲۹۷ (گ)؛ ۲۹۸ (خ)؛ ۲۹۹ (د)؛ ۳۰۰ (ذ)؛ ۳۰۱ (ر)؛ ۳۰۲ (ز)؛ ۳۰۳ (س)؛ ۳۰۴ (ح)؛ ۳۰۵ (ط)؛ ۳۰۶ (ی)؛ ۳۰۷ (ک)؛ ۳۰۸ (گ)؛ ۳۰۹ (خ)؛ ۳۱۰ (د)؛ ۳۱۱ (ذ)؛ ۳۱۲ (ر)؛ ۳۱۳ (ز)؛ ۳۱۴ (س)؛ ۳۱۵ (ح)؛ ۳۱۶ (ط)؛ ۳۱۷ (ی)؛ ۳۱۸ (ک)؛ ۳۱۹ (گ)؛ ۳۲۰ (خ)؛ ۳۲۱ (د)؛ ۳۲۲ (ذ)؛ ۳۲۳ (ر)؛ ۳۲۴ (ز)؛ ۳۲۵ (س)؛ ۳۲۶ (ح)؛ ۳۲۷ (ط)؛ ۳۲۸ (ی)؛ ۳۲۹ (ک)؛ ۳۳۰ (گ)؛ ۳۳۱ (خ)؛ ۳۳۲ (د)؛ ۳۳۳ (ذ)؛ ۳۳۴ (ر)؛ ۳۳۵ (ز)؛ ۳۳۶ (س)؛ ۳۳۷ (ح)؛ ۳۳۸ (ط)؛ ۳۳۹ (ی)؛ ۳۴۰ (ک)؛ ۳۴۱ (گ)؛ ۳۴۲ (خ)؛ ۳۴۳ (د)؛ ۳۴۴ (ذ)؛ ۳۴۵ (ر)؛ ۳۴۶ (ز)؛ ۳۴۷ (س)؛ ۳۴۸ (ح)؛ ۳۴۹ (ط)؛ ۳۵۰ (ی)؛ ۳۵۱ (ک)؛ ۳۵۲ (گ)؛ ۳۵۳ (خ)؛ ۳۵۴ (د)؛ ۳۵۵ (ذ)؛ ۳۵۶ (ر)؛ ۳۵۷ (ز)؛ ۳۵۸ (س)؛ ۳۵۹ (ح)؛ ۳۶۰ (ط)؛ ۳۶۱ (ی)؛ ۳۶۲ (ک)؛ ۳۶۳ (گ)؛ ۳۶۴ (خ)؛ ۳۶۵ (د)؛ ۳۶۶ (ذ)؛ ۳۶۷ (ر)؛ ۳۶۸ (ز)؛ ۳۶۹ (س)؛ ۳۷۰ (ح)؛ ۳۷۱ (ط)؛ ۳۷۲ (ی)؛ ۳۷۳ (ک)؛ ۳۷۴ (گ)؛ ۳۷۵ (خ)؛ ۳۷۶ (د)؛ ۳۷۷ (ذ)؛ ۳۷۸ (ر)؛ ۳۷۹ (ز)؛ ۳۸۰ (س)؛ ۳۸۱ (ح)؛ ۳۸۲ (ط)؛ ۳۸۳ (ی)؛ ۳۸۴ (ک)؛ ۳۸۵ (گ)؛ ۳۸۶ (خ)؛ ۳۸۷ (د)؛ ۳۸۸ (ذ)؛ ۳۸۹ (ر)؛ ۳۹۰ (ز)؛ ۳۹۱ (س)؛ ۳۹۲ (ح)؛ ۳۹۳ (ط)؛ ۳۹۴ (ی)؛ ۳۹۵ (ک)؛ ۳۹۶ (گ)؛ ۳۹۷ (خ)؛ ۳۹۸ (د)؛ ۳۹۹ (ذ)؛ ۴۰۰ (ر)؛ ۴۰۱ (ز)؛ ۴۰۲ (س)؛ ۴۰۳ (ح)؛ ۴۰۴ (ط)؛ ۴۰۵ (ی)؛ ۴۰۶ (ک)؛ ۴۰۷ (گ)؛ ۴۰۸ (خ)؛ ۴۰۹ (د)؛ ۴۱۰ (ذ)؛ ۴۱۱ (ر)؛ ۴۱۲ (ز)؛ ۴۱۳ (س)؛ ۴۱۴ (ح)؛ ۴۱۵ (ط)؛ ۴۱۶ (ی)؛ ۴۱۷ (ک)؛ ۴۱۸ (گ)؛ ۴۱۹ (خ)؛ ۴۲۰ (د)؛ ۴۲۱ (ذ)؛ ۴۲۲ (ر)؛ ۴۲۳ (ز)؛ ۴۲۴ (س)؛ ۴۲۵ (ح)؛ ۴۲۶ (ط)؛ ۴۲۷ (ی)؛ ۴۲۸ (ک)؛ ۴۲۹ (گ)؛ ۴۳۰ (خ)؛ ۴۳۱ (د)؛ ۴۳۲ (ذ)؛ ۴۳۳ (ر)؛ ۴۳۴ (ز)؛ ۴۳۵ (س)؛ ۴۳۶ (ح)؛ ۴۳۷ (ط)؛ ۴۳۸ (ی)؛ ۴۳۹ (ک)؛ ۴۴۰ (گ)؛ ۴۴۱ (خ)؛ ۴۴۲ (د)؛ ۴۴۳ (ذ)؛ ۴۴۴ (ر)؛ ۴۴۵ (ز)؛ ۴۴۶ (س)؛ ۴۴۷ (ح)؛ ۴۴۸ (ط)؛ ۴۴۹ (ی)؛ ۴۵۰ (ک)؛ ۴۵۱ (گ)؛ ۴۵۲ (خ)؛ ۴۵۳ (د)؛ ۴۵۴ (ذ)؛ ۴۵۵ (ر)؛ ۴۵۶ (ز)؛ ۴۵۷ (س)؛ ۴۵۸ (ح)؛ ۴۵۹ (ط)؛ ۴۶۰ (ی)؛ ۴۶۱ (ک)؛ ۴۶۲ (گ)؛ ۴۶۳ (خ)؛ ۴۶۴ (د)؛ ۴۶۵ (ذ)؛ ۴۶۶ (ر)؛ ۴۶۷ (ز)؛ ۴۶۸ (س)؛ ۴۶۹ (ح)؛ ۴۷۰ (ط)؛ ۴۷۱ (ی)؛ ۴۷۲ (ک)؛ ۴۷۳ (گ)؛ ۴۷۴ (خ)؛ ۴۷۵ (د)؛ ۴۷۶ (ذ)؛ ۴۷۷ (ر)؛ ۴۷۸ (ز)؛ ۴۷۹ (س)؛ ۴۸۰ (ح)؛ ۴۸۱ (ط)؛ ۴۸۲ (ی)؛ ۴۸۳ (ک)؛ ۴۸۴ (گ)؛ ۴۸۵ (خ)؛ ۴۸۶ (د)؛ ۴۸۷ (ذ)؛ ۴۸۸ (ر)؛ ۴۸۹ (ز)؛ ۴۹۰ (س)؛ ۴۹۱ (ح)؛ ۴۹۲ (ط)؛ ۴۹۳ (ی)؛ ۴۹۴ (ک)؛ ۴۹۵ (گ)؛ ۴۹۶ (خ)؛ ۴۹۷ (د)؛ ۴۹۸ (ذ)؛ ۴۹۹ (ر)؛ ۵۰۰ (ز)؛ ۵۰۱ (س)؛ ۵۰۲ (ح)؛ ۵۰۳ (ط)؛ ۵۰۴ (ی)؛ ۵۰۵ (ک)؛ ۵۰۶ (گ)؛ ۵۰۷ (خ)؛ ۵۰۸ (د)؛ ۵۰۹ (ذ)؛ ۵۱۰ (ر)؛ ۵۱۱ (ز)؛ ۵۱۲ (س)؛ ۵۱۳ (ح)؛ ۵۱۴ (ط)؛ ۵۱۵ (ی)؛ ۵۱۶ (ک)؛ ۵۱۷ (گ)؛ ۵۱۸ (خ)؛ ۵۱۹ (د)؛ ۵۲۰ (ذ)؛ ۵۲۱ (ر)؛ ۵۲۲ (ز)؛ ۵۲۳ (س)؛ ۵۲۴ (ح)؛ ۵۲۵ (ط)؛ ۵۲۶ (ی)؛ ۵۲۷ (ک)؛ ۵۲۸ (گ)؛ ۵۲۹ (خ)؛ ۵۳۰ (د)؛ ۵۳۱ (ذ)؛ ۵۳۲ (ر)؛ ۵۳۳ (ز)؛ ۵۳۴ (س)؛ ۵۳۵ (ح)؛ ۵۳۶ (ط)؛ ۵۳۷ (ی)؛ ۵۳۸ (ک)؛ ۵۳۹ (گ)؛ ۵۴۰ (خ)؛ ۵۴۱ (د)؛ ۵۴۲ (ذ)؛ ۵۴۳ (ر)؛ ۵۴۴ (ز)؛ ۵۴۵ (س)؛ ۵۴۶ (ح)؛ ۵۴۷ (ط)؛ ۵۴۸ (ی)؛ ۵۴۹ (ک)؛ ۵۵۰ (گ)؛ ۵۵۱ (خ)؛ ۵۵۲ (د)؛ ۵۵۳ (ذ)؛ ۵۵۴ (ر)؛ ۵۵۵ (ز)؛ ۵۵۶ (س)؛ ۵۵۷ (ح)؛ ۵۵۸ (ط)؛ ۵۵۹ (ی)؛ ۵۶۰ (ک)؛ ۵۶۱ (گ)؛ ۵۶۲ (خ)؛ ۵۶۳ (د)؛ ۵۶۴ (ذ)؛ ۵۶۵ (ر)؛ ۵۶۶ (ز)؛ ۵۶۷ (س)؛ ۵۶۸ (ح)؛ ۵۶۹ (ط)؛ ۵۷۰ (ی)؛ ۵۷۱ (ک)؛ ۵۷۲ (گ)؛ ۵۷۳ (خ)؛ ۵۷۴ (د)؛ ۵۷۵ (ذ)؛ ۵۷۶ (ر)؛ ۵۷۷ (ز)؛ ۵۷۸ (س)؛ ۵۷۹ (ح)؛ ۵۸۰ (ط)؛ ۵۸۱ (ی)؛ ۵۸۲ (ک)؛ ۵۸۳ (گ)؛ ۵۸۴ (خ)؛ ۵۸۵ (د)؛ ۵۸۶ (ذ)؛ ۵۸۷ (ر)؛ ۵۸۸ (ز)؛ ۵۸۹ (س)؛ ۵۹۰ (ح)؛ ۵۹۱ (ط)؛ ۵۹۲ (ی)؛ ۵۹۳ (ک)؛ ۵۹۴ (گ)؛ ۵۹۵ (خ)؛ ۵۹۶ (د)؛ ۵۹۷ (ذ)؛ ۵۹۸ (ر)؛ ۵۹۹ (ز)؛ ۶۰۰ (س)؛ ۶۰۱ (ح)؛ ۶۰۲ (ط)؛ ۶۰۳ (ی)؛ ۶۰۴ (ک)؛ ۶۰۵ (گ)؛ ۶۰۶ (خ)؛ ۶۰۷ (د)؛ ۶۰۸ (ذ)؛ ۶۰۹ (ر)؛ ۶۱۰ (ز)؛ ۶۱۱ (س)؛ ۶۱۲ (ح)؛ ۶۱۳ (ط)؛ ۶۱۴ (ی)؛ ۶۱۵ (ک)؛ ۶۱۶ (گ)؛ ۶۱۷ (خ)؛ ۶۱۸ (د)؛ ۶۱۹ (ذ)؛ ۶۲۰ (ر)؛ ۶۲۱ (ز)؛ ۶۲۲ (س)؛ ۶۲۳ (ح)؛ ۶۲۴ (ط)؛ ۶۲۵ (ی)؛ ۶۲۶ (ک)؛ ۶۲۷ (گ)؛ ۶۲۸ (خ)؛ ۶۲۹ (د)؛ ۶۳۰ (ذ)؛ ۶۳۱ (ر)؛ ۶۳۲ (ز)؛ ۶۳۳ (س)؛ ۶۳۴ (ح)؛ ۶۳۵ (ط)؛ ۶۳۶ (ی)؛ ۶۳۷ (ک)؛ ۶۳۸ (گ)؛ ۶۳۹ (خ)؛ ۶۴۰ (د)؛ ۶۴۱ (ذ)؛ ۶۴۲ (ر)؛ ۶۴۳ (ز)؛ ۶۴۴ (س)؛ ۶۴۵ (ح)؛ ۶۴۶ (ط)؛ ۶۴۷ (ی)؛ ۶۴۸ (ک)؛ ۶۴۹ (گ)؛ ۶۵۰ (خ)؛ ۶۵۱ (د)؛ ۶۵۲ (ذ)؛ ۶۵۳ (ر)؛ ۶۵۴ (ز)؛ ۶۵۵ (س)؛ ۶۵۶ (ح)؛ ۶۵۷ (ط)؛ ۶۵۸ (ی)؛ ۶۵۹ (ک)؛ ۶۶۰ (گ)؛ ۶۶۱ (خ)؛ ۶۶۲ (د)؛ ۶۶۳ (ذ)؛ ۶۶۴ (ر)؛ ۶۶۵ (ز)؛ ۶۶۶ (س)؛ ۶۶۷ (ح)؛ ۶۶۸ (ط)؛ ۶۶۹ (ی)؛ ۶۷۰ (ک)؛ ۶۷۱ (گ)؛ ۶۷۲ (خ)؛ ۶۷۳ (د)؛ ۶۷۴ (ذ)؛ ۶۷۵ (ر)؛ ۶۷۶ (ز)؛ ۶۷۷ (س)؛ ۶۷۸ (ح)؛ ۶۷۹ (ط)؛ ۶۸۰ (ی)؛ ۶۸۱ (ک)؛ ۶۸۲ (گ)؛ ۶۸۳ (خ)؛ ۶۸۴ (د)؛ ۶۸۵ (ذ)؛ ۶۸۶ (ر)؛ ۶۸۷ (ز)؛ ۶۸۸ (س)؛ ۶۸۹ (ح)؛ ۶۹۰ (ط)؛ ۶۹۱ (ی)؛ ۶۹۲ (ک)؛ ۶۹۳ (گ)؛ ۶۹۴ (خ)؛ ۶۹۵ (د)؛ ۶۹۶ (ذ)؛ ۶۹۷ (ر)؛ ۶۹۸ (ز)؛ ۶۹۹ (س)؛ ۷۰۰ (ح)؛ ۷۰۱ (ط)؛ ۷۰۲ (ی)؛ ۷۰۳ (ک)؛ ۷۰۴ (گ)؛ ۷۰۵ (خ)؛ ۷۰۶ (د)؛ ۷۰۷ (ذ)؛ ۷۰۸ (ر)؛ ۷۰۹ (ز)؛ ۷۱۰ (س)؛ ۷۱۱ (ح)؛ ۷۱۲ (ط)؛ ۷۱۳ (ی)؛ ۷۱۴ (ک)؛ ۷۱۵ (گ)؛ ۷۱۶ (خ)؛ ۷۱۷ (د)؛ ۷۱۸ (ذ)؛ ۷۱۹ (ر)؛ ۷۲۰ (ز)؛ ۷۲۱ (س)؛ ۷۲۲ (ح)؛ ۷۲۳ (ط)؛ ۷۲۴ (ی)؛ ۷۲۵ (ک)؛ ۷۲۶ (گ)؛ ۷۲۷ (خ)؛ ۷۲۸ (د)؛ ۷۲۹ (ذ)؛ ۷۳۰ (ر)؛ ۷۳۱ (ز)؛ ۷۳۲ (س)؛ ۷۳۳ (ح)؛ ۷۳۴ (ط)؛ ۷۳۵ (ی)؛ ۷۳۶ (ک)؛ ۷۳۷ (گ)؛ ۷۳۸ (خ)؛ ۷۳۹ (د)؛ ۷۴۰ (ذ)؛ ۷۴۱ (ر)؛ ۷۴۲ (ز)؛ ۷۴۳ (س)؛ ۷۴۴ (ح)؛ ۷۴۵ (ط)؛ ۷۴۶ (ی)؛ ۷۴۷ (ک)؛ ۷۴۸ (گ)؛ ۷۴۹ (خ)؛ ۷۵۰ (د)؛ ۷۵۱ (ذ)؛ ۷۵۲ (ر)؛ ۷۵۳ (ز)؛ ۷۵۴ (س)؛ ۷۵۵ (ح)؛ ۷۵۶ (ط)؛ ۷۵۷ (ی)؛ ۷۵۸ (ک)؛ ۷۵۹ (گ)؛ ۷۶۰ (خ)؛ ۷۶۱ (د)؛ ۷۶۲ (ذ)؛ ۷۶۳ (ر)؛ ۷۶۴ (ز)؛ ۷۶۵ (س)؛ ۷۶۶ (ح)؛ ۷۶۷ (ط)؛ ۷۶۸ (ی)؛ ۷۶۹ (ک)؛ ۷۷۰ (گ)؛ ۷۷۱ (خ)؛ ۷۷۲ (د)؛ ۷۷۳ (ذ)؛ ۷۷۴ (ر)؛ ۷۷۵ (ز)؛ ۷۷۶ (س)؛ ۷۷۷ (ح)؛ ۷۷۸ (ط)؛ ۷۷۹ (ی)؛ ۷۸۰ (ک)؛ ۷۸۱ (گ)؛ ۷۸۲ (خ)؛ ۷۸۳ (د)؛ ۷۸۴ (ذ)؛ ۷۸۵ (ر)؛ ۷۸۶ (ز)؛ ۷۸۷ (س)؛ ۷۸۸ (ح)؛ ۷۸۹ (ط)؛ ۷۹۰ (ی)؛ ۷۹۱ (ک)؛ ۷۹۲ (گ)؛ ۷۹۳ (خ)؛ ۷۹۴ (د)؛ ۷۹۵ (ذ)؛ ۷۹۶ (ر)؛ ۷۹۷ (ز)؛ ۷۹۸ (س)؛ ۷۹۹ (ح)؛ ۸۰۰ (ط)؛ ۸۰۱ (ی)؛ ۸۰۲ (ک)؛ ۸۰۳ (گ)؛ ۸۰۴ (خ)؛ ۸۰۵ (د)؛ ۸۰۶ (ذ)؛ ۸۰۷ (ر)؛ ۸۰۸ (ز)؛ ۸۰۹ (س)؛ ۸۱۰ (ح)؛ ۸۱۱ (ط)؛ ۸۱۲ (ی)؛ ۸۱۳ (ک)؛ ۸۱۴ (گ)؛ ۸۱۵ (خ)؛ ۸۱۶ (د)؛ ۸۱۷ (ذ)؛ ۸۱۸ (ر)؛ ۸۱۹ (ز)؛ ۸۲۰ (س)؛ ۸۲۱ (ح)؛ ۸۲۲ (ط)؛ ۸۲۳ (ی)؛ ۸۲۴ (ک)؛ ۸۲۵ (گ)؛ ۸۲۶ (خ)؛ ۸۲۷ (د)؛ ۸۲۸ (ذ)؛ ۸۲۹ (ر)؛ ۸۳۰ (ز)؛ ۸۳۱ (س)؛ ۸۳۲ (ح)؛ ۸۳۳ (ط)؛ ۸۳۴ (ی)؛ ۸۳۵ (ک)؛ ۸۳۶ (گ)؛ ۸۳۷ (خ)؛ ۸۳۸ (د)؛ ۸۳۹ (ذ)؛ ۸۴۰ (ر)؛ ۸۴۱ (ز)؛ ۸۴۲ (س)؛ ۸۴۳ (ح)؛ ۸۴۴ (ط)؛ ۸۴۵ (ی)؛ ۸۴۶ (ک)؛ ۸۴۷ (گ)؛ ۸۴۸ (خ)؛ ۸۴۹ (د)؛ ۸۵۰ (ذ)؛ ۸۵۱ (ر)؛ ۸۵۲ (ز)؛ ۸۵۳ (س)؛ ۸۵۴ (ح)؛ ۸۵۵ (ط)؛ ۸۵۶ (ی)؛ ۸۵۷ (ک)؛ ۸۵۸ (گ)؛ ۸۵۹ (خ)؛ ۸۶۰ (د)؛ ۸۶۱ (ذ)؛ ۸۶۲ (ر)؛ ۸۶۳ (ز)؛ ۸۶۴ (س)؛ ۸۶۵ (ح)؛ ۸۶۶ (ط)؛ ۸۶۷ (ی)؛ ۸۶۸ (ک)؛ ۸۶۹ (گ)؛ ۸۷۰ (خ)؛ ۸۷۱ (د)؛ ۸۷۲ (ذ)؛ ۸۷۳ (ر)؛ ۸۷۴ (ز)؛ ۸۷۵ (س)؛ ۸۷۶ (ح)؛ ۸۷۷ (ط)؛ ۸۷۸ (ی)؛ ۸۷۹ (ک)؛ ۸۸۰ (گ)؛ ۸۸۱ (خ)؛ ۸۸۲ (د)؛ ۸۸۳ (ذ)؛ ۸۸۴ (ر)؛ ۸۸۵ (ز)؛ ۸۸۶ (س)؛ ۸۸۷ (ح)؛ ۸۸۸ (ط)؛ ۸۸۹ (ی)؛ ۸۹۰ (ک)؛ ۸۹۱ (گ)؛ ۸۹۲ (خ)؛ ۸۹۳ (د)؛ ۸۹۴ (ذ)؛ ۸۹۵ (ر)؛ ۸۹۶ (ز)؛ ۸۹۷ (س)؛ ۸۹۸ (ح)؛ ۸۹۹ (ط)؛ ۹۰۰ (ی)؛ ۹۰۱ (ک)؛ ۹۰۲ (گ)؛ ۹۰۳ (خ)؛ ۹۰۴ (د)؛ ۹۰۵ (ذ)؛ ۹۰۶ (ر)؛ ۹۰۷ (ز)؛ ۹۰۸ (س)؛ ۹۰۹ (ح)؛ ۹۱۰ (ط)؛ ۹۱۱ (ی)؛ ۹۱۲ (ک)؛ ۹۱۳ (گ)؛ ۹۱۴ (خ)؛ ۹۱۵ (د)؛ ۹۱۶ (ذ)؛ ۹۱۷ (ر)؛ ۹۱۸ (ز)؛ ۹۱۹ (س)؛ ۹۲۰ (ح)؛ ۹۲۱ (ط)؛ ۹۲۲ (ی)؛ ۹۲۳ (ک)؛ ۹۲۴ (گ)؛ ۹۲۵ (خ)؛ ۹۲۶ (د)؛ ۹۲۷ (ذ)؛ ۹۲۸ (ر)؛ ۹۲۹ (ز)؛ ۹۳۰ (س)؛ ۹۳۱ (ح)؛ ۹۳۲ (ط)؛ ۹۳۳ (ی)؛ ۹۳۴ (ک)؛ ۹۳۵ (گ)؛ ۹۳۶ (خ)؛ ۹۳۷ (د)؛ ۹۳۸ (ذ)؛ ۹۳۹ (ر)؛ ۹۴۰ (ز)؛ ۹۴۱ (س)؛ ۹۴۲ (ح)؛ ۹۴۳ (ط)؛ ۹۴۴ (ی)؛ ۹۴۵ (ک)؛ ۹۴۶ (گ)؛ ۹۴۷ (خ)؛ ۹۴۸ (د)؛ ۹۴۹ (ذ)؛ ۹۵۰ (ر)؛ ۹۵۱ (ز)؛ ۹۵۲ (س)؛ ۹۵۳ (ح)؛ ۹۵۴ (ط)؛ ۹۵۵ (ی)؛ ۹۵۶ (ک)؛ ۹۵۷ (گ)؛ ۹۵۸ (خ)؛ ۹۵۹ (د)؛ ۹۶۰ (ذ)؛ ۹۶۱ (ر)؛ ۹۶۲ (ز)؛ ۹۶۳ (س)؛ ۹۶۴ (ح)؛ ۹۶۵ (ط)؛ ۹۶۶ (ی)؛ ۹۶۷ (ک)؛ ۹۶۸ (گ)؛ ۹۶۹ (خ)؛ ۹۷۰ (د)؛ ۹۷۱ (ذ)؛ ۹۷۲ (ر)؛ ۹۷۳ (ز)؛ ۹۷۴ (س)؛ ۹۷۵ (ح)؛ ۹۷۶ (ط)؛ ۹۷۷ (ی)؛ ۹۷۸ (ک)؛ ۹۷۹ (گ)؛ ۹۸۰ (خ)؛ ۹۸۱ (د)؛ ۹۸۲ (ذ)؛ ۹۸۳ (ر)؛ ۹۸۴ (ز)؛ ۹۸۵ (س)؛ ۹۸۶ (ح)؛ ۹۸۷ (ط)؛ ۹۸۸ (ی)؛ ۹۸۹ (ک)؛ ۹۹۰ (گ)؛ ۹۹۱ (خ)؛ ۹۹۲ (د)؛ ۹۹۳ (ذ)؛ ۹۹۴ (ر)؛ ۹۹۵ (ز)؛ ۹۹۶ (س)؛ ۹۹۷ (ح)؛ ۹۹۸ (ط)؛ ۹۹۹ (ی)؛ ۱۰۰۰ (ک)؛ ۱۰۰۱ (گ)؛ ۱۰۰۲ (خ)؛ ۱۰۰۳ (د)؛ ۱۰۰۴ (ذ)؛ ۱۰۰۵ (ر)؛ ۱۰۰۶ (ز)؛ ۱۰۰۷ (س)؛ ۱۰۰۸ (ح)؛ ۱۰۰۹ (ط)؛ ۱۰۱۰ (ی)؛ ۱۰۱۱ (ک)؛ ۱۰۱۲ (گ)؛ ۱۰۱۳ (خ)؛ ۱۰۱۴ (د)؛ ۱۰۱۵ (ذ)؛ ۱۰۱۶ (ر)؛ ۱۰۱۷ (ز)؛ ۱۰۱۸ (س)؛ ۱۰۱۹ (ح)؛ ۱۰۲۰ (ط)؛ ۱۰۲۱ (ی)؛ ۱۰۲۲ (ک)؛ ۱۰۲۳ (گ)؛ ۱۰۲۴ (خ)؛ ۱۰۲۵ (د)؛ ۱۰۲۶ (ذ)؛ ۱۰۲۷ (ر)؛ ۱۰۲۸ (ز)؛ ۱۰۲۹ (س)؛ ۱۰۳۰ (ح)؛ ۱۰۳۱ (ط)؛ ۱۰۳۲ (ی)؛ ۱۰۳۳ (ک)؛ ۱۰۳۴ (گ)؛ ۱۰۳۵ (خ)؛ ۱۰۳۶ (د)؛ ۱۰۳۷ (ذ)؛ ۱۰۳۸ (ر)؛ ۱۰۳۹ (ز)؛ ۱۰۴۰ (س)؛ ۱۰۴۱ (ح)؛ ۱۰۴۲ (ط)؛ ۱۰۴۳ (ی)؛ ۱۰۴۴ (ک)؛ ۱۰۴۵ (گ)؛ ۱۰۴۶ (خ)؛ ۱۰۴۷ (د)؛ ۱۰۴۸ (ذ)؛ ۱۰۴۹ (ر)؛ ۱۰۵۰ (ز)؛ ۱۰۵۱ (س)؛ ۱۰۵۲ (ح)؛ ۱۰۵۳ (ط)؛ ۱۰۵۴ (ی)؛ ۱۰۵۵ (ک)؛ ۱۰۵۶ (گ)؛ ۱۰۵۷ (خ)؛ ۱۰۵۸ (د)؛ ۱۰۵۹ (ذ)؛ ۱۰۶۰ (ر)؛ ۱۰۶۱ (ز)؛ ۱۰۶۲ (س)؛ ۱۰۶۳ (ح)؛ ۱۰۶۴ (ط)؛ ۱۰۶۵ (ی)؛ ۱۰۶۶ (ک)؛ ۱۰۶۷ (گ)؛ ۱۰۶۸ (خ)؛ ۱۰۶۹ (د)؛ ۱۰۷۰ (ذ)؛ ۱۰۷۱ (ر)؛ ۱۰۷۲ (ز)؛ ۱۰۷۳ (س)؛ ۱۰۷۴ (ح)؛ ۱۰۷۵ (ط)؛ ۱۰۷۶ (ی)؛ ۱۰۷۷ (ک)؛ ۱۰۷۸ (گ)؛ ۱۰۷۹ (خ)؛ ۱۰۸۰ (د)؛ ۱۰۸۱ (ذ)؛ ۱۰۸۲ (ر)؛ ۱۰۸۳ (ز)؛ ۱۰۸۴ (س)؛ ۱۰۸۵ (ح)؛ ۱۰۸۶ (ط)؛ ۱۰۸۷ (ی)؛ ۱۰۸۸ (ک)؛ ۱۰۸۹ (گ)؛ ۱۰۹۰ (خ)؛ ۱۰۹۱ (د)؛ ۱۰۹۲ (ذ)؛ ۱۰۹۳ (ر)؛ ۱۰۹۴ (ز)؛ ۱۰۹۵ (س)؛ ۱۰۹۶ (ح)؛ ۱۰۹۷ (ط)؛ ۱۰۹۸ (ی)؛ ۱۰۹۹ (ک)؛ ۱۱۰۰ (گ)؛ ۱۱۰۱ (خ)؛ ۱۱۰۲ (د)؛ ۱۱۰۳ (ذ)؛ ۱۱۰۴ (ر)؛ ۱۱۰۵ (ز)؛ ۱۱۰۶ (س)؛ ۱۱۰۷ (ح)؛ ۱۱۰۸ (ط)؛ ۱۱۰۹ (ی)؛ ۱۱۱۰ (ک)؛ ۱۱۱۱ (گ)؛ ۱۱۱۲ (خ)؛ ۱۱۱۳ (د)؛ ۱۱۱۴ (ذ)؛ ۱۱۱۵ (ر)؛ ۱۱۱۶ (ز)؛ ۱۱۱۷ (س)؛ ۱۱۱۸ (ح)؛ ۱۱۱۹ (ط)؛ ۱۱۲۰ (ی)؛ ۱۱۲۱ (ک)؛ ۱۱۲۲ (گ)؛ ۱۱۲۳ (خ)؛ ۱۱۲۴ (د)؛ ۱۱۲۵ (ذ)؛ ۱۱۲۶ (ر)؛ ۱۱۲۷ (ز)؛ ۱۱۲۸ (س)؛ ۱۱۲۹ (ح)؛ ۱۱۳۰ (ط)؛ ۱۱۳۱ (ی)؛ ۱۱۳۲ (ک)؛ ۱۱۳۳ (گ)؛ ۱۱۳۴ (خ)؛ ۱۱۳۵ (د)؛ ۱۱۳۶ (ذ)؛ ۱۱۳۷ (ر)؛ ۱۱۳۸ (ز)؛ ۱۱۳۹ (س)؛ ۱۱۴۰ (ح)؛ ۱۱۴۱ (ط)؛ ۱۱۴۲ (ی)؛ ۱۱۴۳ (ک)؛ ۱۱۴۴ (گ)؛ ۱۱۴۵ (خ)؛ ۱۱۴۶ (د)؛ ۱۱۴۷ (ذ)؛ ۱۱۴۸ (ر)؛ ۱۱۴۹ (ز)؛ ۱۱۵۰ (س)؛ ۱۱۵۱ (ح)؛ ۱۱۵۲ (ط)؛ ۱۱۵۳ (ی)؛ ۱۱۵۴ (ک)؛ ۱۱۵۵ (گ)؛ ۱۱۵۶ (خ)؛ ۱۱۵۷ (د)؛ ۱۱۵۸ (ذ)؛ ۱۱۵۹ (ر)؛ ۱۱۶۰ (ز)؛ ۱۱۶۱ (س)؛ ۱۱۶۲ (ح)؛ ۱۱۶۳ (ط)؛ ۱۱۶۴ (ی)؛ ۱۱۶۵ (ک)؛ ۱۱۶۶ (گ)؛ ۱۱۶۷ (خ)؛ ۱۱۶۸ (د)؛ ۱۱۶۹ (ذ)؛ ۱۱۷۰ (ر)؛ ۱۱۷۱ (ز)؛ ۱۱۷۲ (س)؛ ۱۱۷۳ (ح)؛ ۱۱۷۴ (ط)؛ ۱۱۷۵ (ی)؛ ۱۱۷۶ (ک)؛ ۱۱۷۷ (گ)؛ ۱۱۷۸ (خ)؛ ۱۱۷۹ (د)؛ ۱۱۸۰ (ذ)؛ ۱۱۸۱ (ر)؛ ۱۱۸۲ (ز)؛ ۱۱۸۳ (س)؛ ۱۱۸۴ (ح)؛ ۱۱۸۵ (ط)؛ ۱۱۸۶ (ی)؛ ۱۱۸۷ (ک)؛ ۱۱۸ |

اردو ادب کا سماجی پس منظر

۴۴۴ وہ ترکیب اندھ چاند سے بدکن وہ بازو پہ ٹھٹکتے ہوئے نور تن

ہمارے مورچوں پر نور تن باندھے تھے افکار نے

۴۴۵ کہی بھیننی کسے کہ چتر کیا دس کا جوڑا

بدکن میں جامہ زرکش، سراپا جس پر زیب آند

۴۴۶ کرے، بندے، چڑے، اچھوٹی، نور تن ہیکل

یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے

۴۴۷ جھلک کسی کے دمپٹے میں نور تن کی سی

جھلکتے ہیں ستارے جس طرح باریک بادل میں

۴۴۸ ترے بازو پہ زیر آستیں یوں نور تن جگے

کسی کے چمکتے ہوئے نور تن کسی کے وہ کھڑے پتھر کی بھیننی

۴۴۹ ہیروں کا نور تن نہیں تیرے، بھٹے ہیں جمع

۴۵۰ یہ چاندنی کے پھول، مگر کھل کے، چادیاں

ناد علی؛ سونے یا چاندی کی تختیوں پر مہشت پہل رخوہ چار گوشہ ناد علی کو کندہ کرا کے لغزو

حفظہ و فتح نظر بدغوش اقتقاد مسلمان اپنے بچوں کو پہناتے ہیں اور حسین عورتیں گلے میں پہنتی

ہیں۔ اکثر ناد علی زہر مہرے کی تختی پر کھودتے ہیں۔ اس وجہ سے زہر مہرے کی تختی کو بھی جو گلے

میں ڈالنے کے واسطے بنائی جاتی ہے، ناد علی کہتے ہیں۔

انشا؛ ممکن نہیں اس پر نظر بدکا اثر ہو زریہ میں علی بند بھی ہے، ناد علی بھی

ہمیکل؛ تعویذ، ایک زریہ جو گلے میں پہنا جاتا ہے۔

۴۴۴ ایضاً؛ ۲۵، ۵۶، ۵۹، ۶۹، ۷۱، ۷۵ کلیات انشا؛ ۱۲۵، ۱۵۵

۴۴۷ کلیات نظیر اکبر آبادی؛ ۱۳۷ ایضاً؛ ۱۳۳

۴۴۸ کلیات قاسم؛ ۲۹۹؛ کلیات ہمت؛ ۱۹

۴۴۹ مجموعہ مثنویات میر حسن؛ ۲۵

۴۵۰ دیوان نظیر؛ ۲، ۷، ۹۱، ۱۸۱، ۳، ۲۱۰

جواہر سے مینے کی ہیکل جھٹی ۴۵۱
کرا اور گولے کے نیچے بڑی
وہ الماس کی ہیکل اک خوشنما ۴۵۲
تصور رہے جس سے دل کا لٹکا
وہ ہیکل جس کو دیکھ دل کو پہل ۴۵۳
وہ چھلے جس کے اندازوں میں چل بل
تعویذوں میں ہیکل کے کیا تعبیر اس کو

۴۵۴
پرویں کی جو ہاتھ آئے غیب ان پاؤں کی لوث
کولہ سے روز کہ تعویذوں کی ضامن ہو کر

۴۵۵
اس کے ہیکل میں بڑے نکٹی دل در چار
گر گڑا ہٹ جو سنی، صنم! تیری ہیکل کی

۴۵۶
کل گئی اور محو میرے دل بیگل کی

۴۵۷
بدن میں جامے زر کش، سراپا جس پر زیب آمد
کڑے، بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، توہن ہیکل

۴۵۸
اگر کہتے کہ ہم ہیں بیکل، ذرا گلے مل تو ہنس کے ظالم
دکھا دے ہیکل اٹھا کے، یعنی بلا سے میری، مجھ تو کل ہے

۴۵۹
دیکھی جو اس محبوب کی ہم نے جھلک ہیکل کی کل
ہائی ہر ایک تعویذ میں اپنے دل بیکل کی کل
۴۶۰
پے دھو کر تیرے ہیکل کے تعویذ دیے جھینک اور سب مل کر تعویذ

۴۵۱ مجموعہ شخویات میر حسن: ۶۹، ۱۵۶، ۵۶

۴۵۲ ایضاً: ۶۹ ۴۵۳ ایضاً: ۱۵۶

۴۵۴ دیوان معصی: ۵، ۲۸ (ب) ۴۵۵ ایضاً: ۵، ۱۵ (الف)

۴۵۶ ایضاً: ۳، ۷۱ (الف)؛ ایضاً: ۶، ۶۲

۴۵۷ کیا صفتیر اکبر آبادی: ۱۰۳ ۴۵۸ ایضاً: ۱۰۴

۴۵۹ ایضاً: ۱۰۵

۴۶۰ دیوان غفر: ۳، ۳۶

ہار: موتیوں یا پھولوں کی مالا۔

۴۶۱ وہ ہاتھ ٹوٹ جائیو، یارب! شب وصال
جس ہاتھ سے گلے کا تیرے ہار توڑے

۴۶۲ رشک سے اشک نہ کیوں ہار گلے کے ہوں میرے
سینہ یار سے ہے موتیوں کے ہار کو فیض

۴۶۳ پہن کر ہار گلے میں جو وہ سویا شب کو
پڑھنے گردن نازک پہن ہار کے خط

۴۶۴ بندھا جواں خوں کا تار دیکھا، تو اس نے ہنس کر یہ مجھے پوچھا
تو نے اپنے گلے میں ڈالا یہ موتیوں کا ہار کیسا

۴۶۵ کہتا تھا میں گلے کا ترے ہو پڑ گیا ہار
دیکھا زنگل کو سر پہ چڑھانے لے کیا کیا

ہنسلی: نقری یا لٹائی گلے کا زیور۔

۴۶۶ پہنے پھرے ہیں شمع کڑے اندر نہلیاں
پھولوں کی میوہوں میں ہیں شاخیں اُڑیں لیاں

۴۶۱ دیوان معصومی، ۱۹: ۴۶۲؛ نیز دیکھیے مجموعہ غزل: ۱۳۹، ۱۵۸، ۱۷۶، ۵۸

۴۶۲ دیوان نظری: ۱۳۶ ۴۶۳ ایضاً: ۱۳۹

۴۶۴ ایضاً: ۱۴: ۳

۴۶۵ کلیات سودا، ۱: ۱۱۷، ۱۶۷، ۱۷۷؛ مجموعہ غزلیات میر حسن: ۵۶

۴۶۶ کلیات قطب اکبر آبادی: ۴۲۲

پریم چند — ماضی اور حال کا ادیب

ایک نوجوان ہونہا افسانہ نگار سے باتوں کے دوران میں پریم چند کا ذکر نکل آیا۔ اُن کا خیال تھا کہ پریم چند جدوجہد آزادی کے زمانے میں تھے لہذا اُن کے دُور کے مسائل اور تھے، آزادی کے بعد کے مسائل اور ہیں۔ اس وقت ادب، جدوجہد آزادی کی وجہ سے، سماج میں پیدا ہونے والی اجتماعی پُمل اور حرکت کے ساتھ زیادہ وابستہ تھا اور آج انسان کی انفرادی زندگی کی محدودیتوں اور تنہائیوں سے زیادہ وابستہ ہے، اس وقت ادیب اُسی جدوجہد کا ایک حصہ تھا اور ادب روحانات یہ ہیں کہ ادیب کسی کا پابند اور کسی کو جوا بد نہیں، وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔ اُس وقت ادب کی طرزِ براہِ راست اور سادہ تھی کیونکہ منزل صاف تھی؛ اب چاروں طرف پیچیدگی ہے۔ اس لیے ادب بھی بلا واسطہ اور پیچیدہ ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے وقت پورے ملک میں اُمید کی لہر تھی؛ آزادی کے بعد اس کی جگہ مایوسی نے لے لی ہے؛ لہذا ادب میں بھی اس مایوسی کا موجود ہونا لازمی و ناگزیر ہے۔ آزادی سے پہلے بین الاقوامی رنگ و رجحانات ہمارے ادب پر کم اثر انداز ہوتے تھے، آج زیادہ ہمارے ملک میں سماج کا ڈھانچا بڑی تیزی سے بدل رہا ہے، پُرانی قدیں بدل رہی ہیں، نئی ہنوز مستحکم نہیں ہوئی ہیں، اس صورتِ حال کی وجہ سے نفسیاتی پیچیدگی بڑھ رہی ہے جس کا نتیجہ ادب میں بھی گھٹک، ابہام، مادرائی کیفیات اور داخلیت کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ اگر آج ہم ان کیفیات کو ادب میں جگہ نہ دیں تو حقیقت پسند نہ ہونگے اور اس لیے یہ ادبی مصیبت

اور ادب کے وہ نمونے اور وہ موضوعات جو ہم نے پیش کیے تھے، وہ اُن کے وقت کے لیے درست اور صحیح تھے، ہمارے لیے آج وہ تقویم پاریز ہو چکے ہیں۔ وہ موضوعات پرکرنے ہو چکے ہیں۔

واقعاً مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ اُس نوجوان نے اتنا سوچا اور یقیناً حالات کی جو تصویر اس نے پیش کی، وہ بھی درست ہے۔ لیکن یہ صرف آدمی حقیقت ہے اور اس نے اس حقیقت سے جو نتیجہ اخذ کر کے، ادب کے لیے جس رخ کا تعین کیا، وہ میرے خیال میں قطناً درست نہیں ہے۔

میں آج کل عام طور پر دیکھتی ہوں کہ پریم چند کی اہمیت کو گھٹانا اور ان کے قائم کیے ہوئے ادبی میبادوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کچھ فیشن سا بنتا جا رہا ہے۔ اس کوشش میں رجعت پسندوں کا بھی کچھ ہاتھ ہے؛ اور باہری ادب کے اُن "متوں کا بھی اثر ہے" جو ہمارے ملک کے لیے بالکل غیر موزوں ماحول نامناسب ہیں۔ ساری دنیا میں ادیب کی آزادی کاغزوہ لگا کر اسے سلج کو بدلنے کا ایک زوردار آڈ کار بننے سے روکنے کی جو شعور ہی کوشش کچھ اطراف سے ہوتی ہے، اس کا بھی اس میں دخل ہے۔ لیکن ساتھ ہی کم از کم میں یہ نہیں ماننا چاہتی کہ ہمارا نوجوان ادیب اتنا سلی ہے کہ وہ صرف ان سب باتوں ہی سے متاثر ہو کر پریم چند سے دُور ہٹ رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ادیب بنیادی طور پر ہمیشہ پُرانی ٹوکر سے ہٹ کر چلنا چاہتا ہے، وہ اپنی تخلیق میں سدا ایک نیا پن پیدا کرنا اور اپنے بزرگوں سے آگے جانا چاہتا ہے۔ اس کی یہ خواہش نہایت مستحسن ہے !

ایک مرتبہ کسی ادبی محفل میں ایک نوجوان ادیب نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا تھا کہ یہ بڑے ادیب جن سے اُن کی مراد کرشن چندر وغیرہ تھے، قطب مینار کی طرح ہمارے راستے میں کھڑے ہیں، اُن کو ڈھاننا چاہیے۔ میں نے اُن سے آہستگی کے ساتھ کہا: بھائی! ہم نے تو جیو میٹری میں یہ پڑھا تھا کہ کسی کبیر کو چھوٹا ثابت کرنا تو اس کے برابر میں اس سے بڑی ایک کبیر کھینچ دی جائے، قطب مینار کو ڈھانے کی کیا ضرورت، اس کے برابر میں

ایک اسکاٹی اسکریپر کھڑا کیجیے۔ مگر یاد رکھیے کہ آج سیمنٹ اور لوہا اور انسان کی محنت اتنی سستی ادا کرتی نہیں ہے کہ آپ صرف بنانے کی خاطر کوئی چیز بنا دیں گے۔ اگر وہ اسکاٹی اسکریپر لوگوں کے رہنے یا کام کرنے کے لیے نہیں، آپ کی حرفِ شان کے لیے ہوگا، تو اس کا ٹھہرنا تو درکنار بن ہی نہیں سکیگا۔

سوال یہ ہے کہ ہندوگوں سے مختلف ہونے کی کوشش، اُن سے آگے بڑھ جانے کا ارادہ نہایت مستحسن، مگر اس کے لیے بھی تو آخر کوئی معیار ہونا چاہیے۔ ادب میں پڑنے اور دینے کا رشتہ زمین اور بیج کی مانند ہے۔ زمین وہی ہے، لکھو کھاساں پڑانی، لیکن نئی اور پہلہاتی فصلیں سال میں دو دو بار ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ ہر سال اس زمین کو تیار کیا جائے، اس میں نیا اور عمدہ بیج ڈالا جائے۔ یقیناً ہم ہر سال نئی ہی فصل چاہتے ہیں، لیکن نہ تو زمین کے بغیر نئی فصل کا تصور ہو سکتا ہے، نہ نئے بیج کے بغیر۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج حالات پریم چند کے زمانے سے مختلف ہیں لیکن میں یہ نہیں مانتی کہ وہ موضوعات ختم ہو گئے، جو ان کے زمانے میں تھے۔ پریم چند ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے صدارتی خطبے میں کہتے ہیں:

ہماتما بدھ، اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ سب ہی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی عمارت کھڑی کرنی چاہی، مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی، اور آج اعلیٰ و ادنیٰ کی تفاوت جتنی بیدردی سے نمایاں ہو رہی ہے، شاید پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس بات کو ایک حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے؛ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے، جہاں وہ مساوات، اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔

کیا آج بھی یہ واقعہ نہیں ہے اور زیادہ شدت سے نہیں ہے کہ کچھ لوگ امیر تر ہوتے جا رہے ہیں اور زیادہ لوگ غریب تر؟ منصوبے پر منصوبہ بن رہا ہے اور پڑھے لکھے بے روزگار لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے؛ اُن میں سمجھنی، پریشانی، بدعالی اور اس کے

نتیجے کے طور پر نظمیں، انتشار اور تشدد کا رجحان فطری طور پر بڑھ رہا ہے۔ مسادات کیلئے آج حوا اقدام حکومت کی طرف سے بھی ہوتا ہے، وہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جاتا پھر یہ موضوع تقویم پارینہ کیسے ہو گیا؟

پریم چند کی متعدد کہانیوں کا ایک مخصوص موضوع ذات پات کی تفریق اور رسوائی فرسودہ و نظام رنگ اکودہ کی عکاسی تھا۔ کیا گزشتہ چند سال میں ہمارے ملک میں ہر بچوں پر نظام نہیں ہوئے؟ فرقہ وارانہ فسادات کی ہیبت سے ہمیں دوچار نہیں ہونا پڑا؟ کیا زندگی کے سلسلے میں آج بھی لائق فوجانوں کے بجائے بارسوخ لوگوں کے نالائق رشتے داروں کو ترجیح نہیں دی جاتی؟ اب شیڈیل کاسٹ کا اثر ناک لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ کیا اس کا یہ نتیجہ تو نہیں نکلیگا کہ رعایت پانے والے کو ہر وقت یہ بات یاد آتی رہیگی کہ میں بھی تھا اس لیے مجھے یہ رعایت دی گئی۔ کیا فیض ابھی تک ٹوہنگ سے کچھ زیادہ ہے؟ کیا عورتیں آج جینز کی محنت میں پہلے سے زیادہ گرفتار نہیں؟ — اگر یہ سب کچھ صحیح ہے، تو پھر پریم چند کے یہ موضوعات آج پڑانے کیوں سمجھے جائیں؟ جب تک کسی نئے ادیب کا تخلیق کیا ہوا کوئی افسانہ "کفن مے آگے نہیں جاتا، کوئی نیا ادیب پریم چند سے آگے جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

میں تسلیم کرتی ہوں کہ آج لوگوں پر حد درجہ احساس محرومی طاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اب لوگوں کی بہت بڑی تعداد کام پر لگی ہوئی ہے، محنت مشقت کر رہی ہے اور بڑی جرات کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ساتھ ساتھ اپنے حق کے لیے لڑ بھی رہی ہے۔ اسی انسانی ریلے کا ایک فرد ادیب بھی ہے؛ اس راہ میں جو سب پر گزرتی ہے، وہی اسے بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ احساس طبیعت رکھنے کے باعث وہ حالات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ — پریم چند نے کہا ہے: "جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے، جماعت سے الگ وہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جن کو جتنی ہی بہتر تعلیم اور ذہنی قوی حاصل ہیں، ان کا دھڑ سناج

کی اتنی ہی زیادہ ذمہ داری مائد ہوتی ہے، اس معیار کے مقابلے میں آج کل ادیب کی انفرادیت کا ایک لغزہ چل پڑا ہے، جس سے بالعموم یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ ادیب کی کوئی سماجی ذمہ داری نہیں، وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں — ان دونوں باتوں کو سامنے رکھیے تو ایک اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ ادیب کی ذات اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سماج کی کیفیات کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ اگر ماحول میں انتشار و بے نظمی، بے عنوانی اور مایوسی ہے، تو ادیب کو اس سے کس طور پر متاثر ہونا چاہیے؟ میں ادیب کی ذات اور اس کی انفرادیت کی بڑی شدت سے قائل ہوں، مگر میں اس کی عظمت اور انفرادیت اس میں سمجھتی ہوں کہ بیشک، وہ ماحول کی مایوسی کا عکاس ضرور ہو، لیکن اس کا فکارت نہ ہو، چاروں طرف جتنی بھی مایوسی ہو، ادیب اس گھپ اندھیرے میں بھی اپنے دل میں امید کا چراغ روشن کیے رہے، اس کا یہ اعتقاد کہی نہ ڈوگائے کہ خصلتِ انسانی بنیادی طور پر نیکی کی طرف مائل ہے، محنتِ انسانی بالآخر کامیاب ہوگی — یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن اگر ادیب اس مشکل پسندی کو نہیں اپناتا تو پھر اس کا امتیاز اور انفرادیت کس بات سے ثابت ہوگی؟ — پریم چند نے لکھا ہے: ”ہمارے لیے وہ جذبات ہیمنے ہیں جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور بھی مسلط ہو جائے، جن سے ہمارے دلوں پر اندھ مایوسی طاری ہو جائے.... داخلیت وہ شے ہے، جو جمود، پستی اور سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لیے نہ اجتماعی حیثیت سے مفید ہے، نہ انفرادی — میرے خیال میں یہ معیار جتنا درست اور بر محل آج ہے، اتنا وہ پریم چند کے زمانے میں بھی نہیں تھا۔

یقیناً پریم چند نے یہاں جو لفظ انفرادی استعمال کیا ہے، وہ بڑا اہم ہے۔ آج کل افسانوں میں ایک ترکیب استعمال ہوتی ہے: ”میرے اندکائیں“۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم پڑانے قسم کے زبان دان تو ہیں، کو برے معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کسی کو مغرور و خود پسند معذرت پرست کہنا ہو تو کہتے ہیں: ”ظان میں تو بڑا میں ہے“

یہ میں ہمہ تن ادیب کو کسی اندھیری کوٹھری میں ڈھکیل دیتی ہے، جس میں روشنی اور آکسیجن کے لیے روزانہ تک نہیں ہوتے۔ برہم چند نے لکھا ہے: ”جو سچا آرٹسٹ ہوگا وہ خود برستی کی زندگی کو پسند نہیں کر سکتا، وہ اپنے اطمینان قلب کے لیے نمائش کا سہارا نہیں لے سکتا۔“

آج کل افسانوں میں ایک روحان یہ بھی دیکھتی ہوں کہ برے معنوں میں غیر معمولی (جسے ABNORMAL کہہ لیجیے) کردار، ذہنی الجھنیں، جنسی براہ رویاں پسندیدہ موضوعات بن گئے ہیں۔ ان کو بڑھ کر میرے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان ہی موضوعات کا انتخاب کیوں؟ اگر یہ واقع ہے کہ ادیب انہی چیزوں پر قلم اٹھاتا ہے، جو اس کے دل کو لگتی ہیں، تو ادیب کے دل کو اتنے سارے کردار چھوڑ کر یہ طیرھا میٹرھا کردار ہی کیوں پسند آیا؟ اتنے بہت سے سماجی مسئلے ہیں جن کا اثر ادیب پر بھی پڑنا ناگزیر ہے، تو ان کو رد کر کے یہ ایک الجھا پلجھا نفسیاتی مسئلہ ہی آسے کیوں بھایا؟ کیا یہ ادیب صرف حیرت کے جذبے کے تحت لکھتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں پانی ناقص ہے اور مٹے تلخ کیا ب، اس لیے کہی کبھار منہ کا مزہ بدلنے کے لیے یہ بھی اچھی لگ سکتی ہے۔ لیکن اگر صرف اسی کے استعمال کی عادت پڑ جائے تو آخر میں جگر پھلنی ہو جاتا ہے۔ ادیب سماج کا سماج ہے، لیکن اگر وہ خود ہی اس بیماری میں مبتلا ہو جائے، تو کب کیا کہیے گا؟ یہی ناکہ اس نے اپنے پیشے کے ان اصولوں سے بے احتیاطی اور لاپرواہی برتی، جن پر اسے شدت سے قائم رہنا چاہیے تھا۔ ایسے ادیبوں کے متعلق برہم چند نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابھی ان کی نگاہیں اتنی وسیع نہیں ہوئی ہیں کہ وہ کشمکش حیات میں زندگی کے حسن کا عروج دیکھیں۔ اور یہ کہ ”آرٹسٹ اپنے آرٹ سے عین کی تخلیق کر کے اسباب و حالات کو بایدیگی کے لیے سادہ کار بناتا ہے۔“ میرے خیال میں ادیب جب تک معمولی میں غیر معمولی یعنی اچھے معنوں میں غیر معمولی دیکھنے کا اہل نہیں بنتا، وہ معمولی سے عظیم ادیب نہیں بن سکتا۔

ہر طرف ”ادیب کی آزادی“ آج کل ایک زبردست غور ہے۔ ظاہر ہے کہ اصولاً اس

مے کون اختلاف کر سکتا ہے! مگر یہ آزادی کیسی ہوا اور کس لیے؟ اس سلسلے میں بھی پریم چند کا نام ابھی تک سرِ فہرست ہے۔ اس نے ادیب کی آزادی کے نعرے تو نہیں لگائے، مگر ایسی تخلیقات ضرور کیں کہ جنہیں انگریزی شہنشاہیت نے جلا دینا ضرور نہ سمجھا۔ آج ہم اس بات کو تو مانتے ہیں کہ محلات پریم چند کے زمانے سے بدتر ہیں، لیکن ہم آپ سے کس کی تحریروں کو صاحبانِ اقتدار نے اتنا مؤثر سمجھا کہ ان میں آگ لگادی جائے؟ کبھی کسی کتاب کے ممنوع قرار دیے جانے کی خبر آتی بھی ہے، تو حنیات یا مذہبی تعقبات کے الزام میں! پریم چند ایسے ادیبِ آفاذِ قلم کا خیال ایک طرف یہ تھا کہ ”ادیب انسانیت، علویت اور شرافت کا علمبردار ہے، جو پامال ہیں مظلوم ہیں، محروم ہیں، اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے اور سوسائٹی اُس کی مدالت“۔ اور دوسری طرف اس کا یہ خیال تھا کہ ”ادب سیاسیات و وطنیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں، بلکہ ان کے آگے آگے مشعل دکھانے والی حقیقت ہے“۔

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھیے، تو یہ معیار بنتا ہے کہ پریم چند کی نظر میں ادیب اپنے سماج کا سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد زبان انسان ہوتا ہے؛ اس میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ وہ کوئی بات برسرِ اقتدار طبقے کے ڈر سے، اپنے مفاد کے حساب سے، اور زمانے کے ممانعات کے لحاظ سے نہیں، کسی کی نقل میں نہیں، بلکہ اپنے یقین اور اصول کے مطابق کہتا ہے۔ اور اس لیے اس کی ہر تخلیق کے قدم مضبوطی سے اُس کی دھرتی میں گڑے رہتے ہیں، اس کی شخصیت اور انفرادیت کثرت میں وحدت کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ وحدت جس کا ظہور اور خہر و کثرت ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ پریم چند کا یہ میاں اُن طبقات کے بالکل خلاف جاتا ہے جن کی کوشش یہ ہے کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ ادیب کو زیادہ سے زیادہ سدا سے کاٹ دیں۔ اُسے اُس کی انفرادیت کی انیون، ذات کی آزادی کی شکر میں لپیٹ کر اس حد تک دے دیں کہ وہ اس اصول ہی سے مشکوک ہو جائے کہ سدا کو بدلنے میں ادب کا پھول کو ہٹا ہے جو ہیرے کا جگر کاٹ سکتی ہے۔ کیونکہ سدا میں صمدتِ تبدیلی، نیچے دبی

پریم چند

ہوئی اکثریت کے لیے راہ حیات ہے، تو ادب پرستی ہوئی اقلیت کے لیے پریم موت! ایک ادیب ہونے کے ناتے میں یہ جانتی ہوں کہ ادیب کو حکم نہیں دیا جاسکتا۔ مگر ساتھ ہی میرا یہ عقیدہ ہے کہ ادیب سے امید بھی کی جاسکتی ہے، اس سے گلہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ تو تسلیم شدہ امر ہے کہ جس سے ہوتی ہے امید، اُسی سے گلہ ہوتا ہے! اگر لاکھوں انسان کسی ایک انسان کی نوکِ قلم کو اپنی نوکِ زبان سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ اس صاحبِ قلم کے لیے انتہائی مسرت اور فخر کی بات ہونی چاہیے، اور اس عظیم اعتماد کا جب اگرچہ چند الفاظ میں دے سکے تو یہ سودا نہایت ارذل ہے!

ہم میں سے ہر ایک کو پریم چند کی زندگی کا علم ہے۔ کیسی مشکل، پریشانی اور بد حالی میں انھوں نے اپنی ساری عمر گزاری، لیکن کم از کم مجھ کو ان کے کسی افسانے میں اس تنہائی اور فرطِ طریش کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، جس کی آج اس قدم ہائے ہائے بچی ہوئی ہے۔ مانا، ہر فنکار پر اکیلے ہونے کا احساس کبھی کبھی طاری ہوتا ہے، مگر یہ تو ہر انسان پر بھی کبھی کبھی طاری ہوتا ہے۔ تو پھر اس احساس کا راگ الاپتے رہنے میں ادیب کی کیا فضیلت ہوئی؟ اور اگر ایسا ہی تنہائی سے عشق ہے، تو سنیاں کیوں نہ لے لیا جائے؟ کم از کم دوسروں کی جان تو آپ کی محرومی کا دکھڑا سننے سے بچ جائیگی۔ اس غیر مستمند رُحمان کا علاج تو وہی ہے، جو ایک عینی کہارت میں کہا گیا ہے: ”مجھے اس کا فہم تھا کہ میرے پیروں میں جوتے نہیں، یہاں تک کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کے پیروں میں جوتے تھے۔“

کچھ دن پہلے میں نے ایک تنقید نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ انھوں نے جدید ادب میں اس ذاتیاتی رنگ، تنہائی و محرومی کے احساس کی یوں تاویل کی تھی کہ مشینوں کی وجہ سے زندگی میکانیکی ہو گئی ہے؛ چنانچہ محبت، مروت، دوستی، رفاقت سبھی ختم ہو گئے ہیں، چنانچہ ادیب تنہائی محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ میں بند ہوتا جاتا ہے۔ میں حیران رہ گئی کہ اتنے بڑے کلمے آدمی نے یہ کیا کھد دیا ہے؟ ہندوستان کے سماج کو یقیناً صنعتی سوسائٹی نہیں کہا جاسکتا! یہاں مشینیں کہاں ہیں؟ پھر جب وہ حالات ہی نہیں تو

سوچنے کا یہ طریقہ کہاں سے آیا؟ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ یورپ ہی کے کچھ ملکوں میں مشینیں اگر انسان کے لیے لعنت ہیں تو کچھ ملکوں میں برکت — جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے فولاد کی بنی تو اور مجاہد کے ہاتھ میں اعلان حق ہے تو ظالم کے ہاتھ میں علامت جبر و استبداد — پس قصور مشینوں کا ہے یا نظاموں کا؟

مجھ سے کئی نوجوان ادیب کہتے ہیں: ”آج کل ہندوستان میں جدوجہد ہی کونسی ہو رہی ہے؟ آزادی کی لڑائی میں منزل صاف تھی، اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ — پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے: ”اگر گورے کی جگہ کالا اور جان کی جگہ گوند بیٹھ جائے، لیکن گورے وہی جو جان کرتا تھا تو اس کے خلاف بھی وہی کرونگا۔ جو جان کے خلاف کرتا“ اور پریم چند کی تخلیقات دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف انگریزی حکومت ہی کے خلاف نہیں تھے، انھوں نے اس چیز پر بھی کاری ضربیں لگانے کی کوشش کی، جسے انھوں نے ”مہاجنی تہذیب“ کا نام دیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں سے پوچھتی ہوں کہ ”انا“ آزادی مل گئی، لیکن کیا آپ آج کے حالات سے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو سوچیے، اس عالم اسباب میں کوئی نتیجہ بغیر سبب کے ظاہر نہیں ہوتا۔ اس لیے سوچیے اور اس سوچ میں پریم چند آپ کا سب سے بڑا رفیق اور سب سے قریبی دوست ثابت ہوگا۔

موضوعات اور نفس مضموں سے متعلق اتنی بات کے بعد اب میں بیان کے متعلق دو ایک باتیں کہنا چاہتی ہوں۔ افسانے کی زبان کے لیے بھی وہی معیار ہونا چاہیے، جو مولانا حالی نے ابن رشيق کے حوالے سے شعر کے لیے قائم کیا تھا۔ یعنی ایسی زبان ہو کہ ہر بڑھنے والا سوچے ایسی تو میں بھی لکھ سکتا ہوں، مگر لکھنے بیٹھے، تو نہ کھ سکے۔ حالی کے اسی معیار کو پریم چند نے کسی قدر مختلف انداز میں یوں لکھا ہے: ”آئینہ دل کی وسعت کے ساتھ زبان طوطی خود سلیس ہوجاتی ہے۔ حسن معنی آلالیش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو امر کا ادیب ہے وہ امر کا طرز بیان اختیار کرتا ہے، جو عوام الناس کا ہے، وہ عوام کی زبان کھیلتا۔“ مگر ان ہندوگوں کی دھندل باتوں سے الگ ایک اور قسم کی بھی زبان آج کل نظر آتی ہے۔

— ابھی ہوئی زبان، جسے ہندی کے ادیب امرت لال ناگر، ”جلیبی اسٹاکس“ کہتے ہیں۔ میری نظر میں اس زبان کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو سیدھی سی دھبہ ہے کہ خیالات میں الجھن ہوگی، تو زبان میں بھی ضرور ہوگی۔ پریم چند نے سیاری زبان کی ایک اور تعریف بھی کی ہے: ”ادیب جس ذہنیت یا زاویے سے کسی امر کو دیکھے، اس میں اس کا پڑھنے والا بھی اُس سے متفق ہو جائے۔“ اس جملے میں ذہنیت اور زاویہ دونوں بڑے اہم لفظ ہیں۔ حالات کے اسباب و علل کا علم حاصل کر کے، کسی نتیجے پر پہنچنے کے زبان و بیان میں مہارت حاصل کرنے کے بعد کسی واقعے یا کردار یا صورت حال کو ادب کی شکل دینا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا پتھر کو مہیقل کر کے آئینہ بنانا۔ اس لیے جب پریم چند ذہنیت اور زاویہ کی بات کرتے ہیں تو گویا وہ ادیب سے اس تمام ریاض کی امید کرتے ہیں جو ذہنیت اور زاویہ بنانے میں صرف ہو کر اُسے ادب کی تابانی بخشی ہے۔ جو ادیب کو شروع کر کے کل بڑا کہلانے کا خواب دیکھتے ہیں، انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ جہاں تک سیوا کا سوال ہے اور خاص کر نغمہیں، وہاں یہ نہیں چل سکتا کہ کاتا اور لے دوڑی! پہلے فکر سلیس ہو، پھر بیان نفیس۔ تب ادب بنیگا۔

پریم چند نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ”افسانے میں جہاں کہیں ایسا موقع آتا ہے، جہاں طبیعت پر زور ڈال کر شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے، تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔“ کیا اس حقیقت سے انکار ہو سکتا ہے کہ ٹپس کی ایک رات، ٹوڑھی کالی تشکر، حکایت قید گاہ، اور کفن ابھی تک ادب و افسانے کے تابندہ شاہکار ہیں، جن میں نثر اور شعریت بڑے کمال کے ساتھ گھل جلی گئی ہے؟

یہ بھی کہیں کہیں سننے میں آتا ہے کہ پریم چند کے یہاں سپاٹ پن ہے۔ اس کی شکایت غالباً انہیں ہوگی جو یا تو سادگی کے حسن کو پوری طرح نہیں سمجھتے، یا سادگی و پُرکاری جن کے بس کا لوگ نہیں ہے، کیونکہ زبان پر انہوں نے ابھی تک اتنا عبور حاصل نہیں کیا بیان پر محنت کو انہوں نے اپنا شیوہ نہیں بنایا۔ زبان پر عبور کا ذکر کرتے ہوئے میں اپنے

پریم چند

فوجان ساتھیوں سے ایک سلسلے میں ہمدردی رکھتی ہوں۔ مجھ سے ایک نو عمر ادیب نے کہا تھا کہ ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اردو ہاتھ سے چھٹ گئی، ہندی آتی نہیں، انگریزی بہر حال بدیسی زبان ہے اور جب ہمارے حوام ابھی ستر فی صدی اپنی زبانوں میں ہی اُن پڑھ رہے ہیں تو انگریزی کو کون کہے۔۔۔ اُس کی یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کو ادیب بننا ہے تو وہ ریاض کرے، ورنہ شعر گفتن چر ضرور۔۔۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال بھی فن تو جیسا کہلائیکا، جب وہ کوئی آڑی لباس پہن لیگا۔ وہ رنگ ہو یا لکیریں، پتھر ہو یا الفاظ! پریم چند نے زبان کو منزل پر پہنچنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ آپ سوچیے کہ راستہ اور بڑا کھارٹ ہو گا، یا ایسا جسے ہر دم ہی کرتا رہے، تو اس کے منزل تک پہنچنے کا سوال ہمیشہ سوال ہی رہیگا!

میں نے جان بوجھ کر اس مضمون میں اپنے اُن ساتھیوں میں سے کسی کا نام نہیں لیا، جن کے یہاں مجھے یہ رجحانات نظر آتے ہیں۔ جو نہ کہ فی الحال اپنی ذات وغیرہ اُن کے لیے بڑی اہم ہے، اس لیے خطرہ ہے کہ کہیں وہ مجھے اپنے ایک خیر خواہ دوست کے بجائے ناصح نہ سمجھ بیٹھیں! ناصح تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا، پھر ان کو کیوں لگے! البتہ وہ یہ سمجھے رہیں کہ جن صحرا میں انھوں نے قدم رکھا ہے، اُس میں پریم چند ایسے دیوانوں کے نقش پا بھی موجود ہیں!



عوام سے دھوکا

مزدور کے پرچوں ماپ تول میا
 اگر ایک فیصدی کی بھی غلطی ہو تو پرمان
 عوام کے ساتھ ۱۰۰ کروڑ روپیہ کا
 دھوکا ہوتا ہے۔
 آپ اس سے بچ سکتے ہیں۔
 سرکاری نشان والے ماپ تول کے
 میسج پیازوں سے سامان خریدیے۔
 غلط ماپ تول کی شکایت اپنے علاقہ
 کے انسپکٹر ماپ تول سے کیجئے۔
 ماپ تول کے اعتداری پیمانے
 گاہک کی حفاظت کرتے ہیں۔

وفیات

عادل رشید - سید محمد منظور الحق

دارغ کے مشہور شاکر و نوح ناروی کا ایک شعر ہے :

چڑھیں ریل پر اور پہنیں سسرا تھو

سرا تھو سے تو میل دکھن ہے نار

یہ جغرافیہ اور محل وقوع انہیں اس لیے بتانا پڑا کہ ایک صاحب نے ان سے پوچھا تھا کہ حضرت! یہ نارا کہاں ہے، جس کی نسبت سے آپ ناروی کہلاتے ہیں۔ نوح ٹھہرے شاعر اور شاعر بھی ایسے کہ شعرا کی کجیہ کلام تمام انہوں نے جواب میں یہ شعر کہ دیا۔ سائل کی تسلی ہو گئی۔ خدا کرے کہ آپ کی بھی ہو جائے اور آپ مجھ سے یہ نہ پوچھنے لگیں کہ ہم کو نئے اسٹیشن سے ریل پر چڑھیں؟ اور سسرا تھو کہاں ہے؟ میں شاعر نہیں ہوں اور نوح صاحب بھی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ کو اللہ کو پیارے ہو گئے، ورنہ کہتا مان سے پوچھیے۔

تو ان کا یہ فقہ اس سے یاد آیا کہ عادل رشید بھی ۲۰ نومبر ۱۹۶۲ کو اسی نارا میں پیدا ہوئے یہاں ان کی نا اخیال تھی۔ ان کے نا ملا جی یہاں کے بہت بڑے پیر تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے میں تو ان کے نانا آبا ترک دنیا کر چکے تھے۔ اور ان کے بیٹے میڈ شاہ حمام الدین احمد عادل کے ماموں، مسند سجادگی پر رونق افروز تھے۔

وفیات

عادل رشید کا اصلی نام محمد منظور الحق تھا۔ ان کے والد سید شاہ محمد فضل الحق خلع الہ آباد کی تحصیل سرانہو کے قصبہ رشید مئی کے جاگیردار تھے۔ یہ جاگیر انھیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی، جہاں وہ اپنے آبائی مکان کٹرا انچپور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ بزرگوں میں قضاء اور طبابت پشتوں تک رہی تھی۔ چنانچہ عادل رشید کے پردادا اور پردادا سید شاہ محمد عبدالحق بھی اس علاقے کے نامہ ہوئے حکیم تھے۔ دادا نے ان کے پیدا ہونے ہی اعلان کر دیا کہ میں اپنے پوتے کو طب کی تعلیم دے گا اور حکیم بناؤں گا۔ لیکن قدرت کو منظور نہیں تھا۔ دادا ابا کا سال بھر بعد ۱۹۲۱ء میں انتقال ہو گیا۔ والد شاہ محمد فضل الحق کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، انھیں اپنی کیتی باڑی کے علاوہ صرف انھیں چیزوں سے دلچسپی تھی، جن سے اس عہد کے دوسرے جاگیرداروں کو دلچسپی تھی اور اس میں کئی طرح کی بازیاں شامل تھیں۔ اس کے برعکس ان کی والدہ ماجدہ (امتہ الفاطمہ) پڑھنے لکھنے اور علم و ادب کا ذوق اپنے میکے سے ساتھ لائی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی تھنا تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ادیب اور مصنف بنے۔ ان کی تھنا اور دھالپوری ہوئی۔ لیکن افسوس کہ وہ اسے دیکھنے کو زندہ نہ رہیں۔ عادل صرف آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں ان کی والدہ رحلت کر گئیں۔ اس زمانے میں خاندان کا سپرد میں رہتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں کانپور میں زوروں کا فساد ہوا تھا۔ شاہ محمد فضل الحق اس سے ڈر گئے۔ انھوں نے مستقبل کے موموں خطروں سے بچنے کے لیے کانپور سے نقل مکان کر الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی وہاں ان کے رشتے دار اپنے محلے دائرہ شاہ رفیع الزماں (حکیم بادشاہ) کے گویا مالک تھے محلے میں رفیع الزماں لائبریری نام کا ایک دارالمطالعہ تھا جس میں ملک بھر کے مشہور رسالے اور جرائد آتے تھے۔ عادل نے اگرچہ علم و ادب کا ذوق اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا، لیکن اس ذوق پر جلا نہیں ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے اس لائبریری میں جلتے اور یہاں رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ اسی سے بڑھ کر انھیں خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا سب سے پہلا افادہ "قرض" کے عنوان سے کانپور کے رسالے مستورات کے خاص نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔

اس افادے تک وہ سید محمد منظور الحق عادل رشید میٹروی تھے۔ عادل تخلص اور رشید میٹروی وطن سے نسبت ادنیٰ طلبست۔ لیکن بعد کو دیکھا کہ نسبت کبھی رشید میٹروی چھپ جاتی ہے کبھی

رشید میٹھی، تو انہوں نے اسے بکیرا ڈاربا، جس سے وہ عادل رشید بن گئے۔ بعد کے زمانے میں وہ اس نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ آج شاید ہی کوئی ان کا صحیح نام محمد منظور الحق جانتا ہو۔ شروع میں وہ بہت دن تک نعت اور قوالی لکھتے رہے۔ اس زمانے میں ان کے چند گانوں کے ہزار سٹرس وائس کمپنی نے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کیے تھے۔

۱۹۳۵ء میں وہ والد کے سلوک سے جنھوں نے دوسری شادی کر لی تھی، تنگ آکر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ حال آنکہ وہ اس زمانے میں اسلام آباد کالج میں زیر تعلیم تھے اور اس کی تکمیل کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ وہ پہلے بریلی گئے۔ یہاں سے اس زمانے میں ایک ماہنامہ شاہد شائع ہوتا تھا۔ ساحر قدوائی (مال ڈاکٹر ساحر بریلوی، لائل پور، مغربی پاکستان)، اس کے مالک اور مدیر تھے۔ عادل صاحب اس رسالے میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ساحر صاحب اس رسالے کو ساتھ لے کر دلی آئے، تو عادل بھی ان کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ وہ یہاں تین برس رہے۔ اس زمانے میں وہ یہاں کے ہفتہ وار پرچے جمیل کے بھی مدیر رہے۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۴۰ء میں قسمت آزمائی کرنے کو بھٹی کی راہ لی۔ ادھر ساحر نے دیکھا کہ وہ اکیلے شاہد کو نہیں چلا سکتے۔ انھوں نے پرچہ عادل کے سپرد کر دیا اور خود واپس بریلی چلے گئے۔ عادل بھٹی پہنچے تو انھوں نے اسے ہفتہ وار کر دیا اور وہیں سے شائع کرنے لگے۔

بھٹی بڑا نادر شہر ہے اگر کسی شخص کو دنیا کا نام کا خاص فن نہیں آتا، تو اس کے لیے بھٹی میں کامیابی حاصل کرنا محال نہیں، تو بہت مشکل ضرور ہے۔ عادل بھی اس فن سے نااہل تھے۔ لہذا انھیں بھی ہر طرح کی مشکلات سے گزرنا پڑا، جن میں خاتے اور رات کو بازاریک ٹری پر سونا بھی شامل ہے۔ یہاں بھٹی میں ایک صاحب تھے سلطان حسین۔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن کتابیں چھاپنے اور ان کے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ (سلطانی پریس) تھا، اس کے علاوہ لکھڑی کابیو پارسی تھا۔ غرض بہت کامیاب تاجر تھے۔ عادل کی ان سے دوستی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ تجارت میں ان کے شریک بن گئے۔ انھوں نے شاہد بھی سلطان حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس زمانے میں شاہد کا دفتر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کامرکز بن گیا۔ بھٹی کے جتنے ادیب اور شاعر تھے، وہ عادل کے دوست اور شاہد کے دفتر کے مستقل حاضر باش تھے۔ سلطان حسین بھی عادل کو بہت اُنتے

تھے، چنانچہ ان کی وساطت سے پہلے مصنفوں کو سلطان حسین صاحب سے مالی مدد ملی، مادل نے خود بھی کسی زمانے میں ایک انجمن صداقت پسند مصنفین قائم کی تھی۔ وہ اس کے صدر تھے، حیات وارثی اس کے سکتر تھے۔

لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن ہوا۔ خدا معلوم کس نے سلطان حسین کے خلاف رضا کاروں کی امداد کرنے کا اتہام لگایا۔ بس پھر کیا تھا، سلطان حسین مگر قاتر کر لیے گئے۔ تین دن حالات میں رہے۔ آخر کار کرشن چندر اور عادل رشید انہیں ضمانت پر رہا کر لائے۔ تعینش پر الزام غلط ثابت ہوا۔ اور وہ بقیہ صور قرار پائے۔ لیکن اس تین دن کی حالات نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔ وہ اسے اپنی انتہائی توہین اور ذلت تصور کرتے تھے۔ یہی کاسار کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اچھے چلے گئے۔

سلطان حسین کے بھئی سے جانے کے ساتھ ہی عادل رشید کا ادبار بھی شروع ہوا۔ ان کا اپنا ہانہ پریم نجات اور اشتہاری کہنی جو انہوں نے کسی زمانے میں چلائی تھی، وہ پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اب شاہ بھی بند ہو گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا عزیز ترین دوست ان سے پھڑ گیا۔ ان کے بچلے دل کے تمام دوست ہٹھ دکھا گئے اور کسی نے جھوٹوں بھی ان سے نہ پوچھا کہ بھائی بھوس حال میں ہو۔ نوبت فاقوں تک پہنچی۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمت مردانہ پر کہ وہ ان انتہائی مخالفت حالات میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہوئے۔

اب انہوں نے قلم کا سہارا لیا۔ ان کے ناول مینہ کی طرح برسے لگے۔ ہر مہینے نیا ناول کسی مہینے دو دو بھی، چھپنے لگے۔ ان کے کم و بیش ڈیڑھ سو ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ وہ آخر تک اپنے قلم کی کمائی کے سہارے عزت آبرو سے جیے۔

صحت بالعموم اچھی رہی، لیکن آخر کار متواتر کثرت کا لے پانا آخر دکھایا، کبھی کبھی بیمار بھی ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کی کچھ شکایت محسوس کی، تو علاج کے لیے نانا دی اسپتال (دہلی) میں چلے گئے۔ وہیں پیر کے دن ۳ جنوری ۱۹۷۲ء صبح کے ساڑھے تین بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا اور اسی شام جو محلہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

وفیات

مادل نے ۱۹۴۱ء میں مدرا بیگم سے شادی کی تھی۔ مدرا، مسلمان الارشد، حال مدیر ماہنامہ اشباع، کراچی، کی سھو سپی زاد بہن ہیں۔ ارشد تھانوی ان کے ماموں تھے؛ شوکت تھانوی بھی رشتے میں ماموں ہوتے تھے۔ اس نیک بیوی نے عادل کا ہر حال میں ساتھ دیا۔ ان کے چھ بچے ہیں، چار بیٹیاں (ناہید اور نسیم اور نسریں اور شاہینہ تنویر) اور دو بیٹے (جاوید اور گلریز)۔

بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم

ان کا خاندان دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ہجرت کر کے دکن میں جا بیٹے تھے۔ بشیر کے والد مولوی عبدالرحمن ریاست حیدر آباد دکن کے محکمہ سیاسیات میں مدکارا سسٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے؛ اور والدہ شمس النساء بیگم، میرزا صادق علی بیگ تعلقدار کی سبھا بھتیجی تھیں۔ ماموں نے سبھا بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی۔ وہ خود اپنی طہریتی، فیاضی اور درویشانہ صفات کے لیے مشہور تھے۔ شمس النساء بیگم نے جو اس ماحول میں تربیت پائی، تو یہی خصوصیات ان کے کردار کا بھی جزو بن گئیں۔ وہ بہت اچھی خوشنویس تھیں اور خطابت میں بھی ان کا شہرہ تھا۔

بشیر ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم سراسر نجی طور پر ہوئی۔ فارسی کی تحصیل بہت حد تک اعلیٰ درجے کی تھی۔ عربی میں قرآن بامعنی، تفسیر کے ساتھ پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی شعرا کا وافر کلام تعلیم کے دوران میں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ چونکہ حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا، اس لیے اس کا بشیر حقہ یاد میں محفوظ ہو گیا؛ اور پھر اسی سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ جلد ہی کلام دہی کے رسائل عصمت، ساقی وغیرہ میں چھپنے لگا۔ شاہر دکن نے بھی ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ وہاں کے زمانہ رسائل شہاب، ناہید وغیرہ نے ان کی پذیرائی کی۔ نفاست طبع کے ساتھ شعر و سخن کے اس شغف کے باعث خواجہ حسن نظامی مرحوم (د جولائی ۱۹۵۵ء) نے انھیں چن آرا کا خطاب عطا کیا تھا۔

شروع میں مہاراجہ کشن پرشاد (د ۱۹۴۱ء) کے دیباری شاعر صادق حسین خبار سے مشورہ رہا

وفیات

نے سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کا دلکش اور خوبصورت تعویذ تیار کر لیا ہے۔
بہت لوگوں نے تاریخ وفات کہنی حکیم محمد خواجہ شفیع حسن عارف (ابوالعلائی آفائی) کے
خطے کا آخری شعر ہے:

نما آئی رضوان سے، عارف، یہی
کہ کہہ دو: ٹھکانہ ہے خلد بریں
(۱۳۹۲)

جی اظمی

ان کا آبائی وطن قصبہ بہاراج گنج (ضلع اعظم گڑھ) تھا۔ جہاں وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً
۱۹۱۹ء میں انھوں نے مقامی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی کی
تعلیم اپنے والد مولوی ضیا اللہ سے پائی۔ مولوی صاحب موصوف پرنے طرز کے مدرس اردو
اردو اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی
تھی۔ یحییٰ صاحب نے ان کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا۔ بلکہ جب زمانہ تعلیم کے دوران ہی میں
انھیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو کلام بھی والد ہی کو دکھایا۔ انھوں نے حوصلہ افزائی بھی کی
اور کلام پر اصلاح بھی دی۔

۱۹۲۰ء میں ہماری سیاسی تحریک نے نیا موڑ لیا تھا۔ خلافت تحریک بھی اپنے پورے شباب
پر تھی۔ نوجوان یحییٰ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ دراصل ان کی قومی اور ملی شاعری کا منبع یہی
سیاسی تحریکیں ثابت ہوئیں۔

جون ۱۹۲۵ء میں بعض احباب اور بزرگوں کی وساطت سے وہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے
دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق انھوں نے عمر بھر نباہا۔ یہیں کے قیام کے دوران میں انھوں
نے پرائیویٹ طور پر دوسروں کے درجے کا انگریزی امتحان بھی پاس کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی
باقاعدہ تعلیم کسی درگاہ کی مرہون منت نہیں تھی۔ اپنے وطن کے مڈل اسکول کا تعلق بھی
برائے نام رہا۔ جیسا کہ خود اس خط نے ایک مرتبہ بتایا تھا، انھوں نے جو کچھ بھی پایا، گھس کر
تعلیم سے اردو فارسی کا ذوق ذاتی مطالعے اور فاضل بزرگوں اور شفیعوں کے فیض صحبت

اور حسنِ قرابت کا قیمہ تھا۔

دارالمصنفین میں انھیں جو فضا میسر آئی، یہ سراسر علمی اور ادبی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (د ف ۱۹۵۳ء) کی صحبت میں ان کے جذبہ شعر گوئی نے بہت ترقی کی، اب وہ برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ غالباً ان کی سب سے پہلی نظم جو معارف میں شائع ہوئی، وہ غازی نادر شاہ مرحوم دہلی افغانستان کے حادثہ قتل (۸ نومبر ۱۹۳۲ء) سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ یہ خطاب بملتِ افغان کے عنوان سے معارف کے دسمبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شامل ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ افغانستان کے مشہور ہندوستان دوست شاعر سرور خان گویا لے کیا تھا، جو ان کے اپنے جواب کے ساتھ وہاں کے رسالے کا بل کی اشاعت ۶ جنوری ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ یہ بھی اعلیٰ نے پھر اس کا جواب فارسی میں لکھا، جو معارف کی اشاعت مارچ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے باعث وہ قوم پرورد طبقہ میں نہ صرف متعارف تھے، بلکہ غلام مقبول تھے۔ چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (د ف مئی ۱۹۹۹ء) کے ایسا پر "نوائے حیات" کے عنوان سے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے شروع میں مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

کلام کا دوسرا مجموعہ نوائے عمر بھی جنوری ۱۹۴۷ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ پیش لفظ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ہے۔

یہ بھی اعلیٰ مرحوم شبلی اسکول کے شاعر تھے اور ان کے ذوقِ شعری کی تربیت میں اقبال احمد سہیل کا بہت ہاتھ تھا۔ شبلی (د ف نومبر ۱۹۱۴ء) اور سہیل (د ف نومبر ۱۹۵۵ء) کا جتنا کامیاب تعلق انھوں نے کیا ہے، وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ ان کے دونوں مجموعے اس دعوے پر شاہد مادل ہیں۔ انھوں نے رجالِ مصر سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں اور ان میں کلام کا جو شکوہ ہے، اس سے ان کی قدردان زبان، فارسی میں دلک، فن کی مہارت ایک ایک مصرعے سے نمایاں ہے۔

شاعر کے علاوہ وہ ذاتی طور پر بھی بہت اچھے انسان تھے، درویش صفت اور نیکسرمطبع اور قناعت کا مجسمہ۔ دارالمصنفین کی نوکری سے جو تنخواہ انھیں ملتی تھی۔ وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو بھی

وفیات

بھصل ہی کفایت کرتی ہوگی۔ لیکن اللہ کے اس نیک بندے نے صبر و شکر سے اس میں سادی زندگی بسر کر دی۔

انہیں کچھ عرصے سے جگر کی خرابی اور فشارِ دم کا عارضہ لاحق تھا۔ آخر میں صبرِ بول کے دہلے پڑنے لگے۔ اسی میں کوئی دو ہفتے کی طالت کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء چار بجے شام رحلت کی۔ تدفین اگلے دن ۲۳ فروری صبح کے دس بجے ہوئی۔ نماز جنازہ حکیم محمد سمان صاحب نے پڑھائی اور اعظم گڑھ شہر کے قبرستان میں دفن ہوئے، اپنے پیچھے جسمانی اولاد میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑے۔

ناصر کاظمی، ناصر رضا

اگرچہ کچھ موردِ فانی زمینداری بھی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے خاندان میں سپاہبری اور فوج کی لازمت پشتوں سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ ان کے والد محمد سلطان بھی فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ بزرگوں کا وطن انبالہ شہر تھا۔ اور یہیں ناصر صاحب ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایف اے تک پائی۔ دسویں درجے تک اپنے وطن میں اور انٹر اسلامیہ کالج لاہور میں۔ بی اے میں تعلیم پار ہے تھے کہ بوجہ امتحان دینے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ چھاڑ، واپس انبالہ چلے گئے۔ یہاں دو ڈھائی سال گھر کی زمینداری کا کام دیکھتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں پھر لاہور چلے گئے اور اس کے بعد اسی شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ اولاً چند سے ایک نیم سرکاری دفتر میں نوکری کی تھی۔ لیکن ان کا مزاج ادبی تھا۔ یہاں دل کیسے لگتا! چنانچہ سال بھر بعد اوراقِ نو، ماہنامے کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ تین برس تک یہاں کام کیا اور ۱۹۵۲ء میں مشہور رسالے ہالیوں کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ وہ آخر تک یہیں رہے۔

انہوں نے شاعری طالبِ علمی کے زمانے میں شروع کی تھی۔ اس دہائی میں ان پر میراورد فانی کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب دوسرا دور شروع ہوا، تو وہ فانی کے جینگل سے آزاد ہو گئے اور ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ انہوں نے غزل میں وہ رنگ اختیار کیا، جو مسلسل غزل اور نظم سے قریب تر تھا۔ اب خیالات میں جینگل آگئی تھی۔ یہی اسلوب آخر تک قائم رہا۔ وہ میر کے کامیاب

وفیات

متبع کہے جاسکتے ہیں۔ وہی جذباتی دھیما پن اور کسک اور سپردگی کا لہجہ اور انداز جو میر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکال لی تھی۔ میر کے علاوہ ان پر ہندی شاعری بالخصوص دوہے کا بھی نمایاں اثر تھا۔

ان کے کلام کا انتخاب 'برگ' نے، کے عنوان سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ابتدائی زمانے کے چند شعروں کے علاوہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۲ء کا کلام لیا تھا۔ جب کتاب دوسری مرتبہ (۱۹۵۷ء میں) شائع ہوئی، تو اس میں ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۷ء کا انتخاب بھی اضافہ کر دیا گیا۔

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا، اودان کے ساتھ اردو کا ایک پختہ کار، روایت کا پابند، و شعاری کا دلدادہ شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔

آدمی کس کے سہارے زندہ ہے.....؟

زندہ رہنے کے لیے صرف روٹی ہی کافی نہیں۔ پیارا اور باہمی سُوجھ بوجھ بھی ضروری ہے۔ زندگی سے احساسات اور خوبصورتی کا بھی اتنا ہی گہرا تعلق ہے، جتنا کہ روٹی کا۔ جیسا ایک فن ہے اور منصوبہ بندی اس کی بنیاد۔ جب ہم دوسرے معاملات میں منصوبہ بندی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں تو کنبہ کو محدود رکھنے کے لیے بھی اس کا سہارا کیوں نہ لیں۔

زندگی میں پیارا تعاون، باہمی سُوجھ بوجھ کے لیے اپنائیے.....

خاندانی منصوبہ بندی



بچے ہم پر امید لگائے ہوئے ہیں

ہاں۔ بیرونی کامیابی رکھنا چاہئے۔

اسکی ہر شے اسکی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ہم یہ ہی ہے۔ اپنی
فرک نہ ہے کہڑے سادہ بھی تعلیم کا حق ہے۔ لڑا ہو کر انہیں اچھا استاد
بھی ملنا چاہئے۔ لیکن اگر بچے زیادہ ہوں تو کیا ہم ان کی تمام ضروریات
پوری کر سکتے ہیں؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔۔۔۔۔ چھوڑ گئے۔ کتبہ جتنا
پھڑا ہوگا اتنا ہی ہرجے کو زیادہ پیلوں سکے گا۔

مفت مشورہ اور خدمت کے لئے فیملی ویلفیئر ٹنگ سوسائٹی
تفصیل دے گئے۔

تعمیر

علمی مجلسِ دہلی کا تہائی رسالہ

جلد ۶	مرتب: مالک رام	شمارہ ۳
۶۱۹۷۲		
مالک رام	ملاحظات	۲
پروفیسر نذیر احمد، مدرسہ شعبہ فارسی	مارا الا فاضل کی ترتیب نو پر ایک نظر	۳
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	ناگپور کے اخبار و رسائل	۷۷
سید محمد شرف الدین ساحل، ناگپور	نقد و نظر	۱۰۳
ماہد رضا بیار	وفیات	۱۰۷
مالک رام		
چندہ سالانہ (مع محصول رجسٹری ڈاک) ۱۵ روپے	اس شمارے کی قیمت	
غیر ملک: ۲/۱ پونڈ انگریزی یا ۷ ڈالر امریکی	۵ روپے	

پرنٹر و پبلشر نخل جاس جاسی نے کوہ فوڈ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر
دفتر طبعی مجلس ۴۲۹ چھتہ نواب صاحب فراشناہ دہلی ۶ سے شائع کیا۔

ملاحظات

ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس سال 'تحریر' کی اشاعت ہماری تمام خواہشوں کے باوجود بہت بپاۓ رہی۔

یہ ۱۹۷۲ء کا تیسرا شمارہ ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ سال کا آخری شمارہ خواجہ غلام السیدین مرحوم سے مخصوص کیا جائے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس کے مضامین کی کتابت بروقت مکمل نہیں ہو سکیگی۔ اس لیے فی الحال یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ بعد کو دیکھا جائیگا۔

۱۹۷۳ء کا پہلا شمارہ اردو کے مشہور شاعر اور بزرگ ادیب حضرت جوش ملیح آبادی سے مخصوص ہوگا، اور ہمیں قوی توقع ہے کہ اسی کے ساتھ تحریر کی اشاعت بھی معمول کے مطابق آجائے گی۔

حکیم

مدار الافاضل کی ترتیب نو پڑ ایک نظر

مدار الافاضل فارسی زبان کی اہم لغت ہے جس کو فیضی سرہندہ نے اکبری مہد کے اوائل یعنی ۱۰۰۱ھ میں مرتب کیا اس فرہنگ کے اہم خصائص میں سے یہ بات ہے کہ مولف نے اس کی ترتیب میں صحت کتبوں سے مواد اخذ کیا ہے اکثر ان کے نام درج کر دیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں اس میں شعر کے کلام سے اکثر استشہاد ہوا ہے، مگر بسا اوقات شاعر کا نام ظہور نہیں ہو سکا ہے، بعض مقامات پر تاریخی کتابوں کے حوالے سے بھی واقعات درج ہوئے ہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر قدیم فرہنگوں میں سوائے چند کے کوئی فرہنگ اتنی اہم نہیں ہے۔ حال ہی میں پروفیسر محمد باقر، پرنسپل اورنٹل کالج، لاہور کے اقتباس اس فرہنگ کے تین مجلدات شائع ہوئے ہیں۔ یہی مطبوعہ نسخہ ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔

موصوف نے اس فرہنگ کی تعمیر و ترتیب میں ایک مدعا صرف کی ہے۔ انھوں نے اس کے مندرجہ نسخے جمع کیے اور ان کے مقابلے و مقابلے میں بڑی کاوش کی۔ اگرچہ حاشیے میں کہیں کہیں اختلاف نسخ بھی نظر آتے ہیں، لیکن یہ زیادہ نہیں۔ یہ اختلافات کثیر تعداد میں لے ہوئے، اس بنا پر ان کے اندراج سے صرف نظر ہوا۔ بعض اوقات قدیم فرہنگوں کے حوالے سے حاشیے میں مطالب درج ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے متن کی تعمیر میں مدد کم لی گئی ہے؛ مرتب کی تو بہ اکثر ایسے معانی کی طرف رہی ہے، جو مدار الافاضل میں درج ہونے سے رہ گئے تھے۔ اگرچہ یہ بھی ایک سود مند کام ہے، لیکن متن کی تعمیر میں ان سے استفادہ مقدم تھا۔ بہر حال دور جدید میں تعمیر و ترمیم کا ایک معیار یہ ہے کہ جس طرح کسی متن کے تمام اہم نسخوں کی فراہمی ضروری ہے۔ بالکل

دارالافتاء کی ترقیب و نمو

اسی طرح جن مآخذوں سے کسی متن میں مندرجات و مطالب درج ہوئے۔ ان کا فہم کرنا امدادی کی مدد سے متن کی اصلاح بھی لازمی ہے۔ اکثر ایسے مسئلے جو براہ راست اخذ سے حل نہیں ہو سکتے۔ محض انھیں ضمنی اور ثانوی مآخذ کی مدد سے حل ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر تحریر کی ضرورت سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ لغت کی اکثر کتابوں میں عموماً دارالافتاء میں خصوصاً حوالے نہایت کثرت سے ملتے ہیں۔ اس بنا پر حوالے کی ساری کتابوں سے استفادہ وقت طلب ہے، لیکن ہے سید ضروری۔ دراصل مدار کی موجودہ ترقیب میں اس میں ضرورت کی طرف جتنی توجہ لازم تھی، اتنی نہیں ہوئی۔ اس بنا پر متن کتاب جتنا دقیق، ناقدانہ اور معیاری ہونا چاہیے تھا، اتنا نہیں ہو سکا۔ راقم حروف نے محولہ کتابوں کے مندرجات سے بعض جگہ مقابلہ کیا، تو موجودہ متن کی بعض خامیاں سامنے آئیں، جن کی طرف قارئین کی توجہ لازم بذکر ہونا چاہیے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ تحریر ہوا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اصل متن کے بارے میں کچھ لکھا جائے، معجم کے تحریر کردہ دیباچے کے سلسلے میں چند ضروری باتیں درج کر لے گی ہیں۔ ۱۴ صفحے کے دیباچے میں بعض غلطیاں ہو گئی ہیں، پہلے ان کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جا رہا ہے:

ص: ج: مہذب الاسماء: مولف: آں محمود بن عربیہ محمود بن منصور القاضی افرنجی السجری
اسف۔

مولف کی آفری دو نسبتیں یعنی افرنجی اور السجری غلط ہیں۔ افرنجی میں ال، کا حذف ممکن نہ تھا اس لیے کہ اس کے پہلے اور بعد کی دونوں نسبتوں میں یہ علامت موجود ہے۔ مہذب الاسماء کے دیباچے میں افرنجی الزنجی کی شکل میں آیا ہے (مقدمہ لغت نامہ: ۲۰۲)، لیکن مرحوم آفے دھما لے الزنجی کو الزنجی کی تصحیف قرار دیا ہے۔ زنجی سمرقند کے اطراف میں ایک قدیم قصبہ تھا۔ بہر حال الزنجی دراصل ہوا الزنجی، افرنجی تو بہر حال غلط ہے۔ اسی طرح السجری بھی غلط ہے۔ السجری ہونا چاہیے۔ دراصل سجری، بھستان یا سیستان کے رہنے والے کو کہتے ہیں، لیکن دم واقیصہ کی بنا پر ہندوستان میں یا سب سے تصحیف خوانی سے سجری میں تبدیل ہو گئی۔ حضرت ۱۔ بار غلطی کے بیان کے مطابق سمرقند سے غلاما بلنے والی مرکز پر قصبہ زان سے پانچ چھ فرسخ کی دوری پر زنجی واقع تھا۔ بار غلامی میری میں غلام شاہ اول سلطان کے زمانے میں یہ قصبہ آباد ہو گیا۔ (پاکستان ۹۷۰)

خواجہ معین الدین چشتی یا میری بھری کی غلط نسبت سے اس درجہ مشہور ہوئے کہ ظاہراً قبال صحابہ نے حضرت داماد گنج بخش لاہوری کو اشتباہاً پیر پیر لکھ دیا ہے۔ حال ہی میں دائرہ خدو کو قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کی کتابت حضرت خواجہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ غائر مطالعہ سے واضح ہوا کہ قرآن کے آخر میں کسی جعلی قلم سے معین الدین چشتی سفری لکھا ہوا ہے۔ ملاوہ اور اہم قرینوں کے یہ غلط نسبت ہی اس نسخے کی اہمیت کم کر دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ سفری کی نسبت جو ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے درج کی ہے، کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

ص ۳ : تاج المعاد : مؤلف آن ابو جعفر احمد بن علی المقرئ البیہقی است؛

مؤلف کی نسبت المقرئ جو ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے درج کی ہے، یہ غلط ہے۔ صحیح المقرئ ہے۔ تاج المعاد کے دیباچے میں اس کا نام اس طرح آیا ہے؛

الشیخ الامام الزائد ابو جعفر احمد بن علی المقرئ البیہقی۔

علم قرأت سے اس کی دلچسپی کا حال یا قوت کے حسب ذیل بیان سے ہوتا ہے، جو سمعانی کے حوالے سے آیا ہے؛

وی در قرأت و نحو و لغت و تفسیر امام بود۔ تصنیف دے در بلاد محس

شد۔ دانشمندان برای استفادہ بخاند وی می آمدند و او جز در اوقات نماز

کہ مسجد میں نہ۔ بجائی تعمیرت، و در سلخ رمضان ۵۴۴ درگذشت۔

ص ۵ : نصاب الصبیان لغت نامہ منقول عربی بغدادی تالیف ابو نصر فارابی مسعود۔

نصاب الصبیان کا مؤلف ابو نصر فارابی ہے، نہ فارابی۔ ابو نصر محمد فارابی مشہور فلسفی گزرا ہے؛

اس کی تاریخ وفات ۳۴۹ ہے۔ فارابی کا پورا نام ابو نصر محمد بن علی بن محمد (یا مسعود) فارابی بھری

ہے۔ وہ ۹۷۰ ہجری کے بعد فوت ہوا۔ گویا دونوں کے فاصلوں میں کچھ کم ہیں سو سال کا فرق ہے۔

روزنہ المعصفا، حبیب السیر اور بعض دوسری تاحیوں میں نصاب الصبیان کے مؤلف کے سلسلے میں

۲۔ سید مجیر مصطفیٰ ام مرتبہ امیر سحر را حرم (اسرار خودی)

۳۔ ایضاً

۳۔ مقدمہ لغت نامہ ۲۷۹

علامہ الافاضل کی ترقیب نو

ایک اور التباس بھی پایا جاتا ہے۔ البوصرفراہی کا ایک ہم وطن اور ہم عصر امام شرف الدین احمد فراہی ملک الکلام تھا۔ وہ یمن الدولہ بہرام شاہ بادشاہ نمرود (۶۱۲-۶۱۸) کا صاحب تھا۔ متذکرہ العدد کتابوں میں لصاب الصبیان شرف الدین کی بلک قرار دی گئی ہے، جو مراۃ غلط ہے۔ بہر حال جس طرح قدیم زمانے میں لصاب الصبیان کے مؤلف کے بارے میں التباس رہا ہے، آج بھی اسی قسم کا التباس ڈاکٹر باقر صاحب کی تحریر میں پایا جاتا ہے۔

ص ۷: تاریخ تالیف مؤید الفضلا: ۹۲۵ھ

یہ تاریخ بلا غمین نے درج کی ہے۔ لیکن خود مؤید (۱: ۱۵۹) میں اکبر بادشاہ کا ذکر ہے جو سلطان جلال الدین محمد اکبر کے علاوہ کوئی بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب ۹۶۳ ہجری کے بعد لکھی گئی ہے۔ ۹۲۵ ہجری صرف اس صورت میں تاریخ تالیف قیاس کی جاسکتی ہے، جب اکبر سے متعلق بیان غلط ہو، لیکن بحالت موجودہ اس کی کوئی صورت نہیں اس سے واضح ہے کہ ۹۲۵ ہجری جو مؤید الفضلا کی تاریخ درج ہوئی، غلط ہے۔

ص ۷: درین لغت (مؤید الفضلا) معانی کلیہ لغات و عبارات ہننامہ و

نظم نظامی و شش قطعا (اشعار سنائی و دیوانی خاقانی و لغوی ظہیر

۵۔ فراہ کا باشندہ اسی لیے فراہی کہلا تا ہے۔ مگر لغت نامہ و نغداد (الوسعید۔ اثبات)

ص ۹۰۷ میں فراہ کے بجائے فرو لکھا ہے اس صراحت کے ساتھ کہ اس میں الفا زیادہ ہے۔ مگر

یہ خیال غلط ہے۔ باب الالباب، طبقات نامری وغیرہ میں قصص کا نام فراہ ہی ہے۔ البوصرفراہی

اد شرف الدین فراہی کے سلسلے میں دیکھیے: باب الالباب (تعلیقات ۶۱۲-۶۱۳) لغت نامہ و نغداد

(مقدمہ ۲۹۳)؛ ایضاً (الوسعید۔ اثبات) ۹۰۷؛ نیز دیکھیے طبقات نامری (۱: ۲۸۲)

۶۔ و فقیر گوید کہ این لغت را از مجموعی کہ در دین خود فاضل بود و آرد شیر نام داشت و

در عهد محمد اکبر بادشاہ از کمران بہندوستان آمدہ بود، تحقیق نمود الخ

دارالافتاح میں ترتیب نو

عہری و حافظ و سلمان و سعدی و غیر ہم شرح دادہ شدہ است،

یہ جملہ دارالافتاح کے حسب ذیل بیان سے مستفاد ہے :

چنانچہ مولف (مؤلف مؤید الفضل) در تعریف ان کتاب گفتہ کہ این نسخہ کافی و شافی است برای خواندن و سبق گفتن شاہنامہ فردوسی طوسی و نمسہ خواجہ نظامی و رستہ سنائی و دوا وین خاقانی و انوری و طہیر و عہری و حافظ و سلمان و سعدی و خسرو و جز ان۔

دارالافتاح کا یہ بیان مؤید الفضل کے بیان سے سرموتفاوت نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر باقر کا بیان اپنے آخذ سے باعتبار ذیل مختلف ہے :

۱۔ دار میں یہ نہیں لکھا ہے کہ مؤید الفضل میں شاہنامہ، نمسہ نظامی، اشعار سنائی وغیرہ کے سارے لغات اور عبارات کی شرح کی گئی ہے۔ اس کے برعکس اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مؤید الفضل کی تالیف سے ان کتابوں کا مطالعہ آسانی سے ہو سکیگا۔

۲۔ شش قطعہ از اشعار سنائی، رستہ سنائی کی غلط توجیہ ہے۔ رستہ سنائی در اصل سنائی غزنوی کی حسب ذیل چھ منظموں کے مجموعے کا نام ہے، حدیقہ الحقیقہ طریقیہ التحقیق، سیر العباد، کارنامہ بلخ، عقل نامہ اور عشق نامہ۔ ڈاکٹر باقر صاحب نے درجہ نامے کیونکہ انہیں شش قطعہ سے تعبیر کر لیا۔

ص ۳: کرد انشا صید بد قینتہ الفتیاں کہ بہت

در لغت نزدیک اہل فضل گنج شایگان

پہلا مصرع و نل سے خارج ہے، قینتہ کے قبل لفظ 'این' درج ہونے سے دیکھا گیا لغتاً و تخریماً (مقدمہ: ۳۲۱) میں یہ مصرع صحیح صورت میں نقل ہے۔

۴ - ۱۵ ص ۳

۸ - ۱۵ ص ۳

دارالافتاء دہلی کے مرتبہ

ص ۱۰ حاشیہ: بقول پرفسور محمد شیرانی مؤلف ہائے کتاب (۱۰۰ زفان گویا) علامہ رشید برادر جد ابراہیم قوام فاروقی صاحب شرفنامہ ابراہیمیہ است و تاریخ البیعت ۱۳۰۲ھ (۱۳۷۱ م) میں باشندہ پنجاب میں اردو لیکن صاحب فرسنگ جہانگیری نام مؤلف را بدالدرین ذکر کرده و نام کتاب دانیز بیک صورت دیگر یعنی جہان تو یا برای زفان گویا آورده است کہ از پنج کوشی یا ہفت بخشی ہم خواندہ اند۔ جناب آقا علی اصغر حکمت نام کتاب را بصورت جہان پویا و نام مؤلف آنرا بدالدرین ذکر کرده اند۔

جہاں بالا میں جو مختلف ماخذوں سے نقل ہوئی ہے، کئی طرح کے اسقام پائے جاتے ہیں کچھ ماخذوں کی غلطیاں ہیں اور کچھ کتابت کی ماور کچھ ماخذ کی غلط فہمی پر مبنی گویا ہیں۔ سب کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر باقر صاحب کے بیان سے زفان گویا اور اس کے مؤلف کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ملتی اس بنا پر اس سلسلے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

شیرانی مرحوم نے پنجاب میں اردو میں معتق زفان گویا کا نام دوبار لکھا ہے۔ ایک بار علامہ رشید برادر جد جہاں شرفنامہ منیری (ص ۲۳۴) اور دوسری بار علامہ رشید پدا ابراہیم برادر جد جہاں شرفنامہ منیری (ص ۲۴۰)؛ اگرچہ مرحوم نے مراعت اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا لیکن ان کے قول کی بنیاد شرفنامہ ابراہیمیہ قوام فاروقی کے حسب ذیل بیان پر ہے:

ابارده بالفتح بارا بر موقوف نام تفسیر زند کہ تصنیف ابراہیم زندگشت است و می گویند تفسیر تنگ است و آن ہم کتابی است مغال را۔ نیز گویند کہ از معین منقول است۔ و دو معنی اخیر منقول است از فرسنگ زفان گویا کا از معنی مولانا بدلا ابراہیم برادر جد جہاں شرفنامہ است۔

شرفنامہ کا یہ قول چار مختلف نسخوں پر مبنی ہے جن میں اس امر خاص میں کسی قسم کا اختلاف ۹۔ پنجاب میں اردو مکتبہ کیلین ۱۹۶۰ء ۱۰۔ میرے عزیز دوست استاد ڈاکٹر سید محمد طارق حسن لکھنؤ شرفنامہ پر تحقیق متلا پیش کیا تھا۔ یہ اطلاع اسی سے حاصل کی گئی ہے۔

نہیں۔ مندرجہ بالا قول سے واضح ہے کہ زفان گویا کے مؤلف کا نام بدابر ابراہیم تھا اور وہ جامع مرفق نامہ کے مادہ (جد) کا بھائی تھا۔ شیرانی مرحوم کا بیان اپنے نسخہ اخذ کے صحیح بیان سے دو اعتبار سے مختلف ہے:

- ۱ شیرانی مرحوم کے یہاں مؤلف کا نام ملا رشید درج ہے۔ جب کہ مرفق نامہ کے قابل توجہ نسخوں میں اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔
- ۲ شیرانی صاحب کے یہاں جہاں تک پنجاب میں اردو کے مطبوعہ نسخوں کا تعلق ہے، بدابر ابراہیم بدابر ابراہیم پڑھا گیا، جو ملا رشید کے رشتے کا مطہر ہے۔ یعنی ملا رشید ابراہیم کے باپ تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ زفان گویا کے مؤلف کا نام بدابر ابراہیم تھا، اس فقرے میں اضافت ابنی ہے، یعنی بدربن ابراہیم گویا مؤلف کا نام بدابر ابراہیم کے باپ کا نام ابراہیم تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خود جس بیان کی طرف سے شیرانی صاحب نے زفان گویا کے مؤلف کا نام ملا رشید لکھا ہے، اس کے اعتبار سے مؤلف کا صحیح نام بدابر ابراہیم ہے۔ اس نام کی تائید حسب ذیل امور سے ہوتی ہے:

- ۱ زفان گویا کے مقدمے میں خود مؤلف نے اپنا نام بدابر ابراہیم لکھا ہے۔
- ۲ اس کے قلمی نسخے کے سرورق پر مؤلف کا نام بدابر ابراہیم درج ہوا ہے۔
- ۳ مؤلف فرنگ جہانگیری نے اس کا نام عبداللہ بن لکھا ہے۔ بد سے عبداللہ بن کا قیاس: تقدق طود پر ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر باقر صاحب نے پنجاب میں اردو کے حوالے سے زفان گویا کی تاریخ تالیف ۱۷۳۷ء چھپی لکھی ہے، جو کسی سہو کا نتیجہ ہے۔ زفان گویا میں کہیں تاریخ درج نہیں، اور نہ کوئی ایسی داخلی شہادت بظاہر موجود ہے جس سے اس کی تاریخ تالیف پر روشنی پڑتی ہو؛ البتہ بعض قرائن ایسے ہیں جن سے اس کے دو قلمی نسخوں کا طم ہے، ایک خدا بخش خان پبلک لائبریری، بانکھی پور، پٹنہ میں ہے، دوسرا لیمن گھاٹ میں ہے۔ دوسری عالم بالیاسکی نے مجھ سے دوسرے نسخے کی اطلاع دی ہے۔ میرے مطالعے میں صرف اول الذکر نسخہ رہا ہے۔

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۸۲۲ء اور ۸۳۷ء ہجری کے درمیان مکمل ہوئی، اس سلسلے کی بحث میرے مضمون قدیم فرسنگوں میں اردو عناصر - زبان گویا رسالہ اردو جولائی ۱۹۶۷ء ۱۹۶۸ء میں ملیگی۔ اس پر کوئی سودمند اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر باقر کا صاحبِ جہانگیری سے متعلق حسبِ ذیل بیان بھی مبہم اور غیر واضح ہے: نام کمالہ
 را بر یک صورت دیگر جہان تو یا بر اے ز فانی گویا آورد و است۔

جہانگیری کے مطبوعہ نسخے میں صرف اس قدر ہے:

فرنگ زفان گویا و جهان تو یا مشهور بلقب نغشی تصنیف بدرالدین :-

اس بیان میں 'تویا' اور 'بلقب' کتابت کی غلطیاں ہیں۔ صحیح لفظ 'لویا' اور 'بہفت' ہیں۔ چنانچہ فرسنگ جہانگیری کے قلمی نسخوں میں یہ جملہ بالکل صحیح طور پر منقول ہے۔ ڈاکٹر باقر صاحب نے کاتب کی غلطیاں مصنف کی طرف منسوب کرنے میں جملت سے کام لیا ہے۔ موصوف کے یہاں سے مزید یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جہانگیری میں زبان گویا کے بجائے فرسنگ کا نام جہان تو یا ہے بلکہ یہ واقع نہیں۔ جہانگیری میں اور دوسری کتابوں کی طرح اس فرسنگ کا دہرا نام زبان گویا اور جہان پویا ہے۔ خود مقدمہ زبان گویا سے اسی دہرے نام کی تائید ہوتی ہے۔

'نام این فرسنگ نامہ زبان گویا جہان پویا نہاد۔'

زفان گویا کے دوسرے نام پنج بخشی یا ہفت بخشی کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنے کی ہیں۔ دراصل یہ نام خود کتاب میں کہیں نہیں آیا۔ بظاہر کتاب کے مندرجات کی وجہ سے زفان گویا اس نام سے مشہور ہوئی، چونکہ زفان گویا حسب ذیل سات بخش میں منقسم ہے اس بنا پر اس کا نام ہفت بخشی مناسب ہوگا:

بخش نخست: سخنان پهلوی و ددی که جداگانه است و میوند با مثنوی دیگر خلطه.

بخش دوم : سخنان پهلوی و ردی که از دو سخن پیونید یافته است.

بخش سوم : سمنان پہلوی و دری کہ از آن کردار پابیرون آید۔

بخش چهارم : سخنان تازی

۱۲ دیکھیے مقدمہ کتاب

دارالافاضل کی ترتیب نو

ششم: سخاوت آمیزہ الامازی و ترکی و جمعی

ششم: سخاوت رومی و یونانی

شہتم: لغات ترکی

یت فرہنگ نامہ: لغات متفرق

سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ زفان گویا کا دوسرا نام ہفت بخشی مناسب ہوگا، نہ کہ
نشی۔ البتہ دارالافاضل میں بار بار اس کا نام پنج بخشی آیا ہے جو یقیناً کسی غلط فہمی کا
ہے۔ پنج بخشی فرہنگ نامہ قواس کا نام مناسب ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ آخر الذکر
پانچ حصوں (بخش) میں منقسم ہے، اور زفان گویا کے مندرجات فرہنگ نامہ قواس
یروی میں سات بخش میں منقسم ہوئے۔ مختصر یہ کہ زفان گویا کو پنج بخشی کے نام سے یاد
سراسر غلطی ہے۔ اس کا نام ہفت بخشی ہے اور ہی نام فرہنگ جہانگیری میں پایا جاتا
ہے۔ اگرچہ اس غلطی سے ڈاکٹر باقر صاحب کا تعلق نہیں۔ لیکن وہ مدار کی پیروی میں اس
بخشی اور فرہنگ جہانگیری کی روایت سے ہفت بخشی قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ مدار
جہانگیری کے اختلاف بیان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ بلکہ انہوں نے اس
غلطی کو در خود توجہ ہی نہیں سمجھا۔

ط: این سہ کتاب (زفان، تجتزی، حل لغات الشعراء) بانعام منابع

دیگری کہ ذیل بلانہا اشارہ می شود۔ مود واستفادہ مؤلفین دولغت نامہ

مؤید الفضلا و تحفہ السعاده اسکندری بودہ است، و مؤلف مدار نسبت

بہر دو مؤلف مذکور بحکم و احترام فراوان مرعی میدارد:

۱۵ ص ۲ میں ہے: چنانچہ زفان گویا کہ ادب پنج بخشی نیز گویند، ڈاکٹر باقر صاحب نے اس پر

فیہ بڑھایا ہے، زفان گویا و جہان بویا مشہور ہفت بخشی تصنیف بدو العین (فرہنگ جہانگیری)۔

ن گویا مرکب نویسنی ہے، اس لیے اس کو پیوست لکھنا غلط ہے؛ بویا، بے محل ہے۔ بویا ہونا چاہیے

الطرح یہ پوئیدہ لکھنا صحیح فاعل ہے۔

- ۱ نصیب الولدان
 - ۲ دستور و خلاصہ فارسی از ضمیر
 - ۳ دستور و فرہنگ فخر قواس
 - ۴ فرہنگ علمی
 - ۵ قنیۃ الطالبین
 - ۶ مؤید القوائد
 - ۷ لسان الشعراء
 - ۸ طب حقائق الاشیاء
 - ۹ فرہنگ علی نیک پی
- یہ بیان گنجشک اور اپنے ہاتھ سے کافی مختلف ہے؛ مگر قبل اس کے کہ اس سے متعلق براہ راست کچھ لکھا جائے، مدار الافاضل کا بیان درج کیا جاتا ہے:
- وہر دو آن کتاب (تحفۃ السعادة و مؤید الفضل) منقولہ اند، از کتب معتبرہ و معتبرہ چنانچہ لغات تازی از ملاح و تاجین و نصیب الولدان و دستور و خلاصہ فارسی از ضمیر و دستور و فرہنگ فخر قواس و علمی و علی نیک پی و شرح مخزن و قنیۃ الطالبین و مؤید القوائد و لسان الشعراء و طب حقائق الاشیاء
- مدار الافاضل کی اس عبارت میں کتابت کی چند غلطیاں ہیں :
- ۱ 'خلاصہ فارسی' غلط ہے؛ صحیح عبارت یہ ہوگی: خلاصہ و لغات فارسی الخ
 - ۲ مؤید القوائد کے بجائے مؤید القوائد ہونا چاہیے۔
- گویا مؤلف مدار الافاضل کے بیان کی روش سے تحفہ اور مؤید کے مولفوں نے عربی کی اردہ فارسی کی فرہنگوں، ایک شرح اور ایک کتاب طبی سے اپنے لغات تیار کیے لیکن یہ فہرست تحفہ اور مؤید کے تمام ماتخذ کو حاوی نہیں؛ ذیل میں دونوں لغات کے ماتخذ

درارالفاضل فی ترتیب

درج کیے جاتے ہیں؛ تحفۃ السعاده کے مقدمے میں ہے:

و معجم از نسخہ ہامی معتبر و فرہنگ نامہ ہامی مقتدر چنانچہ ضمیر و دستور و
فرہنگ فخر قواس و زفان گویا و دستور الفضلا و شرح مخزن و فرہنگ
قاضی ظہیر و فرہنگ ابراہیمی و سینی و فرہنگ عجائب و لغات تازی
از صراح و غلامہ و نصیب الولدان و تاجین نقد اللہ احکامہم بیک
نور و آورده الخ

مؤید الفضلا میں ہے:

این کتاب مشتمل است از لغات عرب علی قدر ایحتاج من القراح و
التاج و از لغات فارس و روم و سمرقند و اورام النہر و ترک و جزآن سلسلہ
الشعراء و ادات الفضلا و دستور الافاضل و زفان گویا و مواد الفوائد
و شرح مخزن و اسرار و طب و قالین الاشیاء و آنچه در شرف نامہ و قیستہ
الطالبین و در فرہنگ نامہ و نسخہ ہامی متعارف و متداول مسطور
است استخراج نموده الخ

گویا متحدہ اور مؤید کے عربی اخذ یہ تھے:

صراح، تاجین، غلامہ، نصیب الولدان (۵)

فارسی اخذ کے نام یہ ہیں:

- | | |
|---|----------------|
| ۱ | فرہنگ ضمیر |
| ۲ | دستور الافاضل |
| ۳ | فرہنگ فخر قواس |
| ۴ | زفان گویا |

۱۵ مخطوطہ نمبر ۲۴۸۳ کتابخانہ دہلی

۱۶ مواد دستور الافاضل

۱۷ ۱۵ ص ۲-۳

۵	دستور الفضلا
۶	شرح مخزن الاسرار
۷	فرہنگ قاضی ظہیر
۸	فرہنگ ابراہیمی یعنی شرفنامہ
۹	فرہنگ حسینی
۱۰	فرہنگ عجائب
۱۱	لسان الشعر
۱۲	ادات الفضلا
۱۳	مواد الفوائد
۱۴	طب حقایق الاشیاء

اس فہرست کے مدارالافتاء میں درج فہرست کے مقابلے سے واضح ہے کہ مدارالافتاء میں ایک عربی لغت زیادہ ہے، جس کا نام دستور لکھا ہے۔ اگر یہ بیان صحیح ہے اور صاحب مدار کو تحفہ مؤید کے اخذ میں اس لغت کا نام لکھا ملا ہے، تو شاید اس سے مراد لفظی کی کتاب دستور اللغات ہوگی۔ البتہ فارسی کی حسب ذیل کتابیں مدار کے مقدمے میں ان دونوں کتابوں کی نسبت سے درج نہیں: زبان گویا، دستور الفضلا، فرہنگ ظہیر، فرہنگ ابراہیمی (شرفنامہ)، فرہنگ حسینی، فرہنگ عجائب، ادات الفضلا۔

حسب ذیل دو فارسی فرہنگوں کے نام مجھے تحفہ اور مؤید میں نہ مل سکے:

فرہنگ علمی، فرہنگ علی نیک پی،

لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤید الفضلا میں آخری فرہنگ یعنی فرہنگ علی سے مستفاد ہوا ہے۔ جس کو وہاں فرہنگ علی بھی بتایا گیا؛ گو دیباچہ میں یہ نام صراحتہً مذکور نہیں۔

دارالافتاء میں تحفہ السعادة اور مؤید الفضلا کی نسبت مجھے جو اخذ کی کتابیں درج ہیں،

مدارالافاضل کی ترتیب نو

ان کی نوعیت پر اب تک گفتگو ہوئی ہے؛ ڈاکٹر باقر صاحب نے مدارالافاضل سے اس سلسلے میں جو کچھ اخذ کیا ہے اور جسے ہم اس بحث کے شروع میں نقل کر چکے ہیں، وہ اپنے ماخذ سے کافی مختلف اور غلط فہمی پر مبنی ہے اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابلِ توجہ ہیں :

۱ ڈاکٹر محمد باقر نے متحدہ اور مؤید کے ماخذ کی جو فہرست مدارالافاضل کی رو سے مرتب کی ہے، اس میں صراح اور تاجیں کے بجائے زفان گویا، تبغری اور حل لغات الشعر کا ذکر ہے، حال آنکہ یہ تینوں لغات مدارالافاضل میں مندرج فہرست سے غائب ہیں۔

۲ ”دستور و خلاصہ فارسی از ضمیر“ کو ایک نمبر کے ذیل میں نقل کرتا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نزدیک یہ ایک فرہنگ ہے۔ حال آنکہ یہ ٹیکہ نہیں ہے۔ دراصل یہ فقرہ مقدمہ مدارالافاضل میں غلط چھپا ہے اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ”خلاصہ“ پر پہلا جملہ تمام ہو جاتا ہے گویا وہاں تک عربی کی جو فرہنگیں ہیں، اس کے بعد فارسی کی فرہنگیں درج ہو رہی ہیں اس لیے خلاصہ پر ہمزہ اضافت غلط ہے اس کے بعد ”ولغات“ کے الفاظ درج ہونے سے وہ گئے ہیں۔ پس مندرجہ بالا فقرے میں تین لغات یعنی دستور و خلاصہ (لغات عربی) اور ضمیر کا ذکر ہے اور ضمیر سے پہلے ”ولغات فارسی بھی تھا، جس میں ”ولغات“ درج نہ ہو سکا، جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب موصوف اس پورے فقرے سے ایک ہی لغت پر استدلال کر رہے ہیں۔

۳ دستور و فرہنگ فقر قواس کو نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر ایک نمبر کے ذیل میں نقل کر کے یہ قرینہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف انھیں ایک ہی فرہنگ خیال کرتے ہیں۔ حال آنکہ ایسا نہیں؛ دستور سے مراد صاحب غیرت کی دستورالافاضل اور فرہنگ فقر قواس سے دوسری فرہنگ مراد ہے۔ حسن اتفاق سے الہ دونوں فرہنگوں کے واحد نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ میں موجود ہیں۔

مدار الافاضل کی ترتیب نو

- ۳۔ شرح خضر بن اسرار، مدار میں مندرج فہرست میں شامل ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب موصوف نے دجالے کس وجہ سے اسے اپنی فہرست میں درج نہیں کیا۔ اس شرح سے ملا محمد بن قوام بن رستم کی شرح ہے، جو ۷۹۰ھ کے قریب ہندستان میں مرتب ہوئی۔ شارح ایک مشہور فرہنگ بحر الفضائل کے مؤلف ہیں۔ جو ۸۲۷ھ کے قریب مرتب ہوئی تھی۔
- ۵۔ فرہنگ ملی کی دوسری صورت فرہنگ ملی حسین انجوشیرازی کی فرہنگ جہانگیری کے ملبوم نسخے میں درج ہے؛ قیاس ہوتا ہے کہ استاد نفیسی نے اسی نسخے سے یہ صورت لی ہوگی۔ اس بنا پر نفیسی کے بجائے جہانگیری کا حوالہ مناسب تھا۔
- ۶۔ فرہنگ ملی نیک پی کا نام فرہنگ ملی سبکی مؤید الفضلا میں چند بار اور جہانگیری کے دیباچے میں کم از کم ایک بار آیا ہے۔ اگرچہ ملی نیک پی مدار کے متن میں واضح طور پر موجود ہے، اور سعید نفیسی کے یہاں بھی نام ملتا ہے۔ لیکن مؤید الفضلا اور جہانگیری کے بیان کی روشنی میں یہ مسئلہ محققانہ طور پر حل ہونے کا متقاضی ہے۔

شروع میں ذکر ہو چکا ہے کہ ثانوی ماخذ کی مدد سے متن کی تصحیح میں عموماً بڑی مدد ملتی ہے اور فرہنگوں کی تصحیح میں تو خصوصاً ثانوی ماخذ کی ماہیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن مدار الافاضل کے ملبوم نسخے کی تصحیح میں اس سے بہت ہی کم مدد لی گئی ہے۔ اس بنا پر باوجود توجہ کے اس کا متن متوقع معیار کا نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں چند مثالوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائیگی۔

مدار الافاضل میں ذوالفقار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے،

ذوالفقار، دبراہرہی و مؤید و ملقات است، بفتح فاء، شمشیریت
کہ از سید بن حاج و قتی کہ سہمی بحضرت رسیدہ بود و بجہت غود اختیار
فرمودہ بود، و در عرف شمشیر شاہ مروانست کذاتی الابرار سہمی و المؤمنین الخ

اس بیانی سے صراحتہ واضح ہے کہ یہ قول فرہنگ ابراہیمی یعنی شہر قنار اور مؤید الفضلا سے اخذ ہے۔ لیکن یہ دونوں فرہنگیں میرے سامنے ہیں، خرفانہ کا تنقیدی ایڈیشن ہے

دارالافتاء کی ترتیب نو

جو چند نسخوں سے تیار ہوا ہے، اور مؤید کا مطبوعہ نسخہ، مگر ان دونوں کتابوں میں ذوالفقار کی شرح دوسرے انداز میں کی گئی۔ شرح فنامہ میں ہے:

ذوالفقار بفتح فاء نام تیغ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ دکن پیغامبر علیہ السلام بخشیدہ بود؛ ذوالفقار اسم سیف النبیؐ

مؤید الفضل کی روایت یہ ہے:

ذوالفقار بالفتح نام تیغ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ

تفصیلات بالاسے واضح ہے کہ دارالافتاء میں جو کچھ شرح فنامہ اور مؤید الفضل کے حوالے سے درج ہے، وہ ان دونوں کتابوں کے موجودہ نسخوں سے مختلف ہے۔ ممکن ہے صاحب مدار کے پیش نظر نسخوں میں یہ عبارت موجود ہو۔ یا صاحب مدار کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر ان امور کا ذکر مع مدارالافتاء حاشیے میں درج فرماتے، تو یہ نسخہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا۔

لیکن یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ مدار کے موجودہ نسخے کی عبارت فوق غلط طور پر نقل ہوئی ہے۔ اور اس میں اسماء بھی غلط درج ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

”حرف لغات“ کے بعد ”است“ سے عبارت کا مفہوم غلط ہو جاتا ہے؛ اس کو حذف کر دینا چاہیے۔

مسید بن حاج غلط ہے؛ مسید، منبہ کی اور حاج، حاج یا الحاج کی تصحیف ہے اس کی تصحیح لغات کی مدد سے بخوبی ممکن ہے۔ سب سے زیادہ سہل الحصول کتاب لغت نامہ دہخدا ہے، جس میں ذوالفقار کے ذیل میں ہے

نام شمشیر منبہ ابن الحاج کہ بروز بدکشتہ شد و آن شمشیر را رسول اکرم صلوات اللہ علیہ برآئے خویش برگزید، و کان ذوالفقار المنبہ ابن الحاج، استخلصہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصطفاہ لنفسہ یوم بدر۔ الجاہلی فی الجہیر

۱۸ اکثر نسخوں میں قوسین کی جگہ موجود نہیں ہے، تو یہ دیکھنے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۹ واضح ہے کہ یہ غلط ہے؛ پہلا حرف مفتوح نہیں، بلکہ فامفتوح ہے۔

للبيروني - ذوالفقار سيف رسول اللہ کا لقب ابن الحجاج وبعضی
آنرا شمشیر ماض بن منبہ گفتہ اند^۱ الخ

بہر حال واضح ہے کہ جناب مصحح تنقیدی متن کی ترتیب سے عہدہ برا نہیں ہو سکے۔ جس کی
بڑی دیکھالوی آغذ کی طرف سے صرف نظر ہے۔

ایک اور مثال آگنج کی ہے، جس کی مدار میں اس طرح شرح ملتی ہے:

آگنج با کاف پارسی بوزن آگند، روده کہ پُر از گوشتاب باشد، عرب
آنرا عصیب خوانند۔ و در پنج بخشی است کہ بہ پنج و جگر پُر کردہ در
تنوہ بریاں کنند، و در سکندر لیست آنرا جگر آگند نیز گویند۔

اگر اس شرح کا موجد کے حسب ذیل بیان سے مقابلہ کریں، تو بعض مسائل روشن ہو جائیں گے:

آگنج بوزن آگند، روده کہ پُر از گوشتاب باشد، عرب آنرا عصیب

خوانند، کفافی شرفنامہ؛ و در لسان الشراہم مدنی آوردہ، حیث قال

آگنج بوزن آگند۔ عصیب کہ آنرا یا رسی جگر آگند گویند الخ

لسان الشعر تو مفقود ہے؛ لیکن شرفنامہ موجود ہے۔ اس میں موجد کے بیان کردہ مطالب
سے کچھ زیادہ مطالب موجود ہیں یعنی یہ کہ خود شرفنامہ میں ہے کہ آنرا جگر آگند گویند۔

پس مدار میں مندرج معنی اول آوردہ معنی جو سکندری کے حوالے سے مندرج ہے، سب

موجود ہے۔ اس طرح واضح ہے کہ خود مؤلف مدار نے قدیم حوالے کے بجائے جدید حوالے پر

اکتفا کیا ہے یعنی شرفنامہ کے بجائے سکندری کا حوالہ دیا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ

شرفنامہ سے قدیم تر کوئی اور حوالہ بھی مل جائے، لیکن زیادہ سہل الحصول شرفنامہ ہی ہے۔

اسی بنا پر مصحح مدار الافاضل سے توقع تھی کہ وہ اس کا ذکر کرتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ پنج بخشی

کے حوالے سے جو کچھ صاحب مدار نے نقل کیا ہے وہ زفان گویا میں موجود ہے، اس فرق کے

ساتھ کہ موجودہ نسخے میں کچھ عبارتیں درج ہونے سے مدہ گئی ہیں۔ زفان گویا کی اصل عبارت

یہ ہے:

۲۱ غیاث اللغات میں بھی یہی ہے۔

مارا لالا فاضل کا قریب ہوا

آجنگ باکاف پارس مصیب کی طعنا میست کہ رودہ را بہ برنج و حبگر پڑ
کرہ الخ

اس کا جارت مندرجہ مار سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اول سے رودہ را "نگ کی جارت
مارا لالا فاضل کے موجودہ نسخے میں درج نہیں ہو سکی ہے۔ مار کے مطبوعہ نسخے کی اس جارت
میں: درج بخشی است کہ بہ برنج و حبگر الخ، مفعول فاضل ہے اور اسی بنا پر ناقص ہے۔
اور ظنی قوی ہے کہ اس واضح نقص کے لیے خود مع نسخہ ہذا ذمہ دار ہیں۔
ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

اور مزد واول روز از ماہ ... چنانچہ اسامی سی روز ماہ موافق
حکیم پارس دفاتر اکبر شاہی درین قطعہ مولف مندرج است:
اولا اند مزد و دیگر ہم وادی بہشت
بعد از آن شہر گور و اسفند مر خور داد دان
چوں امر داد و دیگر دبا درآمد در شمار
آورد و آبان و خوراک ماہ تیر خوان
گوش کن دیگر کہ آمد گوشک نام دہمبر
ہست تا این نصف مہر و مشرب بعد از آن
فرش و فرود ہی دان و دیگر نیرام و رالم
باد دنیا دین و دین آنا و استار آسمان
بعد ازین زمیناد و مار اسفند ایران یادگر
از حکیم پاریسی سی روز ماہ، اہی نکتہ دان!

ظاہر ہے کہ تیس دہائی کے ایرانی نام اکثر لوگوں کی طرح ڈاکٹر باقر صاحب کو بھی معلوم نہ تھے اس
لیے انہوں نے فیضی سریندی کے قطعہ کو بہت غلط درج کیا ہے۔ ذیل میں ان غلطیوں کی نشاندہی
کی جاتی ہے:

پانچواں دن اسفند آمد یا اسفند (اسپند، سپند) ہونا چاہیے۔

”تر“ غلط ہے۔ مسعود سعد سلمان کا شعر ہے:

سپندارند روز خیز، امی نگار!

سپند آرمات و حجام می آر (ص ۶۶۰)

آٹھواں دن دیا آند ہے، نہ دیا۔ برہان میں ہے:

نام روز ہشتم از ہر ماہ شمسی و دین روز از ماہ دی کہ دیماہ باشد فارسیان

حمید کنند (ص ۹۰۹)

مسعود سعد سلمان کے دیوان میں دیا ذر روز غلط ہے۔ دیا ذر روز ہونا چاہیے (ص ۶۶۱)۔ ڈاکٹر

باقر کے یہاں دیا کے بعد کا ٹکڑا ذر، فعل آمد کا مجز قرار دیا گیا ہے جو صراحتہ اشتباہ ہے۔

بارھویں اور تیرھویں دن ماہ تیر سے ظاہر کیے گئے ہیں جو بصورت موجودہ بغیر اضافہ کے

موزوں نہیں ہوتے۔ دراصل ماہ تیر درست ہے، ماہ بارھواں دن ہے اور تیر تیرھواں۔ صاف

مدار نے کلمہ تیر کے ذیل میں قطعہ مندرجہ بالا کا حوالہ دیا ہے:

دسیر دہم روز از ماہ چنانکہ در ضمن اور مزد گذشت (۴۱۰: ۱)

اگر معجم نے اسے توبہ سے دیکھا ہوتا، تو ماہ اور تیر کو ہرگز پیوست نہ لکھتے۔ ماہ روز کے بارے

میں مسعود سعد کی یہ بیت ہے:

ماہ روز اے بروی خوب جو ماہ

بادہ لعل مشکبوی بخواہ

اور تیر روز کے بارے میں بھی اسی شاعر کی یہ بیت ملاحظہ ہو:

امی نگار تیر بالا! روز تیر

خیر و جام بادہ دی بر لب زیر (ص ۶۶۲)

چودھویں اور پندرھویں روز کے نام کے بارے میں ڈاکٹر باقر صاحب کی اطلاع ناقص ہے

”گوش نام دیکھ“ دراصل دولوز نام کا حامل ہے۔ چودھویں دن کا نام گوش^{۲۳} ہے، اور

۲۲ یعنی دی بآذرک، کتاب مزدیسنا، ۱۶۲

۲۳ رک، کتاب مزدیسنا، ۱۶۲

علاقہ داخل کی ترتیب نو

پندرہویں مادی بہتر ہے۔ گوش کے متعلق مسعود سعد سلمان کا شعر ملاحظہ ہو:

گوش روز ۱۲ی نگار مشکین خال

گوش بر لب بجیر و نیک بمال (ص ۶۶۲)

دی بہر کے متعلق برہان میں ہے:

نام روز پانزہم بود از ہر ماہ شمسی و مغانی ای روز را از ماہ دی مبارک

دانند و جشن کنند الخ (ص ۹۰۹)

مسعود سعد کی شہادت ملاحظہ ہو:

دی بہر است مہربانی کن

کز ہمہ چیز مہربانی بہ (ص ۶۶۲)

خود صاحب مداری نے دی بہر کے ذیل میں لکھا ہے: دی بہر یا دہم روز از ماہ چنانکہ در منی اور مزد ذکر یافت (۲۸۲: ۲) واضح ہے کہ یا دہم غلط ہے، پانزدہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ کہ ایسے واضح اشارے پر بھی ڈاکٹر باقر نہیں چونکے۔

سترہویں روز کا نام باقر صاحب مداری نے سروش کے تحت قطعہ بالا کا ذکر کیا ہے:

سروش و سہدیم روز ماہ چنانچہ در منی اور مزد گذشت۔

اگر ڈاکٹر باقر چاہتے، تو اس کی مدد سے وہ قطعہ کو درست کر سکتے تھے۔ سروش روز کے بارے میں مسعود سعد کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

روز سروش است کہ محمود سروش

بادہ خود و نفہ مطرب نبوش (ص ۶۶۳)

قطعہ مندرجہ بالا میں صحیح مصرع یوں ہوگا:

ہست تا این نصف مہ، مہر و سروش و بعد ازیں

۲۳ تک، کتاب مزہبنا، ۱۶۲ ۲۵ ایضا

۲۶ اس کا تعلق بعد کی بیت سے ہے۔

مارالا فاضل کی ترتیب

اٹھارویں روز کا نام ڈاکٹر اقر صاحب نے فرش لکھا ہے۔ یہ رشن پونا چاہیے۔ برہان قاطع میں ہے :

رشن ... نام روزِ سیدیم از ماہِ ہای شمسی۔

رشن کے بارے میں مسعود سعد سلمان کا شعر ملاحظہ ہو :

روزِ رشن است، اے نگارِ دلربای !

شاد بنشیں و بجام می خمرای (ص ۶۶۳)

”باد“ ہر ماہ کے ۲۲ ویں دن کا نام صحیح ہے، لیکن مارہی میں پاد کے ذیل میں آیا ہے :

”نیز روزِ دوم از ماہِ دوم (۱: ۲۷۸)۔ باد کے بارے میں برہان نے واضح طور پر لکھا ہے: نام

روزِ بیست و دوم از ہر ماہِ شمسی باشد الخ (ص ۲۵)

اس سلسلے میں مسعود سعد سلمان کی شہادت بھی ملاحظہ ہو :

چوں بادِ روزِ روزِ نشاطِ آمد، ای نگار !

شادیِ فزایِ بین و بدہ بادہ و یار (ص ۶۶۴)

دنیا دین غلط، تیسویں روز کا نام دیبا دین ہے ”برہان قاطع“ میں ہے :

دیبا دین نام روزِ بیست و سوم باشد از ہر ماہِ شمسی (ص ۹۰۸)

دی کے ذیل میں اسی فرہنگ میں آیا ہے :

و روزِ دی بہر و دیبا دین و دیبا ذہد و متعلق است

مارالا فاضل میں ”دی برین“ کے ذیل میں آیا ہے :

بیست و سوم روز از ماہ چنانکہ در ضمن او و مزد گذشت

نظاہر دی برین دیبا دین کا مخفف ہے دراصل کلمہ دی + با + دین، جو یہاں برین کی شکل

میں آیا ہے۔ لیکن خود صاحب مارلے اپنے قلمے میں اصل شکل دینا دین درج کی ہے، جو ہم

کی غلطی کی وجہ سے دینا دین ہو گئی ہے مسعود سعد سلمان کے یہاں دیبا دین ہی آیا ہے :

۲۷ رک، کتاب مزدیسنا: ۱۶۲: ۲۲۱

۲۸ کتاب مزدیسنا: ۱۶۲ دی برین ہی ہے۔

دارالافتاء کی ترتیب وار

دین بدین است و دین مرد خرد

آن شناسم کہ لعل بارہ خور د (ص ۶۶۵)

پیشہ کی ۲۶، ۲۵، ۲۴ ویں دن کے نام کے بارے میں ڈاکٹر باقر کے یہاں بڑی غلط فہمی
اقع ہوئی ہے و دین آرا کسی دن کا نام نہیں ہے۔ دراصل دین ۲۴ واں اور آرد
۲۱ واں دن ہے۔

بن کے بارے میں مدار میں ہے :

بیت و چہارم روز ماہ کذا فی نغان گویا (۲: ۲۸۶)

بہ خود پہلے ایک اور آخذ سے اس لفظ کو قطع میں درج کیا جا چکا تھا، تو یہاں
فان گویا کے نام کا اندراج غیر ضروری تھا۔ بہر حال سعود سعد سلمان کی بیت یہ ہے :

دین روز، ای روی تو اکنت دین

می خود و شادی کن و خرم نشین (ص ۶۶۵)

رد کے بارے میں مدار میں ہے :

بیت و پنجم از او اردی بہشت (ص ۶۶۰)

نامخ رہے کہ اس میں اردی بہشت کی تخصیص غلط ہے، ہر ماہ کا ۲۵ واں آرد وار و بتخفف
(۱) ہی کہلاتا تھا۔ برہان قاطع میں ارد کے ذیل میں ہے :

و تدبیر و مصالح روز آرد کہ بیت و پنجم از ہر ماہ شخصی است بدو تعلق

دارد (۹۸-۹۹)

سعود سعد سلمان نے آرد (بالفتح) اس طرح نظم کیا ہے :

آرد روز است فرخ و میمون

باہم لہو و خرمی مقرون (ص ۶۶۵)

خطہ میں استاد نام لفظ طور پر درج ہے۔ اشتاد ہونا چاہیے۔ برہان قاطع میں ہے :

۲۱ کتاب مزدلینا: ۲۵۶، ۱۶۲ میں لکھا ہے۔ جو تھری شکل ہے۔

۲۰ ایضا ص ۱۶۲

مدار الاضافی کی ترتیب تو

نام بیست و ششم است ہر ماہ قمری الخ (ص ۱۳۷)
 مسعود سعد سلمان کے یہاں اس طرح آیا ہے :
 اشتاد روز تادہ ز گل بوستان
 اہی دوست ! می ستان ز کف دوستان
 قطعے کا مصرع اس طرح درست ہوگا :

باد، دیادین و دین، آرد و اشتاد آسمان

۲۸ دین روز کا نام قطعے میں زیاد تخفیف کے ساتھ ہے۔ مد اصل اس روز کا نام زامیاد^{۳۱}
 ہے۔ خود صاحب مدار نے زامیاد کے ذیل میں لکھا ہے :

زامیاد بیست و ششم روز از ماہ، چنانکہ در ضمن اور مزد مذکور شد (۲۵۶:۲)
 مسعود سعد سلمان نے زامیاد نظم کیا ہے، لیکن مطبوعہ نسخے میں زامیاد غلط درج ہے :
 چوں روز زامیاد نیاری ز می تو یاد

زیرا کہ خوشتر آید می روز زامیاد (ص ۶۶۶)

قطعہ بالا میں تیسویں دن کا نام ایران، مدار کے مطبوعہ نسخے میں ڈاکٹر باقر صاحب کے ہاں
 بالکل غلط درج ہوا ہے، یہ انیرانی ہونا چاہیے۔ چنانچہ خود صاحب مدار نے انیران کے ذیل
 میں اس قطعے کا حوالہ دیا ہے، جسے ہم بعد کو نقل کریں گے۔ مسعود سعد سلمان نے بھی انیران ہی نظم
 کیا ہے :

انیران، ز پیران شنیدم چناں

کہ می خود باید بہ رطل محمدان (ص ۶۶۷)

ان شالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی متن کی تعمیر میں ثانوی متن کس طرح مفید ثابت
 ہوتے ہیں۔

۳۱ کتاب مودینا ص ۳۲۰، ۳۲ ۱۵، ص ۱۳۱

۳۳ رک، مودینا : ۱۶۲

مدار الافاضل کی ترتیب نو

راقم حروف نے مدار الافاضل کی محو کہ کتابوں میں سے خصوصاً زان گویا اور مؤید الفضلا کی مدد سے مطبوعہ نسخے پر ایک ناقلاً نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے جو سطور ذیل میں ناظرین کی خدمت میں پیش ہے :

مدار الافاضل	مؤید الفضلا
آہنج بوزن آہنج انداختن چنانچہ گویند	آہنج بوزن آگنج انداختن و اندازہ و انداز کنا
آہنج یعنی بانداز، نیز بمعنی اندازہ و در	فی شرفنامہ و در لسان الشعر بمعنی اول مذکور
لسان الشعر بمعنی اقل است۔ صاحب یزید	است، و میان قاضی شہ در حاشیہ لمقطع بعلم
از قنیز بمعنی پوشیدہ نقل کردہ است و	خود بمعنی نوشندہ نوشتہ است و این لفظ مشتق
در قنیز آہنجیدن بمعنی کشیدن گفته الخ	از آہنجیدن بمعنی آہنجیدن در قنیز کشیدن
	نہشتہ است الخ

ظاہر ہے کہ مدار کا یہ پورا قول مؤید سے استفادہ ہے اس لیے کہ صاحب مدار کے پیش نظر نہ لسان الشعر اتھی، نہ قنیز، مؤید کے نسخہ مطبوعہ میں نوشندہ اور مدار میں اسی کتاب کے حوالے سے پوشیدہ ہے۔

اگرچہ پوشیدہ صحیح ہے اور مؤید میں اس کے بجائے نوشندہ غلط ہے، کیونکہ آہنجیدن کے تحت مؤید لکھیں ہے و

انداختن و در قنیز بمعنی کشیدن است و در حاشیہ بخط میان قاضی شہ مرقوم است : آہنج پوشیدہ۔ ازین معلوم میشود کہ بمعنی پوشیدن نیز است۔

لیکن اختلاف کا اندراج اور تحقیق مرتب نسخہ کی ذمہ داری تھی۔

مدار	مؤید
البوالمولیٰ... در مؤید است :	البوالمولیٰ... در عجائب البلدان است : مرغی است برکوه
مرغی است کہ بکچہ چرخک، چوں امداد دل کنا، ہر کوئی کہ در عالم است در پڑہای دی باشد	

دارالافتاء کی ترتیب نو

شب دہا آتشی نماید و آوازی سخت بامداد بلونی نماید، و میانه روز برنگی دیگر و آخر روز برنگی نیکو دارد۔ و نیز گفته: سبز خالوست
از حرم قدری بزرگ کہ در جمع برنگی نیکو دارد و کاتب را سماع است از زبان بندگی۔ شیخ
و در میانه روز برنگی دیگر و شب برنگی المشاخ شیخ سلطان کہ در عہد ملک شمس مقطع بہار
نماید۔ گویند شخصی سیاحی آورده بود بوتلمون را در بہار آورده و آن جانوری از حرم قدری بزرگ
چنین بود و در شرف نامہ است و برنگہای گوناگون می نماید۔ و در شرف نامہ است:
کینیت حرم باست الخ کینیت حرم باست الخ

ان دونوں بیاقوں کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ صاحبِ مدار نے مؤید کے تفصیلی بیان کا خلاصہ لکھ دیا ہے، جس میں مؤید میں منقول سارے اخذوں کو حذف کر دیا ہے۔ مؤید میں بوتلمون کے ذیل میں مزید یہ ہے کہ در عہد ملک شمس مقطع بہار آنرا سیاحی آورہ بود۔ یہ اطلاع صاحبِ مؤید کو شیخ المشاخ کے ذریعہ ملی تھی۔ مدار میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ علاوہ بریں مدار کے مطلوبہ متن میں بعض خامیاں ہیں: (۱) آتشی نماید کے بجائے اند آتشی نماید ہونا چاہیے۔ (۲) سبز جانور نیست غلط ہے، و آن جانور نیست، صحیح ہے۔ (۳) چنین بود کا ٹکڑا مہمل ہے۔

اشکوب: و در شرف نامہ تعبیر بہ بام کردہ کہ عرب آنرا سطح گویند؛ صاحبِ مؤید این را نسبت بسہو کردہ و تائید از لسان الشعر آورہ کہ بمعنی سقف گفتہ و در مقدمہ سیر مؤید آنست اس بیان میں چار فرشتوں کے حوالے ہیں، جن میں ایک یعنی لسان الشعر مفقود ہے، باقی کے چند جات یہ ہیں:

مشرف نامہ اشکوب: با شین موقوف و آواز سہی، بام و آنرا اشکوب بقصر، و آسمان نیز گویند، بتازیش سقف خوانند۔

(مؤید الفضل) اشکوب: با سین موقوف آسمان کہ عرب آنرا سقف خوانند؛ و در شرف نامہ مندرج است بام کہ بتازیش سقف خوانند و فیہ نظر زیر اچہ بام را بتازی سطح گویند و ہم در شرف نامہ مذکور است کہ بام بالائی سقف؛ و دداوات مذکور است آسمان سقف کہ

مدار الافاضل کی ترتیب نو

اہل ہند آخر اچھت می ناخند و قول لسان الشعر امویہ قول ادات است۔ ومعنی
سقف در مقدمہ جارا اللہ ز محشری آسمان خانہ بنشتہ است، و بعضی آسمان نیز مگھیند
زیرا چہ این پردہ مترادف اندوہم از بہر این در شرفنامہ معنی آسمانہ سقف نوشتہ است
وازیں جملہ معلوم می شود کہ بسہو بجای آسمانہ بام بنشتہ الخ
(مقدمہ محشری، سقف بمعنی آسمان خانہ)

اس سلسلے میں چند معروضات ہیں :

۱ صاحب مدار نے ادات کا نام ضبط نہیں کیا ہے۔ دراصل جملہ یوں ہونا چاہیے :
وتائید لانا دات و لسان الشعر آردہ،

۲ مدار کے مطبوعہ نسخے میں ہے : در مقدمہ سیر مؤید آنت، یہ غلط درج ہوا ہے صحیح
عبارت یوں ہوگی : مقدمہ نیز مؤید آنت، اور مقدمہ سے مراد محشری کا مقدمہ
الادب ہے۔ بظاہر ڈاکٹر صاحب معجم مدار الافاضل نے اس جملے کی تصحیح نہ کر کے یہ
گمانی پیدا کر دیا ہے کہ وہ مقدمہ کو کسی مخصوص کتاب کا نام نہیں سمجھتے۔

۳ جہاں تک مؤید الفضلا کے مطبوعہ نسخے کا تعلق ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اس میں
شرفنامہ کے متعلق صحیح اطلاع درج نہیں ہے، اور اس پر اس اعتبار سے اعتراض کہ
اس میں اشکوب کے معنی بام لکھے ہیں۔ اور بام بمعنی سقف غلط ہے۔ درست نہیں،
اس لیے کہ خود شرفنامہ میں دو معنی دیے ہیں : ایک بام اور دوسرا آسمان جس کا متبادل
عرنی لفظ سقف ہے۔ اور یہ آخری معنی خود آخر میں مؤید الفضلا میں شرفنامہ ہی کے
حوالے سے درج کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ مؤید و دیگر مدار میں شرفنامہ پر ایراد جمل ہے۔

اس گنڈارش سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب معجم مدار اگر محو کتابوں کی طرف
متوجہ ہوتے تو ایک طرف ان کا مرتب کیا ہوا متن اخلاط سے پاک ہوتا، اور دوسری طرف
متن ناقذانہ ہو جاتا۔

۱۔ محضر محشری کے مطبوعہ جہاں کے نسخے میں سقف بمعنی آسمان خاد آیا ہے۔ (ج ۱ ص ۱۳۰)

مدار الافاضل کی ترتیب نو

الطفا ر الطیب نام داروئی است کہ ادا ناخن پریان و ناخن خوش نیز گویند و قبل جانود لیسیت از حشرات دریا، ہند سنکہ خوانند۔

اگرچہ اس میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں لیکن یہ بیان موید الفضلا سے مستفاد ہے، چنانچہ مؤید میں ہے :

الطفا ر الطیب ناخن خوش کہ ہندوی جلیٹھ کھر گویند کذا فی زفان گویا، وود فرنگ نامہ است کہ الطفا ر الطیب خرف و آن جانود لیسیت از حشرات بھری کہ ہندیش نکھہ و نکھوتر می گویند و نیز در فرنگ نامہ مسطور است کہ الطفا ر الطیب را پیار سی ناخن پریان گویندیش، ہندیش نکھہ نامند و آن داروئی است (۱۰۱) موید میں خرف کی شرح ہے :

و در قنیدی گوید حیوانی است از حیوانات دیدہ کہ بتاز لیش الطفا ر الطیب و ہند نکھہ و نکھوتر می گویند۔ (۳۹۲: ۱)

موید کے ان دونوں بیانات کا مدار کے بیان سے مقابلے پر معلوم ہوتا ہے کہ مدار میں ہند ج ہندی مترادف سنکہ یقیناً غلط ہے۔ یہ نکھہ (بمعنی ناخن) کا مصحف ہے۔ خود مدار میں خرف کی یہ تشریح ملتی ہے :

خرف ... در موید از قنید نقل کردہ کہ حیوانی است دیدہ کہ آنرا الطفا ر الطیب و ہند نکھہتر خوانند۔ (۱۳۰: ۲)

ڈاکٹر باقر صاحب نے جلد اول میں الطفا ر کا ہندی متبادل سنکہ لکھا اور جلد دوم میں نکھہتر لیکن ان دونوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی سو صفحات کے بعد ایسی معمولی چیز ذہن سے اتر جاتا قرین قیاس ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ مدار اور موید کے قول میں تھوڑا سا فرق ہے یعنی موید میں الطفا ر کے دو مترادف نکھہ اور نکھوتر دیے ہیں اور مدار میں محض نکھہتر ہے۔

اختار در موید اسب بر و بریز و بدہ الخ (۱۱۱: ۱)

دارالفاضل کی ترتیب نو

دار کے اس بیان کی تائید مؤید سے نہیں ہوتی، ملاحظہ ہو:
 "افشار بالفتح بریز وریز نہ وریختن کذا فی شرفنامہ (۳۹:۱)
 اور یہی بیان شرفنامہ کا بھی ہے:

افشار بالفتح بریز وریز نہ وریختن۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ اگر مؤید کے مندرجات سے اصل کا مقابلہ ہو جائے، تو متن و قیح تر اور قابلِ قدر ہو جاتا ہے؛ بحالی موجودہ نہیں کہا جاسکتا کہ صاحب دار نے مؤید کے غلط نسخے سے مطالب نقل کیے ہیں یا خود دار کا اندراج کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔

ام غیلان نام درختی است کہ خار ہاش کثیر باشد و در پنج بخش است، ہند جو انسا خوانند و در مؤید است درخت کیکر۔ (۱۲۵:۱)

اس بیان میں جو کچھ پنج بخش نامی کے حوالے سے نقل ہے، وہ زفانی گویا میں مینا موجود ہے۔ لیکن مؤید سے متعلق جو بیان ہے، وہ مؤید کے ملبوم نسخے سے کافی مختلف ہے:
 درختی است خار دار کہ خار و گج باشد ہندش جو انسا گویند کذا فی العقیقہ، اما در نسخہ ہست درخت خار دار کہ ہندش کیکر و بول گویند۔

دونوں کے مندرجات کے اختلاف کے علاوہ یہ بات واضح ہے کہ دار کے ملبوم نسخے میں کثیر غلط ہے؛ دراصل لفظ کثیر ہے جس کی دوسری صورت گج مؤید میں مندرج ہے۔

انج بروزی رنج بیرون کشیدن و بیرون کردن، در مؤید است از ادات و شرفنامہ و فرہنگ فقر تو اس بمعنی بیرونی روی چون بینی و زنج و کلمہ و در تختری و در مؤید آن معنی است الخ (۱۳۰:۱)

مؤید میں انج کے ذیل میں ہے:

بوزی رنج بیرون رفتن و بیرون کشیدن کذا فی لسان الشعر و در ادات شرفنامہ بیرون روی ہشتہ میں میدا تم شاید این تحریف کاتب باشد کہ بجای رفتن روی ہشتہ است الخ

دارالافتاح کی ترتیب

مویہ ہی میں لُج کے ذیل میں ہے :

بیرون روی چون مینی وز لُج و مرد دست بیکار معنی اخیر از زفان گویاست
بالفتح بیرون کشیدن الخ

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ مویہ میں لُج کے ذیل میں جو قیاس آرائی کی گئی ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔ بیرون روی صرف بیرون رفتن کی تصحیف نہیں ہے، بلکہ لُج خود معصفت ہے۔ صحیح لفظ لُج ہے، جو ملاوہ فرہنگ قواس کے لغت فرس اور صحاح الفرس میں آیا ہے ان تینوں لغات میں لُج درج نہیں ہے۔ مدار میں جو کچھ فرہنگ قواس کے حوالے سے آیا ہے وہ فرہنگ مذکور میں لُج کے ذیل میں ہے، نہ کہ لُج کے ذیل میں۔ اگرچہ فرہنگ قواس معروف تہجی کے اعتبار سے مرتب نہیں ہے اس بنا پر صاحب مدار کے ماخذ کے نسخہ فرہنگ قواس میں لُج کے وجود سے قطعی طور پر انکار نہیں ہو سکتا، اس فرق کے ساتھ کہ بیرونی روی تو جناب مرتب کی غلط خوانی ہے۔ بیرون روی درست ہے، ثانیاً فرہنگ قواس کے موجودہ نسخے سے کلمہ کا لفظ غائب ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب موصوف پر تصحیف کی نشاندہی کی ذمہ داری تھی۔ انھوں نے نہیں کی۔ صاحب مدار پر تصحیف کے نقل کی ذمہ داری مایہ ہوتی ہے۔ اس لیے قریم فرہنگوں میں لُج اور لُج دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ زفان گویا میں الف کے ذیل میں لُج اور ل کے ذیل میں لُج ہے۔ مویہ کے بیان سے کسی قدر دھوکا ہوتا ہے کہ شاید زفان میں لُج بمعنی بیرون روی نہیں، صرف مرد دست بیکار درج ہے۔ مگر ایسا نہیں۔ اس میں واضح طور پر ہے : لُج بیرون روی چون مینی وز لُج و مرد دست بیکار۔

اوشنگ : بوزی ومعنی اوشنگ و در فرہنگ فخر قواس است بمعنی آوند و
در مویہ گفتہ کہ می باید، این تصحیف باشد۔

مویہ میں ہے : اوشنگ بالفتح اوشنگ؛ اوشا و اوشنگ کے یہی معنی ہیں،

بالفتح تحسین بادشاہان و نام ماشینی گلچہر الخ

دراولا فاضل کی ترتیب نو

دار کے بیان کا مؤید کے مندرجات سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ دونوں کے بیانات کے بعض حصے غلط ہیں۔ دراصل اوٹنگ اورنگ کا مترادف نہیں، بلکہ آدنگ کا مترادف چنانچہ زبان میں ہے: اوٹنگ معلق و آن اورنگ است۔
مؤید میں آدنگ کے ذیل میں آیا ہے:

رسی کہ بیک سرش بجائی و سر دیگرش بجائی دیگر بندند... و ہندالگنی
نامند... و درادات بدین معنی اورنگ آورده است... و در دستور
ہم بدین معنی آورده است و این خطا و تصحیف است۔

اس سے واضح ہے کہ جو کچھ دار میں فرہنگِ فخر قواس کی طرف منسوب ہے وہ دراصل دستور الا فاضل میں ہے۔ راقم کے پیش نظر دستور الا فاضل کا منحصر نسخہ موجود ہے اور اس میں آدنگ کے بجائے آوند ہی درج ہے پس واضح ہوا کہ یہ خود صاحب دستور کی غلطی ہے، کاتب کی نہیں ہے۔

فرہنگ قواس کے نسخہ موجود میں اوٹنگ آیا ہے اور آدنگ کا مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ادات میں ہے۔ غالباً انھیں بیانات سے مارا اور مؤید میں غلطیاں واقع ہوئیں لیکن قواس میں مندرج اورنگ تصحیف ہے۔ اس لیے کہ اوٹنگ کو آوند کے ذیل میں بیان کیا ہے اور آوند کو آوند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اوٹنگ آوند کا ہم معنی ہے، نہ اورنگ کا۔ اس سلسلے میں اکثر فرہنگوں کا بیانی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ صاحب دار نے فرہنگ قواس کو نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کی طرف جو چیز منسوب ہوئی وہ فرہنگ قواس کے یہاں نہیں پائی جاتی۔

باغ : معروف۔ در مؤید است، این لفظ در فصل عربی نوشتہ و نیز در و نقل کرد
چنانکہ انواع و نباتی میوہ دار و گل دار و ترکاری و جزآن بود، بخلاف بوستان
و مہستانی و معنی بہشت نیز آید۔

مؤید کے مطبوعہ نسخے کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ اس کا بیانی دار سے بعض وجوہ سے

دارالاماخل کی ترتیب نو

مختلف ہے:

۱ مؤید میں فعل فارسی کے تحت ہے، جب کہ دار میں عربی گروا گیا ہے۔ عربی میں اس کے معنی بالکل مختلف ہیں لیکن مؤید میں یہ عبارت موجود نہیں: این لفظ در فعل عربی نوشتہ۔

۲ دار میں گل کے بعد دار د "فعل آیا ہے، جو غلط ہے، اسم فاعل مرغ یعنی گل دار ہونا چاہیے مگر گل دار کے بجائے گل آد زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ مؤید مطبوم نسخے میں ہے ۳ و جائیکہ کے بعد در آن، ضروری ہے در پورا جملہ غلط ہو جائیگا؛ مؤید کے مطبوم نسخے میں ایسا ہی ہے۔

۴ مؤید کے نسخے میں باغ کے لیے صفت پھول اور پھل والے درختوں کی قید نہیں ہے اس میں یہ ہے:

درختانی میوه دار و گل آرد و بی بار و خار دار باشند و ریاحین و ترکاری
نیز بود بخلاف گستان و بوستان الخ

باغ سپید : باغ خاص... کذا فی المؤید۔ راقم کو مؤید کے مطبوم نسخے میں یہ لفظ نہیں نظر آیا۔

بان : نوعی از درخت در مؤید و ابراہیمست درخت سہجہ و نیز در مؤید است؛
درختی است، مانند سرو۔ و قیل خوشبوی است سوختنی۔ فارسیان بمعنی
خداوند در آخر کلمہ آرد۔

مؤید میں بان (عربی) کے معنی درخت درج کیے ہیں، مگر مؤید نسخہ مطبوم، یہ باطنی کے ذیل میں ہے:

اندولی چیزی و پنہان و دانندہ نہای و باطنیہا سمار اللہ تعالیٰ و در زان گویا
ست کہ درخت سہجہ را گویند و در قنیا است درختی ست مثل سرو الخ

مدار الافاضل کی ترتیب نو

مگر مجھے زمان گویا میں نہ باطن اور نہ بان اس معنی میں نظر آیا۔ البتہ مؤید میں پان (فارسی) کے ذیل میں مدار میں مندرج بعض معنی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً
پان چہری خوشبوی از عطریای سوختنی و نیز نام درختی کہ ثمر آنرا حب الپان
نخونید الخ

یعنی جو مدار کے مطلوبہ نسخے کے حاشیے میں برہان کے حوالے سے درج ہے، اس کا جزم اعظم مؤید سے ماخوذ ہے۔ بہر حال مدار میں مؤید کے جس نسخے سے استفادہ ہوا وہ مطلوبہ نسخے سے جتنا مختلف تھا، اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بتخالہ: پیسی کہ بر روی برآید و در ابلہی مست؛ و اورا بتخالہ نیز گویند و حصار
مؤید گوید کہ دریں تصحیف جاری است و الحق چنین است و اورا کہ
در بای ابجد نویسد خطا است۔

مؤید میں بتخالہ نہیں، بتخال و بتخالہ دونوں ہیں، اس میں تصحیف جاری وغیرہ کا مطلق ذکر نہیں۔

بسا: معروف، در شرف نامہ است بمعنی بسیار، صاحب مؤید گوید کہ الف نمائے
درست نیست، زیرا چہ (بس) قابلِ ندا نیست۔ الخ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مؤید نے شرف نامہ پر اعتراض کیا ہے لیکن بصورتِ موجودہ شرف نامہ میں الف نہا نہیں، البتہ مؤید میں شرف نامہ کے حوالے سے الف نہا موجود ہے، مثلاً
بسا بالفتح اے بسیار، و بالکسر ام سائیک کذا فی الشرف نامہ۔ اقوال الذین اول معلوم
میشود کہ الف است و لیس کذا لک الخ

غلامہ کلام یہ ہے کہ مدار میں شرف نامے کے حوالے سے پوری عبارت درج نہیں ہو سکی۔

بستہ: مرقای کہ ہندش بنوائی گویند... در مؤید است مثبت او در تعیر
دیاست و در قیہ است بر سر درخت، در میان دیا از کوہ بیرون آید

- ... و ہر کسرخ در گردن بندد از زخم چشم ایمن باشد الخ
 مؤید کے منہ جات سے مقابلے پر حسب ذیل باتوں میں فرق نظر آیا :
- ۱ در قمر دیا کے بجائے مؤید میں قمر دیا ہے جو بہتر ہے
 - ۲ تبرہ درخت غلط ہے۔ "برشب درخت درست ہے اور یہی مؤید میں قنہ کے حوالے سے آیا ہے
 - ۳ مؤید اور زبان میں ہندی مترادف ہنوالی ہے و ہنوالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس لفظ کے بارے میں مشکوک رہے رکھتے ہیں اس لیے کہ برہست کے ذیل میں نسبت ہندی مترادف ہنوالی درج کیا ہے۔
 - ۴ ہر کسرخ الخ کے بجائے مؤید کی حسب ذیل عبارت زیادہ صحیح ہے :
 ہر کمر جان و دل در گردن کوکان بندد از مصرت چشم زخم ایمن باشند الخ
 زخم چشم غلط ہے، چشم زخم بمعنی نظر بد درست ہے۔
 ان امور کی ذمہ داری کتنی مولفہ مار پر ہے اور کتنی معج پر، وہ ظاہر ہے۔

بسیج : درمویہ است بوزن فراخ بآمالہ و نیز گفتمہ و مشہور بحیم پارسی است و
 ہمدان نقل کردہ کہ بمعنی سائنق کار و عزیمت و اندیشہ۔
 لیکہ مؤید کے مطلوبہ نسخے میں جم مری کے ذیل میں صرف اس قلم ہے :
 بسیج بوزن مریخ بآمالہ آہنگ یعنی قصد۔
 ظاہر ہے کہ قلمی نسخہ کی تلاش ضروری تھی۔ تاکہ دونوں بیانات کے درمیان لغات کی
 حقیقت واضح ہو جائے۔ آمالہ غلط ہے، امالہ ہوگا۔

بشترخ : درمویہ است بمعنی پارہ و خوشہ مرغما و انگور
 مؤید کے مطلوبہ نسخے میں ہے :
 بشترخ... و قیل بفتح رستی است کہ آنرا اسپرگ گویند و گیاہیست کہ

۱۔ لانا فاضل کی قریب نو

ریگ سبز دای زلف... و در دستور بمعنی پارہ از خوشہ انگور و خرا۔
واضح ہے کہ مار میں جو کچھ مؤید کے حوالے سے لکھا ہے، وہ دراصل دستور لانا فاضل میں ہے،
اور دستور کے موجودہ نسخے میں یہ معنی موجود ہے۔ البتہ زمان گویا میں آیا ہے:
بشترخ و زنی افشردا سپرک و آن گیا ہی است کہ جا ماہارا بلان رنگ کتند

بلبل بوستانی ازاغ: کیا یہ ازان سرور است علی الصلوٰۃ والسلام کہ زانی المؤید۔
درجائی دیگر آوردہ بمعنی بہشت و مصلح صوفیہ مقام وحدت کہ بغیری
ننگریست۔

مؤید میں بوستانی ازاغ آیا ہے اور اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:
ای باغ وحدت زیراچہ قول "ازاغ البصر واطغی" شعر برین است کہ
حضرت رسالت در مقام وحدت رسیدہ، بعدہ میل بمکر و بحور و قصور و
رواست کما زین بہشت مراد باشد۔

واضح ہے کہ جو کچھ مؤید میں مذکور ہے، وہ درست ہے، اور مار کا بیان الجھا ہوا ہے اس لیے کہ
اولاً اس میں بوستانی ازاغ اور بلبل بوستانی ازاغ دونوں میں خلط کر دیا گیا ہے۔
بوستانی ازاغ سے باغ وحدت اور بلبل بوستانی سے حضرت رسالت آب مراد ہیں۔ اس
کے علاوہ مار کا بیان باعتبار ذیل ناقص ہے:

- ۱ مؤید کے حوالے سے جو کچھ ہے، وہ مار سے غائب ہے۔
- ۲ بلبل بوستانی سے باغ بہشت و مقام وحدت مراد نہیں ہو سکتا۔
- ۳ ننگریست کا قائل محذوف ہے، یہاں عبارت چھوٹ گئی ہے۔

نچ: (عربی) معرب رنگ معروف و بعضی اجوائن خراسانی را گویند و از قنہ
و صاوتہ معلوم می شود؛ در تخریست بغم زخ؛ در مؤید است بغم زخ
و بغم از لسان الشعراء بمعنی آرزو نقل کردہ و لغتہ بدین معنی بعثت

نہ پڑھتے۔

در اصل مؤید میں عربی کے ذیل میں بیخ اس طرح آیا ہے :

مغرب بنگ و بعضی گویند، اجوائی غلامانی را بیخ گویند و از قنیہ معلوم

میشود کہ دھاتورہ را گویند الخ

فارسی کے ذیل میں اس لفظ کی تشریح یوں کی گئی ہے :

بنج بوزنی گنج ہماں بیخ مذکور کذا فی الشرفنامہ و در زخان گویا مذکور است

بنج بعنم زرخ و اللہ اعلم۔ شاید این زرخ بازار منقوطہ است کہ آنرا قولول

نیز گویند و در دستور نیز مدین معنی مسطورہ است ... و در قنیہ منقول از

لسان الشعر از معنی آرز است اما در نسخہ کتاب متروک است۔

دراغ ہے کہ مدار میں بیخ کے عربی اور فارسی معنی غلط ملط کر دیے گئے ہیں۔ جب زرخ اور

آرز و قولول قولول کے معنی میں ہیں تو مدار کا یہ قول کہ بیخ بمعنی آرز بقول صاحب مؤید

مطابق تحقیق ہے، غلط ہے۔ در اصل مؤید میں صرف اتنا ہے کہ قنیہ کے نسخے میں لسان الشعر

کے حوالے سے جو بات درج تھی وہ صاحب مؤید کے ملوکہ نسخے سے خارج ہے، صاحب مدار

نے اسے غلط سمجھا ہے۔

بزخ : بفتح زین، رنگ آب و عوگ و در دآب و بند آب، بوزن مرغ نیز، در

مؤید از فرنگ تو اس آدرہ بمعنی رسمہ و رنگ آب

مؤید میں بزخ کے ذیل میں ہے :

بوزن مرغ ... نیز رنگ آب کذا فی القنیہ و بزخ بعنم یکم و فتح دوم

عوگ و در دستور بمعنی سیرنگ آب مسطور۔

در اصل مؤید اور مدار کے اقوال میں بہت فرق ہے۔ مؤید کے مطبوعہ نسخے میں فرنگ تو اس کا

حوالہ نہیں، بلکہ دستور کا حوالہ ہے اور جو معنی دیے ہیں وہ اگرچہ مدار سے مختلف ہیں، لیکن

دستور کے نسخہ موجود کے عین مطابق ہیں در اصل ایک لفظ بزخ ہے جس کے معنی در دآب

مدار لفظی کی ترتیب نو

و بند آب کے ہیں اور دوسرا بزرگ ہے، جس کے معنی رنگ آب و خاک کے ہیں؛ یہی بیان زبان گویا کا ہے۔

تتمایچ : بحسب و جیم فارسی ... چونی است دراز مانند تیر کہ برای نان پیمیدہ می مانند۔ الخ و در مؤید این لفظ را در فعل ترکی آوردہ است۔ آبا براسطہ ترکیب لفظی تیرا یہ کہ در پارسی نویسند۔

لیکن مؤید کے مطلوبہ نسخہ میں تتمایچ اور تتمایچ فعل فارسی کے ذیل میں درج ہے اور دونوں کے معنی خود شمشہور ہے۔ جیسا کہ مدار تتمایچ (جیم تازی)۔ ان بین اختلافات کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

تمر قزک : قرآنی مجید و در مؤید است بہمیں معنی بفتح یکم و چہارم و پنجم و کسر دوم۔ مؤید کے مطلوبہ نسخے کی اصل عبارت یہ ہے :

تمر قزک یعنی قرآن مجید کذا فی فرنگ علی یگی و در فرنگ قواس ہم ہیں معنی بفتح یکم و چہارم و پنجم و کسر دوم مرقوم است۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدار میں جو کچھ مؤید کے حوالے سے نقل ہوا ہے وہ مؤید میں فرنگ قواس سے ماخوذ ہے۔ لیکن فرنگ قواس کے موجودہ نسخے سے تمر قزک غائب ہے۔ مؤید میں فرنگ قواس کا نام کئی جگہ غلط درج ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی ایک یادداشت راقم کے ایک الگ مضمون میں شامل ہے۔

جہلو : نوعی از غلہ و در مؤید است معنی مشتک ... و شتک تصغیر است و ہمیں صحیح است۔ و نیز نوعی از بازیا است۔

مؤید میں مشتک نوعی از غلہ و مشتک نوعی از بازی و کتک تین معنوں میں درج ہے اول دو معنوں کے لیے لسان الشعر اور فرنگ فہری کے ترتیب وار حوالے ہیں۔ لیکن

مدار افغانی کی ترتیب

فرہنگ میار جمالی شمس فخری سے یہ لفظ خارج ہے۔ معلوم نہیں کہ اس فرہنگ سے صاحب مؤید کی کیا مراد ہے؟ خلاصہ کلام یہ کہ صاحب مدار نے مؤید کے اخذ کے بجائے خود مؤید کی طرف معنی منسوب کر دیا ہے۔

چغہ : و در مؤید است بعضی بحیم تازی خوانند الخ
مؤید کے مطلوبہ نسخے میں دوسرے تلفظ کا ذکر نہیں ہے۔

چغہ : صاحب مؤید بحیم تازی و پارسی در باب رای ہملہ بمعنی عموک آوردہ؛
آتشہور برای مچھا ست۔

مؤید میں چغہ ترسیدک و التفات خودی معنی درج ہے اور چغہ کے ذیل میں یہ ہے:
بالفتح مع سکولی الغین المعجمۃ فیہا، جانو دیست آبی کہ آنرا عموک گویند۔
و در زفانی گویا ست کہ چغہ بفتحین ہم دست ترست و در فرہنگی نوشتہ
کہ چغہ آواز و صدای عموک را نامند و نیز ترس ویم و نال و ناری و نیز
بوہ بھیجا ہی۔

اس سے واضح ہے کہ صاحب مدار نے مؤید کا قول صحیح نقل نہیں کیا ہے۔ مؤید میں عموک
معنی کے لیے چغہ نقل کیا ہے نہ چغہ؛ البتہ زفانی گویا میں چغہ بمعنی عموک و صدای
عموک درج ہے۔

خرف : در مؤید از قنہ نقل کردہ کہ حیوانی است دریائی کہ آنرا اظفار الطیب
و ہند کہتر خوانند۔

مؤید کے مطلوبہ نسخے میں ہندی مترادف لکھ و نکموتری درج ہے۔ یہ بات قابل ذکر
ہے کہ مدار میں اظفار الطیب کے ذیل میں ہندی مترادف لکھ ہے، جو یقیناً لکھ کی
تصحیف ہے۔ ڈاکٹر باقر صاحب نے اس نام کی طرف قرار واقعی توجہ نہیں کی۔

دارالفاضل کی ترتیب و نو

بخت : در مؤیدہ بمعنی نیش کر نقل کردہ اند؛
 نید کے مطلوبہ نسخے میں ہے : ... در فرنگ مولانا فخر قواس بمعنی نیش کر است،
 ن فخر قواس کے نسخہ حاضر میں زحمت سرے سے فائب ہے معلوم نہیں صاحب
 نید کی غلط فہمی کی بنیاد کیا ہے۔ بہر حال ملازم جو کچھ مؤید کے حوالے سے ہے، وہ مؤید میں
 اس کے نام سے درج ہے۔

مارخک : در مؤیدہ است، بکاف فارسی و وزن باریک الخ
 نید میں کاف تازی اور کاف فارسی دونوں سے آیا ہے۔ اس کا وزن باریک کے بجا
 رک ہے، یعنی حرف چہارم بای تازی صامت ہے نہ مصوت کشیدہ۔

ن : در مؤیدہ است بفتح بوزن عج رخ و رخسارہ و بضم سرین و نیز گفتہ
 لغت اخیر از قیہ است الخ۔ صاحب مؤید ... از لسان الشعر نقل
 کردہ سنخ و زنی گنج، سرین ہا از قیہ آوردہ سنخ بضم سرین مردم۔
 نید کے مطلوبہ نسخے میں عج سرے سے فائب ہے۔ البتہ قیہ کے حوالے سے سنخ بمعنی
 سرین لکھا ہے۔ مطلوبہ نسخہ کے اعتبار سے مدار کا قول بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اس میں
 عج مذکور نہیں۔ قیہ میں سنخ ہے۔ ضمنا عرض ہے کہ زخان گویا میں عج بمعنی رخسار اور
 سنخ بمعنی سرین آیا ہے۔

شرک : بکسر فوعی از دیدگی کہ کوکان را باشد و جامہ بفتح نیز، و بضم جامہ کہ
 بالی دار و بندہ۔ صاحب مؤید گوید کہ در فرنگ فرخی بدین معنی و شرک
 بواو است۔

نید میں بکسر و بفتح بمعنی دیدگی، یقیناً بمعنی دام در ہا ہی بزرگ الخ آمدہ۔ اس سے
 اہر ہے کہ شرک کے ذیل میں صاحب مؤید نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مدار کے قول کی تائید

دارالافاضل کی ترتیب

نہیں ہوتی۔ البتہ درشک و دشرک کے معنی جامع دار و کھے ہیں اور اس میں کسی فرہنگ کا حوالہ نہیں۔ معلوم نہیں فرہنگ فرخی^{۲۵} سے کونسی فرہنگ مراد ہے، شمس فرخی کی فرہنگ مراد نہیں لی جاسکتی، کیونکہ اس میں نہ شرک ہے نہ دشرک نہ درشک۔ بہر حال مدار اور اس کے اخذ میں جو اختلاف ہے، اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

شید: در مؤید است و بیای پارسی، روشن و آفتاب و قیل یعنی چشمہ آفتاب مؤید کے مطبوعہ نسخے میں ہے:

بیای پارسی روشنی آفتاب و در زان گویا چشمہ آفتاب
مؤید کا یہ قول ڈاکٹر باقر مرتب نسخہ مدارالافاضل نے حاشیے میں نقل کیا ہے، لیکن اسخول نے یہ نہیں بتایا کہ متن حاضر (مدار) غلط ہے، روشن و آفتاب کی جگہ روشنی آفتاب چاہیے۔

فان: صاحب مؤید نقل کردہ چوبی کہ در درباری خانہ تاد را تبعمیل توانند شکست۔ اسدی گوید چوبی کہ در چوب شکافۃ بجہت استحکام نہند۔ مؤید میں ہے:

خانہ .. و در فرہنگ نامہ است خانہ چوبی کہ .. نتواند شکست۔ و اسدی گوید فاد مجاز است یعنی چوبی کہ دو شکافۃ نہند تا محکم کنند۔ کذافی ز فائنگریا۔

جو کچھ صاحب مدار نے مؤید کی طرف منسوب کیا ہے، وہ دراصل فرہنگ نامہ قواس کے مندرجات ہیں۔ اور فرہنگ اسدی کی جو عبارت مدار میں مندرج ہے وہ خود مؤید سے منقول ہے اور مؤید میں زان گویا ہے۔ بالفاظ دیگر در صاحب مدار نے اصل لغت دیکھے اور در صاحب مؤید نے۔

۲۵ ممکن ہے کہ اس سے فرہنگ فرخی مراد ہو، جیسا کہ مہلو کے ذیل میں لکھا ہے۔

دلائل داخل کی ترتیب نو

شما سب : چون او کشتہ شدہ جا اسپ حکیم کہ وزیر اویو، بجائے او نصب کردند
وہی آتش پرستی را آب دلو و در شرف نامہ بیای تادی نیز گفتہ و صاحب مؤید
گوید کہ در نسخہ شرف نامہ کہ در ام بیای فارسی است۔

مدار کی اس عبارت میں الفاظ جھوٹ گئے ہیں۔ مؤید میں عبارت بالکل صحیح ہے۔ مثلاً:
جا اسپ حکیم را کہ وزیر اویو، بجای زرقشت نصب کردند، تا اویو
آتش پرستی را آب دلو و در لسانی الشعر با بای تازی است کذافی شرف نامہ
تا در لسانی الشعر کہ نزدیکہ است، دران با بای پارسی است
اگر اس عبارت سے مقابلہ کر لیا جاتا تو مطبوعہ تن کا نقص دور ہو جاتا۔

مدار میں زفان گویا کے حوالے سے جو مندرجات آئے ہیں، ان میں سے بعض کامتابلہ
زفان کے نسخہ موجود سے کیا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ صاحب مدار اپنے ماخذ
کا استعمال کس طور پر کرتا ہے، اور ضمناً بعض مقامات پر مطبوعہ تن کا نقص بھی رفع ہو
جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر باقر صاحب کو زفان گویا کے نسخے کا علم نہیں تھا، اس لیے وہ اس
سے معذور رہے۔

بم : رود سطر باب و در پنج بخشی است بانگ بلند
زفان کے نسخے میں رود سطر و بانگ بلند دونوں معنی ضد مع ہیں۔

نخلی : در پنج بخشی است زقار و شادمانی
زفان کے موجودہ نسخہ میں یہ لفظ شامل نہیں۔

ختم : در زفان گویا بمعنی شاخ افی یا ماہی کہ او را زال گویند۔
مؤید کے مطبوعہ نسخے میں زفان کے حوالے سے زال کے بجائے زال ہے مگر زفان کے

دارالفاضل فی مرتبہ نو

نفس موجود میں حال ہے، اور کلمہ ماہی والی شعلہ کے یہاں اکٹرا آیا ہے۔ خلائی لکھا ہے:

از آئیں بنفشہ بروید ز روی خسارہ سلب

وزین پیشیز بریزد ز پشت ماہی وال

خرودہ و خرمہ: خردوس و جانور دشتی؛ و درادات بمعنی تاج خردوس و بتان افروز

و در پنج بخش خود خروہ بمعنی مذکور۔

اس میں شبہ نہیں کہ زفان میں خود خروہ کے وہی معنی ہیں جو دار میں آئے ہیں۔ لیکن خروہ

اور خروہ کے بھی وہی معانی زفان میں مندرج ہیں، جو دار میں نقل ہیں۔ مگر تعجب کی بات

یہ ہے کہ ان الفاظ سے صرف نظر کرتے ہوئے صاحب دار نے خود خروہ کا ذکر کیا۔ حال آنکہ

یہ لفظ اصلاً ایک لغت کی حیثیت سے دار میں آیا ہی نہیں ہے۔

زاک: پشکری و اجناس آن۔ و مؤید از طب نقل کروہ، ہندش تاج خوانندہ

و در شرف نامہ است بمعنی زک بضم ...

مؤید کا بیان یہ ہے:

زاک یعنی پشکری و اجناس آن و در طب حقایق الاشیاء مسطور است

زاک ہندوی تاج را گویند و در شرف نامہ بمعنی لک است۔

ان دونوں بیانیوں میں چند اعتبار سے اختلاف ہے:

۱ دار میں مندرج تین معنی مؤید سے ماخوذ ہیں۔ حال آنکہ صاحب دار ایک یا زیادہ

مضایادہ و دو کو مؤید کے حوالے سے نقل کرتا ہے۔

۲ دار میں 'طب' ہے، اور دار میں کتاب کا پورا نام طب حقایق الاشیاء درج

ہوا ہے۔

۳ شرف نامہ کے حوالے سے جو کچھ دار میں ہے، وہ حاصل مؤید ہی سے ماخوذ ہے۔ اس

حصے میں بھی 'زک' غلط ہے، لک 'ہونا چاہیے' مؤید الفضل میں یہی ہے اور شرف نامہ

میں بھی رُک کے بجائے لگ ہی پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو جو ڈاکٹر اتر صاحب کی توہم میں نہ آسکی۔

۴ 'رُک' کے بعد بضم د ثمود میں ہے، نہ شرف نامہ میں۔

۵ مار میں ایک قول تبختری کا درج ہے، جو نہ ثمود میں ہے، نہ شرف نامہ میں۔

زغاره : نان کا ڈرسی در پنج بخشی است نابکار و زمین سخت۔

زفان گویا کہ نسخہ موجود میں زغاره کے یہ معنی بیان ہوئے ہیں : زغاره نان کا ورسین و در نسخہ زراء معجمہ است۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ مار میں پنج بخشی (زفان) کے حوالے سے درج ہے۔ اس کا اصل نسخے سے کوئی تعلق نہیں۔

زغند : شد بر جستن، در پنج بخشی است و بانگ سخت

زفان کے نسخے میں اصل عبارت اس طرح ہے : بانگ سخت و بر جستن۔

جب تک مار کے نسخہ موجود ہیں پنج بخشی کے بعد علاوہ شدہ "محذوف نہیں سمجھا جائے" اس وقت تک اس میں مندرج معنی ناقص ہیں۔

زلہ : در پنج بخشی است و پزردہ و گناہ و آنچه صوفیان از آمدہ برگیزند۔

زفان کے نسخے میں زلہ کے یہ معانی درج ہیں : کمری است کہ در گرمابا باشد و فریاد کند۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب مار نے جو کچھ زفان کے حوالے سے لکھا، اس کی تائید نسخہ موجود سے نہیں ہوتی۔

سرخوچ : در پنج بخشی است سرلوش و پامہ جامہ کہ زفان زیر دامن افکند الخ

زفان گویا میں ہے، اسرای خوچ، سرلوش کہ بتازی عنانہ گویند۔

ظاہر ہے کہ مدار میں جو دوسرے معنی درج ہیں، وہ نسخہ زفانی سے خارج ہیں۔

سرام : در زفانی گویا است دای قلعی کہ در سر باشد۔
زفانی کے نسخہ معاصر میں ہے : سرام قلعی است یعنی قلعہ داغ۔ دونوں سند جات میں جو
فرق ہے وہ اظہار من الشمس ہے۔

شفترنگ و شفرنگ : شفتالو و درخت بخش آلودہ کہ بار درختی است، اتند شفتالو بیشتر
سرخ و پید باشد۔

زفان گویا میں شفرنگ کے یہ معنی درج ہیں : شفتالو و درخت رنگ نامہ است کہ میوہ است
مثل شفتالو، سرخ و پید باشد۔

واضح ہے کہ مدار میں جو کچھ زفان کی طرف منسوب ہے، وہ زفان میں فرہنگ نامہ کے حوالے
سے آیا ہے، اور فرہنگ نامہ سے مراد فرہنگ نامہ قواس ہے۔ چنانچہ قواس کے نسخہ موجود میں
یہ معنی درج ہیں۔

شیب : بکرو یا ی پارسی نشیب بمعنی فرو۔ و درختی است مختصر نشیب و با و
یای فارسی فرود و آشفتن و بمعنی کونیز۔ و درختی بخش است بیای پارسی و
تازی بمعنی مذکور۔

مگر زفانی کے نسخہ موجود میں یہ ہے :

شیب تازیانہ و فرود چیز است و در اسدی شیب بابر عربی و پیام
پارسی... رشتہ تازیانہ۔

مدار اور زفانی کے سند جات میں جو فرق ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ بیای پارسی و تازی کے
بجائے بیای پارسی و بای عربی درست ہوگا۔
فہم : و درختی بخش گفہ اند، نام داروی است۔

زفان کے نسخہ موجود ہیں یہ لفظ شامل نہیں؛ داروی میں یا ہی تکبیر کا اضافہ ہونا چاہیے۔

قرآن خواک، گوشتابہ، در زفان گویا و پنج بخشی این لفظ را در قاف آوردہ و الا در فرنگہای دیگر در باب فاست۔

زفان گویا میں قرخواک بمعنی گوشتابہ ہے۔ یعنی فاکے ذیل ہی میں ہے۔ دراصل محاسبہ مؤید سے غلطی ہوئی کہ اس نے لکھا کہ در زفان گویا با قاف آوردہ۔

مگر زفان کے نسخہ موجود سے اس کی بخوبی تردید ہو جاتی ہے۔ ضمناً دو باتیں اور بیان کرنے کی ہیں۔ اولاً مدار میں زفان گویا و پنج بخشی سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس سے دو لغات مراد ہیں۔ ثانیاً مؤید میں قرخواک کے ذیل میں زفان کی طرف غلط قرأت منسوب ہے یعنی قرخواک جیسا کہ مدار میں ہے۔

قرآنکند: در پنج بخشی آوردہ کہ این زبان نبلی است۔
دراصل زفان کے نسخہ موجود میں قرآنکند ہے اور ایک باز بخش پنجم در سخانی آیمختہ از تازی و ترکی و محلی کے ذیل میں اس طرح آیا ہے،
قرآنکند لغات و این نبلی است۔

دوبارہ لغات ترکی کے ذیل میں بخش ہفتم میں قرآنکند بمعنی لغات درج ہے۔
خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس لفظ کی جو شکل مدار میں درج ہے یعنی قرآنکند، کجاغند، کجاگند، کواغند و کمرآگند، ان میں سے کسی کا زفان میں مندرج صورت سے کوئی تعلق نہیں ہے

داس کالہ، عصای سرکچ و داس رزمی پرای، در سکندی و ادات و پنج بخشی
”سرکش“ قیدہ شد۔ و در ابراہیمی و مؤید ”سرکچ“ و ہم در پنج بخشی است
و بعضی گویند عصای تبرکش۔
زفان کے موجودہ نسخہ میں ہے:

داس کا، عصای سرکش و داس ز پیرای و بعضی گویند عصای سرکش۔
اس سے ظاہر ہے کہ مار میں زفانی کے حوالے سے سرکش معنی تجویز کرنا غلط ہے، اس لغت میں بالکل وہی معنی مندرج ہیں، جو مار میں آئے ہیں۔ سرکش سرکش کی غلط خوانی ہے۔ اس کی فہم کی ذمہ داری صحیح پر ہے۔

قیداف: نام مردی کہ پادشاہ بدروع بود و در شاہنامہ و پنج بخشی ملکہ روم گفتہ
و در مویا است: نوشاہ را گویند۔

زفانی کے موجودہ نسخے میں اس طرح آیا ہے: قیداف نام زنی کہ ملکہ بدروع فاندلس بود،
مویا میں زفانی کے حوالے سے صحیح معنی دیتے ہیں۔ اس میں مزید یہ ہے کہ شاہنامہ میں ملکہ روم
ہے۔ واضح ہے کہ مار کا بیان زفانی گویا اور مویا الفضلا دونوں سے بالکل مختلف ہے۔

کراہ: بکسر، و مویا است بفتح مرغست سیاہ و در پنج بخشی است، واسب الخ
زفانی کے نسخہ، موجود میں حرف چہارم 'یا' ہے۔ اور اس کے معنی صرف مرغ سیاہ
درج ہیں۔ مویا میں بھی کراہ ہے اور اس کے کئی معنی بشمول اسپ و شتر و اجرت کوئی
وغیرہ درج ہیں۔ بہر حال جو معنی مار میں بحوالہ زفانی درج ہے، اس کا نسخہ موجود ہے
کوئی تعلق نہیں۔

کنجہ: داروئی کہ عرب آنرا عنزروت خوانند.... و در پنج بخشی است بکسریم
پادزہر۔

زفانی کے موجودہ نسخے کی عبارت ملاحظہ ہو:

بعض و فتح جیم عنزروت، فانی داروئی است، و در فرنگنامہ است،
کنجہ بکسر جیم پادزہر گویند آن داروئی است۔

جہاں ہے کہ جو کچھ مار میں زفانی کے حوالے سے لکھا ہے، وہ دراصل فرنگنامہ کے مندرجات ہیں

مارا الافاضل کی ترتیب نو

اور فرہنگنامہ قواس کے موجود نسخے میں یہ عبارت بعینہائی بجاتی ہے۔

کوچ بجوچ : صاحب مؤید مرکب دنداں را گوید یعنی زفن بتواتر و در سکندری
و پنج بخشی است مرکب کوچ بلوچ و کلمہ دوم بلام و ہر دو کلام بمعنی
نذکرہ۔

زفانی میں آیا ہے : کوچ و بلوچ مرکب و در ہر دو واو پارسی، دنداں را گویند و مجرد
کوچ احوال باشد و چند و پیارہ و دزد و بعضی بحکم عربی گویند۔
مؤید کے مطبوعہ نسخے میں کوچ کوچ ہے۔ اس میں مندرج معنی کا مدار کے معنی سے مقابلہ
کرنے پر معلوم ہوا کہ گوید کے بعد مار میں واو عاطفہ درج ہونے سے مدہ گچھ۔ اسی طرح
زفانی سے مقابلہ سے ظاہر ہے، بلوچ کے بعد مار کی عبارت میں واو زائد ہے، اور ہر
دو واؤ کے بعد پارسی کا لفظ درج ہونے سے رہ گیا ہے

کوک : و پنج بخشی است بوا و تازی و بلو و پارسی ترہ الیست کہ ہندش
بجاتل گویند۔ صاحب مؤید گوید ترہ الیست کہ از خود دل آن خواب
زیادہ شود۔

زفانی کے نسخے میں صرف واو فارسی سے ہے اور ہندی مترادف بمتل ہے اور یہی شکل
فرہنگ قواس اور دستور الافاضل میں بھی ہے۔ مار میں جو کچھ صاحب مؤید کے حوالے
سے نقل ہے، وہ زفانی میں بھی موجود ہے۔ پس اس قدیم فرہنگ کے حوالے کے بجائے
اس سے جدید تر فرہنگ کا ذکر کرنا مناسب ہے۔
بہر حال یہ قابلِ توجہ امور ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب کو غور کرنا چاہیے۔

کار : صاحب مؤید مطلق نیش دنداں ہم آدہ، در زفانی گویا و پنج بخشی است
بئی دنداں و محوی جثہ و موصو کہ بر سر کوہ باشد۔ اما در ادات بدین معنی

دارالفاضل کی ترتیب نو

بکاف تازی است۔

معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مدار نے زفانی گویا میں یہ لفظ خود نہیں دیکھا، ورنہ وہ اس طرح نہ لکھتے۔ دراصل زفان میں گھاز کے ذیل میں صرف اس قدر ہے:

گھازیشِ دندان و موی جشہ،

اسی فرہنگ میں گھاز کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں:

صومعہ بر سر کوہ گویند محیسم بکاف فارسی است۔

صاحبِ مؤید نے زفانی کی دونوں عبارتیں ملا کر گھاز کی اس طرح وضاحت کی:

در زفانی گویا است گھاز پیشِ دندان و موی جشہ و صومعہ باشد بر سر

کوہ و درادات بدین معنی اخیر بکاف تازی است۔

بظاہر صاحبِ مدار نے مؤید سے نقل کیا ہے، نہ براہِ راست زفان وادات سے۔ اس لیے کہ اس کے مندرجات زفان سے مختلف ہیں مگر وادات کے سلسلے میں تو یہ غلطی ہوئی ہے کہ صاحبِ مدار کے نزدیک وادات میں صومعہ کے علاوہ اور معنی کے لیے بھی گھاز بکاف تازی ہے، نہ گھاز (بکاف فارسی)، حال آکھ حقیقت یہ نہیں ہے۔ وادات میں فقط صومعہ کے معنی کے لیے گھاز اور بقیہ کے لیے گھاز ہے۔ یہی مؤید کا بیان ہے۔ مگر مدار کے مطلوبہ نسخے میں تھوڑی سی غلط فہمی کی صورت نظر آرہی ہے۔

گوپال: دیونج بخشی است: فردوسی گوید سخت آہنین و چوبین۔

زفانی کے نسخے میں ہے: گوپال باوا پارسی گرز واسدی و فردوسی گویند: سخت آہنین و چوبین باشد۔

زفان میں دو فرہنگوں کا ذکر ہے، لیکن مدار نے اس فقرے کے حوالے سے صرف ایک فرہنگ کا ذکر کیا ہے؛ ثانیاً سخت، سخت کی مضحکہ خیز تصحیف ہے جس کو بظاہر مولف کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ یہ معنی نسخہ کی غلط خوانی ہے۔ برہان میں سخت کی جگہ سخت اور اوزنگ آہنین و چوبین ہے۔ یہ بھی نہایت مہمل تصحیف ہے۔

مدار الافاضل کی ترتیب نو

گوز: بکاف پارسی بوزن سوز و خود کہ آنرا چہار مغز نیز گویند و در پنج بخشی
بمعنی بد و ازین جاست کہ لغتہ اند، بانقران لغزی و باگوزان گودی۔
زنان کے نسخے میں یہ ہے:

گوز: جوز و بدین جاست کہ گویند بانقران لغزی و باگوزان گودی؛
و بمعنی بضم کاف و واو پارسی گویند و بدین لغت نیز بادی مراد است
کہ از دُبر رہا شود۔

یہ ساری باتیں مؤید میں بعینہ مندرج ہیں۔ مگر صاحب مدار نے ان کو ادھورا نقل کیا؛
مطبوعہ متن میں حسب ذیل نقائص ہیں:

(۱) سوز کے بعد واو عطف غلط ہے۔

(۲) خور غلط ہے، جوز ہونا چاہیے۔

(۳) پنج بخشی کے حوالے سے بد غلط ہے، باد ہونا چاہیے اور یہ بامخصوص ہے۔

(۴) 'ازینجا' سے جو سبب شروع ہوتا ہے، وہ تمام تر غلط ہے؛ بد (صحیح باد) کے
جگہ اس کا تعلق جوز سے ہے، جیسا کہ زنان اور مؤید دونوں سے ظاہر

جس طرح زنان گویا تک معج مدار الافاضل کی رسائی نہ تھی، اسی طرح فرہنگ قواس
کا نسخہ بھی ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ مدار میں فرہنگ قواس کا نام چند جگہ آیا ہے،
لیکن یہ فرہنگ صاحب مدار کے ماخذ میں نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی دوسرے
ماخذ سے یہ اطلاع حاصل کی گئی ہے۔ اگر ایسے تمام مقامات کی تصحیح فرہنگ مزبور کے
نسخہ موجود سے کر لی جاتی، تو مطبوعہ متن ناقلاً از اور صحیح تر ہو جاتا۔ اس فرہنگ کی نسبت
سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

سارنک و در فرہنگ قواس بمعنی پشتہ و کند

قواس کے نسخہ منحصراً بغرد (دوق ۲۴ الف) سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'ارد' کے معنی کند کے
ہیں اور سارنک کے معنی پشتہ؛ 'ارد' اور سارنک دو الگ الگ لفظ ہیں۔ اس سے ظاہر

کہ سادہ رنگ کے ذیل میں نارنگ کے معنی بھی درج ہو گئے ہیں۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ صاحبِ مدار کی غلطی کسی قدیمی فرہنگ کی غلط خوانی پر مبنی ہے۔

مدار میں صحاح الفرس کے جا بجا حوالے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب سے صاحبِ مدار براہِ راست استفادہ نہیں کر سکا ہے، لیکن بعض قدیمی ماخذوں میں اس کتاب سے استفادہ ہوا ہے۔ اسی بنا پر مدار میں اس کا نام برابر آتا ہے۔ اس فرہنگ کے قلمی نسخے عام نہیں۔ لیکن چار سال قبل یہ ایران میں طبع ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اب سہل الحصول ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے مدار الافاضل کی تفہیم میں اس سے کام نہیں لیا۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سیکے گا کہ صحاح الفرس سے استفادے کی کتنی ضرورت تھی۔

خرابنار، آنکہ جمعی بایکی... کنند، لبیبی، یکی مفاجری شرم ناخوشی کہ ترا الخ۔ و در صحاح فرس و بعضی کتاب لغت بمعنی جمع شدن در کاری آورده اند، بتائید این بیت استاد: بمدح او قصد دشمنانش الخ صحاح الفرس میں فقط معنی اول مع بیت لبیبی کے درج ہیں، مگر جو کچھ صاحبِ مدار نے اس لغت کے حوالے سے درج کیا ہے، اس سے صحاح الفرس کا کوئی تعلق نہیں۔

دبوت: در صحاح گوید، چیزی است چنانکہ کہ آن مرغ میدان کند۔ در اصل یہ لفظ صحاح الفرس میں موجود نہیں۔ صاحبِ مدار کو غلط فہمی ہوئی۔

ژاژ: در صحاح فرس و بعضی لغت فرس گفتہ کہ گیا ہی است کہ خار ہا بسیار دارد، و از آن ترہ دوغ کنند و در صحرای شتر باشد و در بیشتر مواضع آنرا کتکرہ گویند۔

استاد: حسود شتر دل کہ میبش کنند سزا کہ تشکیبدا شتر ژاژ

مدار الافاضل کی ترتیب نو

صاح الفرس کے مطبوعہ نسخے میں یہ ہے :
 ژاژ دو معنی دارد، اول گیا ہی باشد تلخ کہ تره دو رخ از وی سازند یعنی
 ریچال مسجدی گفت : ژاژ داری تو دستند بسی ژاژ خزان الخ : دوم سخن
 ہریان و یا ذبور : فرخی گفت : کسی کہ ژاژ در آید بد گھٹش بنور الخ
 اس سے واضح ہے کہ جو کچھ مدارس صحاح الفرس کے حوالے سے درج ہے وہ صحاح کے
 مطبوعہ نسخے سے بالکل مختلف ہے ۔

سپنج : امار صحاح فرس گفتہ کہ معنی سپنج آرا نگاہ و جای مہمانی است و مستشہد
 این سخن یتی آوردہ از فردوسی :
 گما مشب بدین خان یا ہم سپنج نباشد کسی را ز من بیج رنج
 صحاح کے مطبوعہ نسخے میں ہے :
 سپنج آرا نگاہ باشد و جای مہمانی و عارف عاریتی نیز گویند ، فردوسی گفت :
 چنین است رسم سرامی سپنج گہی ناز و نوش و گہی درد و رنج
 ان دونوں بیانوں میں جو اختلاف ہے ، وہ اظہر من الشمس ہے

قلقبائی : در صحاح فرس گفتہ زعم من آنست کہ آن سنگ را غلبتائی یعنی (صح
 بغین) معجمہ باید گفت بجهت آنکہ اورا بر بام می غلطاند و در نیست کہ
 بواسطہ تکرر استعمال قاف بغین (صح بغین) قرب مخرج بدل کردہ
 باشند ۔

صاح کے مطبوعہ نسخے میں ہے :
 زعم این ضعیف آنست کہ آن سنگ را غلبتائی بیاہ گفت بغین معجم ،
 نہ بقاف چہ بعض از زبانہا بام را بان گویند و بقلب مہم بہ وزن ، و آنرا
 بر بام می غلطاند و بحضرت استعمال قاف بغین مبتدل شدہ جہت

قرب مخرج۔

دونوں بیانات میں جو بنیادی فرق ہے، وہ بخوبی ظاہر ہے۔

اب تک ان اخذوں کا ذکر ہوا ہے جو باوجود اس کے کہ ضمنی اور ثانوی ہیں۔ لیکن ان سے اصل لغت، معانی اور آیات استشہاد سب کی تصحیح میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بعض ایسی کتابوں کا ذکر ہے جن کے حوالے سے کوئی تاریخی واقعہ درج ہوا ہے۔ معجم نسخہ کا فرض تھا کہ ان مخصوص کتابوں سے حسب ضرورت استفادہ کرتا۔ اس کے متن کی تصحیح میں بڑی مدد ملتی۔ ذیل میں بعض ایسے مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے، جن میں کتابوں کے حوالے ہیں۔ اور اگرچہ یہ کتابیں چھپ کر عام ہو چکی ہیں۔ لیکن معجم نسخہ، مدار نے ان سے استفادہ غیر ضروری خیال کیا۔

۱ : ۵۲ میں التیز کے ذیل میں طبقات ناصری کا حوالہ ہے۔ یہ واقعہ طبقات میں (کابل ایڈیشن ۱ : ۳۰۰ پر) موجود ہے، لیکن دونوں میں قدرے تفاوت ہے، مثلاً :

۱۔ طبقات میں التیز ہے، مدار میں التیز

۲۔ طبقات میں وطواط نام : امام رشید الدین ہے، مدار میں امام الرشید

۳۔ حدائق کا نام طبقات میں کتاب حدائق فی دقایق الشعر ہے، مدار میں حدائق السحر

۴۔ طبقات میں تالیف، مدار میں تصنیف

اگرچہ یہ بنیادی اختلاف نہیں، لیکن مدار نے صاحب طبقات کے اصل اقوال نقل کیے ہیں۔ اس بنا پر یہ جزوی اختلاف بھی قابل توجہ ہیں۔

۱ : ۶۵ میں ادیم کے ذیل میں قبعر شری شاعر کا ایک مکالمہ حجاج کے ساتھ، منقول ہے، اور حوالے کے سلسلے میں ہے، کذا فی المطول الہروی (کذا)

یہ واقعہ مطول میں موجود ہے، جس کا مولف گفتا زانی ہے، اور کتاب عربی میں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مطول کے مولف کے تعین میں مدار کے مطبوعہ نسخہ میں مترج غلطی ہوئی، معلوم نہیں یہ غلطی صاحب مداری کی ہے، یا ڈاکٹر محمد باقر معجم نسخہ موجود کی۔ الہروی، غلط ہے۔

مدار الافاضل کی ترتیب نو

”الہروی“ صحیح ہوگا۔

۱۰۱، ۱۲۱، ۱۲۱ میں الفیہ و شافیہ کے ذیل میں مذکورہ دولت شاہی کے حوالے سے طغانی شاہ سلجوقی کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ مذکورہ دولت شاہی سے مراد مذکورہ دولت شاہ سمرقندی ہے جو مطبوعہ فنکھل میں موجود ہے۔ رادریہ واقعہ بھی اس میں شامل ہے۔ اگر معجم کے قلم سے حاشیے میں اس کا اضافہ مع تاریخ طغانی شاہ کے ہو جاتا، تو متن زیادہ ناقص اور قابلِ توجہ ہوتا۔

۱ : ۱۲۹ میں انگلیوں کے ذیل میں کشف المحجوب کا ذکر ہے۔ کشف المحجوب چھپ چکی ہے، اگر مدار میں مندرج مطالب کا اصل نسخے سے مقابلہ ہو جاتا، تو بعض غلطیاں اور خامیاں رفع ہو جاتیں۔ مثلاً مدار میں صاحب کشف کی نسبت جلالی دی ہے، جو جلالی کی تصحیف ہے۔ اس کی تصحیح از بس ضروری ہے۔ وضع مانی غلط ہے، وضع مانی ہونا چاہیے۔ رودی کے بعد در زائد ہے۔ فرہنگ سرودی کا متن میں توسیع کیا، اضافہ غلط ہے، یہ نام حاشیے میں درج ہونا چاہیے تھا۔

۲ : ۲۰۷ پر چہر زاد کے ذیل میں ایک واقعہ طبقاتِ ناصری کے حوالے سے درج ہے۔ یہ واقعہ طبقات کے موجودہ نسخے (۱۰ : ۱۲۵، ۱۲۶) میں موجود ہے۔ دونوں یہاں کے مقابلے سے اندازہ ہوا کہ مدار کا متن ناقص ہے، اور اس کا نقص مطبوعہ نسخے کے مقابلے سے رفع ہو سکتا تھا۔ متن مدار کے بعض نقائص یہ ہیں :

طبقاتِ ناصری

چون بہمن از دارِ قنا نقل کرد

پسری آمد، طلا نام کرد، بر رسید

ہمای شغصِ حالِ ادوی بود چون اورا معلوم شد

و باد آں را بجلد آورد

سبزان رسید

مدار الافاضل

چون بہمن نقل کرد

پسری آمد دانا نام کرد و بر رسید

ہمای شغصِ حالِ ادوی بود اورا معلوم شد

و باد آں را بجلد بآورد

اسیطان رسید

اس طرح کی مثالوں سے پوری طرح واضح ہے کہ متن کی تصحیح کے موقع پر ان تاریخی کتابوں سے استفادہ ضروری تھا۔

دارالافتاح کی ترتیب نو

ڈاکٹر محمد اقرع دارالافتاح شرعی تحریک کی طرف توجہ نہیں کر سکے، حال آنکہ دو درجہ میں تصحیح متن کا یہ بھی لازمی عنصر ہے۔ اس لیے کہ اس کی بدولت شاعر کا نام معلوم ہو جاتا ہے، کبھی کبھی شرعی دوسری روایت کا بھی پتا چلتا ہے اور اکثر متن کی تصحیح ہو جاتی ہے۔ دارالافتاح کے سلسلے میں لغت فرس اسدی، صحاح القس، فرہنگ قواس، مشرق نامہ وغیرہ خصوصیت سے قابل توجہ تھے۔ ان میں سے اول دو تو مطبوعہ فیکل میں موجود بھی ہیں اور ان سے استفادہ نہایت آسان ہے۔ ذیل میں اس سلسلے کی بعض مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

- ج اول ص ۱۲ البتہ کے ذیل کا شعر شبید کا ہے
 ص ۲۰ آغشیج کے ذیل کا پہلا شعر شمس فخری صاحب میعار جمالی کا ہے۔
 ص ۳۱ آفاذ کے ذیل کا شعر عنصری کا ہے
 ص ۳۳ آفریں کے ذیل کی بیت تاج ریزہ کی ہے
 ص ۳۷ آمرغ کے ذیل کا شعر کسائی کا ہے
 ص ۱۲۸ انبرہ کے ذیل کی بیت خواص کی ہے
 ص ۱۵۴ ایلیا کے ذیل کا شعر اسدی طوسی کا ہے۔
 ص ۱۵۶ باغسہ کے ذیل کا شعر شاہنامہ میں نہیں، اس کا مصنف اسدی طوسی ہے اور یہ شعر مگر شاسب نامہ (ص ۴۰۰) میں موجود ہے۔ متن میں بیت لنگ غلط ہے، بیست رنگ ہونا چاہیے۔
 ص ۱۶۵ بادغر کے ذیل کا شعر ابو شکور کا ہے۔ دونوں میں بیت کی قرأت میں بڑا اختلاف ہے:

دارالافتاح	صحاح ۷۴
بساغای وکاشاد و بادغر	بسا جای کاشاد و بادغر
بزیر اندوشاد می نوش کرد	بدواندرون شادی و نوش خود
ص ۱۷۶ بالغ کے ذیل کا شعر عمارہ کا ہے، نہ عمار کا؛ صحاح میں بیت کی قرأت میں اختلاف پایا جاتا ہے،	

مدار الا حاصل فی ترتیب نو

مدار صحاح
 باجنگ سعدیانہ و بالذی و کتاب
 آمد سحابی چاکر خود خواہجہ با صواب
 واضح رہے کہ مدار کے مطبوعہ نسخے میں شعر جس طرح لکھا ہے، یہ بھی معنی ہے۔
 ص ۱۷۸ بالوانہ کے ذیل میں جو بیت، مدار میں درج ہے، وہی لغت فرس، صحاح الفرس
 اور فرہنگ قواس میں بالوائہ کے لیے بقید شاعر غنوی آئی ہے۔ مدار کی قرأت اور دوسری
 قرائتوں سے خاصی مختلف ہے:

مدار میج قرأت
 آب و آتش بہم بریا میزد
 آب و آتش بہم نیامیزد
 بالوائہ ز خاک بگریزد
 بالوائہ ز خداد بگریزد
 ظاہر ہے کہ یہاں میزد غلط ہے، خداد ایک نیکو کاری چڑیا ہے، جس کو غیلواذ کہتے ہیں۔ اس سے
 بالوائہ جو ایک چھوٹا پرندہ ہے، خوف سے گریزاں رہتا ہے؛ اسی کی طرف شعر مذکور میں اشارہ
 ہے۔ مدار کے نسخے میں مطبوعہ شعر یہ معنی ہے۔
 ص ۱۷۸ بالوس بمعنی کافور منشوش کے ذیل میں یہ شعر بغیر شاعر کی تخصیص کے نقل ہوا ہے:
 کافور تو بالوس شد و مشک ہمہ پاک
 آلود گیت در ہمہ ایام نشد پاک
 یہ شعر صحاح فرس اور لغت فرس جاحشہ میں اس طرح آیا ہے:
 کافور تو بالوس بود مشک تو باناک
 بالوس تو کافور کنی دایم منشوش
 البتہ فرہنگ قواس میں شعر کی صورت مدار سے مشابہ ہے یعنی:

کافور تو بالوس شد و مشک ہمہ پاک
 آلود گیت در ہمہ ایام نشد پاک
 واضح ہو کہ پاک جو مدار میں ہے وہ غلط فاش ہے، صحیح لفظ ناک ہے، اور ناک ہی کی توضیح
 کے لیے فرنگوں میں آیا ہے۔ ناک مشک منشوش کو کہتے ہیں۔ البتہ شاعر کے نام کے بارے
 میں اختلاف ہے لغت فرس (تمن) اور فرہنگ قواس میں مدد کی کا نام اور لغت فرس (حاشیہ)

اور صحاح الفرس میں کسائی کا نام درج ہے۔

من ۱۹۱ ہجرت کے ذیل کا شعر سوزنی کا ہے

من ۲۰۴ ہجرت کے ذیل کا شعر عنبری کا ہے

من ۲۲۵ ہجرت کے ذیل کا شعر ابو القاسم مودب کا ہے اور لغت فرس و فرہنگنامہ قواس اور صحاح الفرس میں نقل ہے؛ فرہنگنامہ کے قلمی نسخے میں یہ نہایت غلط درج ہوا ہے۔

لغت فرس اور صحاح الفرس میں پہلے مصرع میں "ای عشق باز" کی جگہ "عاشقا" ہے۔ مدار کے دوسرے مصرع میں خیر غلط ہے، "خیز" ہونا چاہیے۔

من ۲۲۵ ہجرت کے ذیل کا شعر فردوسی کا نہیں فردوسی کا ہے۔ فردوسی ایک قدیم شاعر ہے جس کے اشعار لغت فرس، صحاح الفرس، فرہنگ قواس، ترجمان البلاغہ وغیرہ کتابوں میں موجود ہیں۔ مدار میں جس طرح شاعر کا نام غلط درج ہو گیا ہے اسی طرح دوسرے مصرعے میں برتشت بھی غلط ہے، صحیح برتشت ہے۔

من ۲۳۱ ہجرت کے ذیل کے شعر میں اوستہ کی جگہ قی اوستہ صحیح ہے جیسا کہ لغت فرس میں ہے، اسی طرح علم بھی غلط ہے، علم ہونا چاہیے۔

من ۲۳۵ ہجرت کے ذیل کا دوسرا شعر سوزنی کا ہے۔

من ۲۵۱ ہجرت کے ذیل کے دونوں شعر صحاح الفرس کے مولف کے باپ ہندو شاہ نجوانی کے ہیں۔ مدار میں اصل لغت تو بای عربی اور شعر شاعر میں غلط بای فارسی ہے مگر صحاح میں دونوں جگہ بای فارسی ہی ہے۔

من ۲۹۵ ہجرت کے ذیل کا شعر کسائی کا ہے، مدار کے نسخے میں پہنانہ غلط چاچی ہے۔

من ۲۸۱ ہجرت کے ذیل کے شعر شاہد میں چشم کی جگہ خشم اور اندلان کے بجائے اندرون ہونا چاہیے۔

من ۲۸۳، ۲۸۴ ہجرت کے ذیل کی بیت ابو القاسم کی ہے۔

من ۲۹۸ ہجرت کے ذیل کی بیت آغا جی کی ہے۔

من ۳۱۳ ہجرت کے ذیل کی بیت شاکر بخاری کی ہے۔ بیت مذکور میں غلط بلندی ہے مگر

مدار لافاضل کی ترتیب نو

صباح میں لغت اور شعر دونوں جگہ بلندیں (بای عربی) ہے۔
 ص ۳۱۵ پناغ کے ذیل کی بیت سوزنی کی ہے؛ فرنگ قواس میں بناغ ہے۔
 ص ۳۳۵ پیلور کے ذیل کی بیت دوم خاقانی کی ہے۔ دیوان خاقانی اور فرنگ فرخ قواس
 میں بای عربی سے ہے۔

ص ۳۳۷ یوس کے ذیل کی دوسری بیت عنصری کی ہے۔
 ص ۳۵۱ تورا کے ذیل کی جو بات حاشیہ میں ہے۔ اس کے خاتمے قوسین میں حکیم
 غناک کا نام درج ہے؛ صباح الفرس میں یہ عمارہ کی طرف منسوب ہے۔

ص ۳۵۱ تیرہ کے ذیل کا شعر منوچہری کا ہے۔ سحر تخلص ہے نخستین ہونا چاہیے۔
 ص ۳۵۲ تتو کی درست قرأت تترلو ہے؛ قواس، مؤید، سرودی، رشیدی سب میں یہی
 ہے۔ مدار میں تتو کے لیے جو بیت شاہد فرنگ سے نقل ہوئی ہے، وہ سوزنی کی ہے۔ دیوان اور
 مدار دونوں میں بیت شاہد میں خاصا اختلاف ہے:

مدار	دیوان
لیکن چو باز گردم از شرم مردان	لیکن باز گردم از شرم مردان
تا در خور تماخرہ و تتوی تو شوم	تا در خور تماخرہ و تتو شوم

تماخرہ لفظ سوزنی کی حسب ذیل بیت میں آیا ہے:

از مدح تو تماخرہ و زنج آدم
 ہر چند دوری از رہ زنج و تماخرہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہ تتو کی کوئی اصل ہے اور نہ تماخرہ کی۔

ص ۳۶۱ تماک کے ذیل کا پہلا شعر صباح الفرس میں خسروانی کے بجائے خسروی کی طرف
 منسوب ہے۔

ص ۳۶۲ تز کے ذیل کی دوسری بیت رودکی کی ہے
 ص ۳۸۱ قفسہ کے ذیل کی بیت البوالعباس کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں خسروانہ زنی کے
 بجائے خسروانہ تہنی ہے۔

دارالافتاء کی ترتیب نو

ص ۲۸۳ نکش کے ذیل میں یہ بیت شاہ درج ہے :

دیدہ بدخواہ تو چون بزم انگور است سرخ
در لگد کوب عنا بادا جدا آب از نکش

در اصل یہ بیت سوزنی کی ہے اور اس کے دیوان (ص ۲۲۲) میں ایک قصیدے کے ذیل میں ہے، جس کے قوافی ہوس، فرس وغیرہ ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اس بیت کا قافیہ نکش کے بجائے نکس ہوگا۔ بہر حال کم از کم اس بیت سے نکش کے وجود پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ صحاح الفرس میں نکس ہی ہے۔ تو اس، سوزنی کی اس بیت کا قافیہ نکش لایا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ سوزنی کا شعر اس طرح سے ہے :

دیدہ حاسد بتو چون غزم انگور است سرخ
در لگد کوب عنا بادا جدا آب از نکس

ص ۳۸۷ تلاح صحاح الفرس کے اعتبار سے فارسی ہے، بیت شاہ کا ناظم لہیان کے بجائے طیان ہے۔ شب یز غلط ہے، صحیح شب دیر ہے۔

ص ۳۹۲ تندرہ کے ذیل کی بیت میں نگر دامن غلط ہے، نگر دامن ہونا چاہیے۔

ص ۴۱۲ تیغ کے ذیل کی بیت شاہ جو کسائی کی ہے، بہار کی تعریف میں ہے۔ یہ نسخہ دار میں غلط نقل ہوئی ہے، مثلاً دوسرا مصرع اس طرح ہے :

زنگ بہ تیغ اندرون شاخ ز دور آرید

صحیح مصرع یہ ہے : زنگ بہ تیغ اندرون شاخ زد و آرید

اگر دار میں زنگ نہ ہوتا، تو سمجھا جاسکتا تھا کہ چھاپے میں حرفوں کے درمیانی فاصلے کی غامی ہے، صحیح کی غلطی نہیں ہے، لیکن زنگ کے بجائے زنگ لانے سے واضح ہے کہ شعر کا مطلب سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ یہاں زنگ بمعنی ہرن، تیغ، سرکروہ، اور شاخ بمعنی سینگ ہے۔

جلد دوم ص ۲۹۱، ۲۵۱ مجر کے ذیل میں بزم بمعنی کفش کے اشتہاد کے لیے جو بیت نقل ہوئی ہے، اس سلسلے میں صاحب دارالاشتباه کا شمار ہوتا ہے۔ یہ بیت جو مخفیک کی ہے، دراصل شمس کی توضیح کے

لیے لغتِ فرس اور صحاحِ الفرس میں آئی ہے۔ مار میں بیتِ مخلوط نقل ہے، اور دوسرا مصرع خارج از ذلک ہے۔ ذیل میں دونوں صورتیں نقل کی جاتی ہیں :

فرس و صحاح

مدار

چنانکہ مدحِ کردم چندین عذاب دیدم چندین مدحِ کردم چندین عذاب دیدم
مگر سیم نیست جفتِ جہم فرست باری مگر سیم نیست باری جفتی ششم فرست
دار میں جنت میں یا تے تنکیر کے دلانے سے مصرع ساقط الوزن ہو گیا ہے۔ فرس و صحاح میں
ششم میں سیم دوم ضمیر واحد متکلم متصل مفعولی ہے، یعنی مجھ کو ایک جوڑ کفش بھیج۔

ص ۲۶ جسٹ کے ذیل میں شاکر بخاری کی بیت کے مصرع دوم میں پاکند کے بجائے پاکند
ہونا چاہیے، یہ چھاپے کی غلطی ہوگی۔

ص ۵۷ چغز کے ذیل کی بیت سوزنی کی پہلے فرہنگِ قواس میں اشتباہاً چغز کے بجائے
جغز لکھا ہے۔

ص ۱۱۷ تختبر کے ذیل کی بیت ابوالعباس کی ہے۔ پہلے مصرع میں سخت ہی نیک، کے
بجائے سخت ہی تنگ یا بستم تنگ ہونا چاہیے۔

ص ۱۲۵ غریبواز کے ذیل میں ختار کے شعر کے پہلے مصرع میں روزگار کی جگہ کار روزگار
ہے، جیسا کہ صحاحِ الفرس میں آیا ہے۔

ص ۱۲۷ خرد کے ذیل کی بیت خسروی کی ہے۔

ص ۱۴۵ خشکار بضم طے است کہ عرب استسقاء و ہند جلندھر و جالند گویند۔

خشکار اور آمار دونوں کے معنی استسقاء کے ہیں۔ صحاحِ الفرس میں ہے : آمار استسقا
بود رود کی گفت :

آنگہی گنجور مشک آمار کرد

تا مراد را زان بدان بیدار کرد

خشکار بمعنی آمار است یعنی استسقاء

در اصل معیارِ جمالی میں آمار کے معنی کسی قدیمی کتاب کی غلط خوانی کی وجہ سے استسقا کی

جگہ استسقا درج ہو گئے، اور اس کے مولف شمس فخری نے اس غلط معنی کے لیے حسب معمول یہ بیت نظم کر دی:

حضور جاہ تو بی آب در تونہ رفتی

مباد جز بہ بیابان فتادہ آمار

لیکن خشکار کے معنی استسقا و تھوڑے بلوغ ہی لکھا اور اس کی بیت شاہد یہ قرار پائی:

خدا یگان سلاطین کہ روزگار ندید

نظیرش ارچہ بسی مجست و کرد خشکار

مختصر یہ کہ صاحب مدار سے خشکار کے معنی متعین کرنے میں سخت قسم کا تسامح ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مدار میں رودکی کی جو بیت شاہد آئی ہے، اس سے استسقا ہی کے معنی نکلتے ہیں، استسقا کے ہرگز نہیں۔ بیت یہ ہے:

از سرادانی کہ خشکار کرد زان نہاں مرمر در بیدار کرد

در اصل یہ بیت وہی ہے جو مدار سے تغیر کے ساتھ صحاح میں آمار کے لیے آئی ہے مگر صاحب

صحاح سے رودکی کی بیت شاہد کی قرأت میں غلطی ہوئی؛ خشکار جو ایک لفظ ہے اس

میں مشک آمار کی شکل میں آیا ہے۔ دراصل رودکی کے شعر کی صحیح صورت یہ ہے:

آنگہی مخمور خشکار کرد

مرد را از آن بدان بیدار کرد

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر معجم شعر کی تخریج کی طرف رجوع کرتے، تو ان مسائل سے

منزور و دوچار ہوتے، جن کا اجمالاً ذکر ہوا ہے۔

ص ۱۴۶ فخرک کے ذیل کی بیت رودکی کی ہے۔ مصرع دوم صحاح الفرس اور مدار

میں باقتلا درج ہے، مثلاً:

صحاح

مدار

ایا، بلاہمیری کار کرد و پنهان شد ایا، بلاہم اگر کارب تو پنهان شد

ص ۱۵۸ خنخ کے ذیل میں خنخ کے لیے بیت شاہد مصرعی کی ہے۔

ن : ۱۷۲ غنیمت کی بیت، شاہ کے پہلے مصرع میں "بگذر از سالیان" غلط ہے؛ اس کی جگہ بزرگ سالیان ہونا چاہیے۔

۲۳۱۔ دروش کے ذیل کا شعر سوزنی کا ہے، دروش داغ کے بجائے دروش و آغ با داو ماطف، درست ہے۔

۲۵۹۔ دم کے ذیل کی پہلی بیت نظامی کی ہے۔

۲۶۰۔ دند کے ذیل کی بیت ابوشکور کی ہے۔

۲۷۰۔ دستکان کے ذیل کی بیت فرخی کی ہے۔

۲۹۰۔ دیولاخ کے ذیل کی بیت میں خرمیہ غلط ہے، چرمیہ ہونا چاہیے۔

۳۰۹۔ ربوہ (ع) ... خوشی از جماع برای مجہد نیز۔

ن میں برائے کے قبل کام (۱)، ہونا چاہیے؛ رائے مجہد کوئی چیز نہیں؛ زای مجہد مقصود وگا؛ مگر یہ بھی درست نہیں اس لیے کہ کوئی عربی لفظ زای مجہد کا حامل نہیں ہو سکتا؛ ظاہر زای تازی مقصود ہے؛ چنانچہ اسی جلد کے ص ۳۶۱ پر ربوہ درج ہے لیکن وہاں یہ فارسی لفظ گڑباز ہے۔ ربوہ کو عربی لفظ قرار دینا صحیح نہیں اس لیے کہ خالص فارسی رنگوں میں یہ لفظ آیا ہے؛ اس سلسلے میں فرہنگ تو اس اور زبان گویا کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جہاں اس کو بصورت ربوہ درج کیا ہے نہ ربوہ۔ مؤید الفظلا میں ربوہ اور ربوہ دولو ہے اور دونوں جگہ فارسی لفظ قرار دیا گیا ہے۔ مگر ربوہ کے ذیل میں اس میں موجود ہے۔ و بزاء مجہد نیز لغت است۔ بظاہر صاحب دار نے یہ اطلاع یہیں سے حاصل کی تھی جو مطلوبہ نسخے میں رہی مجہد کی شکل میں ملتی ہے۔ باوجود زاء مجہد کے لکھنے کے صاحب غلطی نے اس کو زای تازی ہی سمجھ لیا ہے۔

۳۷۹۔ زنگ کی بیت شاہ میں دو لفظ غلط ہیں؛ کین عزیز چیست کی جگہ کاین غریب چیست ہونا چاہیے؛ دوسرے مصرع میں کرم کے بجائے گرم درست ہے۔

۴۱۸۔ سام کی بیت شاہ کسائی کی ہے۔

۴۲۰۔ ساد کے ذیل کی بیت فردوسی طوسی کی ہے۔

ص ۴۷۱ سے کے ذیل کی بیت حکیم فرزدی کی ہے اور فرنگ خواں میں چکا د کے لیے آئی ہے۔

ص ۴۸۱ سکار کی بیت شاہ سوزنی سمرقندی کی ہے، پہلے مصرع میں مار دنیا کے بجائے بار دنیا ہونا چاہیے۔

ص ۴۸۲ سکا کے ذیل کی بیت دوم عید کی ہے، جو در تعلق کا شاعر سجاد بلوئی، ۳۳۱ ص ۵۰۲ سندل کی بیت شاہ منصری کی ہے، مار میں مندرج مصرع اول وزن سے خارج اور غلط سے پڑ ہے۔ مثلاً :

صحیح صورت

مار

گفتم بجای رسیدی زان مگر فتم بجائی رسیدی زمال

بجائی میں ای کی تکیہ کا حذف غیر مستحسن ہے۔ مار کے مطلوبہ متن میں بالعموم اس طرف کم توجہ ہوئی ہے؛ اس سلسلے کی چند مثالیں غلط الامائی کے تحت لیگی۔

ص ۵۰۲ سنقر کے ذیل کی بیت خاقانی کی ہے۔

ص ۵۱۸ سیام کی بیت شاہ رودکی کی ہے۔

ص ۵۲۰ شاک کے ذیل کی بیت سوزنی کی ہے۔

ص ۵۵۲ شمس کاہ کے ذیل کی بیت رودکی کی ہے۔

ص ۵۶۳ شفا کے ذیل کی بیت کسائی کی ہے، فرخی کی بیت اس کے عین مشابہ ہے۔

(دیکھیے، صحاح: ۲۵)

جلد سوم

ص ۱۳۸ فالوک کے ذیل کی بیت خسروانی یا خسروی کی ہے۔

ص ۱۳۹ فار چ کی بیت شاہ شاکر بخاری کی ہے۔

ص ۱۴۰ غرا شیدہ کی بیت شاہ علی قزوکی ہے۔

ص ۱۵۱ غزنہ کی بیت شاہ ہندو شاہ پدر صاحب صحاح الفرس کی ہے؛ دوسرے مصرعے

میں غلطیاں ہیں؛ ہر سپاہ از برتری چوں شیر نر غزنہ باز کے بجائے ہر سپاہ از فتر تو الخ

علامہ ابن خلدون کی برقیہ

درست معلوم ہوتا ہے۔

ص ۱۶۲ غلطی کے ذیل کی بیت لمبی کی ہے۔

ص ۱۶۹ غلطی کے ذیل کی بیت شاہ میں پہلا مصرع اس طرح ہوگا :

ہر گلی پڑ مرده گرد و زرد ز دیر الخ

ص ۱۷۲ خوش کی بیت شاہ صحاح الفرس میں خسروانی کے بجائے خسروی کی بتائی گئی ہے

مدار میں مندرج دوسرا مصرع موجودہ صولت میں وزنی سے خارج ہے، دالک کے بجائے

دالک گاہ سے وزنی سے پورا ہوتا ہے، اور یہی صحاح میں ہے۔

ص ۱۷۲ غولت کے ذیل کی بیت رودکی کی ہے

ص ۱۹۳ فرخ کی بیت شاہ کی قرأت میں اختلاف ہے، مثلاً

صحاح

مدار

ای بوالفرخ زادہ ہمیدوں ہمہ فرخ ای بلفرخ سادہ ہمیدوں ہمہ فرخ

نامت فرخ و کینت باب تو بوالفرخ نامت فرخ، کینت ملعون بلفرخ

ص ۱۹۳ فرخ کے ذیل کی بیت ابوشکور کی ہے۔ مدار اور صحاح کی قرائتوں میں

خاص فرق ہے،

صحاح

مدار

بسا کسان کہ برہ است و فرخشہ بر خوانی بسا کسان کہ برہ است و فرخشہ بر خوانش

بسا کسان کہ جوین نان ہی نیابند سیر بسا کسان کہ جوین نان ہی نیابند سیر

واضح ہے کہ صحاح کی روایت زیادہ معتبر ہے

ص ۱۸۲ فردی کے ذیل میں فرخ کی توضیح کے لیے جو بیت شاہ ہے، اس کا ناظم خسروانی

ہے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مدار کو فردن کے لیے کوئی بیت نہیں ملی ماسی لیے اس میں

فرخ کی وہی بیت شاہ درج ہے، جو صحاح وغیرہ میں موجود ہے۔

ص ۱۹۲ فرد کے ذیل کی پہلی بیت ابوشکور کی ہے۔

ص ۲۰۰ فرخ کی بیت شاہ عمارہ کی ہے، عمار غلط ہے۔

مارا نامن کی ترتیب

ص ۲۰۰ فرغول کی بیت شاہ اسدی طوسی کی ہے۔ چنانچہ مگر شاسب نامہ (ص ۳۱۱) میں موجود ہے، مار میں شاہنامہ کی طرف منسوب کرنے میں تسامح ہوا ہے۔ مار میں پہلا مصرع اس طرح ہے جو غلط ہے: بہر کار و پندار بشکول باش؛ اس کی صحیح شکل یہ ہے: بہر کار بیدار و بشکول الخ

ص ۲۰۴ فرناس کے ذیل کی بیت عنصری کی ہے، مار میں مندرج مصرع دوم وزن سے خارج ہے مثلاً من دیوانہ ام نہ فرناسم؛ صحیح صورت یہ ہے: من نہ دیوانہ ام، نہ فرناسم ص ۲۰۵ فرجنگ کے ذیل کی بیت خاقانی کی ہے۔

ص ۲۱۰ ابو نصر کی نسبت مروزی غلط، مرغزی ہونا چاہیے۔

ص ۲۲۳ فلج کی بیت شاہ طہ قرقا کی ہے، قرط غلط ہے۔ دوسرے مصرع کا آخری لفظ منگ ہونا چاہیے، بدنگ بالکل غلط ہے۔

ص ۲۲۷ فلج کے ذیل کی بیت منجیک کی ہے۔ مار میں مندرج صورت مشتبہ ہے:

لغت فرس و فرنگ قواس

مار

عجب آید مرا ز تو کہ بھی
چون کشی آن کلان دوغایہ فلج

مجھی آید از تو کہ بھی
چون کشی آن دوکلان غایہ فلج

ص ۲۳۳ فیادار کی بیت شاہ عنصری کی ہے۔ دوسرے مصرع میں اختلاف ہے — مگر مار میں مندرج صورت بہتر ہے۔

ص ۳۱۷ کارج کی بیت شاہ عنصری کی ہے اور صحاح الفرس میں مار سے کافی مختلف نقل ہوئی ہے:

صحاح

مار

مرد را کمد گردن و سر و پشت
کوفتہ سر بسر بکارج و بخت

مرد ترا کشتہ گردن و سر و تن
کو مرا سر بسر بکارج و بخت
مار کی روایت غلط ہے۔

ص ۳۲۶ کبداء کے ذیل کی بیت دقیق کی ہے۔ صحاح الفرس میں اصل کلمہ کبدہ ہے معیار جمالی

(ص ۹۵) میں کبیدی ہے اور بیت شاہیر ہے:

چو طوبار صیت تو لمصق کنند دہ از لواط قمر چہ رخ کبد

مگر زفانی، عویۃ وغیرہ میں کبیدی ہے۔ مدار میں اس کے معنی کفسیر (سین پہلے سے) درج ہے، جو بظاہر غلط ہے؛ شین نقطہ دار درست ہے۔ جیسا کہ خود مدار (۳۸۱: ۳) میں لکھا ہے۔
ص ۳۳۹ کبید چیزے باشد کہ بان چیز یا پزند کنند و آن را عرب بجم گویند؛ استاد:

از آنکہ مدرج تو گویم، درست گویم راست

مرا بکار نیاید سرشیم و نہ کبید

و بدین معنی کبید نیز گذشت و در بعضی فرہنگ است کبد بمعنی گوشت آرد کہ عرب آن را لیم خوانند۔ اس سلسلے میں چند اشتباہات ہیں۔ مثلاً
۱۔ بجم غلط ہے، لیم ہونا چاہیے۔

۲۔ یہی بیت ذرا سے فرق کے ساتھ کبد کے ذیل میں تین صفحے پہلے گزری ہے، ایک بیت دو غلطوں کی شاہد بھی ہو سکتی ہے۔

۳۔ مصرع دوم صحاح الفرس میں منقول صورت سے مشابہ ہے، اس میں نہ کبید کے بجائے نہ کبد ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ خود صاحب مدار نے کبد لکھا ہو، جو غلط خوانی کی بنا پر کبید کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

۴۔ بجیداً فاحش غلطی ہے، کبد ہونا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ یہ کاتب یا مصنف کی غلطی ہو، نہ کہ مؤلف کی۔

۵۔ لیم کے معنی گوشت آرد کے بجائے کفسیر زنگری درست ہے۔ صحاح: ۸۲ میں ہے:
کبد لیم باشد کہ ماں چیز می پزند الخ

ص ۳۴۲ کمت کے ذیل کی بیت فرخی کی ہے۔ مدار میں جہاں غلط ہے، جہاں لیاں درست ہوگا۔

ص ۳۴۲ کچ کے ذیل کی عبارت میں بعض خامیاں ہیں:

۱۔ ترشی است مانند پیر کے بجائے زفانی گویا میں ہے؛ ترشی شیر مانند پیر۔

- ۲ ترشی و شیر شل پنیر میں داد ملاحظہ فرمائیے۔
 ۳ جنرات را با شیرینی مرکب کنند، نسخہ اصل میں شیر ہے۔
 ۴ تا - نحو ترشی کہ از شیر الحما؛ تا زاید ہے۔
 نسخہ کی بیت شاہد فرہنگ قواس میں کسی شاعر کے نام سے ہے جس کا نام اشتباہاً دختر کا فہمال لکھا ہے۔ شاید دختر کے بعد پہلا لفظ قاضی ہو۔

قواس میں شعر کی شکل پوری طرح درست نہیں، لیکن مدار میں تو بالکل غلط منقول ہے :

فرہنگ قواس

مدار

من شکرم، بلی تو شکری من چو شکرم بلب چرا تو کھنچی

ازین قلم نہ سرکہ انجی زرین قلمی، نہ سرکہین زنجی

ص ۳۵۴ کمرستوں کے ذیل کی بیت زرین کتاب کی ہے؛ دوسرے مصرع میں مدار میں شاہی غلط ہے، شاہین ہونا چاہیے۔ ترازو کی رعایت ملحوظ ہے، اس لیے کہ کمرستوں ترازو کو کہتے ہیں۔

ص ۳۶۰ کر دز کے ذیل کی بیت خسروانی کے بجائے صحاح الفرس میں خسروی کے نام سے ملتی ہے۔ مدار میں منقولہ بیت میں دو واضح غلطیاں ہیں :

کشت غلط ہے، گشت ہونا چاہیے؛ اور منشیوں فعلی نہیں کے بجائے منشی درست ہے
 ص ۳۶۵، ۳۶۱ میں کستی اور گشتی کے ذیل میں ایک ہی بیت ذرا سے فرق کے ساتھ نقل ہے :

ص ۳۶۱

ص ۳۶۵

رہبان سبھ گشتند و کستی باقند رہبان سبھ گشتند و کستی باقند
 گوہر قند بشکستند و ساغر مانقند گوہر قند بشکستند و ساغر مانقند
 نسخہ نسخہ کستی و گشتی کے فرق کو ملحوظ رکھ سکے، نہ دونوں شعروں کے اختلاف رعایت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حال آنکہ چند صفحے پہلے کستی کا ذکر ہوا ہے۔

ص ۳۶۴ کوازدہ و کوزہ کی بیت شاہد میں لفظ کوازدہ ہے، حال آنکہ کوازدہ و کوازی کی سند دو کا رہتی۔ صحاح الفرس میں بھی بیت گوازی کی سند میں نقل ہوئی ہے۔ دونوں کتابوں میں بیت کافی متضاد

ملارالافاضل کی ترتیب نو

صاح	مار
دوستاں را بیافتی بمراد	دوستاں را نیافتی بمراد
مہر دشمن بکوفتی بجواز	دشمنان را بکوفتی بجواز

صاح کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

تفصیلات بالا سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر باقر صاحب مار کے متن کی تعبیر کے وقت لغت فرس، صحاح الفرس وغیرہ کو پیش نظر رکھتے تو کتاب کی بیشتر خامیاں رفع ہو جاتیں۔

مارالافاضل کے مطبوعہ متن میں بعض المائی کوتاہیاں راہ پا گئی ہیں۔ یہ کوتاہیاں ایسی ہیں، جن کا فن الما سے تعلق ہے، چھاپے کی غلطیاں نہیں ہیں۔ ان میں سب سے قابلِ توجہ وہ خامی ہے، جو بعض الفاظ میں ذال اور زے کے درمیان فرق ذکر کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ فارسی میں جن دو مصدروں اور ان سے مشتق افعال و اسماء کے بارے میں اکثر التباس ہو جاتا ہے، وہ گزاشتن یا گزشتن اور گزاردن ہیں؛ گزاشتن سے مضارع گزارد اور گزاردن سے گزاردا آتا ہے۔ گزاشتن بمعنی چھوڑنا، ڈالنا اور گزاردن بمعنی عرض کرنا، پیش کرنا آتا ہے۔ ان میں بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ اکثر ایرانی مصنفین کی تصانیف میں بھی اس طرح کی خامی دیکھی جاتی ہے۔ مثلاً تاریخ بیہقی چاپ دکتہ رضی و دکتہ فیاض سامنے ہے، اس میں صفحہ ۴۰۲ پر دو جگہ یہ غلطی ہے۔ (س ۲) از آب گنگ گزارہ شد، اس میں گزارہ (ذال سے) درست ہوگا۔ (س ۹) مالی عظیم.... از خراج گزاران بستہ، اس میں گزاران کی جگہ گزاران (ز سے) ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر باقر صاحب بھی اس المائی تسامح کے شکار ہوئے ہیں۔ مثلاً ج ۱: ص ۱ میں نکتہ گزار غلط ہے، نکتہ گزار درست ہوگا۔ اسی طرح گزارش بمعنی بیان زے سے درست ہوگا، اس لیے کہ یہ گزاردی سے اسم مصدر ہے اس کے برخلاف بعض مقامات پر جہاں ذال درست تھی وہاں زے کا استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں یہ ہیں:

مدار الافاضل کی ترتیب نو

۴۳: ۱ ای صباہر بجزری بر ساحل رودارس

۳۳۹۰۲ روزہ گزاری

۴۴۰: ۳ گزند نامہ، خواب نامہ یعنی تعبیر خواب و خطی کہ گزند بانای و انویسند

مگرد نامہ بمعنی خواب نامہ درست ہے، اس لیے کہ گزند بمعنی تعبیر ہے، لیکن گزند بانان
ذال سے درست ہے، اس لیے کہ یہ گزشتن سے بنا ہے۔

۴۴۰: ۳ گزشت بمعنی جز

۴۴۰: ۳ گزشتہ معروف

لیکن اس سے یہ برگز مقصود نہیں کہ مدار کے نسخہ، مطبوعہ میں گزشتن سے مشتملات ذال
سے آئے ہی نہیں، بلکہ اکثر ذال ہی سے ہیں۔ صرف بعض جگہوں پر زے سے ہے، جو درست
نہیں ہے۔ مثلاً گزشتن کی صحیح صورتوں کے لیے ملاحظہ ہوں:

۳۵۸: ۳ / ۵۹۳: ۲ / ۵۸۳: ۲ / ۲۶۵: ۲ / ۲۳۷: ۲ / ۱۹۹: ۱ / ۱۸۳: ۱

دھیسرہ

مدار الافاضل کے نسخہ، حاضری دوسری ماہم المانی کوتاہی ہای غیر محفوظ سے متعلق ہے
ہای غیر محفوظ پر یاے تنکیر، یا نسبت یا یا یا خطاب عموماً، ای، سے ظاہر کی جاتی
ہے۔ جیسے خامہ ای، قمشہ ای یا دیدہ ای، لیکن اضافت یا توصیف کی صورت میں
ہمزہ استعمال ہوتی ہے، جیسے بندہ من، خامہ خوب۔ مرزا محمد قزوینی نے اپنی بعض
تحریروں میں اس امر کی پوری صراحت کر دی ہے اور یہی طریقہ ایران میں عموماً متداول ہے
لیکن مدار کے مطبوعہ متن میں اس پر یکساں عمل نہیں ہو سکا۔ یا یا تنکیر وغیرہ کے لیے اکثر
ای کا استعمال ہوا ہے، لیکن خال خال جگہوں پر اسے حذف کر دیا ہے۔ علامت اضافت
کبھی ہمزہ سے اور کبھی ی سے ظاہر کی گئی ہے۔ بہر حال چونکہ عمل میں یکسانی نہیں، اس لیے
یہ نظروں کو کھٹکتا ہے۔ ذیل کے مثالوں سے میرے بیان کی تصدیق ہو سکیگی۔

ای مثالوں میں علامت اضافت، ی، استعمال ہوئی ہے:

رک بیت مقالہ قزوینی، مقالہ رسم الخط (چاپ شرق)، ص ۳۱، ۳۲

علامہ افاضل کی ترتیب نو

بیشمہ ی شیر	۵۷:۱
ستارہ ی نیک	۹۰:۱
خوشہ ی انگور	۱۹۱:۱
پارہ ی از خوشہ ی انگور	۱۸۳:۱
ذخیرہ ی آب	۲۱۲:۱
خاگینہ ی مرغ	۱۰۷:۲
خایہ ی مرغ	۱۱۳:۲
خرزہ ی خارا	۱۲۸:۲
نکتہ ی باریک	۱۸۳:۲
رہزہ ی ہر چیز	۱۸۳:۲
برہنہ ی مادر زاد	۱۸۷:۲
سینہ ی خود	۱۹۰:۲
ترہ ی معروف	۱۹۲:۲
قلعہ ی مشہور	۱۹۳:۲
آب دیدہ ی گناہ گاران	۱۹۵:۲
مادہ ی کبوتر	۱۹۷:۲
جامہ ی پنبہ	۱۹۸:۲
دیگرہ	

• مندرجہ ذیل مثالوں میں علامت اصناف ہمزہ آئی ہے :

سفرہ عام	۹۵:۱
سایہ خود شید	۸۳:۲
دنبہ فرہ	۱۹۱:۲
پارہ زمین	۲۳۲:۲
جامہ حریر	۲۳۳:۲
پارہ گوشت	۲۳۳:۲
دورہ آدم	۲۹۷:۲
زمانہ جفا کار	۲۹۸:۲
کرہ آتشیں	۵۵:۱
طلبہ موجہا	۵۷:۱
طلوہ ایشاں	ایضاً
انچہ مذکور	۹۲:۱
انجم لغت	۹۳:۱
ادویہ چشم	ایضاً
ادویہ گرم	۹۵:۱
خودہ انگور	ایضاً
خوشہ مراد	ایضاً

• مندرجہ ذیل میں یای تنکیر کا صحیح استعمال ہوا ہے :

سوغاتی و تحفہ ای	۷۹:۱
توانیم کرہی مگر چارہ ای	۱۸۹:۱
فکہ ای کز حراق برغیزد	۱۱۲:۲
کہ بیچارہ ای نیست بتیارہ ای	

الحرف الا فاضل کی ترتیب نو

- ۲۱۹:۲ جامہ ای کہ زیر جامہ باشد
- ۲۳۴:۲ کہ پیدا نشد تحتہ ای برکنار وغیرہ
- حسب ذیل شالوں میں یای تنکیر یا حذف ہو گئی ہے یا ہزہ سے آئی ہے:
- ۴۴:۱ سراپردہ سبز دیدم بزرگ (یعنی سراپردہ ای)
- ۲۸۱:۱ نشستہ بعد چشم دکاڑہ گرفتہ بچنگ اندوں پاڑہ
- ۳۱:۲ بچہ کہ در شکم باشد (یعنی بچہ ای) وغیرہ
- تیسری المائی خامی بھی یای تنکیر وغیرہ سے متعلق ہے۔ یای تنکیر یا نسبت یا خطاب جب الف یا واو پر ختم ہونے والے الفاظ پر آتی ہے، تو بتکرار لائی جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ الف یا واو پر ختم ہونے والے الفاظ میں اصلاً ایک "ی" محذوف ہوتی ہے لیکن جب ان پر یای تنکیر لائی جاتی ہے، تو وہ محذوف "ی" بھی اپنی جگہ واپس آجاتی ہے۔ اس قاعدے کے لحاظ سے روئی دیدم درست، روی دیدم غلط، مگر مدار میں اس قاعدے پر پوری طرح عمل نہیں ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:
- | | |
|--|-----------------------------------|
| <p>۴۴:۱ ارنب نیز نام داروی است</p> <p>۱۴۱:۱ انیسو نام داروی</p> <p>۱۹۲:۲ خیار چنبر نام داروی</p> <p>۲۱۵:۲ گدائی کہ از پادشاہ خواست دخت</p> | <p>ان تینوں جگہ داروی درست ہے</p> |
|--|-----------------------------------|
- گدائی درست ہے
- | | |
|---|---|
| <p>۳۹۵:۲ نام داروی</p> <p>۵۰۲:۲ نائب تنگری توئی کردہ بہ تیغ ہندوی</p> <p>ایضاً مگر فتم بجای رسیدی ز مال</p> | <p>داروی صحیح ہے</p> <p>ہندوئی صحیح ہے</p> <p>بجائی صحیح ہے</p> |
|---|---|
- حسب ذیل شالوں میں یای تنکیر بالکل صحیح آئی ہے:
- ۹۲:۱ نام دریائی
- ۱۸۹:۱ نام دریائی
- ایضاً دریائی است خرد

۵۰۷:۲ سواد الوجہ : سیاہ روئی الخ

• حسب ذیل مثالوں میں یا ای اضافت پر ہمزہ کا استعمال غیر مستحسن ہے :

۵۰۳:۲ یک روئی، ہجو کثر دم سنکیز چولی ستہ : اس میں یک روئی درست ہے۔
ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجم کا تصور راسی تنکیر وغیرہ سے پیدا ہونے والے املائی مسائل کے بارے میں واضح نہیں ہے۔

ایسی غلطیاں جو عموماً تصحیف خوانی کا نتیجہ ہیں، اگرچہ ان میں سے کچھ طباعت کی بھی غلطیاں ہونگی، مطبوعہ نسخے میں کافی پائی جاتی ہیں۔ مدار کے مطبوعہ نسخے کی اس خامی کا کسی قدر اندازہ قارئین کو ہو چکا ہوگا۔ ذیل میں بعض مثالیں جو نمونہ مشقی از خردارے ہیں، درج کی جاتی ہیں :

مصحح شکل	اصل عبارت	
جود تو	از مبلخ دودی تو	۱۵ ص ۳۶
المطول للہروی	المطول الہروی	۶۵ ص
جلانی	حبلائی	۱۳۹ ص
قاسم کاہی	قاسم گاہی	۱۴۲ ص
عمارت گلین	عمارت گلین	۱۵۹ ص
بیت رنگ	بیت لنگ	ایضاً
عمارہ	عمار	۱۷۸
چنگ سفیدانہ	جنگ سفیدانہ	ایضاً
فزون	برون ازین	۱۷۹
خوناب	خوناب	۲۶۶
میدنہ	میدیہ	۲۷۳
اندرون	اندان	۲۸۱

عادلہ فاضلہ فی ترمیمیہ

۲۸۲	زربن	زربین
۲۵	۱۰	ہزربہ
۱۵	جرم گناہ و جرم تن و جرم قبیلہ درین	(تعمیم نہ ہو سکی)
۱۶	روح گناختہ نمایند	روح گناختہ بنامہ
۱۹	گود از تحت	واژگونہ بخت
۲۲	شرط	شرطہ
ایضاً	بخیار این کس	(تعمیم نہ ہو سکی)
۱۰۱	صدہ خارا۱	صدہ خارا
ایضاً	زیر لطف	لطف حذف ہوگا
۱۳۵	قاسم کوہی	قاسم کاہی
۱۵۶	بوصال اندہ بودم	بوصال اندہ بدم
۱۷۵	بہ پل غنیور	بہ پول غنیور
ایضاً	۴	۴
۲۲۲	بکا و بہار	پگاہ بہار
۲۹۰	خریدہ	چریدہ
۳۰۱	رازانم فہری کہ امام رازی ازانجا است	وہ توقف کی غلطی ہے، بے مہنا چاہیے
۳۰۲	رادیز	راویرز
۳۰۷	رعد	رعد (موقوف کی غلطی معلوم ہوتی ہے)
۳۲۳	اصلح	اصلح
۳۸۰	طاقتہ	(تعمیم نہ ہو سکی)
۳۹۰	زنجرو	زنجبرو
ایضاً	زندہ پیچی	(زندہ پیچی ممکن ہے، موقوف کی غلطی ہو)

ملفوظات داخل کی ترتیب نو

۳۹۲	بزار درست وحینی و راہوی و عراق	نوادراست حینی و راہوی
		است و عراق
۳۹۹	سحر دلاغ	سحر دلاغ
۴۰۲	بساط عرصہ عزمت کترین زلیو	عزمت صم ہے اور اسی سے
		مصرع درست ہوتا ہے، درد اعلیٰ
		وزن سے خارج ہے۔
۴۰۳	لفظ فرس	لفظ فرس
۴۱۱	وزن باریک	وزن باریک
۴۳۱	شفق صبح و سرخی و سپتاک	شفق و صبح سرخی و سپتاک
		(لف و نشر مرتب)
۴۳۷	ہمسہ تازی اسپان	ہماں تازی اسپان
۴۳۷	ہمسہ تیغ ہندی	ہماں تیغ ہندی
۴۳۷	کتاب سالک و ممالک	کتاب سالک و ممالک
۴۳۷	سیم اندوز	سیم اندوز
۴۳۷	لفظ بخور دم الخ	لفظ بخور دم الخ
۴۷۵	سفر بمعنی یکی و آن نوشی از شراب الخ	سفر بمعنی یکی الخ
۵۰۱	شنامند مکر ہمہ ہند و سند الخ	شنامند یکسر ہمہ ہند و سند
		یہ بیت فردوسی کی نہیں، اسدی
		کی ہے، اور اگر شامب نامہ (ص)
		(۱۹۶) میں موجود ہے۔ اصل میں مکر
		کی وجہ سے مصرع ماقطالوزن ہے
		پہلا مصرع بغیر اسی کے اضافے
		کے وزن سے خارج ہے۔
۵۳۵	شمارہ نہادہ برستانہ	

مارا لافاضل کی حریف نو

اکثر فرنگوں میں فارسی بتایا گیا ہے موتید میں فارسی کے ذیل میں آیا ہے۔	شعا (عربی)	۵۶۳
بعض و غین معجم	بعض و عین معجم	ایضاً
اکثر فرنگوں میں بشمول مؤید کے شتفت ہے۔	شتفت	۵۶۶
بسوی زمین بین نہ سوی شفت	بسوی زمین بین نہ سوی شفت	ایضاً
سکا در سہا	کا در سہا	۵۶۷
شنبلید و لالہ لغمان	شنبلید و لالہ لغمان	۵۸۳
شخوسہ	شنوشہ	۵۸۷
قاصدان و پیکان استادہ بچہد	قاصدان و پیکان استادہ بچہد	۵۷۷
یا بجنہد		
دبہ برنجین	غزادہ : دبہ ریختن	جلد سوم
توانگری (توان پرگر کے لاء)	فنا تو نگری	۱۶۹
اور پھرای مصد دی کے اٹا۔		
سے بنا ہے)		
فردہ	فردہ	۱۹۳
فنود (ضحاح)	فنودہ	۲۲۹
بعار و عاریتی خویش را چرا فنود	بعار و عاریتی خویش را چرا فنود	۰
توانگر	توانگر	۳۲۶
کالا کدوی سکی	کالا کدوی سنگی	۳۳۱
کازدان، نیز دیکھیے ص ۲۱۰۲۲۷	کازدان	۳۴۸
جواہر درویشانہ	جواہر درویشان	۳۵۳
باغرو	باغرو (ذیل کلن)	۳۹۱

ملفوظات افضل فی ترتیب نو

۲۹۲	خضر ج (باضاد)	خضر ج (بانا)
۲۴۳	ماثوره (ذیل کیسنه)	ماثوره
۲۴۶	سوزانی	سوزنی
۲۵۲	ہزہز	ہزہز
۲۸۹	سخت آہنین (ذیل گوپال)	لخت آہنین
۲۹۱	خود (ذیل گوز)	جوز
۲۹۷	جوہر آہینی (ذیل گوہر)	جوہر آہن
۲۹۸	ہندش جہاد	ہندش جہاد

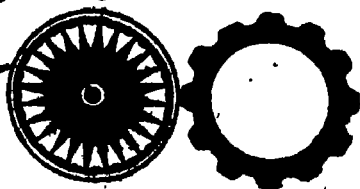
خلاصہ کلام یہ کہ دارالافاضل کا متن قننا و قنن ہونا چاہیے تھا، اتنا نہیں ہے۔ منجملہ اور وجوہ کے اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے آخذ سے بجا طور پر استفادہ نہیں ہو سکا ہے اس کے اہم اور بنیادی آخذ لغات کی کتابیں ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ڈاکٹر محمد باقر مصباح کے پیش نظر تھیں، ان کی مدد سے تصحیح متن کی پوری کوشش عمل میں نہیں آ سکی ہے۔ لغات کے علاوہ اس کے آخذ میں تاریخی کتابیں بھی ہیں۔ وہ کتابیں عموماً مطبوعہ شکل میں ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں، مگر مصباح نے متن کی تصحیح و تحقیق میں ان سے کام نہیں لیا۔ اشعار کی تخریج سے بے اعتنائی کے نتیجے میں اکثر شعر کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ اور بعض جگہ شعر کی تصحیح بھی نہیں ہو سکی ہے۔

ابھی دارالافاضل کی آخری جلد سامنے نہیں آئی ہے؛ اگر معروضات بالا کی روشنی میں نظرِ ثانی کر لی جائے، تو میں اپنی سعی مشکور سمجھوں گا۔



انہوں نے
آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی
کے انقلاب کو پایہ تکمیل
تک پہنچائیں



محمد خرف الدین سائل

ناگیور کے اخبار و رسائل

ریاست مہاراشٹر کا مشہور و معروف شہر ناگیور دینی اعتبار سے اتنا نامدار نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ یہاں ہر دین میں علمی، ادبی اور مصافی کارناموں کی روایت ملتی ہے۔ اس جگہ ہم یہاں کی صحافت کا مختصر تذکرہ در نظر بن کر لیتے ہیں۔

۱۔ ترجمان (ناگیور کا پہلا ہفتہ وار اخبار) :

یہ اخبار اردو زبان میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں قلام عبدالقادر خان زکری کی ادارت میں جاری ہوا۔ بقول ایتق جونہری (والد شفیق جونہری) زکری تاریخ نگہ میں وحید عصر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں سے مزاوت تھی۔ اولاً سید عباس علی شہرت ناگیوری سے مشورہ کیا اور ان کے بعد سید عبدالعلی مآول ناگیوری (ف ۱۳۱۱ھ) سے مآول خود تاریخ کے شاگرد تھے۔ اس اخبار کا صرف ایک ہی ورق دستیاب ہوا ہے جو بہت ہی مشکستہ حالت میں ہے۔ اس پر زکری کے اخبار کے اجراء کے یہ قطعات تاریخ درج ہیں :

لطف سے ایند کے یہ اخبار ہے جاری ہوا (۱۳۰۱ھ)

ایک خاص دھام کو حاصل ہے کل عیش و سرور (۱۸۸۴ء)

سالِ سمت یہ کلمہ زکری اہل شوق نے (۲۹۱۱ھ)

نام ہے اخبار کالو ترجمان ناگپور (۱۹۴۵ء سمیت بکری)
 اسی سرمدق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار میں ملازم گزٹوانہ اور اطراف و جوارب کی
 خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔

۲۔ ادیب (ماہنامہ) :

ادیب کے ابتدائی چار شمارے مولوی محمد عبدالغنی ایم۔ اے (علیگ) پروفیسر ماس
 کالج ناگپور کی ادارت میں نکلے۔ آپ عبدالعلی آسی لکھنوی کے فرزند ارجمند تھے، ادیب
 اور شاعر اردو کی ترویج اور احیاء میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ عرصہ دراز تک ناگپور کے
 قدیم ماس کالج میں پروفیسری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انگریزی حکومت کی جانب
 سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہیں وقتاً
 پائی۔ ان کے بعد ادارت کی ذمہ داری اکتوبر ۱۹۲۰ء سے مولوی محمود علی خاں نے سنبھال
 لی۔ مولوی محمود علی خاں ندوی لکھنوی، مولانا شبلی نعمانی کے شاگرد اور مردہ کے
 دوسرے سال کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے تھے۔ وہ ۱۹۱۰ء میں مولانا شبلی کے حکم
 پر صوبہ متوسط و برار میں اردو کی تجدید و اشاعت کے لیے آئے۔ یہاں دیوان سیونی
 نے ان کی بہت آذ بھگت کی۔ بعد ازاں ۱۹۱۶ء میں خان بہادر راجہ ایم۔ ملک نے
 انھیں انجمن سامی اسلام ناگپور میں عربی اور فارسی پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ یہ مولانا ندوی
 ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ نمونہ العلماء لکھنؤ کا ۱۹۱۸ء کا سالانہ جلسہ نواب مسدود
 ہنگ مولانا حبیب الرحمن خان شرفانی کی صدارت میں انجمن ہال ناگپور میں منعقد
 ہوا۔ انجمن پریس ناگپور بھی انھیں نے قائم کیا تھا۔ اسی پریس سے جون ۱۹۲۰ء (رمضان
 ۱۳۳۸ھ) میں ماہنامہ ادیب شائع ہوا۔ اس سلسلے کا صحافی معیار خاصا بلند تھا۔
 شاہ نمبر (جون ۱۹۲۰ء) میں مولوی سید عبدالرزاق صاحب نائب ناظم انجمن حامی ہلام
 ناگپور نے ادیب کے اجرا اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے
 حسب ذیل مقاصد بتائے ہیں :

۱۔ ملک متوسط و برار میں اردو ادب کی خدمت۔

۲۔ تہذیب و اخلاق۔

۳۔ تاریخ (جس میں ملک متوسط و برابر کو خصوصیت حاصل ہوگی)

۴۔ علم و ہنر کی اشاعت۔

۵۔ محکمہ تعلیم کی اعانت۔

ان مقاصد کے تحت مندرجہ ذیل عنوانوں پر مضامین شائع کیے جائینگے:

۱۔ ادب ۲۔ اخلاق ۳۔ تاریخ ۴۔ تذکرہ سلف ۵۔ علم و ہنر

۶۔ معاشرت ۷۔ نقد سخن ۸۔ اہم تعلیمی معاملات پر تبصرہ اور علمی خبریں۔

۹۔ محکمہ تعلیم کے ضروری احکامات کی اشاعت۔

اسی شمارے میں حکمائے یونانی اور ان کے فلسفہ کی خصوصیات کے موضوع پر ایک جامع مقالہ ہے، مضمون نگار کا نام موجود نہیں ہے۔ یہ مقالہ دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں افلاطون، ڈیمقراطیس، ارسطاطالیس، ارسطو، کوٹا، فیثاغورث، سقراط، ہومیروس، شیلی، دارلینو، ڈیموسنان، امیردوت، الگسمنڈ، ہیراقسط جیسے مشہور فلسفیوں کی زندگی اور ان کے خیالات کے اختلافات پر پُر زور اور مفصل بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد مقالہ ولی اورنگ آبادی از سید عبدالرزاق ہے (ص ۱۷-۲۱)۔ اس مقالے میں انہوں نے ولی اورنگ آبادی کی شخصیت، حالات زندگی، ادبی خدمات اور شاعری پر جامع تبصہ کیا ہے۔ یہ مقالہ تین قسطوں میں شائع ہوا ہے۔

(شمارہ ۱-۲-۳)

علمی و ادبی خبریں (ص ۲۲ تا ۲۷): ان میں سے ایک خبر میں مشہور سائنس دان ہمری سی، وائے کا ذکر ہے، جنہوں نے اس سال ناگپور میں آل انڈیا سائنس کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ دوسری خبر میں بتایا ہے کہ حضور نظام حیدر آباد نے ایک فرمان کے ذریعے سے قدیم کتب السنہ مشرقیہ کی اصلاح و درستی کے لیے ایک لاکھ روپے کے گرانقدر عطیے کا اعلان فرمایا ہے۔

صفحہ ۲۸ تا ۳۲ عمان المجاہد کے عنوان سے حصہ نظم دیا ہے۔ اس میں اول جناب قمر وکیل غازی پور کی نظم مصلیٰ جہنم (۷ اشعر) ہے۔ اس کے بعد مسام کا کردوی اور ابو الحسن ناظم گلاؤٹھو کی فزلیں ہیں۔ (ص ۳۰-۳۲)

شمارہ ۲ (جولائی ۲۰ ۱۹۶۱ء) اس شمارے میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں شمارہ کے مضامین کے بقیہ حصے اس شمارے میں شائع کیے گئے ہیں۔

شمارہ ۳ (اگست ۲۰ ۱۹۶۱ء) ہمارے پاس اس شمارے کا جو نسخہ ہے، اس کے ابت دو صفحے اور سردق غائب ہیں۔ پہلے مولوی عبدالعلیم فخر کا مضمون ہے جو صفحہ ۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ ابتدائی اوراق نہ ہونے کے باعث معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کب موضوع پر غامد فرسائی کی ہے مضمون کے مطالعے سے البتہ قیاس ہوتا ہے کہ غالباً میں مذہب کی تاریخ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اولاً تخلیق آدم اور ان کے جنت سے اخراج کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں حسب معمول تفصیلات انحصار اسرائیلیات پر ہے۔ اس کے بعد حضرت نوح، حضرت ابراہیم حضرت عیسیٰ حضرت اسحاق، حضرت موسیٰ، اور حضرت سلیمان کی بعثت اور ان کی قوموں مافرائیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

انبیاء مرسل کی کوششوں سے دنیا میں دین ابراہیمی تعمیر ہوئے اور انہی کی نسبت سے دنیا میں دین ابراہیمی کے دو اسکول قائم ہو گئے۔ ایک اپنے دین کو خالص دینِ حلیفی ابراہیمی بتاتا اور دوسرے حضرت عیسیٰ کی شریعت پر عمل کرنے کے باعث دینِ موسوی کہلایا مگر مذہب کی تاریخ بیان کرتے وقت ہمیں دنیا کے دیگر مذاہب پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ ہر مذہب کو خدا کے بھیجے ہوئے لوگوں یا خود منہا ہر ایزدی کے ذریعے اپنے احکام و شرائع کے ملنے کا دعویٰ ہے مگر ان کی نسبت ہمارا اعتقاد اور خیال یہ ہے کہ انھوں نے شیطان سے جب آدم میں بہت بدستی اور ماسوا اللہ کے آگے سر جھکا کر کاذب ہر اتوا ان کے

عقلانے سلف نے اپنے قیاسات سے ان کی بے اصول صنم پرستی اور ان کے جاہل و عقائد کو با اصول بنانے کی کوشش کی اور اہلیات کے ایسے مسائل یا قواعد بنا دیے جن کی بنا پر بت پرستی بجائے دور ہونے کے ایک مہذب دین بن گئی۔۔۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ طرح طرح کی ریاضتوں کے ذریعے سے ان نئے بتوں کے تصور سے غم کا تصور مسخ ہو گیا۔۔۔۔

صفحہ ۹-۱۶: ولی اور رنگ آبادی (قسط سوم) از سید عبدالرزاق
صفحہ ۱۷-۲۵: ”مجھے بی۔ اے کے بعد کیا کرنا چاہیے“ (افسانہ) از سید حمید حسین پانی پتی۔

صفحہ ۲۶-۲۹: شذات (علی وادبی خبریں)
صفحہ ۳۶-۳۹: عمان الجواہر (حقہ نظم)
صفحہ ۲۹: غزلیں مولانا سید اکبر حسین صاحب (لاہ آبادی)۔ ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ موصوف کی دو غزلیں ہیں۔ پہلی میں پانچ شعر ہیں اور دوسری میں صرف تین۔ ان کے مطلع ہیں:

بٹ اس زندگی پر غفلوں کا فخر کرنا ہے یہ جینا کوئی جینا ہے کہ جس کے ساتھ مرنا ہے
”ہم خدا“ زبان پہ گو ہے خدا کے ساتھ ممکن نہیں خیال خدا مولا کے ساتھ
ص ۳۰-۳۲: عزیز غزلیں ہیں: ظرافت آب لکھنوی (۵ شعر)، کلیم لکھنوی (۵ شعر)، محشر لکھنوی (۷ شعر)، اصغر (۹ شعر)

یہ ادیب کے چہرے میاری مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائیں:
حضرت کے خاتم النبیین ہونے کا ثبوت از مولوی محمد طہ صاحب متعلم ندوۃ العلماء
میر ۱۹۲۰ء، عشق و ہستی اور انسانی جدوجہد از مولوی عبدالغنی ایم۔ اے (ایضاً)
مدوستان میں پردے کا رواج کس طرح ہوا؟ از منشی وزارت علی (ایضاً) حقائق
خمس میں ادیب بن از جے آر۔ راے جرنلٹ لاہور (ایضاً) احتساب ادب

از قاضی نامہ علی عباسی (جنوری ۱۹۲۱ء)، شاہ عمان کو دعوت ایمان از مولوی حفیظ محمد شہید لکھنوی (فروری مارچ ۱۹۲۱ء)، مشرقی فرشتہ از خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت (ایضاً)، تقطیر از ابو محمد ثاقب (ایضاً)، تحقیقات سائنس (ہوا) از مولوی احمد اللہ گیلوی (اپریل مئی ۱۹۲۱ء)، امام از داعی از مولوی ابوالجلال صدیقی (ایضاً)، نور جہان بیگم از مولوی انور حسین ندوی (ایضاً)، کلام شوق پر ایک نظر از سید علی سجاد گوہر کانپوری (جون، جولائی ۱۹۲۱ء)، ساج محل آگروہ از سید ابو محمد ثاقب کانپوری (اگست و ستمبر ۱۹۲۱ء)، اکبر (الآبادی) سبز گنبد میں از مولوی حفیظ محمد شہید (ایضاً)

اس کے علاوہ کلام سہانہ پوری، پیارے صاحب رشید، رکن الدین دانا، عزیز لکھنوی، باسط بسوانی، مقتول لکھنوی، جگ موہن ناتھ شوق، مشتاق لکھنوی اور ناطق گلڈوٹھ جیسے ممتاز شعرا کی شعری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ افسوس کہ ادیب کو بہت تھوڑی عمر ملے صرف ۴۲ سالہ نکلے تھے کہ مٹا شوق پریشانی کے سبب یہ بند ہو گیا۔

۳۔ الحق (ہفتہ وار) :

اس کے ایڈیٹر مولوی محمود علی خان ندوی لکھنوی تھے۔ الحق ۱۸/۲/۱۹۲۱ء کے بڑے سائز پر ہفتے یکشنبہ کے دن ۶ صفحات پر مشتمل چھپتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ دو روپے اولیہ شمارے کی قیمت تین پیسے تھی۔ کتابت و طباعت کا معیار بھی بلند تھا۔

الحق کا اجرا ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ہوا اور یہ ۱۹۲۷ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ پہلے صفحے کے بالائی حصے میں اخبار کا نام علی حرفوں میں تحریر ہے۔ ایڈیٹر کا ادارہ بالعموم تک ہوتا۔ اس کے بعد اخبار تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ اس میں شب و روز کی ادبی، سماجی، اقتصادی اور معاشی خبروں کے علاوہ مقامی اور غیر مقامی شعراء کا کلام بھی شائع ہوا کرتا۔ الحق میں غیر مقامی شعراء میں عبد الحمید زنجابی۔ اسے کا کلام پابندی سے چھپتا رہا۔ وہ بیشتر نعت لکھتے۔ لیکن کلام میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں ہے۔

نمونہ کے طور پر چند اہم خبریں ملاحظہ ہوں :

۱۔ دریائے آکس کے متعلق افغانستان کی کامیابی :- بیان کیا جاتا ہے کہ روسیہ

نے جزیرہ کا ایک حصہ خالی کر دیا ہے۔ اودافغانی فوج کی دو بلٹنیں اس میں داخل ہو گئی ہیں۔ مگر روس نے اس خونریز ہنگامے کے متعلق افغانستان سے کوئی معافی نہیں مانگی

(۱۱ فروری ۱۹۲۶ء)

۲۔ بہا ماجہ جموں کا جشن تخت نشینی: گذشتہ ہفتے میں راجہ ہری سنگھ والی جموں کے جشن اورنگ نشینی کے جلسے بڑی دھوم دھام سے ہوئے۔ تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ بیلٹ، اسودہ، مظاہرات، فوج، تھیٹر اور اسکول و کالج کے طلبہ کو شیرینی وغیرہ خرچ کرنے کے لیے منظور کیا گیا (۱۳ مارچ ۱۹۲۶ء)

۳۔ حکومت برطانیہ نے اپنی سعود کو ملک ابھاد تسلیم کر لیا۔ (۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء)
۴۔ کلکتہ میں ہندو سما کا افتتاح: پچھلے دنوں کلکتہ میں زیر صدارت بیرٹر چکورتی ہندو سما کا افتتاح کیا گیا۔ اب وہاں سنگٹھن کا کام زوروں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

(۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء)

۵۔ حضور وائسرائے کا دورہ ناگپور: حضور وائسرائے ناگپور میں ۲۲ سے ۲۵ جولائی تک تشریف رکھینگے۔ ہزار سکنسی لیڈی اردن بھی ہمراہ ہوگی۔ ۲۳ جولائی کو ۷ بجے صبح حضور وائسرائے نئے سائنس کالج (ناگپور) کا سنگ بنیاد نصب کریں گے۔

(۱۱ جولائی ۱۹۲۶ء)

۶۔ وائسرائے کا دہلی میں درود: ۱۶ اپریل لاڈل اردن آج ۷ بجے سب دہلی وارد ہوئے۔ آتے ہی ۳۱ توپوں کی سلامی سر کی گئی۔ حکام اور معزز اشخاص سے تعارف کے بعد آپ وائسرائے راج تشریف لے گئے۔ لاڈل اردن اپنی ایگزیکٹو کونسل کا پہلا اجلاس ۱۶ اپریل کو شام کے وقت منعقد کریں گے۔ (۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء)

۷۔ پنجاب کانگریس کمیٹی سے استعفی: لاڈل وچیت رائے، پنڈت کے سنتانم، ڈاکٹر گوپی چند، ڈاکٹر دھن راج، ڈاکٹر پرشوتم لال سوندھی اور لاڈل کشن چند بھاٹیہ نے پنجاب کانگریس ایگزیکٹو کمیٹی سے استعفی دے دیا ہے اور مزید استعفوں کے آنے کا اندیشہ ہے۔

(۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء)

۸۔ سعدی و حافظ کے مقبرے : ملہران کے فارسی جریدہ وطن نے یہ خبر دی ہے کہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے مقبرے کی تعمیر کے لیے دو ہزار تومان کی ضرورت تھی۔ مرزا ابراہیم خان قوام الملک نے اس رقم کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اوصاف یہ کام انھیں کی نگرانی میں انجام پائیگا۔ نیز حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کے مقبرے کے لیے مبلغ ۵۰۰ تومان کی رقم جو وزارت معارف کی طرف سے موصول ہوئی تھی، اس کا کام آقلے آموزگار رئیس معارف کی نگرانی میں انجام کو پہنچ گیا ہے۔ (۱۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

۴۔ اردو اخبار (ہفتہ وار) :

اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سید سجاد حسین اسرار آبادی تھے۔ اردو اخبار بھی الحق کے سائز ۲۲x۱۵ پر چھپتا تھا۔ البتہ اس میں صرف چار صفحے ہوتے تھے اور فی شمارہ قیمت دو پیسے تھی۔ سالانہ چندہ پونے دو روپے تھا۔ یہ اخبار ۶ جولائی ۱۹۲۷ء کو جاری ہوا۔ عبد الحمید خاں زریبا لی۔ اے اور کلیم جلیپوری نے اخبار کے اجرا کی تاریخیں اس طرح نکالی ہیں۔

جس کی سی۔ پی۔ میں ضرورت تھی وہ پرچہ نکلا قوم اسلام کا دسمانہ ہے اردو اخبار دیدہ زیب اس کی طباعت مضامین دلکش ہر طرح مایہ صدناز ہے اردو اخبار

ہے یہی مصرع تاریخ اشاعت زیبا
الحق اسلام کی آواز ہے اردو اخبار
(۱۳ ۳ ۱۳۶ھ)

از سر احسن کہ دو، اے کلیم!
واہ، کیا اسرار کا اخبار ہے
(۱۳ ۳۵ + ۱ = ۱۳۳۶ھ)

(اس قطعے میں کل ۱۶ اشعار ہیں)

اس میں تین کالم ہوتے تھے۔ اول ملک کی اہم خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ ۱۹۲۷ء میں ملک میں شدید سنگسٹن اور تلخ کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اسی سال ناگپور میں

بندہ مسلم فساد بھی ہوا تھا، لہذا اس اخبار نے کافی ترقی کی اور یہ گویا ناگپور کے مسلمانوں کے بذات کا واحد ترجمان بن گیا۔ اسی باعث جب تھوڑے عرصے بعد ہندو مسلم کشیدگی تم ہو گئی، تو یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔ اس اخبار میں ایڈیٹر ڈیل فوٹ مشہور اردو شاعر نالین لائوٹوی کھا کر تے تھے۔ اس میں کبھی کبھی ملک کے مشہور شعرا کی تخلیقات بھی شائع ہوا کرتی تھی۔

بعض اہم خبریں ملاحظہ فرمائیں :

(۱) اگر انقدر عطیہ : حضرت حضور نظام دام اقبالہ نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ عثمانیہ سنٹرل ٹیکسیکل انسٹی ٹیوٹ کے لیے منظور فرمایا ہے۔ (۶ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۲) مہاراجہ اور کابل قدر فرماں : مہاراجہ الور نے ماہ محرم میں اپنی ریاست میں یہ فرماں جاری فرمادیا تھا کہ دوران محرم میں ہماری تمام رعایا، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، ہر ایک تعزیرے اور عظم کی تعظیم کرے اور جب وہ سامنے سے گزرے تو تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ (۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۳) سابق شاہ رومانہ کی وفات کے بعد اب اس کا ۶ سالہ پوتا میکائل اول تخت نشین ہوا ہے۔ ان کے والد شہزادہ کیرول نے جو دلیہ عہد تھے، اپنی خوشی سے سلطنت سے دستبرداری کر لی ہے۔ (۲۷ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۴) جزل ٹائر مر گئے : لندن ۲۳ جولائی - جزل ٹائر (جن کا نام امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے ساتھ ہمیشہ یادگار دیس گا) ایک طویل حالات کے بعد فوت ہو گئے۔

(۲۷ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۵) ولایان ریاست کا جلسہ : جمہور آف پرنسز (کونسل والیان ریاست) کا جلسہ نئی دہلی میں ۲۸ فروری سے ۲۸ فروری (۱۹۲۸ء) تک ہو گا۔ (۱۳ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۶) مردم فطری : حال میں قسطنطنیہ میں جو مردم شماری کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کی آبادی سات لاکھ ہے اور استنبول کی آبادی آٹھ لاکھ سات ہزار ہے۔ (۱۳ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۷) کانگریس ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا کانگریس کی ہندو مسلم اتحاد کی تجویز کو عملی جامہ پہنا۔
 کے لیے حسب ذیل ممبران کو فہرست کمیٹی کے لیے انتخاب کیا ہے: ڈاکٹر انصاری، مولانا
 ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ڈاکٹر کچلو، شرمان صاحب، حکیم اہل خاں، ستیدر قلعی
 مولانا شوکت علی، مولوی محمد شفیع داؤدی، سری نواس آئینگر، بابو بھگوان داس
 بابو شیو پرشاد گپتا، گنیش شنکر دیارتھی، مسٹر سرجنی نائیڈو، جے۔ ایم۔ سین گپتا
 سوباش چندر بوس، کے ناگیشور او، موہنی لال نہرو، ابھینگر، بیٹھ گوند واس سرط
 سرزدل سنگھ کویشر، اے رگھا سوامی آئینگر، ڈاکٹر مراری لال، راجندر پرشاد، دیوان
 چمن لال، پنڈت سنتانم اور ڈاکٹر مستی پال۔ (۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۸) راجہ صاحب بیکانیر نے ہندو یونیورسٹی کو پچاس ہزار روپے کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے
 (۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۹) ترکستان کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ (۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۱۰) افسوس کہ مسیح الملک حکیم اہل خاں دہلوی نے ۲۸ - ۲۹ نومبر کی درمیانی شب کو متوفی
 رامپور انتقال فرمایا۔ (۳۱ دسمبر ۱۹۲۷ء)

(۱۱) راجہ صاحب نانپار نے ایک سو روپیہ ماہوار فرائض محل کو مذہبی تعلیم و تربیت کے
 عطا فرمانے کا حکم دیا ہے۔ (یکم مارچ ۱۹۲۸ء)

۵۔ امید (ہفتہ وار) :

امید پہلے ۱۹۳۱ء میں عبدالستار فاروقی کی ادارت میں جاری ہوا، اور ۱۹۳۳ء کی ابتداء
 تک نکل کر بند ہو گیا۔ اس وقت اس کا سائز ۲۲x۱۵ تھا اور صفحات صرف چھ تھے۔
 تھی۔ بعد ازاں ۱۹۳۴ء کے شروع میں مشہور ادیب حکیم اسرار احمد کروی (برادری)
 ڈاکٹر عظیم کروی، مشہور افسانہ نگار کی ادارت میں اس کا دوبارہ اجراء حکیم اسرار
 انجنی حامی اسلام، ناگپور میں اردو اور فارسی کے مدرسے تھے۔ سی۔ بی میں کانگریس
 آپ کی تصنیف ہے تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ اب امید
 سائز ۲۰x۱۵ کر دیا گیا اور صفحات چھ سے بڑھ کر آٹھ ہو گئے۔ اخبار کا مصنفیہ

ناگپور کے اخبارات

انی بلند تھا۔ یہ سیاسی اخبار تھا، جو کانگریسی نظریات کا حامل تھا۔ بعد کے بدلتے ہوئے حالات میں اس نے اپنا نظریہ بدل کر مسلم لیگ کی موافقت کی۔ یہ جولائی ۱۹۳۷ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

اہم خبریں :- (مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۳۷ء جلد ۴، شمارہ ۳)

(۱) مسلم لیگ کی موت کا خطرہ : سر محمد یعقوب نے مسٹر جناح کو ایک تازہ صبح کر دیا کی ہے کہ براہ مہربانی مسلم لیگ کے ان ممبران کے متعلق جنہوں نے وڈا تیں قبول کر لی ہیں، اپنے فیصلہ میں آئندہ سالانہ اجلاس تک تغیر فرمائیں، تاکہ لیگ انتشار سے محفوظ رہ سکے۔

(۲) کانگریس کی کامیابی : (مسٹر رفیع احمد قدوائی کانگریس امیدوار) اطلاعات منظم ہیں کہ دوسرے دو امیدوار مسٹر رفیع احمد قدوائی کانگریس امیدوار کے مقابلے میں پیٹھ گئے اور مسٹر رفیع احمد قدوائی بلا مقابلہ شمالی برانچ حلقہ سے منتخب ہو گئے۔ یہ جگہ مسلم لیگ کے نمایندے مسٹر اصغر علی کی وفات سے خالی ہوئی تھی۔ مسٹر قدوائی کے آجانے سے ۲۲۸ ممبروں کے ہاؤس میں کانگریس کی میزبانی ۱۲۴ افراد پر مشتمل ہے۔

(۳) قومی مشاعرہ : زیر صدارت مرتضیٰ الشعرار، فصیح البیان، مصوٰر جذبات، صوفی سرمد ثانی، امام الراعیات حضرت مولانا سید امجد حسین صاحب آجندہ مظہر حیدر آبادی، برہنہ مشنبہ ۱۲ صفر ۱۳۵۶ھ (مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۳۷ء) نو بجے شب انجمن ہائی اسکول صدر بازار ناگپور منعقد ہوگا۔

(۴) دربار تاج پوشی کی تقریروں میں شرکت کی مانعت : (صوبہ بھارتی کانگریس کمیٹی کے نام پینڈت جواہر لال نہرو کا مکتوب) پینڈت جی نے صوبہ بھارتی کانگریس کمیٹیوں سے درخواست کی ہے کہ وہ کانگریسی کارکنوں نیز دیگر اصحاب کو اس امر کی یاد دہانی کرا دیں کہ دربار تاج پوشی کی تقریروں میں خواہ وہ کسی شکل میں ہوں اور کسی پہلے پر ہوں شرکت کرنا کانگریس کے خلاف احساس کی پالیسی کے خلاف ہے۔ لہذا یہ اپیل کی گئی ہے کہ ان تقریروں میں شرکت نہ کی جائے۔ (۱۹ مئی ۱۹۳۷ء)

۶۔ آرسی (ماہنامہ) :

یہ صوبہ متوسط و ہمارا پہلا نسوانی رسالہ تھا۔ اس کا سائز عام ماہناموں کی طرح ۱۰×۱۲ تھا؛ ضخامت ۲۸ صفحات اور قیمت سالانہ ڈھائی روپے اور فی پرچہ چار گانے تھی۔ کتابت، طباعت، کاغذ کا معیار بہت اچھا تھا اس رسالے کا اجرا فروری ۱۹۳۷ء میں حکیم اسرار احمد کروی کی ادارت میں ہوا؛ لیکن ایک شمارہ نکلنے کے بعد ہی موصوف نے اس کی ترتیب و اشاعت کا کام اپنے بھتیجے یعنی ڈاکٹر اعظم کروی کے فرزند ارجمند آفتاب احمد اسلم کروی کو سونپ دیا۔

آرسی خواتین کو ان کے جائز حقوق دلانے اور ان میں انسانی خودداری کا احساس پیدا کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ یہ رسالہ پُر جوش نظیں، دلدادہ اور نتیجہ خیز افسانے، مقالات علمیہ تاریخی مضامین، حقیقی معلومات اور ادبی جواہر پاروں سے آراستہ ہوتا تھا۔ اس میں ٹیگور کے ترجمے، ارشد امداد احمد اور حکیم اسرار احمد کروی کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ افسوس صرف چار شمارے نکلنے کے بعد ہی ۱۹۳۷ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔

۷۔ سہ روزہ جمہور (صوبہ متوسط و ہمارا کاترجمان) :

یہ اخبار ۱۳۳۳ھ سائز پر ہفتہ میں دو بار کامٹی سے شائع ہوتا تھا اس کی سالانہ قیمت چار روپے تھی؛ ایک پرچے میں صرف چھ صفحے اور قیمت دو پیسے تھی۔ اس کے ایڈیٹر پرنسپل پبلشر مولانا محمد عمر انصاری الطر صاحب تھے۔ یہ ۱۲۵ اپریل ۱۹۳۵ء کو جاری ہوا؛ لیکن معاشی بد حالی کے سبب ایک سال کے اندر ہی بند ہو گیا۔ ہر صفحے میں تین مساوی کالم ہوتے تھے۔ اس میں خبریں، مضامین کے علاوہ بیرونی اور مقامی شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اخبار کے سرمدق پر اقبال کا یہ مشہور شعر چھپتا تھا:

سلطانی جمہور کا آقا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے بشارت

اور بشت پر شعر ملت ہے:

از غلامی فطرت آنا دور رسا ممکن تا تراشی خواب از برہمن کافر تری

جمہور نے اپنی مختصر زندگی میں رسول نمبر شائع کیا تھا جو بہت اہم ہے۔ اس میں خصوصیت

کے ساتھ راجہ راجہ ایشاد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ آف تیلو تھو اسٹیٹ کی مالک اور تقریر "رحمت عالم کے اخلاق" بہت بلند پایہ ہے۔ "وحدت مذاہب" پمڈیٹر ٹرانسٹر آف انڈیا مسٹر ڈیر سب کا مضمون بھی قابل ذکر ہے۔

اہم خبریں (۱۸ جون ۱۹۳۵ء) جلد ۱۵، شمارہ ۱۵

(۱) لندن: ملک معظم نے ایک مجلس منعقد کی، جس میں سر نیچ بہادر سپرو نے پریوی کونسل کے رکن کی حیثیت سے حلف لیا۔

(۲) الہ آباد: یہاں سب سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں یہ افواہ گرم ہے کہ ملک معظم کی جبری کی خوشی میں تمام قیدیوں کی جو ہندستان کی مختلف جیلوں میں اپنی میعاد سزا پوری کر رہے ہیں، قید میں دو دو ماہ کی کمی کی جائیگی معلوم ہوا ہے کہ سیاسی قیدی اور انقلابی سازشوں کے لیے سزا پانے والوں کے ساتھ بھی یہی رعایت کی جائیگی۔

(۳) لندن: اخبارات کا خیال ہے کہ لارڈ ولنگڈن کے بعد لارڈ لنلتھگرو ہندستان کے وائسرائے ہونگے۔

(۴) غملہ: (۱۲ جون) جنرل کارسل کو جنرل آفیسر کمانڈنگ ویسٹرن کمان کا عہدہ سونپا ہوا ہے کہ رزلٹ کے چوتھے روزے میں سے ایک عورت نکالی گئی جس کے پھر پیدا ہو رہا تھا۔ زچہ اور بچہ دونوں محفوظ ہیں۔

(۵) پیکن: (۴ جون) حکومت جاپان نے اب کئی جدید مطالبات حکومت چین کے رو برو پیش کیے ہیں۔ چین نے ان کو نامنظور کر دیا ہے۔ جاپان کی بے شمار فوجیں سرحد کی طرف ڈھک رہی ہیں۔ جنگ کا امکان یقینی صورت اختیار کر چکا ہے۔

(۶) لاہور: تقریباً پچاس معززین شہر نے جن میں پنجاب یسلیٹھو کونسل کے پریسیڈنٹ چودھری شہاب الدین، سر محمد اقبال اور خان صاحب فضل الہی وغیرہ شامل ہیں، یہ طے کیا ہے کہ ۳ جون کو آغا حشر مہرم کی یادگاہ میں آغا حشر ٹرسٹ

منایا جائے۔

شمارہ (۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء) جلد ۲۔ شمارہ ۴۲

(۱) جنگ شروع ہوگئی (اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا : بمباری اور پسپائی) ۳ اکتوبر
گیارہ بج کر بیس منٹ ریوٹر کا جنگ سے متعلق آج پہلا شمارہ پہنچا کہ اڈا اور اطالوی
جہاز نے بمباری شروع کر دی۔ دوسرا شمارہ ۳ اکتوبر گیارہ بج کر چوبیس منٹ کو پہنچا۔
معلوم ہوا ہے کہ بمباری سے اڈا کو بہت نقصان پہنچا ہے۔
اعلان جنگ : اسرارہ ۴ اکتوبر آج اطالوی جرنیل ڈبازو نے قاعدے کے مطابق اعلان
جنگ کیا۔

(۲) لندن : ۳ اکتوبر شاہ حبش راس سیوم نے جمعیتہ الاقوام کو مطلع کیا ہے کہ اطالوی
فوج نے اڈا اور ڈیگراٹ پر بم بھینکنا شروع کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں کئی
شہری جن میں بوڑھے اور عورتیں بھی شامل ہیں، مجروح ہوئے ہیں۔
(۳) اٹلی کا حفاظت خود اختیاری کا بھانا : (جنیوا ۳ اکتوبر) اٹلی نے جمعیتہ الاقوام کو
اطلاع دی ہے کہ اطالوی جرنیل کو حفاظت خود اختیاری میں حبشہ پر حملہ کرنے کا حکم
دے دیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ حبشہ اپنی جنگی تیاریوں سے باز نہیں آنا چاہتا تھا اور
فوجوں کی نقل و حرکت شروع کر دی تھی۔ حبشہ کا احتجاج منظر ہے کہ بمباری سے
اڈا میں بہت اتلاف جان و مال ہوا ہے۔

عام جنگ کا اعلان : (ادیس ابابا، ۳ اکتوبر) عام جنگ کا تمام حبشہ میں اعلان کر دیا
گیا۔۔۔۔

ایڈیٹن میں جنگ : نیگوس کا ایک شمارہ منظر ہے کہ اڈیگراٹ پر بھی بمباری شروع ہوگئی ہے
اور ایڈیٹن صوبہ میں جنگ کی پہل بھی ہوئی ہے۔
اطالویوں کی پسپائی : بیان کیا جاتا ہے کہ اطالوی فوجیں جو انیم کی طرف بڑھ رہی تھیں،
اڈا اور ڈیگراٹ کے درمیان شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئیں۔
اسی طرح مختلف مقامات کے تحت مزید تفصیلی خبریں ہیں۔

۸۔ ڈیر سخن (ماہنامہ) :

یہ ماہنامہ بھی جمہور کے مدیر عمر انصاری اہل مرحوم نے کامٹی سے جاری کیا تھا۔ اس سے پہلے کامٹی سے کبھی کوئی اخبار یا رسالہ جاری نہیں ہوا تھا۔ جمہور پریس بھی جہاں یہ دونوں پریس چمکتے تھے، ان کی ناقی ملکیت تھا۔ ڈیر سخن ۱۲x۱۲ سائز پر ہر ہفتے ۳۲ صفحوں پر نکلتا تھا۔ ایک پریس کی قیمت دو آنے اور سالانہ ڈیڑھ روپیہ تھی۔ عمر انصاری کے ساتھ احمد انور کامٹی بھی ادارہ تحریر میں شامل تھے۔ یہ پریس ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب آئی۔ ایم۔ ڈی کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا۔ لیکن افسوس کہ صرف تین شلے نکل سکے اور یہ رسالہ بند ہو گیا۔ ہمارے پاس اس کے دو شمارے ہیں۔ شمارہ ۱ (مارچ ۱۹۳۵ء) کے مضامین حسب ذیل ہیں :

شروع میں ملاحظیات کے عنوان سے عمر صاحب کا مختصر طاریہ ہے۔ اس کے بعد ابتدائی ۱۲ مضامین تک باہر کے شعراء کے منظومات درج ہیں۔ ان میں عبدالقیوم شفیق، مولانا ابوالحسن ناطق گل، ڈھوی، مولانا حبیب اللہ خان فاضل (ملک)، مولانا خلیل الہدی شارق، قیصر امرواتی اور حکیم مصطفیٰ حسین خاں بلخ آبادی کی غزلیات اور حبیب بلخ آبادی کی نظم جلوہ سحر ہیں۔ اس کے بعد جن مقامی شعراء کا کلام ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

مولوی محمد عمر انصاری، اہل، نقی فقیر محمد ناظم کامٹی، انور کامٹی، احقر کامٹی اور شاعر کبھی کامٹی۔

حصہ نثر (ص ۱۴ - ۲۹) میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں :

تذکرہ شمس ولی اللہ — مولانا محمد عمر انصاری

ادبیات (قسط اول) — ”ادب ایک فن کی حیثیت سے“ — وقار عظیم ایم۔ اے

حافظ کا ایک شعر — فاضل ایم۔ اے

بلبل (کیش کی نظم کا ترجمہ)

ارتقاے ابد (قسط اول) — عبدالرزاق خاں بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ (ملک)

لغات (انگریزی لغت) — از فائدہ گو

۹۔ مصور الفاروق (ہفتہ وار) :

یہ ہفتہ وار پہلے ۲۲؍۱۸ سائیر نکلا، لیکن بعد کو اس کا سائیر ۲۲؍۲۲ ہو گیا۔ بالعموم اس میں آٹھ سے بارہ صفحے تک ہوتے تھے۔ اسی لیے قیمت بھی ڈھائی روپے سے بڑھ کر چھ روپے سالانہ کر دی گئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر جناب عبدالستار فاروقی تھے۔ موصوف کا مٹی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اردو صحافت کو ترقی دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ الفاروق سے پیشتر ناگپور سے نکلنے والے متعدد اخباروں میں ان کا مل دخل ملا ہے۔ ان کا ایک دارالمطالعہ بھی ہے جس میں ہمیشہ قیمت اور نادر کتابیں موجود ہیں۔ سیاسی میدان میں بھی سرگرم رہے ہیں۔

الفاروق (ہفتہ وار) ۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو نواب غازی آف گیور دھامیٹ کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ قبولیت عامہ کے باعث یہ اخبار صبح معنوں میں ۲۷ سال یعنی ۱۹۶۳ء تک صوبہ کا واحد ترجمان بن رہا؛ اتنے لمبے عرصے تک یہ اخبار پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس میں دو تین اور چار کالم ہوتے تھے۔ پہلے صفحے کے بالائی حصے میں اخبار کے نام کے ساتھ کبھی کبھی اقبال کا یہ شعر شائع ہوتا تھا:

جینوں کے سایے میں ہم پل کر جاں جو کہیں
خبر ہلال کا ہے قوی نشان ہلال
تقسیم ملک سے پہلے یہ اخبار مسلم لیگ کا موافق تھا۔ بعد کو یہ کانگریس پارٹی کا خاص آئینہ بن گیا۔ اس کا شعار کافی بلند تھا۔ اس میں ملک بھر کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اس میں مقامی ادبا ہر کے شعراء کا کلام بھی شائع ہوتا۔ علاوہ ازیں مضامین، افسانے اور مقالات بھی چھپتے تھے۔

۱۰۔ جدوجہد (ہفتہ وار) :

یہ اخبار صوبہ متروست و برابر میں مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔ فروری ۱۹۳۷ء میں مولانا سید ابوالحسن ناٹک گلاؤٹھی کی سرپرستی اور نگرانی میں جاری ہوا تھا۔ بعد کو انھیں معلوم ہوا کہ یہ اخبار مسلم لیگ کا نقیب ہے۔ چونکہ وہ خود کانگریس پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، لہذا جلد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر عبدالہادی خاں صاحب تھے۔ ان کے بعد سید ابوالنظر

بھاری ہوئے اقدار میں محمد عبدالکلیم ناکر۔ اس اخبار نے وقایہ منداکیم کی پُر زور مخالفت کی تھی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کے شمارے میں اخبار نے ایک مقدمے پر تنقید کی تھی بعد کو اسی کی پاداش میں حکومت وقت نے اخبارات توہیر پریس سے جہاں یہ اخبار چھپتا تھا، دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی اور ضمانت ادا نہ کر سکنے پر دونوں بند ہو گئے۔

۱۱۔ مسلم (ہفتہ وار) :

آٹھ صفحات پر مشتمل یہ ہفتہ وار پرچہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ تین روپے تھا اور ایک پرچہ کی قیمت صرف دو پیسے تھی۔ یہ اپریل ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر علی برادران کے تربیت کردہ، جلیپور کے مشہور صحافی تاج الدین صاحب تھے۔ یہ اخبار کانگریسی نظریات کا حامل تھا۔ چونکہ وہ دوسلم لیگ کے سیاسی تسلط کا تھا، اس لیے اسے قدم قدم پر مالی اور دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر یہ مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا تھا۔

اس اخبار میں بھی اسی مقدمے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی، جس کا اور پڑا ذکر ہوا۔ چنانچہ اس سے بھی دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور عدم ادائیگی کے باعث یہ بھی بند ہو گیا۔ اس اخبار میں سیاسی مضامین کے ساتھ پرجوش اور انقلابی نظمیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ اخبار کے سرمدتی پر اقبال کا یہ شعر لکھا جاتا تھا :

خویریں نہ ہم جس کو اچھے ابو سے مسلمان کو ہے رنگ وہ پادشاہی

۱۲۔ عزیز (ماہنامہ) :

فیض انصاری، قادری نازی اور عثمانی اقبال تینوں حضرات نے مل کر ۱۹۳۷ء کے وسط میں بچوں کا یہ پہلا ماہنامہ ناگپور سے جاری کیا تھا۔ اس میں دلچسپ کہانیوں اور افسانوں کے علاوہ شعری تخلیقات بھی شامل ہوتی تھیں۔ افسوس کہ کچھ سات شماروں کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

۱۳۔ گوہر (ماہنامہ) :

یہ رسالہ مئی ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ اور ایک شمارے

کی قیمت دو آنے تھی۔ یہ معمولی معیار کا رسالہ تھا جسے چند نوجوانوں نے مل کر بچوں کے لیے جاری کیا تھا۔ دو یا تین شماروں کے بعد ہی بند ہو گیا۔

۱۳۔ ہفتہ وار مسلم لیگ گزٹ اور ہفتہ وار محوی :

فروری ۱۹۲۷ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں عارضی طور پر مخالف دوافق پروانہ ہونے کے لیے یہ دونوں اخبار شروع ہوئے۔ اول الذکر کے ایڈیٹر حکیم تاج محمد خان (مشہور اریب و ہاج محمد خان دکنی پریم نگری کے والد) اور موزا الذکر کے ایڈیٹر ناگپور کے مشہور و معروف شاعر جناب سلطان احمد خان محوی تھے۔

۱۵۔ شوکت (ہفتہ وار) :

مولانا شوکت علی مرحوم کی یاد میں یہ اخبار یکم جون ۱۹۴۹ء کو ناگپور سے شائع ہوا اس کے ایڈیٹر سید ابو مظفر بہاری تھے۔ ضخامت آٹھ صفحے، سائز ۲۰×۳۰، سالانہ چندہ ڈھائی روپے اور فی شمارہ قیمت دو پیسے تھی۔ لیکن بہت ہی قلیل عرصے میں معاشی بد حالی کے سبب بند بھی ہو گیا۔ اس کے سرورق پر بھی اقبال کا یہ مشہور شعر چھپا کرتا تھا:

تینوں کھائے ہیں ہم لپکرجواں ہوئے ہیں شجر ہلال کا ہے قوی نشان ہما

۱۶۔ پرواز (ماہنامہ) :

یہ ماہنامہ بڑے اہتمام سے اپریل ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا تھا۔ کانڈا کاتب، طباعت ہر ایک چیز معیاری تھی۔ بالعموم ۳۲ سے ۴۸ تک کی ضخامت تھی۔ سالانہ چندہ چار روپے تھا اور ایک پرچے کی قیمت چھ آنے۔ اس کے ایڈیٹر خیر اہوہ المسلم بی۔ اے تھے اور اُن کے معاون قادر غازی۔ اسے مقامی ادباء اور شعراء کے علاوہ ملک کے بعض مشہور لکھنے والوں مثلاً محوی صدیقی کھنوی، سر دوش عسکری، طباطبائی، نذیر بیگم، بہادر کھنوی، ملّا رموزی، ادیب مالگاؤنی، شفا گویا ری وغیرہ کا قلمی تعاون حاصل تھا لیکن ناسوس کمرن چار خمدے لکھنے کے بعد اگست ۱۹۵۰ء میں یہ بند ہو گیا۔ رسالے کے سرورق پر اقبال کا یہ شعر ہوتا تھا:

اے مائولہ ہوتی اُس رات سے موت تھی جس رات سے آتی ہیں ہلاکتیں کوئی

فلمی نقاد (ماہنامہ) :

یہ مدھیہ پریش کا واحد ادبی فلمی معنوی ماہنامہ تھا۔ تقریباً ہم صفحے کی ضخامت میں مضامین، تصویریں اور فلمی موضوعات پر مضمون ہوتے تھے سالانہ قیمت چار روپے اور ایک شمارے کی قیمت چھ آنے تھی۔ اس کے ایڈیٹر حمید صادق (بی۔ اے) تھے۔ یہ سالہ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں جاری ہوا۔ فلمی خبروں اور مضامین کے علاوہ اس میں افسانے اور شعری تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس کے فلمی موادوں میں بعض اصحاب کے نام یہ ہیں: ناطق گل، دھڑوی، نواب غازی آف گجرات، نادم بلخی، عظیم آبادی، اے۔ این۔ کیلا، یاد عظیم آبادی وغیرہ۔ ایک سال سے کچھ زیادہ مدت تک یہ رسالہ جاری رہا۔

۱۸۔ سنگیت (ہفتہ وار) :

یہ مختصر ہفتہ وار (۶ صفحات) بھی حمید صادق صاحب کی ادارت میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کی سالانہ قیمت صرف تین روپے تھی۔ یہ سیاسی، اقتصادی اور سماجی پرچہ تھا۔ منہ کا ڈانٹہ بدلنے کو کبھی کبھی مقامی شعرا میں سے کسی کی فرل بھی شامل ہو جاتی تھی۔ مالی پریشانی کے باعث یہ اخبار بھی چند مہینوں سے زیادہ نہ چل سکا۔

۱۹۔ تباہ (ماہنامہ) :

تباہ مارچ ۱۹۵۲ء میں حمید آفزا اور بلدیہ دیوان کی ادارت میں ادارہ اشاعت اردو کے زیر اہتمام شروع ہوا۔ اس میں ادبی اور تنقیدی مقالات کے ساتھ مقامی اور غیر مقامی شعرا کا کلام اور افسانے بھی شائع ہوتے تھے۔ چھ سات شماروں کے بعد اس میں فلمی میکسٹن کا بھی اضافہ کر دیا گیا، جسے افسانہ نویس قادر نیازی ترتیب دیتے تھے۔ آخری شمارہ ستمبر ۱۹۵۵ء کا شائع ہوا۔ اس قلیل عرصے میں رسالے نے خاصی معنوی ترقی کر لی تھی لیکن مالی مشکلات کے باعث مجموعہ رسالہ بند کرنا پڑا۔ اس کے پہلے دو شماروں کے محتویات حسب ذیل تھے :

جلد ۱، شمارہ ۱ (مارچ ۱۹۵۲ء)

حصے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "ادراک" اس حصے میں ملا، ناطق

گلاؤٹھوی، لوح ناری، ناز چاند پوری، بہزاد گھنوی، ماہر نقاد دی، الم مظفر گری، مگن ناتھ
آزاد، نازش پرتاپ گوسھی، ستیہ اختر اور دوں جو پوری کی غزلیں ہیں۔

دوسرے حصے کا عنوان "نور شمع" ہے۔ اس میں پہلے سجاد ظہیر کا خطان کی اہلیہ کلام ہے۔
یہ خط محض رسمی نہیں بلکہ حالات حاضرہ پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ "پیر پٹاؤٹھا" پر
آل احمد سرود کے مقالے کی پہلی قسط ہے۔ اس کے بعد محمد یونس خالدی کا ایک دلچسپ
خط ہے، جس میں دنیا کے حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے (ماہ وانجم) میں دیگر ممتاز شعراء کا کلام ہے۔
جو حاحقہ (سنگ و آہنگ) اخلاقی، اصلاحی اور سماجی افسانوں پر مشتمل ہے۔
پانچواں حصہ (گرد و پیش) متفرق ادبی خبروں کا مجموعہ ہے۔

جلد ۲ - شمارہ ۲ (اپریل و مئی ۱۹۵۲ء)

حسب سابقہ قرار دیا کہ میں مولانا طارق گلاؤٹھوی، رئیس امر وہی، طرفہ قریشی، حمید آذر
اور دیگر مقامی شعراء کی غزلیں ہیں۔ اس کے بعد "نور و شمع" یعنی نثری حصے میں حسب
ذیل مضمون ہیں:

ہزار ٹٹھا۔ از آل احمد سرود (قسط دوم)؛ شاعر تاج از فرید تنویر (سیلاب کی شاعری پر
ایک مقالہ)؛ قضیہ نامرضیہ از یونس خالدی۔

اس کے بعد پیر ناز و انجم کے عنوان سے دیگر مقامی اور غیر مقامی شعراء کی نظمیں و غزلیات
درج ہیں۔ آخر میں "سنگ و آہنگ" کے عنوان سے بعض مقامی افسانہ نویسوں کے افسانے
ہیں اور پھر "گرد و پیش" کے تحت مختلف خبریں۔ اس شمارے میں بین الاقوامی
اضطرار کا ایک سیاسی مضمون ماخوذ ہے۔

اس کے علاوہ ابراہیم صلیقی کا مقالہ "تقسیم ہند کے بعد غزل کے نئے رجحانات" شمارہ
دسمبر ۱۹۵۲ء اور نثار فاروقی کا مقالہ "میر کی سیرت کے بدنام نقش" (آپ حیات کے
آئینے میں) نومبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں خائع ہوا ہے۔

۲۔ سویرا (پندرہ روزہ) :

سویرا کے ایڈیٹر جناب اقبال ہاشمی تھے اور ہرنٹر، پبلشر احمد علی ہاشمی۔ یہ پریچہ اگست ۱۹۵۲ء میں نکلا اور سات شماروں کے بعد نومبر ۱۹۵۳ء میں بند ہو گیا۔ اس میں بالخصوص مختصر فنسے اور فزلیں شائع ہوتی تھیں۔ آخر میں فلمی سیکشن بھی ہوتا تھا، جسے قادیسیازی ترتیب دیتے تھے۔

۲۱۔ چاند (ماہنامہ) :

چاند کا دعویٰ تھا کہ یہ حصہ پریڈیشن اور حیدر آباد دکن کے بچوں کا واحد علمی، اخلاقی، معلوماتی ماہنامہ ہے۔ فیض انصاری اور شفیقہ فرحت اس کے ایڈیٹر تھے۔ قیمت فی پریچہ پانچ آنے تھی اور سالانہ ساڑھے تین روپے۔ یہ جنوری ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی غرض سے نکالا گیا تھا اور انھیں کے معیار کے مطابق اس میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں نو مشق طلباء، ادبا، شعراء اور افسانہ نویسوں کی تخلیقات کو بھی اس میں جگہ دی جاتی تھی۔

انہیں میں شفیقہ فرحت اور فیض انصاری میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، جس کے باعث فرحت چاند کی مجلس ادارت سے الگ ہو گئیں اور اپنا ذاتی رسالہ کرئیں (ماہنامہ) جاری کیا۔ جون ۱۹۵۴ء میں چاند بند ہو گیا۔ اس میں چند لکھنے والوں کے نام یہ ہیں: قادیسیازی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، زرش کاشاد، خلیل الہدی شارق، پرکاش پنڈت، منظر حفی، خلیق برہانپوری، ستیہ اختر، ادیب بالیگاؤنی، ان کے علاوہ مقامی حضرات کا حصہ بھی اس رسالے میں کچھ کم نہیں تھا۔

۲۲۔ گزین (ماہنامہ) :

اس کا ڈاکٹر اوپر ہوا ہے۔ اس کی ایڈیٹر جناب شفیقہ فرحت تھیں۔ اس کی قیمت فی پریچہ چھ آنے اور سالانہ چار روپے تھی۔ کاغذ اگرچہ اخباری استعمال ہوتا تھا لیکن اس کی طباعت نکات بہت عمدہ تھی۔

زین اگست ۱۹۵۴ء میں جاری ہوا اور غالباً ڈیڑھ سال تک پابندی وقت کے ساتھ

نکھترا ۱۔ اس میں افسانے، دلچسپ مضامین اور منظومات شائع ہوتی تھیں۔ رسالے کے آخر میں ملحق حصہ بھی ہوتا، جسے خفیہ فرحت کے بھائی ڈاکٹر محمد اسلم (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) ترتیب دیتے تھے۔ کرنیں میں موعتہ کا سلسلہ بھی جاری کیا گیا تھا۔ لیکن یہ چند ہی جہینوں کے اندر بند ہو گیا۔ سعادت حسن منٹو، اختر انصاری، اکبر آبادی، کرشن چندر، صالحہ حاجیہ، زلیخا کمار، شاد شفا گویا، کوثر چاند پوری، عادل رشید وغیرہ مشہور لکھنے والے کے مضامین اور نظیں اس رسالے میں شائع ہوئی ہیں۔

۲۳۔ راہی (ماہنامہ) :

اس رسالے کا دعویٰ تھا کہ یہ نئی فکر، نئے رجحانات اور صحت مندانہ ادب کا ترجمانی ہے۔ اس کے مرتب فخرزاد اسلم بی۔ اے تھے، حالانکہ اس پرائیڈٹر، پرنٹر، پبلشر کی حیثیت جمال الدین برقی کا نام چھپتا تھا۔ شروع میں قیمت فی پرچہ تین آنے تھی جو بعد ازاں دو آنے ہو گئی۔ اسی طرح زمرہ سالانہ بھی دو روپے سے گھٹا کر ڈیڑھ روپیہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۴ء میں جاری ہوا؛ یہ ادبی رسالہ اس میں تنقیدی مضامین کے علاوہ مقبول شعراء کی غزلیں بھی شامل رہیں۔ اس میں دلچسپ افسانے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۵۶ء کے شمارے سے فخرزاد اسلم اپنی ذاتی مصروفیات کی بناء پر راہی بطور حصہ ہو گئے۔ اب ثاقب اقبال نے ان کی جگہ سنبھالی۔ بالآخر شمارہ شمارے بچنے پر بد یہ مئی ۱۹۵۶ء میں معاشی پریشانیوں کا شکار ہو گیا۔ راہی میں حصہ لینے والے مشہور مضمون نگار یہ ہیں :

ناطق گلشن، شارق ایرایانی، معراج لکھنوی، نور لکھنوی، شفا گویا، ضیاء سرور، کھوپالی، ستونت کوری، قادر نیازی، فیض انصاری، شاکر ادنی، کبادی ۲۴۔ شفق (ماہنامہ) :

اس رسالے کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مجید نذیری صاحب تھے۔ اس رسالے کا مقصد درمیانے درجے کا تھا۔ ایک پرچہ میں بیس سے چوبیس صفحات تک ہوتے تھے۔ سالانہ صرف دو روپے تھا۔ دراصل یہ پرچہ چند با ذوق نوجوانوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ستمبر ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا تھا۔ ادبی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ اس میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور فلسفے شائع ہوتے تھے۔ اس میں مضمون نگار بھی زیادہ تر مقامی حضرات ہی تھے۔

۲۵۔ خیال (ماہنامہ) :

یہ وسط ہند کا بہترین ماہنامہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سب کچھ فیض انصاری مرحوم تھے۔ فیض کا ابھی پانچ سال شب جمعہ ۷ مئی ۱۹۷۱ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو چکا ہے۔ وہ ۱۹۶۳ء سے انجمن ترقی اردو علاقہ دور بند کے جنرل سکرٹری تھے۔ ناگپور کی صحافت کی ترقی میں ان کی خدمات بھولنے کی نہیں۔ وہ ہمیشہ اردو کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ آل انڈیا اردو کانفرنس ناگپور (جنوری ۱۹۷۳ء) انہیں کی کو خلیا کا نتیجہ تھی جس میں ملک کے مشاہیر نے شرکت کی تھی۔ ان کی غیر مطبوعہ کتاب مسی پی کی موتی اپنے موضوع پر واحد تصنیف ہے۔ اس کتاب میں صوبہ متوسط اور برار کے شعراء کرام (قدیم و جدید) کا تذکرہ مع تصاویر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وسط ہند میں اردو کی عہد بہد ترقی کا تاریخی جائزہ بھی شامل ہے۔

خیال اپریل ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا اور بہت ہی قلیل عرصے میں اردو کے جیوٹی کے پرچم میں شمار ہونے لگا۔ پہلے اس رسالے کے نائب مدیر یا سٹرٹیم الدین تھے۔ بعد کو عرصہ دوازہ تک زیر رضوی اس کے مدیر اعزازی رہے۔ رسالے کا صحافتی معیار کافی بلند تھا۔ اس میں ہندوستان کے صنفِ اول کے مصنف اور شعرا و حضرات لیتے تھے لیکن انہوں نے یہ پرچم بھی معاشی پلٹ اینڈ کی بحیثیت چڑھ گیا۔ آخری شمارہ دسمبر ۱۹۶۱ء کا تھا۔

خیال کے میعاد کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے چند منتخب مضامین کی فہرست ملاحظہ کیجیے۔ جو اس کی حیات مختصر میں شائع ہوئے۔

اکبر خٹوط کے آئینے میں از انصار اللہ انصاری (اپریل ۱۹۵۷ء)؛ اردو زبان کا مستقبل از قاضی عبدالغفار؛ موسیقی کی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی (ستمبر ۱۹۵۹ء)؛ شہزاد دیندہ و شہزادہ تخلیق کاہلہ و کرب از نسیم سہارنپوری (اکتوبر ۱۹۵۹ء)؛ شاہر صدیقی از عرض سعید راہ

تاج کے ماہنامہ

بات سے بات از فیض انصاری (نومبر ۱۹۵۹ء)؛ دام لال اور اس کا فن از دینندہ (مارچ ۱۹۶۰ء)؛ شاہ باقر از نصیر الدین ہاشمی (اپریل ۱۹۶۰ء)؛ ہلرے ادیب اور ادب از اکرام ادیب (جون/جولائی ۱۹۶۰ء)؛ ادیبوں کے مسائل از کوثر چاند پوری (اگست ۱۹۶۰ء)؛ تاج سعید (اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۰ء)؛ منظر نامہ از شہزادہ منظر (نومبر ۱۹۶۰ء)؛ محسن زیدی از خواجہ مقبول احمد اور بنو ناس از تمکین کاظمی (فروری/مارچ ۱۹۶۱ء)؛ میکے کا چراغ (مزید عظیم آبادی اور ان کی زبانیات) از ڈاکٹر علی اکبر نقوی (دسمبر ۱۹۶۱ء)

اس کے علاوہ خیال میں اس عہد کے تمام شعراء کا کلام بالائزام شائع ہوتا رہا۔
۲۶۔ تاج (ماہنامہ) :

یہ پرچہ جون ۱۹۵۹ء میں نواب غازی آف گیور دھاسٹیٹ کی سرپرستی میں جاری، لیکن افسوس کہ چار شماروں کے بعد ہی بند ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر ظہیر القریشی تھے۔ میں تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر شفا گویا، محو مدنی، لکھنوی، فراق گودکھپوری اور مولانا ناطق گل اور مٹھوی جیسے مشہور شاعروں کا اس رسالے میں شائع ہوا ہے۔

۲۷۔ نو بہن جدید (ماہنامہ) :

ادارہ بزمِ اردو ناگپور کی جانب سے ایک قلمی مجلہ "پیام نو" کے نام سے نکلتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں کارکنانِ بزم نے اسی کو "نو بہن جدید" کا نام دے کر ماہنامے کی شکل میں نکالنے کی کوشش کی۔ مگر افسوس کہ یہی ایک شمارہ اول و آخر ثابت ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مصلح الحسن تھے۔ رسالے کی قیمت ۷۵ پیسے تھی۔

۲۸۔ مدنی تجلیات (ماہنامہ) :

ریاست مہاراشٹر کا واحد مذہبی رسالہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر غلام محمد خان تھے۔ ابتدا میں قیمت فی پرچہ ۵۵ پیسے تھی، بعد ازاں ۶۰ پیسے ہو گئی۔ سالانہ چندہ ۷ روپے پچاس پیسے تھا۔ پیچھے کی ظاہری شکل و صورت بھی ابھی تھی۔ طباعت و کتابت

ناگپور کے اہل و عیال

اگر اس میں کاغذ عمدہ سفید استعمال ہوتا تھا۔ یہ پرچہ جنوری ۱۹۶۶ء میں نکلا تھا۔ دو سال کے اندر ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس میں علمائے اہل سنت کے مضامین کے ساتھ نصت، سلام اور منقبت وغیرہ بھی شائع ہوتی تھیں۔

۲۹۔ تاج (ہفتہ وار) :

جناب ظہیر افروز کی ایڈٹری میں اس پرچے کا پہلا شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۶ء کو شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ پرچہ آج تک جاری ہے۔ اس میں شب و روز کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ مقامی اور غیر مقامی شعراء کا کلام بھی اس پرچے میں چھپتا ہے۔

۳۰۔ اُمنگ (پندرہ روزہ) :

اس پرچے کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر شمیم فیضی اور مدیر معاون مقتول دارفی ہیں۔ یہ دور برس یعنی یکم مارچ ۱۹۷۰ء سے جاری ہے۔ اس میں زیادہ تر سماجی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ عوام کا دیباک ترجمان ہے۔

ان اخبارات و رسائل کے علاوہ طلباء میں ادبی ذوق پیدا کرنے کو یہاں کے اُردو مدارس اور کالجوں سے بھی سالانہ اردو رسائل نکلتے رہے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں :

- ۱۔ مرتق انجمن : انجمن ٹیچرز پرنسپلز بائرسکینڈری اسکول، ناگپور
- ۲۔ تہذیب الکلام : مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول، ناگپور
- ۳۔ گستانِ ربانی : ربانی بائرسکینڈری اسکول، کامٹی
- ۴۔ نورائے سبحانیہ : سبحانیہ ہائی اسکول، ناگپور
- ۵۔ نقوشِ قدسائی : قدسائی ہائی اسکول، ناگپور

۶۔ سائنس کالج میگزین، ناگپور

۷۔ ناگپور مہادویالیہ میگزین، ناگپور

۸۔ ایس۔ ایف۔ ایس۔ کالج میگزین، ناگپور

ناگہ کے خند و حال

ہم نے یہاں حتیٰ الوسع ناگہ کے تمام اردو رسائل و جرائد کا تذکرہ پیش کیا ہے اس بات سے آج تک یہاں سے جتنے پرچے نکلے ہیں انہیں حاصل کر کے ان کے بارے میں صحیح مکمل معلومات دینے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اخبار یا رسالہ نادانہ شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔

فراہمی مواد کے دوران میں بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں یہاں سے مندرجہ ذیل پرچے بھی ضائع ہوئے۔

۱۔ پیام کو (ہندہ رعدہ) - منشی و امدلی کی ایڈٹری میں یہ پرچہ ۱۸۹۹ء میں جا ہوا۔ اس میں چار کالم ہوتے تھے۔ اس میں مذہبی، اخلاقی اور سیاسی خبریں ہوتی تھیں ایڈیٹر منشی و امدلی خود کاتب بھی تھے اور ان کا ذاتی پریس تھا۔ یہ ایک سال بعد یہ ہو گیا۔

۲۔ تجلی عرفان (ہفتہ وار) - مولوی کرم اللہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں مذہبی معلومات زیادہ ہوتی تھیں۔

۳۔ خلافت (ہندہ رعدہ) - یہ سیاسی اخبار تھا۔ ۱۹۰۶ء میں نکلا۔ اس کے ایڈیٹر اکرام صاحب پہلے تحریک خلافت کے کارکن تھے، بعد کو مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے۔ یہ اخبار بھوپال سے چھپ کر آتا تھا۔ بعد کو اس کا نام بھی تبدیل ہو گیا تھا۔

چونکہ یہ تینوں پرچے ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لیے ہم ان سے متعلق مزید مطالعہ ہتیا کرنے سے قاصر ہیں۔

نقد و نظر

”ادب، فکر اور سماج“ راجد ناتھ شیدا کے تنقیدی مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل دس مقالے شامل ہیں:

ادب، فکر اور سماج (تمہیدی)؛ میرا نیس اور ان کا فنی؛ اردو کی ایک شاعری؛ اردو کی رزمیہ نظموں پر ایک نظر؛ پارسی اردو تھیٹر پر ایک طائرانہ نظر؛ جگر مراد آبادی؛ اردو تنقید کی نئی راہیں؛ حدی رایتز ترمی خواں؛ جائسی کی پداوت پر ایک نظر؛ محروم کی نظمیں۔ شیدانے تمہیدیہ میں بعض بہت اچھی اور فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ دیکھیے:

۱. ”ادب کے تاج“ فکر کا سماج پر اثر انداز ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے نقاد کے فرائض میں ادب کی سماجی قدروں پر نظر ڈالنا بھی شامل ہے۔“

۲. چونکہ کسی قوم کا ادب اس کی تہذیبی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور قوم کے تہذیبی معیار پر اچھے بُرے اثرات ڈالتا ہے۔ اس لیے ادب کی طہارت و صحت پر توجہ کرنا بھی اہم قومی، بلکہ انسانی فریضہ ہے۔ اس میں تنقید کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ ادبی تنقید بالواسطہ ہی سہی، تہذیب کے ارتقاء کی ایک بڑی محرک ہوتی ہے۔“

۳. ”نقاد کا سب سے پہلا فرض زیر نظر ادب کا عمیق نظر ہے، اور جہاں تک ممکن ہو، خالی الذہن

”ادب، فکر اور سماج“ از راجد ناتھ شیدا؛ ص ۲۲۳؛ طباعت، کتابت عمدہ؛

قیمت ۱۲ روپے؛ ایلیا پبلشرز، دہلی

تقدیر و نظر

جگر مراد آبادی نئے متعلق دو مقالے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جگر کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اردو کی غریب شاعری میں اس کا مقام متعین کیا جائے جگر کو بھی ایک الزام و تعریف کا شمار ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے جرأت (اور مومن) کے سلسلے کا چوہا پائی کا شاعر کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اسے دورِ حاضر کے بہترین غزل گو شعرا میں شمار کرتے ہیں۔

در اصل جگر کی شاعری کے دو دور ہیں۔ پہلے دور میں، انھوں نے حسن و عشق کی داستان بیان کی ہے۔ رشید امجد صاحب نے نزدیک یہی ان کی پندرہ شاعری کا رنگ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: مختصر یہ کہ جگر کی غزلیں ہمارے روزانہ کے معاملات، حسن و عشق سے بہت قریب کا تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے ملک کے ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اس فقرے کی عمومیت محلِ نظر ہے۔ اس میں ان کے بعد کے کلام کے فکری عنصر کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کا جو کلام آتش گل میں محفوظ ہے، اس کی گہرائی اور فکری گیرائی سے ان کا کلام نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ جہاں ہم ان کا قدیم کلام پڑھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، وہیں اس آخری زمانے کے کلام کا بھی کما حقہ مقام متعین کریں۔

پرداد سے متعلق مضمون اپنے اختصار کے باوجود کامیاب ہے اس میں مختصر پرداد کا تعارف ہے اور اس کے تراجم کی فہرست، اس کا آخری پر ابھی جہاں کچھ اور تراجم کا ذکر ہے۔ پہلی فہرست میں شامل کر دینا چاہیے تھا۔

بحیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ مقالہ نگار کی تحریر میں متانت اور سنجیدگی ہے ان کا دلوں کی بات کہہ دینے کا انداز قابلِ ستائش ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے قاری کے ادنیٰ ذوق کی تشکین ہوتی ہے، اور اس کی پرورش بھی ہوتی ہے۔ ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ شیدا صاحب نے ادب کو اپنا اول صناعہ سمجھنا بنالیا ہے۔ یہ بات دوسرے نقادوں کے لیے بھی قابلِ تقلید ہونا چاہیے۔

وقیات

یوسف ظفر، محمد یوسف

یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو کوہ مری (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ غلام رسول کامیاب تاجر تھے اور ان کا عائدہ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ گویا ظفر صاحب کو شاعری دلنے میں ملی۔

یہ ابھی زیر تعلیم تھے کہ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مزید المیہ یہ ہوا کہ ظفر سے بڑی ایک ہمیشہ خستہ، وہ والد کی وفات کے وقت پاس کھڑی تھیں۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں؛ ان کی لاش دیکھ کر ان کے دل کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ یوں گھر سے بیک وقت دو دو جنازے نکلے۔

ظفر صاحب اس وقت ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھے۔ پندرہ برس کی عمر اور دو ایسے شدید صدمے، غریب کی دنیا تاریک ہو گئی۔ شدید جذبات نے شعر کی صورت اختیار کر لی۔ انھوں نے اپنی پہلی نظم اسی موقع پر کہی، جو گویا مرثیہ تھی۔

۱۹۳۱ء میں بی اے پاس کیا اور اگلے برس ۱۹۳۲ء میں تلاش روزگار میں دلی پہنچے۔ اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے چٹوڑ بلوڈنگ سرپرستی میں ماہنامہ تعلیم جاری کیا تھا۔ ظفر کی ان سے

لغات ہو گئی۔ یہ بہت پریشان حال تھے۔ پوری کوشش کے باوجود انھیں کہیں کوئی کام نہیں ملا تھا۔ انھوں نے بیرونی کاری کے کام میں دیواروں پر اشتہار چسپاں کرنے کے کام کیا تھا اور اس کی ابرصد سے پیٹ بھرنے کو روٹی کھائی تھی۔ جوش نے انھیں کلیم کی مینجری کی پیشکش کی۔ لیکن یہاں فہم نہ سکی۔ چند ماہ بعد وہ مستعفی ہو کر لاہور واپس چلے گئے۔ یہاں انھوں نے محکمہ انہار میں کلر کی اختیار کر لی اس دفتر میں وہ پانچ برس رہے۔ ۱۹۴۲ء میں میاں بشیر احمد (مدیر ہائیوں) نے انھیں اپنے یہاں بلا لیا۔ یہ زمانہ ان کا سب سے اطمینان اور فن کے پہلو سے کامیاب گذرا۔ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا اور انھیں شاعر کی حیثیت سے شہرت بھی ملی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی اور وہ اس میں منسلک ہو کر راولپنڈی چلے گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۷۲ء بوقت شب راولپنڈی ہی میں انتقال ہوا۔

ظفر بے حد حساس طبیعت کے انسان تھے۔ اگرچہ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن والد کی طویل بیماری نے نہ صرف ان کا کاروبار تباہ کر دیا، بلکہ علاج معالجے کے اخراجات بھی ختم کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد اپنی ادھر باری کی ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر آ پڑی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مرنی ویاس کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

شروع میں غزل کہتے تھے کلیم سے تعلق کے زمانے میں جوش کے زیر اثر نظم کہنے لگے۔ لاہور گئے تو احسان دانش اور میراجی کی معیت میں یہ رنگ پختہ ہو گیا۔ آخری دو ایک سال میں پھر غزل کی طرف مائل ہو گئے تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے جوہر غزل کی بجائے نظم میں زیادہ کھلتے تھے۔ اس میں ان پر اختر شیرانی اور فیض کا کافی اثر تھا۔ اور کچھ زمانے سے اب نعت پر بھی خصوصی توجہ تھی۔

وہ بزرگوں کو نہیں کہے جاسکتے لیکن جید و مدبر و فروغ دہ تھے۔ نذات اور ذہر غنہ و مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

باقی صدیقی، محمد افضل

راولپنڈی (پاکستان) سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک مختصر سا قصبہ بہرام ہے، وہیں ۱۰ دسمبر

وفیات

کو پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ خاندان قریشی تھا لیکن باقی نے صدیقی نسبت کو ترجیح دی۔ ابھی اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اسی باعث تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کم عمری میں تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا؛ اور کہاں کہاں کچھ کنوئیں نہیں جھانکے! پانچ سال دیہاتی مدارس میں بچوں کو پڑھاتے رہے۔ جب بالکل ماہر آگئے، تو قسمت آزمائی کو بھی پہنچے کہ شاید غلام میں کچھ کام ملے۔ تین برس یہاں رہے۔ دو ایک جگہ کام کیا، لیکن کوئی مستقل صورت نہ نکلی۔ اتنے میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی، تو فوج میں حوالدار کلک بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد جنگ ختم ہوئی، تو اب بعض اور فوجی محکموں میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں والدہ کی وفات نے یہ سلسلہ بھی منتقل کر دیا؛ وہ استعفیٰ دے کر گھر آ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ادبی محاذ پر کوشش شروع کی۔ شروع میں چندے راولپنڈی کے ہفتہ وار ”راہ و منزل“ میں ملازم رہے۔ سال بھر بعد ۱۹۵۱ء میں ریڈیو میں جگہ مل گئی۔ یہاں دو سال کام کیا تھا کہ تخفیف میں الگ ہونا پڑا۔

آغازِ شعر گوئی میں چندے سید عبدالحمید مدد سے اصلاح لی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے لالہ الیادین کے باعث یہ سلسلہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ (۱) جامِ جم۔ یہ گوشہِ نادب، لاہور نے شائع کیا تھا؛ اس میں نظموں کا انتخاب ہے۔ (۲) دار و درن۔ یہ قومی کتاب خانہ، راولپنڈی کے اہتمام سے چھپا۔ اس میں نظم و غزل دونوں اصناف کا کلام ہے۔

مارچ ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی۔

اشیم خیر آبادی، سید امیر احمد

شاہرین میں سید محمد مسکری ترمذی و سیم خیر آبادی کا نام ایسا غیر معروف نہیں کہ کسی تعارف کا محتاج ہو۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید حسین اصغر خلیفہ امام چہارم زین العابدینؑ سے ملتا ہے۔ سید حسین اصغر کے خاندان کے ایک صاحبِ سید علی مدینہ سے ہجرت کر کے ترمذ (اوزبکستان) میں جا بھجے تھے۔ ایک روایت ہے کہ ان کی اولاد میں سید احمد نام کا

کام امیر ناصر الدین بیکتگیں کی صاحبزادی شہزادی گوہر تاج یعنی سلطان محمود غزنوی کی ملا ہمیشہ سے ہوا تھا۔ امیر بیکتگیں کی وفات (ف ۶۹۹۶) کے بعد سید احمد لہا اپنے خاندان ادا عزہ و اقارب کے ساتھ ہندوستان چلا گئے اور پنجاب میں مقیم ہو گئے۔ یہاں اقبالیہ کے لیے خاندانی کام سادات تریز مشہور ہو گیا۔ مقلوں بعد سید احمد زائر کے وڈا میں سید مہر علی شاہ قلند پنجاب سے نکلے اور غیر آباد (ضلع سیتا پور، یوپی) میں بس گئے۔ انھیں کیا ولاد میں وسیم کے والد سید محمد مہدی تھے یہ شعر بھی کہتے تھے: ہمگیں تخلص تھا۔

وسیم ۱۸۷۷ء کی مشہور فوجی شورش سے پہلے پیدا ہوئے؛ بچیک سال معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ غیر کھاکر تھے کہ اس ہنگامے کے وقت میں سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ وسیم نے شہر گونی وڈے میں پائی تھی۔ انھوں نے کلام پر اصلاح امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰ء) سے لی۔ وہ مقل تار کے ساتھ رامپور میں رہے۔ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں وہ امیر کے دست راست تھے استاد کو ان کی زبانی اور فنی مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر اپنے مبتدی شاگردوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ امیر اللغات کے ملا وہ نو اللغات کی ترتیب میں بھی ان کا حصہ کچھ کم و قیچ نہیں تھا۔

وسیم تسلیم کی تکمیل کے بعد اولاً انگریزی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی اس سے مستعفی ہو کر ٹوکل علی اللہ خاندان میں ہو گئے۔ جب ۱۸۹۰ء میں جونپور کے رئیس راجہ بری ہر دت سنگھ دو بے رنگین ان کے شاگرد ہوئے، تو انھوں نے اصرار کر کے انھیں اپنے پاس بلایا اور اپنی زندگی بھر اپنے سے جدا نہیں کیا۔ جونپور کے دوران قیام میں انھوں نے یہاں سے ۱۸۹۴ء میں گلدستہ گلچین ہماری کیا تھا۔ یہ پرچہ بعد کو خیر آباد اور لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا، پھر بند ہو گیا۔ ایک زمانہ بعد انھوں نے اسے جنوری ۱۹۱۷ء میں سیتا پور سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ ادب اس میں نظم کے ساتھ نثری مضامین کا اضافہ کر دیا۔

جب ۱۸۸۱ء میں مولوی سبھاں اللہ خانی رئیس گورکھ پور کے بلکے ہوئے میاں خیر آباد گورکھ پور گئے، تو موصوف کے ایما پر میاں نے وسیم کو بھی وہاں بلایا۔ وسیم رفتے میں میاں نے

وفیات

ہینوٹی تھے۔ وسیم یہاں مولوی سبحان اللہ خان کے کتابخانے کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ یہ قیمتی کتابخانہ مولوی سبحان اللہ خان کی وفات کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا اور آج کل آزاد لائبریری کا ایک حصہ ہے۔ اسی زمانے میں وسیم کے ایک اور شاگرد نے تحفہ خوشتر کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا؛ وسیم اس کی تربیت میں بھی شریک ہے۔ بالآخر ۱۹۲۸ء میں خاک خیر آباد کی کشش نے وسیم کو وطن بلالیا۔ یہ سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کئی مہینے کی علالت کے بعد ۷ مارچ ۱۹۲۹ء (۲۳ رمضان ۱۳۴۷ھ) کو راجپور سے عالم جاودانی ہوئے۔ اپنی قیامگاہ محلہ شیخ سراے کے متصل کی مسجد مسکری میاں کے صحن میں سپرد خاک ہوئے۔ یہ مسجد بھی خود انھیں کے نام سے شہود ہے، اگرچہ اسے ان کے جہاں بعد نے تعمیر کرایا تھا۔

سید امیر محمد اشیم انھیں وسیم کے خلع اکبر تھے؛ یہ جنوری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سے بڑی ایک بہن وارث فاطمہ تھیں اور چھوٹے ایک بھائی سید خلیل احمد۔ یہ دونوں بھی شعر کہتے تھے۔ وارث فاطمہ کا تخلص صنوبر تھا اور خلیل احمد کا اشیم۔ افسوس کہ اشیم نے مین عنقوانی شباب میں ۲ نومبر ۱۹۵۲ء (۱۳ صفر ۱۳۷۲ھ) کو انتقال کیا۔ اشیم نے بھائی کی تاریخ وفات کہی: اس لمحہ میں بسے اشیم بہشت (۱۳۷۲ھ)۔ اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں محو خواب ابدی ہیں۔ ولادت فاطمہ کا سنہ ۱۲۷۲ھ میں مقدم ہوا تھا۔ وہیں ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کو لاؤ لوت ہوئیں۔

اشیم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ جب استعداد قابل لحاظ ہو گئی تو مدرسہ نیاز، تیرہ آباد میں بھیج دیے گئے۔ یہاں فقہان کا دل پسند موضوع تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد منبعیہ الطبہ کالج، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ دو سال تک یہاں تحصیل کی تھی کہ یہاں ایک حادثہ ایسا پیش آیا جس سے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید وہ طب کی تکمیل نہ کر سکیں۔ ہوا یہ کہ ان کے والد وسیم صاحب کسی کام سے راجہ صاحب محمود آباد کی ملاقات کو لکھنؤ آئے، تو ان کے دیکھنے کو منبعیہ الطبہ کالج پہنچے۔ وہاں گفتگو میں کسی مناسبت سے انھوں نے بیٹے کے کسی شعر کے معنی پوچھے۔ بر قسمتی سے یہ تسلی بخش جواب زدے سکے۔ اس پر وسیم بھرپور گئے؛ بہت برہم ہوئے۔

وفات

فرمایا کہ یہاں تم ترقی معکوس کر رہے ہو۔ یہ کہا اور انھیں کالج سے الگ کر کے اپنے ساتھ واپس خیر آباد لے گئے۔ چندے بعد لوگوں کے بیچ بچاؤ سے انھوں نے انیم کو معاف کر دیا اور واپس لکھنؤ چلے گئے۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں طب کی تعلیم مکمل کی اور درجہ اول پاس ہوئے۔ پھر اگرچہ انھوں نے خیر آباد میں یونانی دوا خانہ کے نام سے اپنا مطب قائم کیا لیکن خود نسخہ بہت کم لکھتے تھے، زیادہ تر مشہور مقامی حکیم انوار حسین صاحب کے ان کے پاس آتے تھے، جس سے اچھا خاصا کام چلتا رہا۔ بعد کو یہ مطب بھی بند ہو گیا۔ جب دسیم نواب سبحان اللہ خان کے بلاوے پر گورکھ پور گئے، تو انیم بھی والدہ ساتھ تھے۔ اس زمانے میں یہاں ریاض اور دسیم کے قیام کے باعث گورکھ پور گویا شعرو کا مرکز بن گیا۔ انیم بھی وہاں کسی مقامی کالج یا اسکول میں اردو اور فارسی کے مدرس ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں وہ گلچین اور تحفہ خوشتر کے بھی معاون مدیر رہے۔ جب زمانے نے گورکھ پور کی باطلی، تو انیم اولاً مصوبہ بہار گئے۔ جب وہاں قدم نہ جم سکے حیدرآباد دکن کی راہ لی۔ ایک زمانہ بعد ۱۹۴۹ء میں وطن واپسی ہوئی۔ ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء سال تک وہ مدرسہ نیازیہ، خیر آباد میں فارسی کے مدرس رہے۔ پھر جولائی ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک مدرسہ اشاعت العلوم، خیر آباد میں بھی سہ شغل رہا۔ خیر آباد سے اس زمانے جمال الدین اسیر انصاری کی ادارت میں ایک رسالہ کاروان شائع ہوتا تھا۔ انیم بھی اس کے قلمبر میں شامل ہو گئے۔ جب کاروان نے دم توڑ دیا، تو یہ کانپور پہنچے اور وہاں مدرسہ میں مدسی کر لی۔ دو سال بعد ۱۹۶۲ء میں وہیں کے ایک اور مدرسے احسن المدارس میں قیام ہو گئے۔ کانپور سے ایک رسالہ جھلک نکلتا تھا۔ مدسی کے ساتھ یہ اس کی ایڈیٹری فرارکن بھی سرانجام کرتے رہے۔ مدتوں اس رسالے کی پیشانی پر انیم کا یہ شعر چھپتا رہا تھا

جھلک دکھا کے محبت سکھائی جاتی ہے
یہ انک خود نہیں لگتی، لگائی جاتی ہے

آخری زمانے میں قیام بیشتر کامپور ہی میں رہا۔ اگرچہ خیر آباد کی ادبی سرگرمیوں میں بھی لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں خیر آباد میں ایک انجمن ادب قائم ہوئی، تو وہ اس

وفیات

مرد بنائے گئے تھے۔ یہ انجن زیادہ دن نہ چل سکی اور سال بھر بعد ختم ہو گئی۔
۱۳۹۰ء میں رمضان کی چھٹیاں گزارنے کو وطن آئے۔ یہاں اجاب اور بچوں کے اصرار پر کانپور کی واپسی ملتوی کر دی۔ اتنے میں بیمار ہو گئے۔ خدا خدا کر کے مہینوں بعد بخار نے پیچھا چھوڑا، تو اب اسہال کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ عمر در اس پر اس موزی مرض کا حملہ، کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ چند دن میں سوکھ کر کاٹا ہو گئے۔ علاج معالجے کے باوجود حالات بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں ۶ اپریل ۱۹۷۲ء قبل دوپہر سو گیا رہ بجے کے قریب جان بحق ہو گئے۔ آخری الفاظ تھے: "اول اللہ، آخر اللہ۔ نماز جنازہ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں ان کے دوست سید نجم الحسن رضوی نے پڑھائی اور بعد مغرب انھیں اپنے والد وسیم کے قریب مسجد عسکری میاں کماٹے میں دفن کر دیا گیا۔ مولوی نثار احمد فاروقی عارف خیر آبادی کے قطعہ تاریخ وفات کا آخری شعر ہے:

برلوح مرقد، عارف! ایں سالِ وفاتش کن رقم
”روح ادب، کابنِ صفا، سید امیر احمد انیم“
(۱۳۹۳ء)

اولاد جسمانی میں دولڑکے (یقین احمد عرف انس میاں اور مشیر احمد) ان سے یادگار ہیں۔

انھوں نے کلام پر اصلاح اپنے والد وسیم مرحوم سے لی تھی، اور خود درجہ استاد ی ماحصل کر لیا۔ س دود کے اکثر رسائل و جرائد میں ان کا کلام ملتا ہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی بہت لکھا اور ان میں بھی کسی سے پیٹے نہیں تھے۔ خوشنویس بھی اچھے تھے۔ تلامذہ کی بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ افسوس کہ مجموعہ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ تمام اصنافِ سخن میں وافر کلام ان کے رزق کے پاس موجود ہے۔

سیم اختر منظر نگری، محمد عبید اللہ صدیقی

ان کا ولادت ۱۹۱۳ء کو ضلع مظفر نگر کے قریب ایک قریہ حسین پور میں لیسٹریہ میں ہوئی

وفیات

اصل میں لفظ بسیرا ہوگا، جو مریدِ زانہ سے دیہاتیوں نے بگاڑ کر بیڑا بنادیا، ان کے والد جناب محمد عرف (۱۹۵۵ء) مدنی پیشہ تھے، وہ ساری عمر مختلف مقامات پر صدر مدرس رہے۔ علیم صاحب نے ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول مظفرنگر سے دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ آگے آیم باری رکھنے کے وسائل مفقود تھے، اس لیے تلاشِ معاش کی فکر ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں ایک مقامی زمیندار کے یہاں کارندے مقرر ہو گئے۔ تین سال بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی، تو فوجیوں کی ضروریات مہیا کرنے کی خاطر حکومت نے کھل بانی کے کارخانے قائم کر دیے۔ یہ کام بہت وسیع پیمانے پر ہوتا تھا۔ منڈی ساولن کی خرید سے لے کر کھل کے منبنے تک کا سارا کام سرکاری ملازموں کے ذمے تھا۔ علیم صاحب اس تحکمے میں پچیس روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ مظفرنگر، نرپڑا، امر وہہ، جالٹھ، کیرانہ وغیرہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ افسرانِ مجازان کے کام سے مطمئن تھے اور یہ خود بھی سکھاتے تھے کہ اب ستر روپیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ لیکن اواخر ۱۹۴۱ء میں بہتر ملازمت مل جانے کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ کر جنرل اسٹور کا پور چلے گئے۔ یہاں سے کٹنی تبادلہ ہوا اور وہاں سے ناگپور جانا پڑا۔ ناگپور میں تھے کہ یرقان کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر سولہ مہینے کی طویل رخصتِ طالت لینا پڑی جس کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا۔ ۱۹۴۶ء میں تندرست ہونے کے بعد وہ دلی آئے، تاکہ یہاں کنٹرولر جنرل کے دفتر سے دوبارہ ملازمت کا حکمانہ حاصل کر سکیں مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بسراوقات کے لیے دلی کے قیام کے زمانے میں یہاں کے مختلف رسائل میں صفحہ تھوڑا تھوڑا وقت کام کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۴۸ء میں ستقل طور پر اہنامہ شمع کے دفاتر میں ملازم ہو گئے۔ اس ادارے کے دونوں پرچوں شمع اور شبستان کی تقسیم و شانت اور دفتر سے متعلق قانونی کام کا ج انھیں کے ذمے تھا۔

پار سال (۱۹۷۱ء) میں ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسپتال میں چند ہفتے نہ گھر آ گئے، کہنے لگے یونہی ڈاکٹروں نے ڈرایا اور ہلکا کیا، محض فشارِ دم کا عارضہ ہے۔ لیکن یہ محض نفسِ سما دھکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے احتیاط سے ہو گئے۔ دوسرا حملہ بھی لپا تک ہوا اور

وفیات

یہی جانی لیوا ثابت ہوا۔

جمعہ کے دن ۲۱ اپریل صبح حسب معمول دفتر گئے۔ یکایک سینے میں درد کی شکایت کی۔ ہمدرد نرسنگ ہوم دفتر کے پڑوس میں ہے۔ وہاں پہنچا یا گیا۔ بیوی بچے بھی پہنچ گئے۔ ان سے بات چیت کرنے لگے۔ معاملے کی نزاکت کا کسی نے احساس ہی نہ کیا۔ باتیں کرتے دوپہر کے قریب روح نفس منسوی سے پرواز کر گئی۔ اللہ وانا الیہ راجعون۔ اسی شام دو گھنٹہ باقی باللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

اولاد میں چار لڑکے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے عظیم اختر حکومت خندک کے محکمہ اطلاعات میں ملازم ہیں، چھوٹے تینوں ابھی زیر تعلیم ہیں۔ شعر میں انھیں لہذا الم مظفر نگری (ف مئی ۱۹۶۹ء) سے تھما، اگرچہ زیادہ تر استفادہ سیاب اکبر آبادی مرحوم سے کیا۔ کلام کا مجموعہ ”جکت گل“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے (دلی ۱۹۵۷ء)۔ اس پر یوپی حکومت نے انعام بھی دیا تھا۔ ایک مختصر سا مجموعہ قطعات (مصور) بچوں کے لیے ”پھول پتے“ کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں خود شائع کیا تھا، جس میں سہل اور سادہ زبان میں سبق آموز قطعات شامل ہیں ایک مجموعہ ”منعت النواہرم“، بچوں کے لیے دوسرا مجموعہ منظم گل بوٹے“ اور ”بوسے جمال“ (دیوان غزلیات) مرتب شدہ وغیرہ چھوڑے۔

میں انھیں پچھلے ۱۵-۱۶ برس سے جانتا تھا۔ بڑے مجلس اودب بے یاد دوست تھے حال آنکہ بیحد مذہبی آدمی، اور صوم و صلوة بلکہ اوراد و وظائف تک کے پابند اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (ف ۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے، لیکن طبیعت میں عبوسیت، نہیں تھی؛ اس کے برعکس ان کی گفتگو میں شگفتگی اور بذلہ سنجی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ میں نے انھیں کبھی بیماری کی حالت میں بھی نگاہیں اور گرفتہ خاطر نہیں دیکھا۔ دعا ہے کہ اسی طرح خوشی خوشی وہ اپنے خالق کے حضور بھی حاضر ہوں۔ آمین!

اعجاز صدیقی نے مندرجہ ذیل قلعہ تاریخ وفات میں ان کی پوری سیرت بیان کر دی ہے، اکیس اپریل، جمعہ، ظہر کا وقت طے بہ محبت کیا عدم کا سفر

کر گئی آکے خود اذانِ مرگ بے نیازِ رکوع و سجود دوسر
صرف بچاؤ و ہشت سال تھی عمر زندگی اس کی سچی مثالِ شرر
دوبل نے کچھ ایسی کروٹ لی کمرے کے کچھ نہ اس کے چارہ مگر
شاعرِ نغز گو، ادیبِ شہیر مابعدِ خوش مذاق و نیک سیر
خوب ہنستا رہا، ہنساتا رہا اپنے غم کی نہ دی کسی کو خبر
دل کے ہاتھوں ہی لٹ گیا، اعجاز!
”شاعرِ دل زندہ علیم اختر“
(۱۹۷۲ء)

ظفر، سراج الدین ظفر

ظفر دراصل ان کا تخلص نہیں تھا، بلکہ جزوِ علم تھا۔ ان کا نام خاندانِ مغلیہ کے آخری تاج
سراج الدین ظفر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ جب بعد کو انھوں نے شعر کہنا شروع کیا، تو
کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو جہلم (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔
خاندانِ گکھر کہلاتا ہے۔ ان کے دادا گکھڑوں کی شاخ اسکندریہ کے شیخ تھے۔ کہا جاتا ہے
گکھر قوم ایرانی الاصل ہے۔ واللہ اعلم۔ ان کے والد محمد عبدالقادر صاحب دہلی کے محکمہ میں
تھے۔ ان کی والدہ مسز (زینب) عبدالقادر اردو حلقوں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے
مشہور ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے ناول راجہ، صدا سے جرس، وادی آ
لاشوں کا شہر وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ اور ذائقے کا مذاق بدل جانے کے باوجود آج
پڑھ جاتے ہیں۔ انھیں تصنیف کا شوق اپنے والد مولوی فقیر محمد (یعنی ظفر کے ابا)۔
ملا۔ مولوی صاحب موصوف دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی دینیات سے متہ
متعدد مصنفات موجود ہیں۔ کوئی پچاس برس تک وہ ایک پرچہ سراجِ الاخبار
کا لکھتے رہے تھے۔

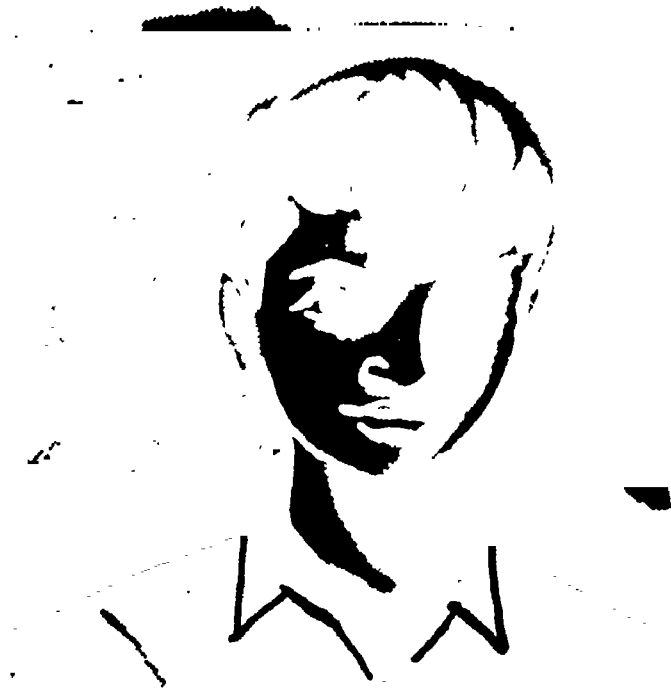
ظفر نے ۱۹۳۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے دو سال بعد وکالت کی سند ایل۔

وفیات

حاصل کی (۱۹۳۵ء) اور اولاً وکالت ہی کا پیشہ بسا وقات کے لیے اختیار کیا۔ لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے اسے ترک کر کے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں فوج کے ہوائی شعبے میں ملازمت کر لی۔ وہ اگرچہ یہاں دس برس رہے، لیکن یہ ملازمت بھی بھاری پتھر ثابت ہوئی۔ اب سب طرف سے ایوس ہو کر انھوں نے ۱۹۵۰ء میں تجارت کی طرف رخ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا لاہور اور کراچی کے مشہور ناشر کتب مولوی فیروز دین (صاحب فیروز سنز) کی صاحبزادی (البشیرہ) سے نکاح ہوا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے ان کی ڈانواں ڈول حالت دیکھ کر انھیں اپنے ادارے میں جگہ دے دی، جس سے ان کی معاشی تک و دو اور پریشانی کا دور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد خاصی کامیاب زندگی بسر کی۔

جس علمی و ادبی ماحول میں وہ پیدا ہوئے، اس میں ان کا تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ بہت ابتدا میں شعر کہنے لگے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس میں کسی سے مشورہ نہیں کیا، نہ کسی سے اصلاح لی۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ شروع میں انھوں نے ضرور سیاب اکبر آبادی سے اصلاح لی۔ ممکن ہے، بعد کو چھوڑ دیا ہو۔ شعر کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ افسانوں کا مجموعہ ”آئینہ“ کے عنوان سے چھپ چکا ہے (۱۹۳۳ء)۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ ”زمزم حیات“ (۱۹۳۶ء) میں شائع ہوا اور دوسرا ”غزال غزل“ فیروز سنز کی طرف سے مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے کسی زمانے میں بچوں کی دس کتابیں بھی خاصی تعداد میں لکھی تھیں۔ سنا ہے کہ وہ انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے، اگرچہ یہ میری نظر سے نہیں گزرے۔

۶ مئی ۱۹۷۲ء ہفتے کے دن کراچی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کیا۔ جہانی اولاد میں ایک صاحبزادہ (طارق ظفر) اور ایک صاحبزادی (ناہیدہ) ان سے یادگار ہیں۔



بچے ہم پر امید لگائے ہوئے ہیں

ہیں۔ ہمیں ان کا سبیل رکھنا ہے۔

اسکی ہر شے اسدیکر ہم ان کی ذمہ داری ہم پر ہی ہے۔ انکی فکر نہ کیجئے کہڑے اسدیکر انکی تعلیم کا حق ہے۔ بڑا ہکر انہیں ماچھا دستار بھی ملنا ہے۔ لیکن اگر بچپن زیادہ بھول کر گیا ہم ان کی تمام ضروریات پر کی کر سکتے ہیں، وہ اس کا ایک ہی جواب ہے۔۔۔۔۔ چھو لگئے۔۔۔۔۔ کٹہر جتا چھوٹا ہوگا اتنا ہی بڑے بچے گزرا رہے ہوں گے گا۔

نقص مندر اور خدمت کے لئے فیملی ویلفیئر سوسائٹی

نیشنل سوسائٹی۔

سماج وادی جمہوریت ہی صحیح معنوں میں جمہوریت ہے۔

قوم کا ہر طبقہ محض اپنے ہذا گمانہ مفادات کے لئے ہی نہیں بلکہ سبھی کی
فلاح و بہبود کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ جذبہ ایسے حالات پیدا
کر سکتا ہے جہاں میں بنی نوع انسان کی تمام قوتیں اس کی مزید
ترقی کے لئے سہمہ دے سہارا لائی جاسکتی ہیں۔

— سری ارونند



بھارت کے دفاع و ترقی میں شرکت کیجئے

ساتھ ہی
7 1/4 %
سود کا پتہ

و سٹاک مارجن کا پتہ

3 سالہ سالانہ 7% ، 1 سالہ سالانہ 6%

ان کے لئے یہ سود و منافع قابلِ تحسین ہے اور
چند لاکھ روپے سے لے کر 1000 روپے تک کی رقمیں

خاص کر ان کے لئے بہتر ہے جو
پچھلے سال کی آمدنی سے زیادہ

74/100

۱۹۷۲

شماره: ۴

جلد ۶

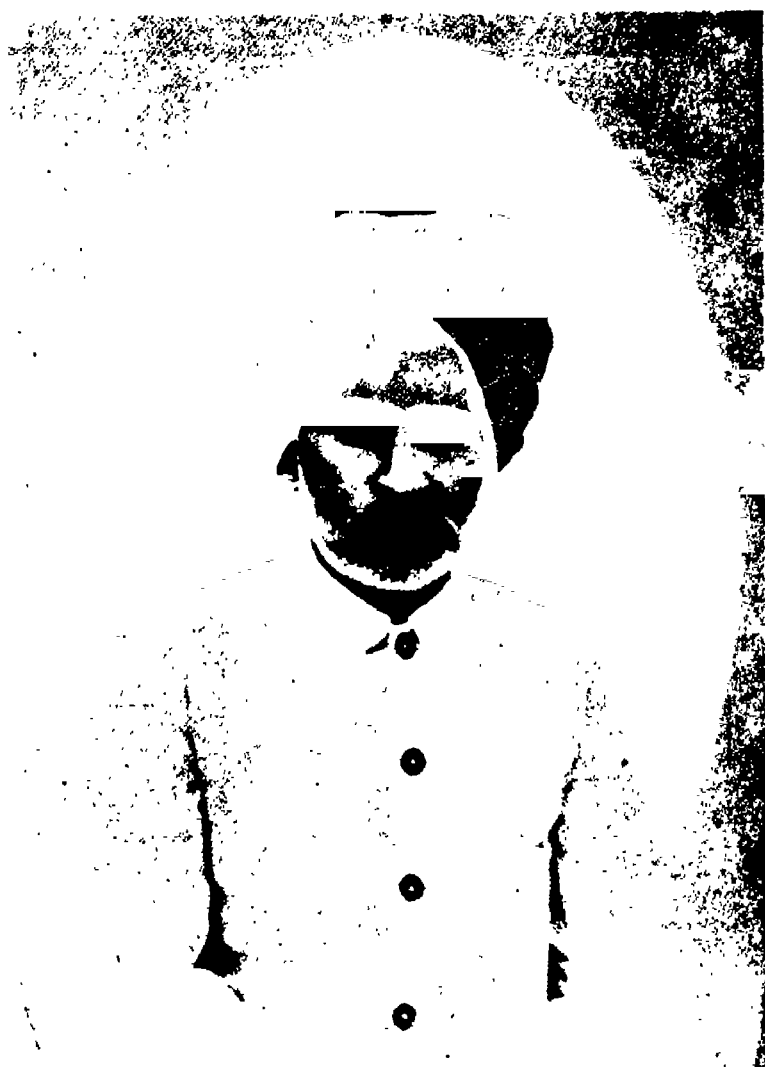
جوش ملیحانی

شخصیت اور فن

مترجم،
حاکم رام



جوش ماسیبانی
۱۹۷۱ء



جوش ماسیانی

۱۹۳۶ء

جوش ملیانی

شخصیت

اور
فن



ابوالفصاحت جوش ملیانی

شخصیت اود شاعری

۱۔ شخصیت

حضرت ابوالفصاحت (پدم شری) چندت لکھنؤ رام جوش ملیانی کے شاعری کش احوال، حوصلہ سوز حالات اور حیرت انگیز کمالات کے لحاظ سے آپ کی ذات بابرکات کو ایسے عجیب و غریب کرشموں میں شمار کیا جاسکتا ہے جنہیں قدرت کی فوق العادت کار فرمائیاں کبھی کبھی عیب سے شہود میں لا کر ایک عالم نیرنگ پیش نظر کرتی ہیں جس صاحب اجتہاد نے پنجاب کے ایک کوردہر میں پیدا ہونے اور اب بھی تیس سال کی عمر ہو جانے تک یہاں ہی علاقے ہی میں قیام رکھنے کے باوجود فصیح الملک داغ دہلوی کی انتہائی فصیح اردو سے متعلق کو اپنی مسلسل جلکاری سے اردو کے بجائے کھلائے کا مستحق بنادیا اور شعر و سخن میں حسن و جمل ابدی حسن بیان کے علاوہ بعض خاص انفرادی خوبیوں کی بدولت اپنے بیشتر خواجہ ناموں مثلاً بنجود بایوئی، ریخود دہلوی، تہر شاہچھا پنواری، ہر گوالیاری، نوح ناردی، احسن مارہروی جیسے مستند اہل زبان اساتذہ کی ہمسری بلکہ ان میں سے کئی پر فوقیت حاصل کر لی اُسے بھونہ روڈ گا رکھنا بھدات "آفتاب آندلیل آفتاب" ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کہ نہ ہے جس میں کسی قسم کی تشکیک دخل نہیں پاسکتی۔

جن مجتہدوں کو برقا نو کا معاشرے کے مختلف النوع شعبوں کی اصلاح اور ان کے کاربازوں کے لئے بہت بوجھا جاتا ہے وہ خدا کی طرف سے ان تمام غیر معمولی صفات اور خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جن کے بدنے کا وہ اپنے بغیر انقلابی عہد آفرینی کا قوت سے فعل میں نامحسوس طرح ملتی نہیں ہوتا۔ ان کے فطری امیال و خواہش کی نفسیاتی تحلیل ان کی چند

خصیت

درجہ شعوری اور غیر شعوری تحریروں اور بیچ در بیچ عقود کی وجہ سے طغیلت کو کیا، جوانی اور کجولت کے زمانے تک بھی طبیعت کے ساتھ تکمیل پذیر نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ عام لوگوں کے درمیان بالکل طلوع سے تو نہیں پائے جاتے، لیکن جلیقہ اعتبارات سے بدیہی طور پر متماثر نظر آتے ہیں۔ ان کا مزاج دشوار پسند ہوتا ہے۔ وہ ہر مشکل کو سہل سمجھتے ہیں ان کے کردار میں ایسی زبردست طاقت جو شرمزین رہتی ہے جو کہ ہمارے گزرنے والے نند اور طوفان خیز دریا کی طرح حائل راہ مضائقہ و موانع کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتی ایسے اصحاب کے فذوقی حل کا کچھ اندازہ میرے اس شعر سے ہو سکتا ہے:

کیا جانتا ہوں منزل و شوار اس کو میں

منا نہیں ہے جادہ دشوار تر ہے

قدت نے حضرت ابو الفصاحت کو اردو زبان کی اصلاح اور شعر و سخن میں تنزیہ و طہارت کا معیار بلند کرنے کا جو کام تفویض کیا تھا، اس کی انجام دہی میں انھوں نے وہ کچھ کیا جو کوئی منظم جماعت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لحاظ سے انھیں ایک ادارہ، لفظی شکل فرد کہا جاسکتا ہو۔ وہ اب بھی وہ کہن سالی کے باوجود اپنے پیش ہنر و خاطر کی تکمیل بالائے تکمیل میں مہمک رہتے ہیں اور کہوں نہ رہیں کہ ان کی تخلیق سے خالق کائنات کا مقصد اور مدعا بھی یہ تھا آپ سالہا سال سے ہندستان کے عظیم شاعر اور مصلح زبان تسلیم کیے جا چکے ہیں۔

آپ نے جنوری ۱۹۱۱ء میں اپنی ایک تازہ ترین رباعی بھی بھیجی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے اندر فکر اور اسلوب بیان میں کوئی کمی گمائی کی بجائے خوش فکری اور خوش گوئی حسب معمول بڑھ رہی ہے۔ رباعی ملاحظہ کر کے میری رائے کی تصدیق فرمائیے:

میری میں طبیعت کی جوانی کیسی!

نغمہ سے مہلے خون میں روانی کیسی!

امید نہ رکھ، زور بیان کی مجھ سے

طاقت ہی نہ ہو، تو پہنلوانی کیسی!

یہ رباعی ہر لحاظ سے تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ اس کے قافیوں میں خوف و اذگ

شخصیات

لہذا میں نے لطف سخن دو چند کر دیا ہے۔ بچوں کو میں آپ کے قواسم باطنی میں کوئی اضمحلال نہیں پاتا اور خود پر رُبا بھی سمجھتا ہوں آپ کے انتہائی زورِ طبع کی شہادہ دہتی ہے اس لیے اس کے مضمون کو خلافِ واقعہ سمجھتا ہوں۔ ایسی بیری جو جوانی پر خندہ زن ہو کسی مامورِ من اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔

اس مقالے کا موضوع حضرت البراہیمہ صحت کی شخصیت اور شاعری ہے۔ لہٰذا اس کے پہلے حصے میں ان کی شخصیت پر خانہ فرسانی ہوگی اور دوسرے حصے میں شاعری اور بیعت لائی جائیگی۔

زندگی کے ابتدائی بیس سال

اُپ ایک خود نوشت مضمون میں رقمطراز ہیں:-

میرے عالم وجود میں آنے کی تاریخ یکم فروری ۱۸۸۳ء ہے۔ مقام ولادت موضع ملیان، تحصیل گکودرہ ضلع جالندھر پنجاب ہے۔۔۔ وہاں آبادی تو ہزار اشخاص کے قریب تھی مگر وہاں صدنا خواندہ تھے۔ سیر والدین اور رشتہ دار بھی اُن پر بڑھتے۔۔۔ یہ تھی اس آبادی کی تعلیمی کائنات جس میں پرورش پانے کے لیے تدبیر نے مجھے محدود کیا تھا۔۔۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا اس پر مغلی اور میرالمانی کا گھٹا ٹپ اندھیل چھایا ہوا تھا۔۔۔ سامنی کے ذرائع مفقود تھے۔ والد (شدت موٹی رام) اپشاور رہتے تھے۔ انھیں بارہ نوشی کی عادت نے یہ ستھا دیا تھا کہ پاک خور امرو زو زہار از آپے فردامنہ! کبھی طبیعت موج پر آئی، تو کچھ بھیج دیا۔ حد تک کچی چنے بالکل خاموش رہتے تھے۔۔۔ والد کو ایک دو گھنٹہ دستکاریوں کی خشقت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھی چچا جو نزدیک کے گاؤں میں کانٹا لگاتے، کچھ ادرا کر دیتے تھے، مگر وہ شخص برائے نام چوتی تھی۔ البتہ اروانی کافی تھی۔ دودھائی آنے میں تن چار افراد کا کنبہ دونوں وقت پیٹ بھر سکتا تھا۔۔۔ مکان بہت چھوٹا تھا اور گنگا

کچا... گاؤں کے بہت بڑے ہونے کے باوجود اسکول صرف پرائمری
 تک تھا۔ پانچ سال وہیں تعلیم پائی۔ جس چار پانچ آنے سے زیادہ دیکھی
 جو برداشت ہوتی رہی۔ مڈل اسکول چار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں
 داخل ہوا۔۔۔ پیدل جانا اور پیدل آنا تھا۔ سڑک نامہوار اور بعض
 جگہ ریتلی تھی۔ جو تا بھی نصب ہو جاتا، کبھی نیگے پاؤں چلنا پڑتا تھا۔
 بڑھنے کے لیے مشعلہ کتب خرید لی جاتی تھیں مگر یہ کفایت بھی
 گھر کے ضروری اخراجات پر باقی تھی۔۔۔۔۔ میرا لباس بہت مختصر ہوتا
 تھا۔ کھادی کے ایک کرتے، کھادی کے ایک پاجامے اور کھادی کی ایک
 چادر میں موسم سرما بسر کرتا رہا۔

جس گاؤں کے صرف ایک فی صد باشندوں نے تیسری یا چوتھی جماعت تک اردو پڑھی تھی وہاں
 حضرت ابوالفضل صاحب کا نام ساعدہ اقتصادی حالات کے باوجود مزید تعلیم حاصل کرنے کی خاطر
 طرح طرح کے سختیاں برداشت کرنا اور پیشانی پر بل دلاتا اس امر کا بدیہی ثبوت ہے، کہ
 قدرت آپ سے کوئی عجز و عقول کام لینا اور آپ کو علم و فضل اور شعرو سخن کے بلند ترین
 درجے پہنچانے کا چاہتی تھی۔ مگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ بھی اپنے معمروں کی طرح زیادہ
 سے زیادہ پانچویں جماعت تک تعلیم پالینے کے بعد مقامی طور پر کسی ایسے دھندے میں لگ
 جاتے جس سے دو دو وقت کی دال دینی بہم پہنچنے کے لائق یافت ہوتی رہتی۔

پرائمری تعلیم کے زمانے میں فاضل کی تدریس جو تھی جماعت ہی سے شروع ہو جاتی تھی۔
 ان کی طبیعت کہ اردو اور فارسی نظم سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھیں پانچویں جماعت
 میں گلستان کی بہت سی آیات اور محمد حسین آزاد کی بعض سالم اردو نظمیں ازبر ہو گئی تھیں۔
 تھے تو کس، لیکن اردو اور فارسی اشعار کی تہہ تک پہنچ کر ان سے لطف اندوز ہونا ان کے
 لیے ذرا بھی وقت طلب نہ تھا۔ ایک دن مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر بادا سنگھ سنگھ بیدی
 نے جو اردو اور فارسی لکھی پڑھاتے تھے، دودھانی تدریس میں ذوق کا شعر

تنگے تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قافل کے

فطیبت

ہر کان سے پوچھا: کیا مارا؟ تو فوراً جواب دیا: "نیر ادا مارا"۔ میری صاحب اس
اب سے ہاتھ کی غیر معمولی ذہانت اور نکتہ رسی دیکھ کر حیران رہ گئے۔

دن کے میں انھوں نے شعر گوئی شروع کر دی، حال آں کہ وہاں کے احوال میں ایک عجیب
یا شخص دھتھا جو شعر کا مفہوم سمجھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ ان کا سب سے پہلا شعر یہ تھا:

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں

فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہ سلسلہ نڈل کی تعلیم ختم ہونے پر، اچھی دستی اور تنگ حالی کے باعث منقطع ہو گیا۔ ابھی
۵ سال کے لگ بھگ اٹھ کر والد کی وفات ہو گئی۔ بکر معاش نے جان پر بنا دی۔ چچا
اپنی دکان پر زون تیل بیچنے کے لیے بلالیا۔ مگر چچا کا گاؤں بہت چھوٹا تھا اور وہاں علی
اکبری شوق کی بجائی اور درقرادی غیر ممکن نظر آتی تھیں، اس لیے یہ وہاں سے لمبیاں
آئے اور پچھتر سال تک سبیل معاش کی تلاش میں ادھر ادھر ٹنگ لٹے، اتنے پھرے لیکن
بازیشاد حالی میں ہی اہدیش ڈھالی، شوگر کے واسے سانسھوں نے لمیان کو خراب آباد ہونے کی
سے چھوڑ دینے کا ہتھ کر لیا۔ اب ابھی اس گاؤں کو خراب آباد کہتے ہیں ان کی ایک غزل کا مطلع یہاں

کیا کر دے گئے جو شش اہم جا کر وہاں

لمبیاں اب بھی خراب آباد ہے

بنا چاہتا ہے کہ ترتیب خراب آباد کی محل داد دے کر آگے بڑھوں۔ خواب اور آباد
تضاد الفاظ ہیں جو جگہ خواب ہو، اس پر آباد کا؛ اور جو آباد ہو، اس پر خواب کا اطلاق
ہو سکتا۔ مگر حضرت ابو الفصاحت نے ان اضداد کو مجتمع کر کے ایک نہایت عمدہ
ترکیب تراش لی۔ اجتماع ضدین محال ہوتا ہے، مگر یہاں ممکن ہو گیا۔ محال کہ ممکن کو
ناممکن فیصل اور جن بیان کے بغیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے یاد ہے میں نے دس سال
پہلے خیمہ بچا ہی کی ٹوئی پر نگر عشق پڑھی تھی اور جب اس میں شعر

ابھی یاد غمت خون در حبر گریں

سرشک آباد چشم آباد تر گریں

خصیت

پڑھا تو ترکیب سرشک آباد دیکھ کر جھٹنے لگا تھا۔ اس غور کرتا ہوں، تو غراب آباد کو
 سرشک آباد کے مقابلے میں بے مراتب بلین تر پاتا ہوں۔ سرشک آباد نہایت عمدہ ترکیب ہو
 لیکن اس میں وہ استعجاب انگیز ندرت کہاں، جو غراب آباد کا اجتماع نقیضین رکھتا ہے۔
 غار کی نظم و نثر میں دروازہ آباد کا تو کمی جگہ دیکھا، مگر غراب آباد نظر نہیں آیا۔ غراب آباد
 کا بدلہ ٹیٹھ اردو میں آجا۔ اسی ہو سکتا ہے جو نقد و امکان اس کا صحیح ترجمہ ہونے کے
 باوجود غراب آباد کی ندرت سے کوئی نقیض نہیں رکھتا۔ غراب آباد سے لطف اندوز ہونا
 کے لیے اعلیٰ درجے کی محنت بھی اور دقیقہ رسی شرط ہے۔
 آپ کا بیان ہے!

۲۰ سال کی عمر تک ہی آشوب و غم رہا۔ اس آشفتمند حالی میں شاعری
 کا جو ہر اکستانی ہوتا تو ضرور مٹ کر رہ جاتا، مگر وہ دہی اور خلاد
 تھا۔ یہ وہ چراغ تھا جسے اندھوں کے رستے میں دکھ دیا گیا تھا۔
 اس کا شعلہ صبر و تحمل اور ازمائشیں نہیں۔

حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے:

شاعری کی ابتدا البینہ ایسی ہوتی ہے، جیسی شطرنج کی ابتدا ہوتی ہو
 جس کی طبیعت کو شطرنج سے لگاؤ ہوتا ہے اس کو وہی چار دن میں
 بادیک اور بھری چالیں سمجھنے لگتی ہیں اور شطرنج میں اس کو ایسا حرا
 ہوتا ہے کہ وہ کھانا پینا اور سونا سب بھول جاتا ہے۔ جن لوگوں کی
 فطرت میں شاعری کا ملک ہوتا ہے ان کی طبیعت ابتدا ہی سے ملہ دینے
 لگتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، تو طبیعت
 کا اقتضا ان کو جبراً اور کھینچ کر لاتا ہے۔ ... ان کو اپنی فطرت
 پہلے راجح و راسخ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی برائی اور بھلائی کا بغیر اس کے
 کہ کسی سے شکر و یا صلاں لینا پائے اعداد کو کہتے ہیں۔

عقب کا دعویٰ، مطلوبہ یا محکم، شمارہ جنوری ۱۹۸۰ء

ہیں آؤ اور عالی نظم جو بدیہی میں منڈھے چڑھا چکے تھے حضرت ابو الغضائف نے
نصف عالی میں چند سب جہاں نظمیں لکھیں۔ ایک نظم میں جس کا عنوان "غریبوں کی دنیا"
رہا ہے:

غریبوں کی حالت سنہلے نہ دیکھی قضا ان کے بایں سے ملی نہ دیکھی
کبھی پھانس غم کی نکلنے نہ دیکھی کبھی نبض صحت سے چلتے نہ دیکھی
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

نک کے ایام میں ایسے صاف اردو اور لڑکھڑکھتہ اشعار اعلان کر رہے تھے کہ یہ نوخیز
گے چل کر فصیح اردو کے مستند شعر کا سمایہ قرار پائے گا۔

بکے شعرانے اردو کے صحیح ذوق و ذوق کی پابندی کا خیال بہت کم کیا ہے۔ اگر حضرت جو ش
ای دیگر چلا پسند کرتے، تو سنہلے، ملتے، نکلنے اور چلتے کی جڑ سنہلے، ملی، نکلتی
قلمبے مان نکھارتے اور اگر کوئی حرف گیری کرتا (اور حرف گیری کرنے والا تھا ہی کون)
دیتے: حالت، قضا، پھانس اور نبض ٹوٹت ہیں، اس لیے افعال، انیت کی شکل میں
ئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح غالب کی طبیعت میں فارسی دبانے کے اصول ابتدا
سے رچ گئے تھے، اسی طرح اردو کا فصیح و دوزخہ جناب کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔

سال تلاش معاش میں سرگرداں رہنے کے بعد وہ پیشہ تدریسی اختیار کرنے کی غرض سے
اسکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں وظیفہ ملتا تھا۔ جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ تمام
دھڑوڈیٹرن کے کامیاب ہونے والوں میں اول رہے۔ آپ کو جلد ہی جائزہ سرچھا دنی کے
اسکول میں ملا رہے مل گئے۔ یہاں کا ماحول ان کے علمی اور ادبی ذوق کے بے سادگانہ
ما۔ اتفاق سے نسیم بھٹو ری شاگرد حضرت ارغ دہلوی کا دلوان ان کے ہاتھ لگ گیا انہوں نے
دہلوی شروع سے آخر تک ہر کون نسیم سے خواہ کتا بیت کا آغاز کر دیا نسیم نے ان کے سونے کے جواب میں
ہیل کے ساتھ دینے کے علاوہ ان کے اشعار کی تعریف بھی کر دی تھی اس کی اور ان کی غیر معمولی صلاحیت
کہ حضرت فصیح المصاحف صلحہ لینے کا شروع کیا اور وہ ان کی شکل میں اپنی سندس سے مل گئے

شخصیت

فرض آپ ۱۹۰۲ء میں حضرت فیض الملک کے شاگرد ہوئے، مگر فروری ۱۹۰۵ء میں استاد کا انتقال ہو جانے سے یہ شاگردی اور اتادی کا تعلق جلد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی اور خود ہی ذاتی ذوق و وجدان کی سلامتی پر بھروسہ کر کے اپنے کلام کی تحسین و تہذیب کرتے رہے

حضرت جوش نے داغ کو جو پہلی غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی، اس کے ابتدائی حار شعر یہ ہیں:

بداد ہر بلب ہوں میں ثنا خواں تیرا دل میں رکھتا ہوں محقق علم نہاں تیرا
زندگی کچھ بھی نہیں سوزِ محبت کے بغیر آگ اس دل کو لگے جو نہیں خواہاں تیرا
قلہم عشق کے طوفان سے بچنا معلوم لے دل زار! اب اللہ نگہاں تیرا
کیوں علی ترک میں آئیے سے تشبیہ دیں اس میں آتا ہے نظر چہرہ خداں تیرا

اگر آپ کو حضرت داغ سے کچھ فائدہ پہنچا، تو وہ محض برائے نام ہی ہو گا۔ داغ کے شاگردوں کی تعداد دوسرا سے متجاوز بنائی جاتی ہے۔ مگر بہرحکم شاگرد ایسے تھے، جنہیں داغ اصلاح کہا جاسکتا تھا۔ میں نے ان کے ایسے متعدد شاگرد دیکھے ہیں جو نہ اردو بخوبی جانتے تھے نہ شعر گوئی کا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر دہلیشاگردوں کا اصلاح طلب کلام اپنے کہنِ مشق اور حاضر باشِ تلامذہ کے حوالے کر دیتے، اور ان کی دی ہوئی اصلاحیں سن لیتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں شاگردوں کی روزنامہ فروزوں کثرت اور خط و کتابت کے بڑھتے ہوئے سلسلے سے تنگ آ کر کہا تھا: ”یہ لوگ مجھ پر کیوں جھکے پڑتے ہیں۔ کیا میں ہی سارے ہندوستان میں ایک استاد رہ گیا ہوں۔ امیر ہیں، جاگ ہیں، ظہیر ہیں، تسلیم ہیں۔ اُن سے کیوں فیضیاب نہیں ہوتے؟“

حضرت جوش نے استاد کے چار دیوانوں کا اردو داغ، آفتاب داغ، قہار داغ، باد داغ اور ان کی شغوی فریاد داغ کی زبان اور روزِ مرتبہ کا غائر مطالعہ کیا اور ان کے تنبیہ کی بدولت بہت جلد فائز المرام ہو گئے۔ اس امر کا خود انھوں نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

ذی الذوق اور دیوان غالب کی، قیادی خوبیاں زیرِ غور ہیں۔ خالص

شخصیت

اُردو خطوط میں شاعری ہی شاعری دیکھی۔ فرق صرف یہ ہو کہ دوزخ و جہنم
بھرتے بالکل بے نیاد ہے۔ حضرت داغ کے چاروں دیوان اور امیر غفرانی
کے دو دیوان دیوان بے شوق سے مطالعہ کیے۔ مگر زبان کا ریاض حضرت
داغ جی کے کلام بلاغیہ نظام سے ہوتا رہا۔ سب سے زیادہ راہنمائی انھیں
کی زبان نے کی۔

حضرت داغ کے شاگرد ہوئے، ادھر بڑی جماعتوں کی مدرسہ کی شرط قابضہ پڑی
لے لیے ٹریننگ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ لاہور کی علمی اور ادبی فضا میں ان کا شوق
نی خوب ابھرا۔ انھیں پہلے خود مشاعرہ دیکھتے اور اس میں شرکت کرنے کا موقع نہیں ملا۔
سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کے تعلق سے پھر تحصیل ننگر، ضلع جالندھر میں پہنچے
امیر کوئی پڑی، امیر دیہاتی حوال کی سابقہ سب سالہ شوگر اور موجودہ سیفکری نے
دعا کرتے ہوئے دیا۔

سب علم و فن

بتا دینا ابھی نہ ہوگا کہ آپ کے زمانہ طالب علمی میں اُردو نڈل کا نصاب تعلیم کیا۔
صحیح اور کیسا فقار وقت آج کل کے لباس کے نصاب پر بھی کئی درجے فوقیت رکھتا
سب مستطلاح دریں اقامت گزریں ہو گئے تو اب تمام توجہ اکتساب علم و فن پر مرکوز
وہ اپنی خداداد فطری ذہانت اور ترقی طلبی کی بدولت فارسی میں ششی فاضل اور
محل کے امتحانوں کی تیاری کر لے گئے۔ اس زمانے میں ششی فاضل اور دیب فاضل کے نصاب
ادق کتاب میں شامل تھیں جن پر مشورہ کر لینے والے فی الواقع غنیمت چمکتے تھے۔ اپنے ان
معاہدوں میں نہایت قابل تعریف کامیابی حاصل کی اور گویا بی نیاؤں میں نہر مکت ہے۔
میں ان کے جماعت کمال کے شوق کا اعجاز وہی امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جہاں
نات کے اکثر دیگر شعرا علم عروض سے ناواقف تھے (ادب اب بھی ہیں) اور اسے
دیباچہ کہنے کے لیے مولانا ہمدانی کا شعر

انہم فاعلا تن فسا حلات شعر ہی گویم یہ از قند و نبات

مختصیت

جلیل و دل پیش کرتے ہیں وہیں آپ نے ذاتی ریاضت سے اس علم میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ آپ کو متحدہ پنجاب میں بے بدل عروض تسلیم کر لیا گیا۔

یہاں مول پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعر کے لیے عروضدان ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ نریش کا شاد مرحوم نے بھی مجھ سے ایک مرتبہ ایک انٹرویو لیتے وقت پوچھا تھا، "کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور عروض کا جانتا شاعر کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں؟" جواب میں میرے الفاظ یہ تھے میں نے عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ عروض: جانتا نہ جاننے سے بہ حال بہتر ہے۔ لیکن جو شخص نظم ناموزوں طبع نہ ہو اس کو عروض پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً لاہور میں ایک بزرگ فارسی اور عربی کے لیم اے کلاسوں کو ۵۰ سال تک عروض پڑھا کے باوجود ناموزوں اشعار کہتے تھے۔ عروض جاننے کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس کی مدد سے ناموزوں اشعار کہنے والے کو اس کی غلطیاں بدھی طور پر ثابت کر کے قائل کیا جا سکتا ہے؛ حضرت جوش نظم ناموزوں طبع ہونے کے باعث علم عروض کی تحصیل کے محتاج نہ تھے، لیکن تکمیل علم و فن کی خاطر آپ نے اسے نظر انداز کر دینا پسند نہیں کیا۔

میں نے جنوری ۱۹۷۰ میں عروض کے بارے میں آپ کی اسے معلوم کرنی چاہی تھی۔ میرے مکتوب کے جواب میں آپ نے یہ تحریر فرماید جو بھول غالب، متفق گوید مگر بے وطنی بارے میں ہے۔

کب کا یہ غلطی درست ہو ادیس اس سے متفق ہوں کہ عروض نہ جاننے کے باوجود صحیح قسم کی موزونی طبع ہر بحر میں چل سکتی ہے۔ موزوں طبع شخص کو کبھی تقطیع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ناموزوں مصرع اس کی زبان پر آتا ہی نہیں، اور آجائے تو ہونٹوں سے باہر نہیں آ سکتا۔ لیکن اگر کوئی غلط ٹوٹ کہ دے کٹھن شعر میں سکتا ہے، یا وہ ساقط البحر ہے، تو عروض کی واقفیت کے بغیر اس کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔

عروض پڑھنا مگر اس کے قواعد اور اصول یاد نہ رکھنا عروضی دہانے کے برابر ہے۔ پروفیسر محمود خیرانی بہت بڑے محقق تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ میرے پاس عروض کی جتنی خطی اور

مطلوبہ کتابیں ہیں، اتنی دنیا بھر کے کسی فرد واحد کے ذمہ کتب میں نہ ہوتی۔ یہ دعویٰ غلط رہتا ہے۔ میں نے قیس کی مٹھ اور رشید الدین دہلوی کی حدائق التحریر سے لے کر بحر الفضا اور اس کے بعد تک کی ساری کتابیں ان کے مکان (فلہنگ روڈ لاہور) میں دیکھی تھیں۔ خیرانی صاحب کو سالم بھڑوں کے نام اور اراکان تو زبانی یاد تھے، مگر مزاحف بھڑوں کے نام اور اراکان دیکھنے کے لیے انھیں کتاب کالنی پڑتی تھی یہ ایک دن ان سے ملنے گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ عروص کی دس بارہ مطلوبہ کتابیں ان کے سامنے کھلی ہیں۔ میں نے پوچھا: ”باب کیا اہتمام ہے؟“ انہیں ان کی بے انتہا شفقت کے باعث ان کے بیٹے اختر شانی کی طرح بابا کہتا تھا انھوں نے فرمایا: ”مید سلیمان ندوی نے اقبال کے ایک شعر پر عرضی اعتراض کیا ہے۔ عبد المجید سالک اور محمد بن تاثیر جہ سے اعتراض کا ہنکا اچاہتے ہیں۔ یہ کتابیں اسی فرد سے نکالی گئی ہیں۔“

حضرت بخش کو تمام و کمال عروض اور سہ مشلا اگر آپ سے اجابک سوال کیا جائے تو بھرل کی دو چار پارچے مزاحف شکلیں کیا ہیں، جو ایک غزل میں آسکتی ہیں اور ان کے نام کیا ہیں تو یہ کتاب تو بیکے بغیر فوراً ان کے نام سے اراکان تقطیع بنا دیتے۔

آپ کو علم عروض و قافیہ کی طرح فارسی اور اردو کے قواعد صرف و نحو بھی حفظ ہیں۔ خان زند نے امام جمال الدین سیوطی کی عربی کتاب ”مذہر“ کے مقابلے میں فارسی علم اللسان پر مبنی نسخہ جو اپنی قسم کی پہلی کتاب تھی خان مصروف نے اس ایک کی فصل میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا شعر نے ایران سے اپنی زبان فارسی کے استعمال میں غلطی ہو سکتی ہے یا نہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح کبھی کبھی ہم ریتے ہیں وزن شعر، قافیہ اور ردیف کی قیدوں کی وجہ سے استعمال الفاظ میں، وزن قرعے کی غلطی ہو جاتے ہیں اور قواعد صرف و نحو کا پورا خیال نہیں رکھتے، اسی طرح اب ایران بھی بعض اوقات جادو مستقیم اور جادو ہر جاتے ہیں۔ حضرت بخش کو غیر اہل زبان اردو کی قواعد صرف و نحو کی طرف سے بے پروائی بعض اوقات انہیں بڑی شکل میں ڈال دیتی ہے اور وہ معمولی سے سوال کا جواب دینے سے کام لیتے ہیں۔

شخصیت

مضمون رسالہ آج کل میں شائع ہوا ہے، وہ میں نے پڑھا ہے۔ گیارہ کے ایک شعر میں لفظ
گرا بنا رہا لفظ رقا فیہ یوں آیا ہے:

ہنسل ہے عشق مجھ کو مگر اے اربابِ ارادیکھ کر، آپ نے اس لفظ پر توجہ نہیں کی۔ مگر انباء تو
عورت کو کہتے ہیں؟ انھیں علم تھا کہ اثر صاحب کی نگاہ سے عداوت ہے۔ تاہم آپ نے
ان کو وہیں ذوق کے یہ دو شعر سناد لیے ہیں۔

کیوں اتنا گرا بنا ہے جو رختِ سفر بھی اے راہِ و ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا
اے ذوق! کیا کہوں میں گرا بنا رہی گناہ کشتی میں ہوں تو بوجھ سے لنگر کو توڑ دو
یہ سن کر اثر نے کہا "اچھا" آپ لغت کی کتاب ضرور دیکھیں "آپ نے فرمایا "اگر لعنت
کی کتاب میں یہ مفہوم بھی لکھا ہے، تو وہ نہایت فقید المثال ہے"

میں عرض کر چاہتا ہوں کہ اگر کوئی اس بار حقیقی معنی کے برخلاف مجازی معنی میں حاملہ
کے لیے متحمل بھی ہے تو اثر صاحب کو یہ بھی تو دیکھنا چاہیے تھا کہ قائل مرد ہے اور
کو حل نہیں ہوتا۔

اپنے کلام میں آئے ہوئے کسی لفظ یا اصطلاح کے صحیح استعمال کی سند دنیا تو شاید اکثر شعر
کے لیے ذخیرہ نہ ہو، لیکن دوسروں کے متعلقات کو اساتذہ کے کلام سے استناد کوہ کے بجائے
ثابت کرنا اسی شاعر سے ممکن ہے جس نے زبان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک اصطلاح
پر ڈیمے ڈال رکھے ہوں۔

پنجاب میں اردو

پنجاب میں اردو اور انگریزی سرکاری زبانیں تھیں اور پنجاب یونیورسٹی میں بی اے تک
اردو کی تعلیم کے علاوہ اردو کے ادیب، ادیبِ عالم اور ادیبِ فاضل کے امتحانات بھی ہو
تھے، لیکن پنجاب کے اردو شاعروں نے اہل زبان کے روزمرے، فنِ شعر اور علمِ عروض سے
عدم واقفیت کے باوجود اپنی استعداد میں کوئی کمی محسوس نہیں کی اور شاعری کے ان اوزار
کو غیر ضروری سمجھا۔ اگر بات یہ نہیں کہ، مٹی، تو درگزر کی جاسکتی تھی؛ مگر ان لوگوں نے غلط
دمنے ہوئے آئیں بائیں شائیں کر کے اور بھی غضب کو دیا۔ یہاں دھانڈلی کی چند مثالیں

تخصیص

پیش کی جاتی ہیں۔

۱۹۱۲ء میں اقبال کے ایک دوست مجھے ان سے ملانے لے گئے کچھ دیر تک رمی گفتگو ہوئی رہی۔ پھر اقبال کے دوست نے ان کی نظم شکوہ سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اقبال بڑی خوش الحانی سے پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر آئے:-

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں معبود تھے پھر کہیں معبود شجر
تو نے کہا دوسرے مصرع میں ”نقص رہ گئے۔ ایک یہ کہ لفظ ”تھے“ جہاں آنا چاہئے
تھا وہاں نہیں آیا؛ اور دوسرا یہ کہ معبود اور معبود تو ہم دونوں اور عربی کے الفاظ ہیں لیکن
پتھر اور شجر میں یہ بات نہیں۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا ”کہیں معبود تھے“ کہیں معبود شجر تو
لفظ ”تھے“ اپنی جگہ پر آجاتا اور اس کے لئے تلفظ میں بڑی آتی اور تکرار اور شجر بھی معبود اور معبود
طرح ہمزون ہو کر پورے مصرع کو متعجب کر دیتے۔ اقبال نے یہ سن کر ٹھٹھاندا کر دیا۔ پھر دو
تین منطقی خاموش رہ کر بولے ”یہ ایسی دقیق فنی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ آپ ہی کو مبارک
رہیں۔ آپ میرا پیغام سمجھنے کی کوشش کیجئے“

ظفر علی خاں کی ایک نظم کے یہ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں:-
بڑھا امرتسری قہجی کے بل پر سیل لاشی کا
دکھا اے اسب بازی تو بھی اپنی خوشخبری کو
مسلمانوں سے پوچھو، مستندوں سے پوچھئے کیا
مری شیوا بیانی کو امری جادو کلامی کو
ظفر علی خاں روزانہ صبح کے وقت ال دوڈلا ہو رہے نہر تک یہ کہہ کر آتے تھے۔ ان سے میری تلقا
وہیں ہوتی تھی۔ میں نے ان سے کہا: ”آپ کی نظم کے ہر شعر میں دو لفظ (کو) حشو ہے۔“ وہ بولے:
”میں اسے حشو نہیں مانتا۔ اس میں کیا قیامت ہے؟“

ان سے محاورے کی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے ایک نظم میں ”بھیس کھل گئیں“ لکھ دیا۔
”بھیس پھٹ گئیں“ لکھ دیا تھا۔

عبد الحمید مساک کی ایک نظم کے پہلے شعر کا دوسرا مصرع یہ تھا: ”جس سے نبی کا بول ہوا بالادہ کام“
اس پر انعام ”دریہ“ مجھ کے مدیر جلالی نے اعتراض کیا کہ محاورہ بول بالا ہوتا ہے۔ محاورہ
میں تعریف یا الفاظ کی تعظیم و تائید نہ ہوتی ہے۔ پھر بول ہوا بالادہ میں ذم کا پہلو بھی ہے۔ بول

خصیصہ

عربی میں پنجاب کے لیے متعلیٰ ہوتا ہے۔ سالک سے اس اعتراض کا جواب تو بنا نہیں،
مگر انھوں نے "انقلاب" میں جس کے ایک مدیر وہ بھی تھے، بدرجہا لال کا نام جدا بلانی لکھ کر
انھیں بہت سی صلوٰۃ تہن سنا دیں۔

شمیلے کے ایک مشاعرے میں ایک شخص نے حنیفہ جالندھری کو محاورے کا غلط استعمال کرنے
پر توجہ دلائی تو انھوں نے کہا: "محاورہ ہی تو غلط ہے، اور تو کوئی بات نہیں۔ پھر اگر الکاہل
کا مطلع پڑھ دیا۔"

ہنگامہ بیانیوں ہے، تھوڑی سی جو چکی ڈاکا تو نہیں ماما، چوری تو نہیں کی ہو۔
میں نے حضرت جوش سے ایک مرتبہ خط لکھ کر دریافت کیا کہ آپ کو پنجاب کے شاعروں کی
عام روش کے برخلاف اہل زبان اساتذہ کے سانی متبع کا خیال کیونہ نہ ہو۔ جواب میں
آپ نے تحریر فرمایا:

میں نے پنجاب کے شاعروں میں یہ نمایاں کمی دیکھی کہ انھوں نے حسن طبعیت
کے باوجود زبان اور فن کی تحصیل پر بہت کم توجہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں
کوئی بھی درجہ استناد حاصل نہ کر سکا۔ میں نے مشق سخن کے ابتدائی
اور وسطی زمانے میں صحت زبان اور حسن بندش پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز
کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل زبان اساتذہ کے سوا اور کوئی میری نگاہ
میں نہیں اچھا۔

یہ آپ کے فطری ذوقِ سلیم اور وجدانِ صمیم ہی کا تقاضہ تھا کہ آپ نے علمِ زبان میں کامل
دستگاہ ہم پہنچانے کی شکلات کو یکسر نظر انداز کر کے سہل اچھا روی کی بجائے حرقریزی اور
جھانٹائی کو ترجیح دی اور اردو کے مذہمے اور محاوروں کا درست استعمال نہ کرنے کے
شاعروں کے ذمے میں شامل ہونا گوارا نہ کیا۔ درحقیقت آپ نے اردو زبانِ ادبی میں کمال
پیدا کرنے کی جیسی کوشش کی ویسی کوئی غیر اہل زبان نہیں کر سکا۔ اس لحاظ سے آپ
فردِ فرید ہیں۔ کسی غیر اہل زبان کا زبانِ ادبی میں اہل زبانِ فصحا کے برابر ہونا غیر ممکن تو

شخصیت

نہیں، لیکن مجددِ شہزاد ضرور ہے۔

پنجاب نے عہدِ جاگیر گیری کے بعد سے اب تک تین ہاں گال ایسے پیدا کیے ہیں جن سے یہ کوئلہ کا کے اہل زبان اساتذہ میں اور ایک کو امدد کے متنازعہ کا شہر تہہ تسلیم کرنے میں کوئی ہاتھی نہیں چمکتا۔

۱- راسه دایان انندرام مختلف ابن راجہ ہرود رام ساکنہ سودھروہ (پرمگنہ وزیر آباد) پنجاب۔

۲۔ دیوان سیاح کوئی مل دارستہ سیاح کوئی۔

۲۔ حضرت ابو الغضاعت جو شمس لمبانی :-

فصل چہدھم شاهی میں وزیر اعظم کو اب قرالین خاں کے ذکیل اور بادشاہ کے دربار میں اُن کے نمایندہ تھے۔ اُن کی تصانیف دیوانِ مخلص، 'براء الاصلاح' (نُصحت)، 'مدافع وقائع' (چشم دید و احوالات کامیابان)، 'ایک مجبور و باعیاات'، و دوسری فقہ ہنگامہ، عشق اور کارنامہ شہنشاہ ایک مجبور و قحط اور مرقعِ مخلص ہیں۔ اُن کا دعوے تھا کہ میں نے اپنی نظم و نثر میں کوئی مفرد یا مرکب لفظ ایسا نہیں لکھا جس کی سند اساتذہ ایران کے کلام سے نہ مل سکوں۔ جب نادر شاہ ہندوستان سے واپس چوتے ہوئے انکاکے پاس پہنچا اور جاٹوں نے اُس کے لشکر کا سامان رسد لوٹ لیا تو اس نے محمد شاہ کو ایک مژا سلیج بھیج کر دھکی دی کہ اگر میں بس نقصان کی تلافی نہ کی محی تو میں پھر ہندوستان پر حملہ کر دوں گا۔ محمد شاہ نے مقتدر نامور اراکین و وزراء سے نادر شاہ کے مژا سلیج کا جواب لکھا یا اور مخلص کی تحریر جو مضمون اور عبارت کے لحاظ سے بہترین تھا، نادر شاہ کو بھیج دی۔

دارستہ دیوان دارستہ، مصلح السعدین (مدفن شعر) مصنفات کائنات (نثر و غیرہ کے مصنفات) اور فرنگ مصطلحات شعر کے مدون تھے۔ اُن کی تحقیق و ترقی سے اسے ایک چاند بہادر ایسے قلم کار ہوتے کہ انھوں نے فرنگ مصطلحات شعر اور بہادر نجم کی حمد وین کے وقت نامکمل تھی بہادر نجم میں شامل کوئی۔ دارستہ نے خان آملو جیسے عظیم القدر و طراز اور تحقیق کی بعض اہمیات اور تحقیقات لغت پر محنت و نگہبیری کرنے کے علاوہ اُن کے تعلیمات کے بعد میں جو خان موصوت نے حاکم لاہوری کے دیوان کے حواشی پر رقم کیے تھے انکے و سارے جو بہشتانی بھی لکھا تھا۔

شخصیت

حضرت ابو الفصاحت کو ایک مستند عربی لغت کے مؤدوں جوہری سے بھی فیہد دی جاسکتی ہے۔ جوہری بھی الاصل ہونے کے باوجود عربی زبان پر ایسا قادر تھا کہ عرب عرب با بھی اُسے عرب سمجھتے رہے اور اسی مخالط کے باعث اُس کا کھاج ایک ممتاز عرب قبیلے میں ہو گیا۔ جوہری کی زبان دانی کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس نے مدت مدید تک عرب میں رہ کر عربی زبان کے نزدیک اور محاذ سے پر قدرت کاملہ ہم پہنچائی تھی۔ اُس کے برعکس حضرت ابو الفصاحت کو دہلی میں رہنے اور اہل زبان فصحا کے فیضِ صحبت سے بہرہ یاب ہونے کا موقع کبھی نہیں ملا۔

آپ ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے سلم الثبوت استادانِ یے گئے تھے اہل آپ کی شہرت پنجاب سے باہر ہندستان کے اردو دان موبوں میں پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں کچھ دھلے کا سالانہ مشاہیر شیخ سر عبد القادر کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی چشمِ کیفیت پندت ہری چند اختر مرحوم نے لکھی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جوہری سے اس مشاعرے میں نہیں آسکے تھے۔ سر عبد القادر نے کچھ دھلے پہنچے ہی دریافت کیا کہ اتنا بڑا استاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اسے نہیں بلا سکے۔ بعد کو انھوں نے خاص آدمی بھیج کر بوٹر کا دے انھیں مشاعرے میں آنے کی دعوت دی

ایک طرح کا ایک واقعہ جناب استاد ملتان نے تحریر کیا ہے :

"شغلے میں پریس آف دیلر مینا میں مشاعرہ ہوا تھا۔ شیخ سر عبد القادر کو کسی صدارت پر تشریف فرما تھے۔ جب اچھے اچھے شاعر کلام نہا چکے تو پندت جی کے نام کا اعلان ہوا۔ سر عبد القادر نے اٹھ کو خاص طور پر ان کا تعاون کر دیا۔ جب انھوں نے قول پڑھی تو سارا بندھ گیا۔ ایک ایک شعر باد باد پڑھوایا گیا۔ سر عبد القادر مجھ کو شہر دہرا رہے تھے ۔"

ایسی مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے :-

"۱۹۳۲ء کے شاعرے کا وہ منظر بھی مجھے اب تک یاد ہے جب شغلے

شخصیت

کے ”ڈیوی کو“ ال میں سید سر رضا علی کی صداقت میں مجلس گوم تھی۔

حضرت انکو مراد آبادی مرحوم کے بعد پٹنت جی کی بادی آئی۔ انہوں نے

ایک غزل سانی جن کا مطلع تھا،

سوزِ غم میں دیدہ تر کام آسکتا نہیں یہ وہ آتش ہو جسے پانی بجھا سکتا نہیں

یوں تو اس غزل کے ہر شعر کی خوب پذیرائی ہوئی لیکن ذیل کے شعر نے تو

قیامت برپا کر دی،

میری رسوائی کا حال لے دو اور فخر تو بچھ میں بھری غزل میں یہ تقدیر نامکن نہیں

جب یہ غزل ختم ہوئی تو مزید کلام کا مطالبہ ہوا اور انہوں نے ایک اور غزل

پڑھی جس کی زمیں تھی: دنیا، ایک اور، دوسرے زیبا ایک اور۔ اس غزل

کا یہ اثر ہوا کہ اس کے ختم ہونے پر حاضرین نے ایک زبان ہو کر ”ایک اور“

ایک اور“ کا شور مچا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں تیسری غزل بھی سانی پڑی۔

اصلاحِ زبان

حضرت جو شمس نے زبان دانی اور قاعدہ الکلامی میں اہل زبان اساتذہ سے اپنی بلند مرتبتی

تسلیم کر لینے کے بعد حضرت داغ کی اردو کو اور زیادہ مانجھے اور نکھالنے کی ضرورت کا

احساس کر کے بعد ازاں ”آرامتین سرور پر استن است“ ایسے الفاظ تو ایک کمال استعمال

ترک کر دیا، جنھیں ساخت کے لحاظ سے غلط یا فادہ سمیت کا منہ بول بول چال کے خلاف پایا

گیا۔ آپ نے اپنے مژدکات کی فہرست میں ان الفاظ کو تراکیب کے مطالعہ جو حضرت داغ

کے زمانے سے مژدک چلے آتے ہیں، بہت ایسے مفرد اور مرکب الفاظ جمع کیے ہیں جن

کے استعمال سے احتراز واجب ہے۔ یہ طویل فہرست آپ کے دوسرے مجموعہ کلام مجموعہ

پوش میں دی گئی ہو سکتی ہے۔ مگر اس فہرست کی اس لحاظ سے نامکمل سمجھنا چاہیے کہ ان

کے مژدکات کا سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔

میں یہاں صرف چند ایسے الفاظ کے نمونے پیش کر دیتا ہوں جنھیں آپ ہمارے ترک کیا ہے۔

جہاں میرا نقطہ مدد مجھ ”دہاں میں حضرت ضحیٰ الملک کا شعر بھی لکھ دیتا ہوں تاکہ یہ امر بخوبی

شخصیت

دافع بھانے کو آپ نے اصلاح زبان کے میدان میں کس شخصیت کو قدم اُگے بڑھایا ہے۔
آپ نے اتفاق کے ساتھ ساتھ اُن کے ترک کیے جانے کی وجہ یہ بھی کو دی ہے 'جو افادیت
کے اعتبار سے بہت ضروری تھی۔

چاہت : چاہ ہندی الاصل ہے۔ اس کے ساتھ تائے مصدری محبوب ہے۔

چڑھتے ہیں 'انھیں غیروں کی چاہت ایسی ہوتی ہے
خُدا کی شان ہے' ایسوں کی حالت ایسی ہوتی ہے (دآغ)

رنگت : یہ فہرست مترکات میں درج نہیں ہے۔ غالباً سہو اندراج سے رہ گیا۔ یہ بھی
چاہت کی طرح میوب ہے۔

شبنم سے شب، بحر کی قلت نہیں جاتی
سوشوب پڑیں تو بھی یہ زحمت نہیں جاتی (دآغ)
صورت : یعنی مانند بغیر ترکیب فارسی۔

بزمِ دُخس میں نہ کھلتا گلِ ترکی نمودت
جاؤ بکلی کی طرح، آؤ تکر کی صورت (دآغ)

غزل میں دیوان، عرفان وغیرہ قافیے ہوں تو مطلع میں سامان، ارمان کافیا ہے۔ ان
قوافی میں عربِ ردی کے عربِ اقبل حلق نہیں ہیں۔

ہنوا ہے جب سے شہر و اُس حد سے دین و ایمان کا
کوئی دل چیر کر دیکھے عجب دہرِ مشکاں کا (دآغ)

کابِ طَلت : یہ فارسی ہے۔ اُردو کی بول چال میں مستعمل نہیں ہوتا۔ صرف کابِ بہار
کابِ مناجات اور کابِ صلہ استعمال ہوتے ہیں۔ (کابِ طَلت کے ترک کے بارے
میں لوحِ ناری نے آپ کا مشورہ مان لیا تھا)

قصیں غریبوں کیوں کو کر لیا جو آسماں
یہ رقم نہ پانچ لگتی، نہ یہ انکار ہوتا
طرح (دیکھو ثانی) : ایک وجہ ترک تو یہ ہے کہ آساکن ہو تو طرح 'کیا دے معنی دیتا
ہے۔ دوسری وجہ کہ بول چال میں سب کو کو متحرک ہوتے ہیں۔ (آپ نے طرح کے بعد

صحیت

لئے کوڑا اندر دیا ہے،

آئے بھی، تو وہ سُکھ کو چھپاتے مرے آگے
(د آغ) اس طرح سے آئے کہ آئے مرے آگے
تقابلِ ردیفین:

سُنا ہے ہم نے تیرے بھی دہن ہے
(د آغ) جو ہو تا تو کہ صحرانا، کہیں کا ہے

فادہ دہری، الفاظ کی اردو جمع میں کی تخفیف۔ مثلاً سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم۔
حرفِ جار آجائے کے بعد مضاف الیہ اور علامتِ اضافت۔ مثلاً محبت میں ان کی غفلت
سے اُن کی۔

نادر: ہمیں آتش بے ترکیبِ فادہ کی۔ مثلاً نادر و رخ کی۔
رکھا، چکھا (بے تشدید)،

فادہ معمولی آٹھ دس اشعار میں صرف ایک بار لانا ہوتا ہے۔ اُشیاءِ ملا، خواہ ملا،
زمانہ ملا کی ذمہ میں فضاء ملا، کیا ملا، پارِ سادہ ملا وغیرہ توانی کی بھر مار درست نہیں جب
لن حرفِ رومی ہے تو اَلت حرفِ رومی کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ کی طویل فرسبت متروکات میں الفاظ کی خاصی تعداد درج ہونے
سے مدہ گئی ہے کیونکہ آپ نے ابھی شعوری طور سے ایسے الفاظ کا جائزہ نہیں لیا،
بھینس بچھر شعوری طریقے سے ترک کر دیا ہے۔

آپ ترتیبِ الفاظ اور سخنِ بندش کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ جن زمیوں میں ردیف
مُضاف ہوتا ہے، وہاں آپ مضاف الیہ اس کے بالکل متصل لاتے ہیں مثلاً
۱۔ تجھ کو معلوم ہے سب حال ہمارا ساقی۔ ۲۔ دم بھر کرتے ہیں سب شیخ و برہمن میرا۔
۳۔ کئی دن سے خوشام کو رہا ہے آسماں میری۔

تسکین اور سطر: یہ ایک عروضی رعایت ہے مگر اس سے وصفِ مصرع، وہاں نہیں
رہتا، بلکہ غیر مترحم بھی ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس نے جتنا ہی اُچھا لپٹا

تخصیص

..... اس میں یہ مصرع بھی آیا ہے، سوائے آتش ہے کون ہزباں اپنا۔

و اپنے نسکین اوسط سے کبھی کام نہیں لیا۔

قبیض واذالہ: بحر متقارب سالم، بحر متساوی سالم اود بحر ہزج سالم کے مصرع اول کے آخر میں نوں مثنیٰ کے سوا اور عروف بطور قبیض واذالہ نہ لائے جائیں۔ خلل مع

نہ ابرار باقی رہے ہیں نہ احسرا

شکست ناروا

اگرچہ شکست ناروا کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، مگر تمام مستند شعراء فارسی و اردو اس سے اجتناب کیا ہے۔ آپ نے ایک طویل مفعول میں شکست ناروا کی قیامت پر بڑی وضاحت سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:-

”بعض بحر میں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ ترنم اور موسیقی کا تھما نایا ہے کہ ہر حصہ مفہوم کے لحاظ سے مکمل یا قریب قریب مکمل ہو۔ شکست ناروا کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً:-

- ۱۔ اجزائے فعل کا ایک جزو پہلے نصف میں اور دوسرا جزو دوسرے نصف میں ہو۔
- ۲۔ جملہ و جزو میں جزو کا ایک جزو ایک نصف میں رہ جائے اور دوسرا جزو دوسرے نصف کے شروع میں آجائے۔

۳۔ مضاف اور مضاف الیہ میں سے مضاف الیہ اور حرف اضافت ایک نصف میں آئے اور مضاف دوسرے نصف میں جا پڑے۔ (اس کی قبیض صورت یہ ہے کہ حرف اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں لایا جائے۔

- ۴۔ ایک لفظ کا کچھ حصہ پہلے نصف میں اور باقی دوسرے نصف میں ہو۔
- ۵۔ مرکب عطفی کا معطوف الیہ پہلے نصف کے آخر میں اور معطوف دوسرے نصف کے شروع میں آئے۔

۶۔ نثر اور منادے میں حرف نثر پہلے نصف کے آخر میں اور منادے دوسرے

شخصیت

نصف کے شروع میں لایا جائے۔

۷۔ فارسی اصناف میں مضاف کے بعد مضاف الیہ دوسرے نصف کے شروع میں ہو۔

۸۔ فارسی عطف میں پہلا نصف حرف عطف پر ختم کیا جائے۔

حضرت جوش کو شکست نارد کے بارے میں پہلی بار استقصا کو کے مفصل بحث کرنے کا اثر حاصل ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اُن بحروں کی مراثی کو دی ہے، جن میں شکست نارد کا اسکان ہوتا ہے اور بحروں کے نام تحریر کرنے کی بجائے ان کے ہوزن شعر لکھ دیے ہیں تاکہ جو لوگ عروض سے واقفیت نہیں رکھتے وہ بھی باخبر ہو جائیں۔

جب جوش صاحب کا یہ مضمون رسالہ اچکل میں شائع ہوا تو شعرا کے طبقے میں تہلکہ مچ گیا۔ نواب جعفر علی خاں اثر کھنوی نے ان کے فرزند ارجمند جناب جوش ملیانی سے کہا: آپ کے والد صاحب نے شکست نارد پر اتنا مبسوط مضمون تو لکھ دیا، لیکن اتنی پابندیاں کون کون کر لیا کہ ”یہ سن کر جناب جوش ملیح آبادی جو ان دنوں آجکل کے ایڈیٹر تھے، بولے: ”میں اس مضمون کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ حسن بندش کا یہی تقاضا ہے کہ جن بحروں میں یہ احتیاط لازم ہوتی ہے، ان میں اس کا پورا لحاظ رکھا جائے، ورنہ مصرع کا وزن پورا کر دینا عجیب طبیعت کے مترادف ہو گا۔“ یعنی شعرا نے آپ کو اس مضمون پر مبارکباد دی تھی اور تسلیم کیا تھا کہ آپ نے شکست نارد کے سقم سے سب کو آگاہ کر دیا۔

مختلف فیہ الفاظ

میں نے حضرت جوش سے ایک خط لکھ کر مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں آپ کا مسلک دریافت کیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا:

”میں نے مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں خواہ وہ تلفظ سے تعلق رکھتے

ہوں، یا معنی سے، یا ترکیب و تانیث سے، ایک اصول اختیار کر رکھا ہے؛ مثلاً شعر کے سکون، ثانی افع ثانی سے مستند تلفظ ہیں، مگر میں یہ لفظ ہمیشہ سکون ثانی ہی سے لکھتا ہوں۔ مجھے یہ روش پسند نہیں کہ

تخصیص

..... اس میں یہ مصرع بھی آیا ہے، سوائے آتش ہے کون ہزباں
(آپ نے تسکین اور وسط سے کبھی کام نہیں لیا۔)

قبیخ و اذالہ: بحر متقارب سالم، بحر متدادک سالم اور بحر ہزج سالم کے مصرع آوا
آخر میں فون غنہ کے سوا اور حروف بطور قبیخ و اذالہ نہ لائے جائیں۔ اشلوع

نہ ابرار باقی رہے ہیں نہ احسار

شکست نادرہ

اگرچہ شکست نادرہ کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، مگر تمام مستند شعراے فارسی و اردو
سے اجتناب کیا ہے۔ آپ نے ایک طویل مضمون میں شکست نادرہ کی قیامت
وضاحت سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:-

”بعض بحر میں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا
ہے۔ ترنم اور موسیقی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حصہ مضمون کے لحاظ سے مکمل یا
قریب قریب مکمل ہو۔ شکست نادرہ کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً:-

- ۱۔ اجزائے فعل کا ایک جُود پہلے نصف میں اور دوسرا جُود دوسرے نصف میں ہو۔
- ۲۔ جلد و مجرد میں مجرد کا ایک جُود ایک نصف میں رہ جائے اور دوسرا جُود
دوسرے نصف کے شروع میں آجائے۔

۳۔ مضان اور مضان الیہ میں سے مضان الیہ اور حرف اضافت ایک
نصف میں آئے اور مضان دوسرے نصف میں جا پڑے۔ اس کی نتیجہ
ترصورت یہ ہے کہ حرف اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں لایا
جائے۔

- ۴۔ ایک لفظ کا کلمہ حصہ پہلے نصف میں اور باقی دوسرے نصف میں ہو۔
- ۵۔ مرکب عطوف کا معطوف الیہ پہلے نصف کے آخر میں اور معطوف دوسرے
نصف کے شروع میں آئے۔

۶۔ نذر اور نذرانے میں حرف نذر پہلے نصف کے آخر میں اور نذرانہ دوسرے

شخصیت

ضعف کے شروع میں لایا جائے۔

۷۔ فارسی اصناف میں مضامین کے بعد مضامین الیہ دوسرے نصف کے شروع میں ہو۔

۸۔ فارسی عطف میں پہلا نصف حرف عطف پر ختم کیا جائے۔

حضرت جوش کو شکستِ نادر کے بارے میں پہلی بار استقصا کو کے مفصل بحث کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اُن بکروں کی مراحت کو دی ہے، جن میں شکستِ نادر کا امکان ہوتا ہے اور بکروں کے نام تحریر کرنے کی بجائے ان کے ہوزن شعر لکھ دیے ہیں تاکہ جو لوگ عرصے سے واقفیت نہیں رکھتے وہ بھی باخبر ہو جائیں۔

جب جوش صاحب کا یہ مضمون رسالہٴ اُجکل میں شائع ہوا تو شعرا کے طبقے میں ہتکڑیاں لگیں۔ نواب جو علی خاں اُتر کھنوی نے ان کے فرزند ارجمند جناب جوش ملیح آبادی سے کہا: آپ کے والد صاحب نے شکستِ نادر واپر اتنا بسوط مضمون لکھ دیا، لیکن اتنی پابندیاں کون کون کر لیا کہ گویا یہ سن کر جناب جوش ملیح آبادی جو ان دنوں آجکل کے ایڈیٹر تھے، بولے: ”میں ابھی مضمون کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ حسنِ بندش کا یہی تقاضا ہے کہ جن بکروں میں یہ احتیاط لازم ہوتا ہے، ان میں اس کا پورا لحاظ رکھا جائے، ورنہ مصرع کا وزن پورا کر دینا عجزِ طبیعت کے مترادف ہو گا۔“ یعنی شوالے آپ کو اس مضمون پر مبارکباد دی تھی اور تسلیم کیا تھا کہ آپ نے شکستِ نادر کے سقم سے سب کو آگاہ کر دیا۔

مختلف فیہ الفاظ

میں نے حضرت جوش سے ایک خط لکھ کر مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں آپ کا مسلک دریافت کیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا:

”میں نے مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں خواہ وہ تلفظ سے تعلق رکھتے

ہوں، یا معنی سے، یا تہذیب و تائید سے، ایک اصول اختیار کر رکھا ہے، خلاصہً حضرت کے سکونِ ثانی اصدخ ثانی سے مستند تلفظ ہیں، مگر میں یہ نقطہ ہمیشہ سکونِ ثانی ہی سے لکھتا ہوں۔ مجھے یہ روش پسند نہیں کہ

شخصیت

یہاں سکونِ ثانی کی گنجائش ہو، وہاں سکونِ ثانی سے ادبِ جہاں فتح
ثانی کی کھٹ جڑ وہاں فتحِ ثانی سے لکھ دوس۔ اسی طرح کا فرجِ برو سے لغت
فت کے زیر سے صحیح ہے، عام بول چال میں فت کے زبر ہی سے استعمال ہوتا
ہے، میں نے بھی یہی صورت پسند کی ہے۔ تذکرہ تائینت کے متعلق بھی
میری روش یہی ہے۔ سانس، طرز، فکر، غور، فہم مختلف فیہ میں گر میں
طرز، فکر، سانس کو ہمیشہ نوٹ لکھتا رہا ہوں۔ سانس کے متعلق ذوق کا
مصراع مثال ہے: سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد یہ غور اور
فہم کو بند کر لکھتا ہوں۔ فہم کے متعلق میں نے کیفی و بلوی مرحوم دہندت برج
موسن و تاتریہ سے پوچھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اب اس کا استعمال تذکرہ کی
طرت جھکتا جا رہا ہے۔

حضرت جو ش نے ایسی صورتوں میں جو پابندی اپنے اوپر عائد کوئی ہے، وہ آپ کے اصول
اخذ و ترک کی، مقبولیت کے علاوہ آپ کی ہوا پسندی پر مبنی دلائل کوئی ہے۔
حضرت و آغا نے حضرت سکونِ ثانی اور فتحِ ثانی دونوں سے، طرز تائینت سے، سانس اور فکر تذکرہ
سے لکھا ہے مثلاً:-

آبِ بقائے گرچہ بہت روک نظام کی	پیری چلی نہ خضر علیہ السلام کی
اگاہ ہے سبز و کیسا جو منے کے گرد لے ساقی!	خضر آئے نہ ہوں چشمہ کچھ کو آبِ حیاں کا
داعِ معجز بیاں ہے کیا کہنا!	طرز سب سے جدا نکالی ہے
دیکھنے کو ترے اک سانس لگا رکھا ہے	ور نہ بیاد غم، بھر میں کیا رکھا ہے!
شکوہ نہیں عدد سے ملاقات کا بٹھے	تم جانے ہو فکر ہے جس بات کا بٹھے

جہاں تک مجھے علم ہے حضرت و آغا کے شاگردوں میں فوجِ نادرہ اور حضرت جو ش کے
سوائے کسی نے سانس کو نوٹ نہیں لکھا۔ رسی ذوق کی سند تو اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ
فکر کے کلام میں بھی جسے ذوق کا ساختہ و پروا نہتہ کہا جاتا ہے، قلمِ دھامہ کہیں نہ گزرا وہ کہیں نوٹ
آیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مقدم اور متاخر کے لحاظ سے ذوق کی سند کے مقابلے میں ذوق کی سند

شخصیت

وہ معتبر بھی جائیگی۔ بہر حال یہ ایک مجتہد زبان کی ذاتی پسند کا معاملہ ہے؛ اس میں چون چلا

ن ہو!

طاب ابو الفصاحت

بے اس استفسار پر کہ آپ کو خطاب ابو الفصاحت کب اور کہاں سے ملا، آپ نے یہ جواب

مال فرمایا:

”حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حفیظ جالندھری کے نام کے ساتھ ان کے مخلص
اصحاب نے ابو الاثر استعمال کرنا شروع کر دیا، اسی طرح میرے اکیچ پڑے ہوئے نام
نے میرے نام کے ساتھ ابو الفصاحت کی شاخ لگا دی۔ آہستہ آہستہ یہ
لفظ بہت پھیل گیا اور جناب مہر گواریا اور جناب دل شاہ جاپوری بھی اپنے
خطلوں کے سرناموں میں بالالترام لکھنے لگے۔ برادرِ معظمہ مقرر جناب مہر نے
اپنے دیوان ”شعاع مہر“ میں یہ اقطارِ تاریخی شائع کیا، تو یہ اور ایسے ہی لوگ
بھی اعراضی الفاظ استعمال کیے۔ ان کے بعد جب جناب نوح نادروی نے
بھی میرے نام کے ساتھ ابو الفصاحت لکھنا شروع کیا، تو میں نے موصوف
سے اس کا جوڑ پوچھا۔ انھوں نے اس کی سند دس بارہ سطروں میں لکھ کر
دستخط اور ہر سے مزیں کو کے بھیج دی اور خط میں لکھا کہ جب بھائی مہر اور حضرت
دل اس لفظ کا استعمال برحق سمجھتے ہیں تو میں کیوں نہ اس کی تائید کر دوں۔
یہ سند میرے پاس محفوظ ہے، مگر میں نے اس کا تذکرہ ہوا تک نہیں لگائی اور کبھی
یہ لفظ اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کیا، حال آں کہ دوسرے شعر لپٹنے
نام کے ساتھ اعراضی الفاظ عموماً استعمال کرتے رہے ہیں۔ مثلاً حضرت
دآرخ نے نوح نادروی کو ناخدا مئے سخن خطاب دیا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی انھیں
سربشاعرہ فصیح العصر کے الفاظ سے نوازا۔ نواب سائل دہلوی نے حضرت
دآرخ کی ہاشمی کی سند میں جناب مہر گواریا، جناب نوح نادروی اور
جناب بارخ سنجل کی لکھ کر دیں اور یہ اصحاب بجا طور پر خطاب اور جانشین

شخصیت

حضرت خواجہ اپنے نام کے ساتھ لکھتے رہے۔ اسی طرح جناب دول نے خطاب اعتبار الملک کو اپنے نام کا جو قرار دے دیا تھا۔ مگر میں نے ہمیشہ جو شمس لسانی لکھنا پسند کیا۔ اس کی وجہ طبیعت کا انکسار اور صرف انکسار ہے۔ میرے ایک مقطع سے میرے اس میلان طبع کا اظہار ہوتا ہے، خاکساری نے مجھے پاک بنایا، اے جوش!

ایک بھی داغِ رحمت مرے دامن میں نہیں

میں نے خطاب ابو الفصاحت کی مدد یا بی کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا
مداح، معترف، معتقد اور شاگرد

آج حضرت جوش ہندستان اور پاکستان میں رہا نہ ان کا دل اور شاعر مسلم اللہ سے ملے جاتے ہیں۔ ان کے تلامذوں کی تعداد کا اعجاز گنا بہت مشکل ہے۔ جہاں اور وہ ان طبقہ ان کی عالی مرتبتی کا قائل نہ ہو۔ بلند پایہ شاعروں، ادیبوں ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔

اُن میں ہندو برج موہن دتازیر کیفی و لہوی، یخود و لہوی، ریاض خیر آبادی، گنگا جیگری، ناطق گلا و ٹھوی، جگر مراد آبادی، ذاب اثر بھنوی، نیاز فتح پور، احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا غلام رسول ہر کے نام خاص طور پر قابل ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد تین سو سے تجاوز ہے۔

صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ پاکستان میں بھی ہیں اور ان کی زبان اور طرز بیان کی پیروی اُن کے لیے ہمنزلہ جوہا یا ان ہے۔ میں سے جن کا کلام سنا اور پڑھا ہے اُن میں کمال کوٹہ پوری، نسیم ذوقی، جالندھری، ساسو سیالکوٹی، ہمارا زوی وغیرہ کو خوشگونی کے لحاظ سے متاذا حضرت جوش کے فرزند ارجمند جناب عرش لسانی نے اگرچہ ان سے کبھی اصلاً اس کے باوجود انھوں نے آپ کی روایات کے مطابق سخن طرازی کو کہ ہندو میں بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی ہے۔ اصلاح نہ لینے کی وجہ غالباً یہ:

شخصیت

شقانہ کلام والد ماجد کو دکھاتے ہوئے جواب آیا۔ حضرت جوش نے آج سے بیس سال
یہ ملاقات میں مجھ سے فرمایا تھا، "جوش نے مجھ سے اصلاح نہیں لی، لیکن وہ میری
نام تحریریں بغور پڑھتے رہتے تھے جو میں اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے سلسلے
ازر کو پیش کرتا تھا۔ وہ میری انھیں تحریروں کے مطالعے سے خوش فکری اور خوش
کلامی سے بڑی واقف ہو گئے۔"

انگریزی نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی۔

در نظم جو بلند نامی کیں ختم شد است بر نظامی
نظامی کی تقلید میں جوش سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ جوش کے دوست
ن کے کچھ ابتدائی اشعار سن کر جان گئے تھے کہ وہ ایک نہ ایک دن شعرو سخن میں
بیدار ہو گئے۔ انھیں اپنے واحد فرزند کی شاعری اور سعادت مند پوجا فرمے۔ ایک
کے مسئلے میں لکھا ہے:

پڑے جوش اتم کو فرزند چاہیے ایک ہو یا سپر، تو ایک بھی کچھ کہیں
ما وظیفہ ابھینندن گزرتہ اور اعزاز

حکومت ہند نے ۱۹۵۵ء میں ممتاز اور گہن سال شرف ہر دو کو ادبی وظیفے دینے
لیے، تو آپ کا نام نامی بھی وظیفہ یابوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ چنانچہ آپ کو
سندھ کے گورنر ڈیڑھ سو روپے ماہ ملتے رہے۔ اس کے کئی سال بعد حکومت پنجاب
نے آپ کو اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں ایوارڈ دیا، جو سائنس، صنعت اور
بے نقد کی تحفہ لیا اور ایک مختصر سے ابھینندن گزرتہ پر مشتمل تھا۔ ۱۹۷۱ء میں حکومت ہند
نے آپ کو کمالات کی قدر شناسی کے طور پر پدم شری کا اعزاز دیا جسے جو میر غلام میں آپ
ناجہتی سے بدعہما فرد تر ہے۔ اب آپ نے حکومت کو لکھ دیا ہے کہ ان کا ادبی وظیفہ
دیا جائے کیوں کہ آپ کو اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹۷۷ء میں آپ کی شاعری کی عمر ساٹھ سال کی ہوئی، تو آپ کے شاگردوں
عید تہذیب نے آپ کی خدمت میں ایک کتاب المصاب (ابھینندن گزرتہ) پیش

نتیجہ

مکرمے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کے لیے دہلی میں مرکزی وزیر پرنٹنگ و پبلشر پرنٹ مرحوم کی زیر صدارت ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں سربراہ آدرہ ادیب، حکومت ہند کے وزیر، پارلیمنٹ کے ممبر، علی لکئی سفیر اور سینکڑوں شہیدایان اردو تھے۔ پرنٹ پرنٹ نے آپ کو ایک ضخیم بھینڈن گرانٹ پیش کیا۔ اس میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد وزیر اعظم پرنٹ و اہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مقتدا اکابر کے علاوہ بہت سے شعراء و ہائے تحریقی تحریریں آپ کے کمال شاعری و زبان دانی پر کئی اعلیٰ درجے کے مقالے درج ہیں۔

تصانیف

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ بادہ سرخ، پہلا مجموعہ کلام، سال اشاعت ۱۹۴۱ء
- ۲۔ چوں و بوش، دوسرا مجموعہ کلام، سال اشاعت ۱۹۵۲ء
- ۳۔ فردوسِ گوشت، تیسرا مجموعہ کلام سال اشاعت ۱۹۶۱ء
- ۴۔ خمرخ دیوانِ غالب (معدود) اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔
- ۵۔ دستور القواعد فارسی

۶۔ اقبال کی خامیاں

۷۔ دعوتِ عمل (قومی نظمیں)

۸۔ آئینہ اصلاح (شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں مع توجہیں)

۹۔ مجموعہ ہدایات (یہ نیز ترتیب ہے۔ اس میں تقریباً دو سو ہدایاں ہوں گی۔

آپ نے ایک مکتوب میں مجھے بتایا ہے کہ ادبی مضامین نشر کے دو مجموعے ڈھائی ڈھائی سو صفحات کے خوش صاحب کی تحویل میں ہیں، جن کی اشاعت کی نوبت شاید اردو دشمنی کے اس دہر میں گھبی نہ آئے۔ کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی تھا، مگر ان بیاضوں کو دیکھ ایسی ہی طرح چاٹ گئی کہ وہ لکھ کاغذ کا ٹکڑا بھی نہ رہ سکا۔ تیسرا مجموعہ کلام فردوسِ گوشت کی اشاعت (۱۹۶۱ء) کے بعد جراثیم لگے ہیں، ان کی تعداد دو ڈھائی سو کے وہیمان ہوگی۔

مشاعر میں

انہوں نے ہندستان کے بیشتر شہروں کے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ وہ شاعرے میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں اور شعر اور سامعین کو اپنی آمد کا شدید انتظار نہیں کراتے۔ میں نے بار بار دیکھا ہے کہ آپ اپنے کیرئیرن اور پایہٴ محنوری کو کیر نظر انداز کر کے سطح کی کسی عزیز نایاں جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں مگر دوسرے شعراء و منتظم مشاعرہ جلد ہی انہیں اٹھا کر کاؤتیکے کے سہارے صدر میں بٹھا دیتے ہیں۔ پھر جو لوگ آتے ہیں وہ آپ کو ٹوڈ باء سلام کو کے غالی ہنگہوں پر بیٹھنے کے بعد آپ کی نہایت سادہ وضع قطع دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے رہتے ہیں۔

مشاعرے کے آداب کا ہمیشہ پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ آجکل ایک بہت بڑی بد تیزی یہ چل رہی ہے کہ اکثر پختہ، نیم پختہ اور نا پختہ حضرات اپنا کلام پڑھنے کے بعد مشاعرے سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی غرض محض اپنا کلام سنانا ہوتی ہے، اور انہیں دوسروں کا کلام سننے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ غور کیا جائے تو یہ لوگ جو اپنا دھول پیٹ کر مشاعرے سے چلے جاتے ہیں، دراصل ان لوگوں کی توہین کے مرکب ہوتے ہیں جن کے پڑھنے کی ذہنیت اس وقت تک نہیں آئی ہوتی۔ حضرت جوش ان مشاعروں میں مکی جن میں بڑے بڑے اساتذہ مثلاً محمود دہلوی، سائل دہلوی، کھنئی دہلوی، سائر دہلوی، فوج ناروی، دل شاہ جہانپوری وغیرہ شامل ہوتے تھے، اپنا کلام فصاحت و انعام پڑھنے کے بعد اختتامِ مشاعرے تک وہاں سے نہیں اٹھتے تھے۔ اب تو آپ کو آدابِ مشاعرہ کے علاوہ اس وجہ سے بھی آؤتھک بیٹھنا پڑتا ہے کہ شاہیر اساتذہ میں آپ ہی کا وجود مسعود باقی رہ گیا ہے اور ہر شاعرے میں آپ ہی کا کلام مقطع سخن ہوتا ہے۔

البتہ کل کے مشاعروں سے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ یہ مشاعرے نہیں، تماشا گاہ ہیں۔ میں بھی اس احساس میں ان کا شریک ہوں۔ میں نے پُرانے مشاعرے دیکھے ہیں۔ شعرا ایک سطحے میں بیٹھتے تھے اور سطحے کے گرد و سامعین کے لیے جگہ رکھی جاتی تھی۔ پڑھنے والے شاعر کے مخاطب شعراء ہوتے تھے۔ وہی اس کے سخنِ حقیر اور سخنِ بیان کی داد دیتے تھے۔ اب کیا ہوتا ہے؟ ایک ایسیج بنائی جاتی ہے جس پر ایسیج بیکر ٹری یعنی کلام پڑھنے والوں کے نام کا احاطہ

شخصیت

ہوران کا تعارف کوئے والا شخص سب سے آگے بیٹھتا ہے اور اچھے برے سب شامل اس کے پیچھے کچھ فاصلہ پر ایک صف کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں، اسٹیج سکرٹری شام کا نام بھارتا ہے اور شاعر سامعین کو جو اینٹوں اور پتھروں سے کچھ زیادہ سوچھ بوجھ نہیں رکھتے، خطاب کر کے کلام سنا تا ہے۔ شعرا اور بھی کھلی صفوں میں کھسک کر باتیں کرتے ہیں یا لیٹ جاتے ہیں۔ میں نے ایک مشاعرے میں ایک پختہ گوشاوار سے کہا کہ آپ ذرا آگے آکر بیٹھیں تو انھوں نے جواب دیا: یہیں اچھا ہوں۔ آگے بیٹھنے پر داد دینے پڑ گئی :

حضرت جو ش اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ روح ناردی نے ایک جگہ لکھا ہے :
 "اس زمانے میں شعر اکلام کے عیوب چھاننے کے لیے ترم سے کام لیتے ہیں
 مگر میری طرح یہ (روح ملیانی) بھی ترم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے !
 تحت اللفظ میں اپنا کلام سناتے ہیں۔ سامعین اور حاضرین اُن کے
 تحت اللفظ کو سن کر ترم کی ذرا پروا نہیں کرتے :

داد دینے کا طریقہ

حضرت جو ش اچھے شعری داد دینے میں کبھی بھل سے کام نہیں لیتے اور دو سسز نام بھادشاہوں کی طرح خاموش رہنا پسند نہیں کرتے۔ آپ جدیدوں کے جلتے اور بھل کلام سے بیزار ہیں، مگر اُن کی تصنیفات سُسنے اور چُپ رہتے ہیں۔ مجھ سے بعض بر خود غلط شاعروں نے کہا کہ جو ش ملیانی صاحب ہمارے کلام کی داد نہیں دیتے۔ میں نے جواب دیا کہ جب آپ کے اشعار میں لپٹی ہوئی راہیں، سہمے ہوئے سالیے، سیگوں خاموشیاں کی سی ترکیبیں آئیں اور آپ ایسے اشعار لکھیں، جیسا یہ ہے :

رات دُگ جاتی ہے جب ذہن پریشاں کے قریب

درد کے بھول چکے ہیں رُگ جاں کے قریب

تو حضرت جو ش آپ کو دودے کو زبان، فن اور خوش خدائی کا خون کیلے گوارا کر سکتے ہیں ؟
 کبھی کبھی آپ کی داد میں پڑی پُر لطف معنویت بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی دلو کی مثال چرخِ گنہ سے پہلے ایک واقعہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میرے نانا اور پرانا نانا فارسی زبان دلو

شخصیت

مجید عالم افغانی سخن طرازی میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ جب میں پندرہ سال کا تو میرے نانا نے مجھے چار پانچ لغت کی مستند کتابیں با بسم اللہ سے تلے منت تک دے جانے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ جن الفاظ کے معانی تمہیں معلوم ہیں، انہیں بھی پڑھو۔ اس پر میں نے فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، بہارِ نجم اور فرہنگ آئندہ راج دھڑالیں، ان لغتوں میں سے ایک میں لفظ حذر کے متعلق لکھا تھا: "نام مشوقہ عرب عالم لیسے وغیرہ"۔ مجھے لفظ "عالم" نے بید لطف دیا۔ اگر دوں قسم یا قلیل لکھتا تو بتا ہی رہتی لیکن جو خوبی "عالم" میں تھی، ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ ایک شاعرے میں ایک شاعر جو اپنے آپ کو روح القدس کا ہیزبان سمجھتے تھے، بالکل غیر مربوط اور بہت بے ٹکے اشعار تھے۔ جو شخص صاحبِ چپ بیٹھے رہے، مگر جب انہوں نے آغوشِ شرمات بٹھا ہوا ہی قدر اچھا پڑھا، تو آپ نے فرمایا: "وہ کیا صحت مندرجہ پڑھا ہے"۔ مجھے یہ تو معلوم میں کہ اور لوگوں نے لفظ "صحتمند" کی معنویت کا لطف دیا یا نہیں، مگر میں دل ہی دل میں دیر تک اس کی داد دیتا رہا۔ اب بھی یہ لفظ یاد آجاتا ہے تو مجھ سے ملتا ہوں۔ جو خوبی مستند میں ہے، وہ صبح میں کہاں۔

عروں میں جیسا کلام پڑھا جاتا ہے تو اس کے بیشتر حصے سے آپ کی طبیعت کا منقص جاتا قدرتی امر ہے۔ آپ کی ایک غزل کے یہ دو شعر آپ کے احساس کا اظہار کرتے ہیں: "مناہزم سخن میں بھی ہوا ہے مشکل بد مزہ صحبت یاد اں کہیں ایسی تو نہ تھی"۔ ہے جو کچھ بھی شکل ہمارے بجا ہوا، بولہ بول شاعرِ سخن سے جو زبان کہیں ایسی تو نہ تھی

طرح بازی

شرخ باڈی نہیں آتی۔ میری اہلیہ نے مجھے سکھانی چاہی تھی، لیکن میں نے اسے دبا لیا کہ کچھ کو سکھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے جناب شیش چند طالب دہلوی سے جو بہت اچھے طرح باڈی میں حضرت جوش کی بڑی تعریف سنی ہے۔ طالب صاحب کا بیان ہے کہ آپ ہندستان اور پاکستان میں نہایت سرپرست اور وہ شرخ باڈی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لذت ہری چند اختر مرحوم نے لکھا ہے: بار بار دیکھا گیا کہ آپ ایک صبح سے دوسری صبح تک

تخصیصیت

شطرنج کھیلنے رہے اور اُسے بھی تو صرف اس مجبوری سے کہ دنیا اس انہماک کو دیکھ کر کہنا
 کیسی؟ آپ نے شطرنج کے متعلق ایک بیاض میں بہت سے مشکل مشکل نکتے درج کر کے
 ان کے حل بھی بتائے ہیں۔ آپ کے بعض اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہیں بڑی
 عربی سے استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

کچھتے خوب تھے ہم شاطر و دراز کی جاؤں کو مگر نقشہ بڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں
 مجھ سے جاننا ذکر غربت ہے بساط شطرنج جو نہ پلے کبھی واپس وہ پیادہ میں ہوں
 طالب صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے فرزند عبدالعزیز عرش مسیانی صاحب بھی شاعر
 کی طرح شطرنج بازی میں بھی کمال رکھتے ہیں اور کوئی شطرنج کھیلنے والے تو اُس کے
 ساتھ تین چار بازیاں کھیلے بغیر نہیں اٹھتے۔

حلیہ، لباس، خوراک

آپ کا ہر ہرہ آدیائی، رنگ کھلتا ہوا بچپنی اور قد درمیانہ ہے۔ کہن سالی کے باوجود
 آپ کی کمر نہیں ٹھکی۔ آپ لباس میں خاص طور پر گھر کے معمولی کپڑے کی سفید گہری سفید
 قمیص اور سفید دھوئی کو کافی کچھتے ہیں اور عام طور پر اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ سردیوں
 میں کپل ضرور اوڑھ لیتے ہیں۔ آگے کوٹ اور پاجامے کو دفتر کی وردی کہتے ہیں، لیکن کبھی
 کبھی کبھی موسمی حالات سے مجبور ہو کر معمولی بند گلی کا کوٹ اور پاجامہ پہن لیتے ہیں۔ سردیوں
 میں جواہروں کے دو جوڑے کفایت کرتے ہیں، اودان کا استعمال بھی دوران سفر میں ہوتا
 ہے۔ بوٹ کبھی نہیں پہنا؛ ہمیشہ ویسی جوتا ہی پہنتے ہیں۔ کھانے پینے میں تکلف کا قطعاً
 دخل نہیں۔ جوں جاتا ہے خدا کا شکر کر کے کھا پی لیتے ہیں۔ عمر بھر گوشت اور شراب کو
 چھوٹا نہیں، درحالے کہ پنجاب کے برہمن دوسرے صوبوں کے برہمنوں کے برعکس
 گوشت اور شراب برسرعام کھاتے اور پیتے ہیں۔ سادگی اور بے تکلفی آپ کی زندگی کے
 تمام پہلوؤں پر چھائی ہوئی ہے۔ آپ دستار، رفتار، گنبد اور کردار کے لحاظ سے ایک
 سیدھے سادھے دیہاتی نظر آتے ہیں۔ تنہا کوکشی آپ کا مرغوب مشغل ہے لیکن وہ بھی
 حد اعتدال تک۔ آپ ایک با صبح دوسری بار شام اور تیسری ہادرات کو حقہ پیتے ہیں۔

شخصیت

آپ نے پچھلے سال مجھ سے فرمایا تھا: میں حقہ پینے کی عادت ترک بھی کر سکتا ہوں۔ آپ
میں نے کو انیس سو تینہائی لکھے ہیں۔ اس کے متعلق آپ کی ایک غزل کے یہ تین شعر قابلِ دید

ہے:

نازِ صبح سے پہلے نہ کی تدبیر تھی کی تھارے گھر میں فریادی رہی تقدیر تھی کی
ہمارے مولوی صاحب بھی دیکھتے ہیں حقہ کا دھوئیں کے ساتھ اڑ جائیگی اب تکفیر تھی کی
غیر لکھنؤ کا، اس پر خوشبو خوش کی بیچے میں بلائیں لے رہا ہے خطہ کشمیر تھی کی

صحت

خدا کے فضل و کرم سے آپ کی صحت ہمیشہ اچھی رہی ہے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ
بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ ایک شاعر کے اختتام پر جب آپ ایٹم سے اترنے لگے
تو میں نے سہارا دینے کے لیے آپ کا بازو تھاما۔ آپ نے فرمایا: ”آپ مجھے سہارا دیں۔
میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔“ اسی وقت میری زبان پر یہ شعر آیا ”جو میں نے اس لیے نہیں
پڑھا کہ اس میں حضرت یا جناب کا لفظ آپ کے غلصے سے پہلے نہیں آیا تھا۔“

کیا صحت جو شہسبانی دیکھی پیری کے لباس میں جوانی دیکھی
میں نے ایک خط میں آپ کو لکھا تھا کہ میں آپ کو جوانوں سے جوان کر رہا ہوں۔ اس جواب
میں آپ نے تحریر فرمایا:

میرے ایک مقامی شاگرد بلونت کمار ساگر اپنے بھائی سے ملنے فیض آباد
گئے تو انھیں خیال ہوا کہ لکھنؤ بھی دیکھنے چلیں۔ وہ لکھنؤ میں آج لکھنؤ
اور آخر لکھنؤ سے ملنے کے بعد پٹنہ آئے۔ ان دنوں کو ملے ہوئے۔ اُن
دونوں صاحب ہائی کو رٹ کے بیچ تھے۔ ملا صاحب نے دورانِ گفتگو میں
پوچھا: آپ جو شہسبانی صاحب کو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا: وہ میرے
اُستاد ہیں۔ اس کے بعد میری صحت کے متعلق دریافت کیا، تو اس نے کہا
طلب صاحب کی لاٹھ پر سے میں دم لیے بغیر بڑھ جاتے ہیں۔ یہ سن کر
ملا صاحب بہت ہنسے اور کہا: آپ نے صحت کا معیار غلط بتایا۔ اس

شخصیت

میں شک نہیں کہ ستر سال کی عمر میں میری صحت ایسی ہی رہی۔ طلبِ صحت
کی لالچ پرنی اوقات دو بار پڑھا، دم لینے بغیر چوٹی پر پہنچا۔ دو جوان عزیزوں
کی رفاقت تھی۔ واپس آیا، تو دیکھا، وہ دونوں آدھا آدھینڈے کر کے دم
لے رہے تھے۔

آپ کے سفر میں ایک بھی دانت نہیں ہے۔ دو بار مصنوعی دانت لگوائے، مگر پندرہ
آٹے کی وجہ سے نکال کر پھینک دیے۔ آپ کے سٹوٹے اتنے سخت ہو گئے ہیں کہ دانتوں
کا کام دیتے ہیں۔ آپ کا بلڈ پریشر (فشارِ خون) ۱۷۲ ہے جو عمر کے لحاظ سے درجہ اعتدال
وہ ہے متجاوز نہیں۔

خلقِ عظیم

آپ اطلاقِ حمیدہ کا ایسا مجتہد ہیں جس کی نظیر بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ وسیعِ اقلیمی،
کویرِ انفسی، پاکِ مشرقی، محفلِ جمہورِ اتحاد کا آپ کی طینت میں جو رہاؤ ہے، اسے دیکھ کر آپ کو
فرشتہ بقالبِ انسان تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنے پائے کمال اور عالمگیر شہرت سے بے خبر نہ ہونے
کے باوجود ایسے دکھائی دیتے ہیں، جیسے دنیا کے ہر کو بیغزورت ایک بلند ترین مقام و مرتبہ
میں دو یا ہو۔ آپ جو انوں سے بھی جو عمر کے اعتبار سے آپ کے نواسوں کے برابر ہیں، اپنی
بددی کا مطلق خیال نہ کرتے ہوئے ہمسازہ طریق سے ملتے ہیں اور انھیں یہ احساس نہیں بخشتے
دیتے کہ اس عہد کا عظیم شاعر اور مصلحِ زبان ان کو طوطے سے فرد تر سمجھتا ہے۔ میں نے دیکھا، امیرِ
تسلیم، حمید اور جلال کے بڑے بڑے نامور شاگردوں کو دیکھا ہے، لیکن جو صفات آپ میں پائیں
وہ ان میں سے کسی میں نظر نہیں آئیں۔

میں نے پچھلے سال ایک خط لکھ کر آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ وہی تشریف لائیں، تو
مجھے مطلع فرمائیں، تاکہ میں آپ کے فرزندِ ارجمند کے دولکے سے پرستش کو کچھ دیر آپ کی خدمت
میں بیٹھا کی سعادت حاصل کر دوں۔ آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: "میں نے آپ کا
پتہ یادداشت کے کتابچے میں لکھ لیا ہے۔ جب آؤ گھا، آپ کو اطلاع دوں گا۔ میری دختر کا
مکان ساؤتھ ٹیلنگر میں ہے۔ جب دہلی جاتا ہوں، تو وہاں بھی ضرور پہنچتا ہوں۔ اس

شخصیت

رات سے میں سمجھا کہ آپ ماڈل ٹاؤن کی بجائے مجھے ساؤتھ ٹیلنگ ٹریڈنگ، ہوائی سٹیل
تزیینات۔

میں ۱۲ اگست ۱۹۷۰ کو دو پہر کا کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گھنٹی بجی، تو
مے ملازم نے مجھ سے کہا: "یوش ملیانی صاحب تشریف لائے ہیں؟ میں تیسری منزل
نہ اتر اؤ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ دشوار گزار زمینے کے کمرے دوسری منزل پر پہنچ گئے ہیں۔
پ کی پٹائی عرق آلود تھی اور نہ آپ کا سانس جلد جلد جل رہا تھا۔ آپ مجھے دیکھ کر
ب لب کمرائے۔ میں غرم سے زمین میں گر پڑ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپ
قدم و بھر فرمائی کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کر دوں۔

وقت انتہائی تیز و خوب اور جس ہوا کی وجہ سے مجھ کی نہایت شدید تھی۔ آپ چھتری
ماہنیں لائے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کا ایک سعادت مند دوست تھا۔ اس عزیز نے
ایک ہم ایسٹ ٹیلنگ ٹریڈ میں اُس طرف سے داخل ہوئے، جس طرف سے یہ مکان بہت
دستے۔ میں نے ملازم سے کوکا کولا لالے کو کہا "آپ کے ذرا سے لے اسے روک دیا اور مجھ
سے کہا: "آپ ان کے سامنے ایسی چیزوں کا نام بھی نہ لیں۔" یہ سُن کر مجھے معلوم ہوا کہ آپ
اری سروبات کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔

ذیر باتیں ہوئیں۔ پھر آپ نے مجھ سے کلام سننے کی فرمائش کی۔ میں نے دوسرا لیں سنائیں۔
م کے بعد مجھے آپ کی زبان مبارک سے آپ کا بید پر لطف کلام سننے کا شرف حاصل
ڈا۔

مب آپ نصحت ہونے لگے، تو میں نے ساؤتھ ٹیلنگ ٹریڈک شایعت کوئی چاہی مگر
پ نے بہت اصرار فرما کر مجھے روک دیا۔ بہر حال میں مکان کے دواؤں سے دس بارہ
ہم آپ کے ساتھ چلا اور آداب عرض کر کے پانچ سات ہی قدم گھر کی طرف واپس چھا
تاکہ آپ نے مجھے آواز دی۔ جب میں آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے فرمایا: "میں ایک
یہاں آدمی ہوں۔ آپ میری بچھڑی، تمیں اور دھوئی دیکھیے۔ اسی طرح یہاں چلا
یا۔ میں لے گیا: "حضرت سلامت! آپ نے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا ہے۔ اب

شاعری

میں کہوں، تو کیا کہوں؟

آپ کے تشریحات لے جانے کے بعد مجھ پر دیر تک عالم حیرت طاری ہوا۔
 اگرچہ آپ کی شخصیت کے کئی پہلو ابھی تشدد تحریر شدہ گئے ہیں، مگر میں بغضاً کو قدر نظر
 رکھتے ہوئے یہیں قلم کی مددائی مدد دینے پر مجبور ہوں۔ آئندہ صفحات میں آپ کے کمال
 شعوری کا جائزہ دیا جائیگا۔

۲۔ شاعری

حکیم رکن التبیح کا شی اپنے زمانے کا بہت بڑا حکیم و طبیب، بہت بڑا عالم اور بہت بڑا
 شاعر تھا۔ اس کے تعلق کہا گیا ہے کہ اس کی حکمتِ طبیعت پر اور شاعری حکمت اور طبیعت
 دونوں پر پردے ڈالے رہی۔ جامع کمالات حضرت ابو الفصاحت بھی کمالِ جامعیت
 کے اعتبار سے عہدِ حاضر میں منفرد ہیں، لیکن آپ کے کسی ایک کمال نے دوسرے کمالوں
 پر پردہ نہیں ڈالا۔ آپ کی طبیعت، زبانِ ادبی اور شاعری بدرجہ غایت تابانہ و درخشاں
 نظر آتی ہیں، اعدیہ ایسا محسن اتفاق ہے جس کی شائیں دنیا سے علم و فن میں بہت ہی
 کم ملتی ہیں۔

طبیعت اور زبانِ ادبی کا تعلق اکتسابی ہے۔ ان میں کمال پیدا کرنا مشکل و ضرور ہے لیکن
 و خواہ ہرگز نہیں بشرطِ حصولِ مقصد کے لیے عرق ریزی اور جانفشانی میں زرا کمی کر دے
 اٹھا رکھی جائے۔ ان کے برعکس شاعری اکتساب سے نہیں آتی۔ اس کے سرانجام ہونے
 کی اساس خداداد ہوتی ہے۔ یہ دیکھی سے سیکھی جاسکتی ہے، اعدیہ کوئی سکھا سکتا ہو۔ محض
 الفاظِ نظم کرنا سیکھ لینے یا سکھا دینے کو شاعری سیکھ لینا یا سکھا دینا نہیں کہا جاسکتا۔
 حضرت ابو الفصاحت کا ملکہ شاعری وہی اور عطیہ الہی ہے۔ آپ نے اعدیہ شاعری کو
 محسنِ محفلِ ادب محسنِ بیان کے لحاظ سے جس مقام پر پہنچا دیا ہے اس کی برتری آپ کی
 مختلف الانواع استعداد میں غنی کوئی کمی تھی۔ اگرچہ آپ نے حضرت فصیح الملک
 کی شاعری پر ہمیشہ فرمایا ہے۔ مگر دراصل یہ تعلق برائے نام ہوا۔ آپ کا معنوی اثر لا

شاعری

فیاض تھا اور ہے۔ آپ بجا طوطے کہہ سکتے ہیں:

ہرچہ درمبدار فیاض بود، آن من است
گل جذا ناشدہ از شاخ بدایان من است (غالب)

حضرت فصیح الملک کا ذکر آگیا ہے تو میں اُن کی سخن سرائی کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔
۱۔ مقدمہ شعر و شاعری میں وہ جگہ لکھا ہے:

۱۔ "ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا پتھارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے، مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرے کی غولبی میں اَدل سے آخر تک لکھا ہے، لیکن اُس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں زبان کی صفائی اور روزمرے کی پابندی اور محاورے کی بہتات کے علاوہ طرزِ ادا میں ایک شہسواری اور شکلیا پن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے۔"

۲۔ "ذوق، ظفر اور خاص کو داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانک پن پیدا کر دیا ہے۔"

۳۔ حضرت فصیح الملک کے دو ادین کا مطالعہ پہلی بار بارہ سال کی عمر میں کیا تھا۔
وقت مجھے معلوم ہوا کہ فصیح ترین اور دوزبان ایسی ہوتی ہے۔ حضرت موصوف کا مطلع ہے۔

دیکھیں عجب ادائیں اُس شوخِ سیم تن میں
اک ٹیڑ سا دلی میں اک سید مر با بکچن میں

۴۔ دوسرے مصرعے کا انطباق انھیں کی طرز بیان پر ہوتا نظر آیا۔

۵۔ یہ ہے کہ جہاں اُن کے فصیح و بلیغ کلام میں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں اس پاکت، عریانی اور اجتہاد بھی کم نہیں ہے۔ شاعر کا میلان طبع اپنے معاشرے سے جوڑے بغیر نہیں رہتا۔ حضرت فصیح الملک کے زمانے میں، کاکت، عریانی اور اجتہاد

شاعری
قابل اعتراض نہیں سمجھے جاتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اچھے لوگ
پیتے لوگ متقابل ہونے کے باوجود زبانِ بزاری سے معاشرت کرتے تھے، جس کا علم اُن
کے اقربا اور حکومت کے اربابِ نظم و نسق کو ہوتے ہوئے بھی انہیں اس روش سے باز نہیں
رکھ سکتا تھا۔

حکیم مومن ایک مریضہ کی بغض دیکھتے وقت اُس پر عاشق ہو گئے اور انہوں نے اپنے
اس معاشرے کے موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی۔ اس میں ابتدا سے عشق کا واقعہ یوں
بیان کیا گیا ہے:

کیا نگاہ دستِ دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
اسی طرح نواب مصطفیٰ خاں سرتی و شفیقہ نازول کی ایک رنڈی رجمو نامی پرشیدہ تھے۔
انہوں نے اپنے تذکرے گلشنِ بختار میں اس کا ذکر بڑی بیباکی سے کیا ہے۔
حضرت ضیاء الملک کی مثنوی فریادِ غم میں اس کے معاشرے کا نقشہ ہے، بارہا شائع
ہوئی اور ترز بانا اور شیریں بیانی کے باعث انتہائی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ اُن کی
معشوقہ کلکتے کی ایک رنڈی مئی جان حجابِ قلعہ تھی جس کے جبر و جمل کی کیفیت انہوں
نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس معاشرے کے زمانے میں ان کی عمر ۵۰ سال کے لگ
بھگ تھی۔ انہوں نے حجاب کے قصے کی تعریف یوں کی ہے:

۱۔ وہ چمکتی ہوئی کمر آ آ
وہ چمکتی ہوئی نظر آ آ

۲۔ رقصِ طافس باغ سے اچھا
شوقِ طاعتِ دانغ سے اچھا

اور تو اور انہوں نے وفات سے چند سال پہلے اُسے کلکتے سے حیدر آباد بلایا اور اس سے نکاح
کرنے کی ٹھان لی۔ اگر اُن کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم اور اماد نواب سراج الدین احمد
سائل دہلوی کی طرف سے متواتر در اندازیاں نہ ہوتیں تو سترے بہترے قوہِ ضیاء الملک
بہادر نظام کی اجازت سے دو پہلے ہی حاصل کوئی محو تھی، اسے خود اپنی بیگم بلالیتے۔
امیر مینائی نے جو مولوی مفتی اور دارالافتاء کے صدر تھے، غالباً زبانِ بزاری سے عشق

جے ہنسا فی کی شکایت کیا کریں انتخابِ بکلام
تو بہ کر سکتا ہوں، لیکہ کیا کروں لب و لہجہ داری بھی اک الوام ہے
پاد سانی بھی بہت بڑا م ہے

جلئے اے فلک، تو نے چھا خزاہ و انجسہم بھی
بلا کا ہے اندھیرا پھر بھی تیرے شاطی میں
اٹھیں گی اٹھیاں اے خوش! ہر اک درم میں تم
چلے گا پاد سانی کا نہ سگہ اس زمانے میں
ہم ماہِ شریں چل نہیں سکتے کوا کے ساتھ رہتے ہیں آدمی کی طرح آدمی کے ساتھ
چہرے کا کس قدر ہیں محبت کے سلسلے دور و ز بھی نہیں کسی کی کسی کے ساتھ

غدا ہی قسم ہے، غدا ہی قسم صداقت تو یہ ہے، صداقت نہیں
ہست ہیں چھن آشتیاں کے بے غدا ہی کسی کی وراثت نہیں

تاسکا کوئی بسی کا مدعا نہ ہے خدا پرست بھی کہنے لگے، خدا معلوم
فہمے کے مسائل و چہیز، اے خدا! مری نظریں تو معلوم بھی ہے نامعلوم
دُخواں تو دو دُخواں تھا، لیکن ہم محفوظ آتے
نوکس گل کے آتے ہی پر لوٹ بھی گلو ادوں میں
بول گلوے فصل بہاری! کہتے ہیں تو کہتے دے
لیکن یہ ناکید ہے تجھ کو گل نہ بھلیں گلو ادوں میں

بھگوا آج بھی ہے کل جو تھا سلیخ و برہن میں
نقتے رات دن پیدا کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
یہا ہے غدا ہی آنکہ ہر میرا کے حق میں
مگر آئندہ خود پیدا کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

پی لوگے تو، اے شیخ! ذرا گوم رہو گے
 ٹھنڈا ہی نہ کوہیں تھیں جنت کی ہوائیں
 وہ غلط بھی کچھ کہیں گے، تو وہی بجار بیگا
 جو کل گیا زبان سے، وہ کھل گیا زبان سے
 شوقی صبی نے کہیں کا بھی نہ دکھا ہم کو
 درود زخ پہ رو کے گئے، جنت کیسی
 میں نے کہا تو یہ تھا کہ تقصیر و معاف۔

اس کے جواب میں بڑھاپا کچھ نہ پوچھے
 سہ پردہ نشیں! دیکھو یہ دن رات کچھ
 میں گڑ تو نہیں ہوں، ترے کوچے کی زیریں کا
 باتوں میں جو کچھ میں کہہ کر گیا
 تنہا کے زمانے سے کیا بات ہے

مجھے آپ کے اس بیان سے اختلاف ہے۔ ان اشاری زبان حضرت فصیح الملک
 کے عمومی لہجہ کی زبان سے نہ درایتی ظاہر ہے، بلکہ یہ زبان ان کے اور یہ بیان آپ کے اپنے
 ہی ہیں۔ غزل کی زبان محدود ہوتی ہے اور شاعری اس محدود زبان کے استعمال کو نہ
 پر مجبور ہوتا ہے جس سے مشابہت کی وجہ سے سوتیلی بھی آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے
 آپ نے جو شہادت میں اگر مندرجہ بالا جملے لکھے ہیں، حضرت فصیح الملک نے
 پہلی جو شعر و سخن میں اپنے اتاد ذوق سے منزلوں آگے نکل گئے تھے، چرلغ سحری ہو جانے
 کے زمانے میں لکھ دیا تھا:

یہ بہار د آغ ہے کھڑا اور بہار میری
 ذوق کہتے ہیں بہار، انیس اس اتاد کا

ذوق اور حضرت فصیح الملک کا کلام ایک دوسرے سے جتنا مختلف ہے، اس کے بیان
 کی ضرورت نہیں۔ بہر حال ان خواجہ صاحبین سے حضرت فصیح الملک اور حضرت

شاعری
ابوالفصاحت کی احساس شناسی اور محسن پرستی کی وہ شریفانہ صفت ظاہر ہوتی ہے جس کا عہد حاضر میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ آج کل ایسے لوگ بکثرت ملینگے جو استادوں سے سالہا سال اصلاح لینے کے باوجود اپنے آپ کو ان کا شاگرد ماننے سے مطلقاً انکار کر رہے ہیں۔

حضرت ابوالفصاحت خدا کے گھر سے پاکیزہ طبعی لے کر آئے ہیں اس لیے انھیں شرافت اور شائستگی کا ہمیشہ خیال رہتا ہے جس طرح ان کی زندگی تہذیب و طہارت کی مثالی زندہ گئی رہی ہے، اُسی طرح ان کا عاشقانہ کلام بھی اول سے آخر تک افلاطونی معیار عشق کے مطابق تمام کمزوریاں سے مبرا اور متحرک رہا۔ آپ نے اس جام دستان کی بازی میں کبھی مات نہیں کھائی، بات یوں بھی جاسکتی ہے کہ وہ تلوار کی دھار پر چلنے رہے مگر پاؤں کو گز نہ پہنچنے دیا۔

انھوں نے غیر فصیح الفاظ و تراکیب ترک کرنے کے ساتھ ہی ناشائستہ، خلاف تہذیب و عوامی ایک اور مقبذ مضامین بھی جو اردو و غزل میں عائد الزم ہیں اپنے دائرہ کلام کے اندر نہیں آنے دیے۔ میں یہاں اس قسم کے مضامین کا ذکر کرنے کے ساتھ حضرت فصیح الملک کے اشعار سے جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، مثالیں بھی دوں گا۔

بوسہ اور بوسے:

دل کی قیمت ایک بوسہ ہے صنم	آگے جو آئے ترے ایمان میں
میں رُخِ نازک پر گنتی کے نشان	کس نے بوسے تیرے گن گن کیے

سینہ:

یہ سیر ہے کہ دوپٹا اڑا رہی ہے صبا	وہ جب چھپاتے ہیں سینہ، کمر نہیں چھپتی
-----------------------------------	---------------------------------------

کس طرح لیکھا بلائیں کوئی اسودہ خاک	کچھ نہ پہنچے ترے گیسو جو کمر تک پہنچے
------------------------------------	---------------------------------------

زلف:

جال زلف سیاہ نے مارا	تیرا کافور گھاہ نے مارا
----------------------	-------------------------

گیسو۔

تم کو آشفۂ مدھوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کوڑیٹھ موندے گیسو
جو بن:

ادھو بن یہ قیامت کی جو انی آتی
ہاتھ میرا جو ترے سینے پہ اکڑ
ہم آغوشی!

شوق میں ایک فتنہ قیامت کے
ہم گلے مل گئے قیامت کے
عروانی:

بڑا ہی لطف ہو خلوت میں ہوں لڑائی کا
ہمارا ہاتھ سینے پہ تھا اور ہاتھ گود
رکاکٹ:

تم کو ہے وصل غیر سے انکار
اور جو ہم نے آکے دیکھ
ابتذال:

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شمار
ہر جانی معشوق:

سو گھر وہ پھر کرتے ہیں اس گھر سے نکل کر
کیا پاؤں نکالے دل مضطرب سے
بدکردار معشوق:

کیا رہیں ہم کہ ترا چال چلن
پاس رہ کر نہیں دیکھ جاتا
بے وقور معشوق:

نکل کر تم کو آغوش سے اس حال کو پہنچے
کہیں سے پہلے یاد اس کہیں سے کیا
مڑے کا حکم:

مر گیا میں تو نہ سمجھ کر بلا سے چھوٹے
بندہ پرور! یہ محبت ہے محبت
خلو:

عکس بھی لکھتے ہیں چار گھروں بعد آیا
بڑھ چھٹی حد سے سوا ان کی نزاکت
بے غیرتی! لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزاد ایسا کب تک؟ (دو)

شاعری
اس سے ظاہر ہے کہ آپ کا تفریل ردایتی ہونے کے باوجود کس حد تک مدحت مستحق ہے۔
حضرت فصیح الملک کے متبادشاگردوں میں سے کسی نے اس قسم کے اصلاحی اقدامات نہیں
کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ابتذال اور رکاکت کی بھرا دسے ناکام
ادب کو قیادہ ہو کر رہ گیا۔

حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کے متعلق ابنِ خلدون کی بحث سے مستفاد ہوتا ہے کہ انشا پر دازی کا
ہنر نظم و نثر میں صرف الفاظ سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ الفاظ اصل ہیں اور معانی ان کے
مائع۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، اس لیے ان کے لیے کسی ہنر کا کتابتاً کوئی
ہنر نہیں۔ اگر ضرورت ہے، تو اس امر کی کہ معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے الفاظ
کو پیرا اور پانی سمجھو پانی کو چا ہوسونے کے پیراے میں بھر لو اچا ہومٹی کے پیراے میں پانی
کی ذات میں کچھ فرق نہیں آئے گا، مگر سونے کے پیراے میں اس کی قدر بڑھ جائیگی۔ اگلیج
معانی کی قدر ایک فصیح کے بیان سے بڑھ جاتی ہے، اور غیر فصیح کے بیان سے گھٹ جاتی
ہے۔

حضرت ابوالفضل احمد کے ایک شعر سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ آپ حسنِ بیان کو پہلے
دیکھتے ہیں اور حسنِ تخیل پر بعد کو غور کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے۔
مقدم جانتے ہو، جوش، اتم اک حسنِ معنی کو
مگر ہم دیکھتے ہیں شعر میں حسنِ بیان پہلے

آپ نے مجھے ددال گفتگو میں بتایا کہ شعر میں حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا امتزاج بحدہ دمسالہ
ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ارشاد کیا کہ میں صرف زبان کے خزانے کو دیکھ کر ادعا نہیں سمجھتا۔
میرے نزدیک زبان اور بیان کی خوبی کے ساتھ مضمون بھی عمدہ ہونا چاہیے، جو شعر نقل کیا
گیا ہے اس کے مخاطب دراصل جدید شاعری کے علم بردار ہیں جو علمِ بیان سے قطعاً ناواقف
ہونے کے باعث اپنے خیالات کے اظہار کے لیے خلافِ عمل الفاظ استعمال کر کے شعور
اہمال پیدا کرتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ جہاں عمدہ اسلوبِ بیان کے بغیر عمدہ
اپنی جگہ دیک نہیں دکھا سکتا اور بہت مضمون میں ملندی نہیں آتی، اہلِ محض عمدہ

شاعری

اسلوب بیان پر شعر کی خوبی کا انحصار نہیں ہوتا۔ سعدی نے خوب کہا ہے:

جامد از دینقی و دیبا نسترد بر عروس نازیب

آپ کا سارا کلام پڑھ لیجئے جن تغزل اور حسن بیان ہر جگہ شیر و شکر نظر آئیگا اور وہ میں نہایت قابل تعریف قدرت اور جدت ملیں گی۔ اور د شاعری میں اس کی ابتدا اب تک مضمون کے بیان پر سبھاری اور بیان کے مضمون پر پوچھل ہونے کی مثال دیکھنے میں آتی ہیں جن سے انھیں شعر کو شدید رنگ و نہ پہنچا رہا اور پہنچا ہے۔ آپ میں یہ قباحات کہیں نہیں پائی جاتی۔ آپ کا ذوق سلیم اور وجدان صحیح شعر کو رٹا ڈھالتا اور کانٹے میں تولتا ہے اور اگر اس میں کہیں ذرا بکلی کو کرکسرہ جاتی ہے آٹک کر دینے میں ذرا بھی مضائقہ نہیں کرتا۔ آپ قوت متخیلہ کو ہمیشہ قوت میسرہ دیکھتے ہیں اور یہ ایسی بات ہے جو دنیا کے بڑے بڑے سحر نگاروں اور معجز طراز اور کسی سے نہ ہو سکی۔

آپ کو مضمون اور بیان دونوں کی بے جھجکی اور نامموراری سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ فرماتے ہیں:

مجھ سے کس بات پر اچھینکے جو لیغان سخن!

میں نے الجھا ہوا مضمون بھی باندھا ہی نہیں

دو چہلہ مضمون سے ایسا مضمون مراد ہے جس کا سر رشته گم ہو اور جو کوشش دکا و شرہ سمجھ میں آئے بعض لوگ ایسے بے سرو پا مضامین بیٹھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کیا ہوتی۔ ہا ہو میں ایک شاعر نے فصاحت اور بلاغت کے موضوع پر گفتگو مجھ سے کہا کہ فصاحت یعنی قافیہ و اول اور بلاغت پنجابیوں پر ختم ہے۔ وہ حضرت سے بے خبر تھے کہ فصاحت کے چراکان ہیں ان میں ایک رنگد بلاغت بھی ہے حضرت ابوالفصحا حمید بلند سے بلند مضمون ایسی سادگی اور صفائی سے باندہ شعروں میں پہلے المصباح کی صفحہ میدا ہو جاتی ہو۔ غالب بھی جن کے کلام کا بقدر حصہ فادیت اور غفقات کی وجہ سے اردو اور ترے کے مطابق نہیں رہا،

شاعری

فصیح شعری کو بلیغ سمجھتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان کو حضرت فصیح الملک کا یہ شعر بوجہ پسند تھا۔ اسے بار بار پڑھتے اور دہرہ کرتے تھے،

اس کے جلوے کا تو کیا کہنا مگر دیکھنے والے کو دیکھا چلے
سادگی (جس میں تکلفی اور بیاضی شالی ہیں) کے متعلق آپ کا ارشاد ہے:

شعر میں یہ سادگی لے جوش پھر یہ دلکشی

آپ کی بے رنگیاں بھی رنگ ہیں تصویر میں

مگر آپ جس سادگی کے حامی ہیں وہ فصحا کی زبان کی سادگی ہے۔ آپ نے اس سادگی کو چاہا
سادگی سے کبھی خلط ملا نہیں ہونے دیا۔ یہی خوبی آپ کے روزمرے اور محاورے کے استعمال میں ہے۔

آپ تشبیہ اور استعارے کو مودس سخن کا زیور تسلیم کرتے ہیں مگر اس پر ضرورت سے زیادہ
زیور کا بار ہرگز نہیں ڈالے یعنی زیور کے حسن کو قبح نہیں ہونے دیتے۔ آپ کی تشبیہوں اور
استعاروں میں کہنگی اور مفرودگی کی بجائے مازگی اور نوکداری ہوتی ہے جس سے زبان اور
بیان کا میدان وسیع اور پُر جہاد ہو جاتا ہے۔ آپ کے نزدیک بدست زبان اور چست بیان
شاعری کے لوازم میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اکی بنا پر آپ نے فرمایا ہے:

زبان درست، بیاں چست جب نہیں لے جوش!

وہ شعر کیا بوجہ غزل کیا، وہ شاعری کیا ہے؟

آپ صاف، سلجھا ہوا، فوراً سمجھ میں آ جانے والا اور پُر لطف شعر پسند کرتے ہیں۔ شعری
سادگی، صفائی، سرسبز لفظی اور لطف انگیزی کے باب میں آپ نے ذوق اور حضرت
فصیح الملک کی روایات صرف برقرار رکھی ہیں، بلکہ انہیں نکھا کر اور زیادہ چمکایا ہے۔

تہذیبی جن کا نام اہل فن کی اصطلاح میں ایجاد ہے اسے اخلال بھی کہتے ہیں۔ اس میں یہ
ہوتا ہے کہ شاعر مضمون شعر کے بیان میں کچھ ناطق نقطہ مقدر رکھ دیتا ہے، یا جو بات کہنا
چاہتا ہے اسے سچ دے کر ایسے سلیقے سے کہتا ہے کہ شعر میں گہرائی پیدا ہو جانے کے علاوہ
حسن بیان میں بھی بہت اضافہ ہوتا ہے۔ یہ انداز کلام فارسی سے اردو میں آیا ہے، جسے

شاعری

میر و سودا نے کم اور غالب، امون، شبلی و ساداتی نے بہت فروغ دیا۔ ایجا
حضرت نصیح الملک کے کلام میں بھی ملتا ہے مگر وہاں اس کی ایک مناسب حد معین ہے
سے شعر کے سرخیل الفہم ہوئے ہیں غزل نہیں پڑتا۔ میں ایک سیدھے سادے اور تہدار
کی وضاحت کے لیے ایک شعر حالی کی جدید غزل سے جو ان کی قدیم غزل کے برخلاف
سے بالکل خالی ہے اور ایک شعر نظیری کا پیش کرتا ہوں:-

تیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنو سار میں
فخر ہو نہ ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص (حالی)

صد قرن بر محبت لیے گزشتہ است
بے داد بر قسیدہ مجزوں نگر دس (نظیری)

ان دونوں شعروں کا مضمون متحد اور انداز بیان مختلف ہے جس سے دونوں کے م
زمین اور آسمان کا فرق ہو جاتا ناگزیر تھا۔

چند سال پہلے پنجاب سے باہر کی ایک یونیورسٹی نے مجھے اُن امیدواروں کی قابلیت
کرنے کے لیے طلب کیا جنہوں نے اردو فکری کی اساتذہ کے لیے درخواستیں بھیجی تھیں
ساتھ ہی وہ شخص اسٹوڈیو لینے کی غرض سے دکھائیے گئے۔ اُمیدوار پانچ تھے۔ ان میں:-
پی ایچ ڈی تھے اور تین کے پاس ایم اے فرسٹ کلاس کی ڈگریاں تھیں۔ میں نے ا
کے لیے فردا فردا کی بجائے سب کو ایک ساتھ بلایا اور انہیں دو شعر لکھوا کر ان کا م
بیان کرنے کی غرض سے پانچ منٹ کی مہلت کا اعلان کر دیا۔ شعر یہ تھے:

کیونکر مجھے گناہ زلیخا یقین آئے
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز (امون)

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی (حالی)

مجھے تحریری جواب ملے تو میں نے دیکھا کہ دو امیدواروں نے دونوں شعروں کی توجہ

شاعری

نثر کو دی تھی اور تین سے اتنا بھی نہیں ہو سکا تھا۔ خیر میں نے ان سب کی آگاہی کے لیے
مومن کے شعر کا مطلب انتہائی اختصار سے کام لے کر بتا دیا، جو یہ تھا کہ عاشق یوسف کو
لجواظ حسن معشوق سے کمتر اور خود کو بہ اعتبار عشق ذلیل سے برتر سمجھنے کے باعث یہ باور ہی
نہیں کر سکتا کہ ذلیف کا عشق میں اس کے اپنے عشق سے زیادہ رلودگی اور بے اختیار
تھی، جس کے باعث اُس نے یوسف کا دامن لسی دیکھی سے پکڑ لیا کہ وہ کش کش میں
بھٹ گیا۔

جو اشعار تہدار ہوتے ہیں ان میں ایک شق پہلو دار یا ذو معنی کہلاتی ہے مثلاً

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالب)

پہلوان سخن فہموں کے قحط میں جو گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی جاتا ہے، شعر میں اتنی ہی تہدار اور
انتاہی پہلو متقن ہے جو مطلب کے سمجھنے میں اشکال پیدا نہ کرے۔ مثلاً

اب وہ یہ کہ رہے ہیں مری مان جائے

اللہ تیری شان کے قربان جائے (داغ)

کیا دل ہو بعد مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد

بھولے نہیں کہ تجھ کو بھولایا نہیں ہنود (حالی)

عبد محمد شاہی میں ایک نوداد و ایرانی شاعر نے خان آرزو سے کہا تھا کہ شعر دو قسم کے ہوتے

ہیں:

(۱) با معنی اور (۲) یعنی۔ یعنی سے اُس کی مراد بے شعر ہے تھی جس کا مطلب نیم میاں لہو
نیم نہاں مواد جس کی شرح کرتے دقت لفظ یعنی استعمال کو ناچارے۔ یہ سُن کر خان آرزو
نے کہا کہ ہم قہم یعنی کے شعر کو لایم سمجھتے ہیں۔

حضرت ابوالفصاحت کے کلام میں جو تہدار اشعار دیکھے جاتے ہیں ان میں سے کسی میں ایسی
تہدار لایا پہلو نہیں ہے جو فصاحت کا محتاج ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ایسے
اشعار میں معنوی غور رکھتے ہیں لیکن اس تک پہنچنے میں دشواری پیدا نہیں کرتے۔

شاعری

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابراہیم صاحب نے ناشائستہ اور مغربِ اخلاق مضامین سے غزل کو پاک کر دینے کے ساتھ ہی اس میں بتقا ضائے وقت بہت سے نئے مضامین داخل کر کے اس کا میدان بہت وسیع کر دیا ہے۔ نفسیاتی تجربات اور دروں بینی کے نتائج جتنے آپ کی نظر میں آتے ہیں، انہیں نہیں پائے جاتے۔ یہی کیفیت حکمت و دانش، عرفانِ ذات، و عرفانِ دغیر سے متعلق مضامین کی ہے۔ اگرچہ آپ نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی قادر الکلامی کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں، لیکن غزل آپ کی محبوب صنف رہا ہے۔ آپ اپنے تغزل کے متعلق فرماتے ہیں:

کیوں تغزل کا نگہاں نہ ہے فنا میرا

یہی پوچھی ہے مرئی اور ہوا دھن میرا

چونکہ نظم ایک مکمل اکائی ہوتی ہے، اس لیے اس کے جتنے جتنے اشعار سے شاعر کے خیال کی ابتدا ارتقا اور انتہا بتدریج معلوم نہیں ہوتی اور پوری تصنیف سے لطف اندوز ہونا محال ہو جاتا ہے۔ نظریات میں ممتاز نظموں کا متن نقل کرنے کی بجائے ان کے عنوان کھدو گنگا جالی، آدھ اور مکمل کی نظموں کو چھوڑ کر اکثر لوگوں کی نظموں میں ربط اور تسلسل نہیں پایا جاتا جس کا باعث مجز طبع کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کی نظمیں مربوط، مسلسل، فصیح، بلیغ اور تاثیر آفریں ہوتی ہیں اور انھیں خوبیوں نے ان کو مقبولِ خاص عام کر دیا ہے۔

رباعی نظم میں تو شمار نہیں ہوتی، لیکن اس کے چاروں مصرعوں کا قوام ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک اکائی مقصود ہوتی ہے۔ میری نظر سے ایسی رباعیاں بکثرت گوری ہیں، جن کے پہلے دو مصرعے پچھلے دو مصرعوں سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑا نقص ہو۔ آپ نے جتنی رباعیاں لکھی ہیں، ان میں چاروں مصرعوں کا ربط حد انتہا کو پہنچا ہو مگر یہ اور چوتھا مصرعہ بالخصوص ایسا دردناک ہوتا ہے کہ اس سے پہلے تینوں مصرعوں کو پر دے پڑے پر دال لگ جانے ہیں۔

اگرچہ تاریخ گوئی نفسِ شاعری سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن ریضِ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اچھا اور بُرا کچھ لکھنا اور اسے عمدہ اسلوب سے نظم کرنا غیر شاعر سے ہو سکتا نہیں۔ تاریخیں تقریباً تمام مائے نے لکھی ہیں، لیکن ان میں ایسے کم ہی تھے جنہوں نے تاریخ گوئی میں مکمل دکھایا۔ حضرت فصیح اللہ

شاعری

بھی عہدِ فرین شاعر ہونے کے باوجود بچے تاریخ گو نہیں ٹھہرتے۔ انہوں نے اپنے شاگرد احسن مارہروی سے اپنی سوانح عمری جلوہء دماغ لکھوائی اور خود اس کی حداثہ طبع یوں کہی۔
زندگی کے مری آج نے سوانح لکھے عمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
دماغ نے مصرعہ تاریخ کہا جیتہ جلوہء دماغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
ادۂ تاریخ میں الفاظ یہ آنکھ سے ”بھرتی ہونے کے باعث بہت بری طرح کھٹکتے ہیں اور پہلے دو مصرعوں کی بندش بھی مست ہونے کے ساتھ ہی خسرو دہلوی سے خالی نہیں۔

حضرت ابوالفصاحت نے شاعری کی طرح تاریخ گوئی میں بھی اپنے اوپر چند پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً آپ تعبیہ اور تخریج کی رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، پورے مصرعے میں مادہء ناکھالتے ہیں، مادہء تاریخ کا عین مطابق واقعہ اور محل ہونا تاریخ گوئی کی شرط اول سمجھتے ہیں اور اسے نظم کرنے میں فصاحت، زبان اور لطافت بیان میں خلل نہیں آنے دیتے۔ یہ کہنے میں غدا بھی مبالغہ نہیں کہ عہدِ حاضر میں آپ جیسا تاریخ گو نظر نہیں آتا۔ میں بخوف طوالت پورے قطعات تاریخ نقل کرنے سے احتراز کرتے ہوئے صرف چند بے مثل مادہ ہائے تاریخ لکھ دینے پر اکتفا کر دنگا۔

آپ نے مزاحیہ اشعار بھی کہے ہیں جن پر مزاح کے حقیقی معنی کا اطلاق ہوتا ہے۔ مزاح ایسی بات کہنے کا نام ہے جس سے سننے والا ذہن لب لبث متہم ہو جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام بھی کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے۔ چنانچہ مزاح بشرطہ کہ مزاح ہو، شریعت میں جائز ہے۔ آج کل بیشتر نام نہاد مزاح نگار تمسخر اور ہیکلین کو جس میں ناشائستہ الفاظ اور گالی گلوچ سے بھی اجتناب نہیں کیا جاتا، مزاح سمجھتے اور اس پر ہامیوں اور برقیوں سے قہقہے لگوا کر خوش ہوتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں ایک مزاح نگار کا کلام سنا تھا، جس کا ایک مصرعہ لکھا ہوا:

یہ گلی تیرے باپ کی تو نہیں

آپ کی تمام شاعری کے متعلق خلاصہء کلام یہ ہے کہ آپ نہ صرف شاعرِ عظیم ہیں بلکہ شعر و سخن کا خارجی اور داخلی اصلاح میں بھی اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے۔ فصاحت آپ کی سخن طرازی

شاعری

کا خاص الحاح جو ہر ہے، جس سے آپ کے بلخ مضامین بلخ تر ہو گئے ہیں۔ یہ ایک شعر ہو گیا جو نقل کیے دیتا ہوں:

نصیحانِ زمین پر کام کر جاتی ہے افسوں کا
کلامِ بوالفصاحت میں فصاحت ایسی ہوتی ہے

اب نمونہ بنائے کلام مع تنقید ملاحظہ ہوں۔

(الف) تغزل

۱۔ مظلوم کی آہوں کا اثر ہو کے رہیگا

آخر تو ممکن ہے، مگر ہو کے رہیگا

شعر کے عالمگیر رد و قبول میں عقیدہ عامہ ہمیشہ بالادست رہا ہے اور رہیگا۔ سعدی کے متعدد اشعار صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک روئے زمین کے تمدن حصے پر حاکم رکھتے ہیں۔ ان میں آفاقیت یعنی عالمگیر مقبولیت کی غیر معمولی صفت پیدا ہو اس نکتے میں مضمر ہے کہ ان دونوں شعرائے اس قسم کے اشعار کی اساس انسانیت کہہ عام پر مبنی تھی۔ اگر وہ بعید از عقل مضمون آفرینی اور خلاف قیاس خیال آرائی کو۔ ان کا منتخب کلام تمام بڑی بڑی ادبی زبانوں میں ترجمہ ہو کر اقصائے عالم تک پہنچتا زہدہ جاوید ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو شعر حسن بیان کے حامل ہوگا، اس کا مضمون عقیدہ عامہ کے عین مطابق ہونے کے باوجود ہند میں تو کیا خود شاعر کے محدود ماحول میں بھی اثر انگیزی سے قاصر نہ ہوگا۔

زیر نظر شعر میں جہاں مضمون خواص و عوام کے غیر استدلالی مطلقوں سے پوری رکھتا ہے، وہیں حسن بیان کی بھی معجز نمانی سے کم نہیں ہے۔ مشہور رکھادت: ہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں، اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ حضرت بوالفصاحہ اس مضمون کے صرف ایک پہلو کے بیان میں سید زہدہ بھڑا ہو۔ میں اس کی دوگو پر تبصرہ کرنے سے پہلے ایک فارسی شعر نقل کرتا ہوں:

بترس از آہِ مظلومان کہ ہنگامِ دعا کو کون اجابت از در حق بہر استغیا

شاعری

شعر کے عمدہ ہونے میں کلام نہیں۔ اس کی ساری خوبی کا دار و مدار اس جہت طرازی پر ہے کہ خود احباب دعا کے استقبال کے لیے آتی ہے۔ شاعر کا مقصد ظالم کو ڈرا کر ظالم سے باز رکھنا ہو، مگر اس کی جدت طرازی سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کوئی ظالم ایسے ادعا سے کہ ادھر مظلوم نے بد دعا کی، اور ادھر احباب اس کے استقبال کے لیے درخت سے چل پڑی، ہرگز نہیں ڈر سکتا۔

حضرت ابوالفصاحت نے شعر میں دو گونہ معنویت یہ رکھی ہے کہ ظالم کی تحریف اور مظلوم کی تسکین کا اہتمام بیک وقت کر دیا ہے جہاں ظالم کو تینہہ کی ہے کہ اسے ظلم کی سزا ضرور ملے گی، چاہے ایسا ہونے میں کچھ دیر لگ جائے، وہیں مظلوم کو بھی دلاسا دیا ہے کہ اس کی آہوں کے موثر ہونے میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن ان کا اثر ہو کے رہے گا۔

حکیم ارسطو طالیس نے کتاب بوطیقا میں بلاغت کا انحصار الفاظ قلیل اور معانی کثیر پر رکھا ہے، جس کے مصداق اسی قسم کے بلیغ اشعار ہو سکتے ہیں۔ پھر پہلے اور دوسرے مصرعے میں ایسا قوی ربط اور امتزاج ہے کہ پورا شعر ایک مصرعہ یا ایک جملہ معلوم ہوتا ہے اور پڑھنے وقت طبیعت ایسا محسوس کرتی ہے جیسے کسی قدر اندازنے کی امان کی ایک کشادہ سے دوتیر چھوٹے ہیں جن کی سننا سٹیں باجمہل کو ایک آواز کی طرح کان میں آتی ہیں۔

فصیح البیان شاعروں کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ نظم بقدر امکان شعر سے قریب رہے۔ حضرت ابوالفصاحت کا کمال قابل دید ہے کہ آپ نے یہاں نظم و شعر کا فرق یکسر مٹا دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس نظم کو شعر میں تبدیل کرنا چاہے، تو اس کی سعی تحصیل حاصل ہونے کی بجائے کہ شعر کے الفاظ کی ترکیب غوی نظم و شعر میں یکساں ہے۔ ہر وزن شعر، قافیہ اور ردیف کی قیدوں کے باوجود ایسا فصیح شعر اور وہ بھی مطلع کہ دنیا جس میں ردیف کی تکرار سے دعوے کی توثیق مکر رہوتی ہے حسن ابلاغ کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔

۲۔ یہ غلط ہے، اب وہ یاد آتے نہیں

خود فراموشی انہیں کی یاد ہے

ہر حق تحقیق کی طرح شعر کی عمر کے بھی تین درجے ہیں: عمدہ، عمدہ تر، عمدہ ترین۔

شاعری

جو شعر آخری درجے کی سطح سے بھی بالاتر ہو جاتا ہے اسے شعر کی اصطلاح میں
ہیں۔ کسی کا عجاذہو نا اس امر پر موقوف ہو کہ وہ سننے والے یا پڑھنے والے کی طلب
غیر معمولی یا غیر معمولی انقباض یا غیر معمولی استعجاب پیدا کر دے۔ میں یہ
دیر تک غرق حیرت رہا۔ اردو کے اکثر دہشتہ دواویں میں اس کتبے کے اشعار بہ
ہیں۔ یہاں عاشق نے اپنی مدامی خود فراموشی کو معشوق کی دائمی یاد سے تعبیر کر
نفسیاتی لکھنے کی شرح کر دی ہے کہ جب عاشق خود فراموشی کے عالم میں اپنی ذات
احساس سے محروم ہو جاتا ہے تو معشوق کی یاد اس ناسل شدہ شعور کی جگہ لے لیتی
یہ شعر ذوقیات اور وجدانیات کے عالم سے تعلق رکھنے کے باعث ایسی نفاست ا
کا پیکر بن گیا ہے، جن کا معرض اظہار میں آنا ممکن نہیں اس لیے میں قوت متخیلہ
کے سن لامحدود کو محدود کر دینے کی غلط کوششی سے اعتراف کرتا ہوں۔

میں نے ۱۹۲۵ء میں اپنے ذاتی مطالعے کے لیے تیسرا غائب، موحن، شیفتہ، حالی ا
دواویں کا انتخاب نہایت سختی سے کیا تھا۔ اسے ایک ماہ تک زیر غور رکھنے اور مطالعہ
کے مطابق جانچنے کے بعد مجھے بہت سے اشعار اسقاط کر دینے کی ضرورت محسوس
ہو جا رہا تھا۔ رہا ہے مزید کاٹ چھانٹ کی گئی۔ اگرچہ اس آخری انتخاب میں ہر
کچھ رہ گئے، مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ باقی ماندہ ہر شعر عجاذہ تھا۔ اگر اس زمانہ
پر شعر لیا جاتا، تو میں اسے بھی انتخاب میں شامل کر کے بطور تعلیقی حاشیے پر لکھ
معشوق کی دائمی یاد کا مضمون ساکت شاگرد غالب نے بھی باندھا ہے۔

اس علوئے شان کی کیا انتہا

دہ کبھی اترے نہ مہریا یاد سے

اس کی ساری خوبی ”علوئے شان“ اور یاد سے کبھی نہ اترے کی صفا ہی تک محدود

۳ پہلے تو نقابی چہرے کو اکٹھیں کچھ دیکھ لی سکتی تھیں

یہ آپ نے پردہ چھوڑ دیا یا اور اک پردہ چھوڑ دیا

مضمون کے معشوق کا بے نقاب چہرہ بے انتہا ناہناک ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھا

شاعری

بکثرت شاعروں نے باندھ لیا، لیکن جیسی عمدگی سے یہاں بندھ گیا ہے، وہ شاید کسی نے اپنی مثال ہو۔

لود برق ترقی پر وہ رُو ہے بے مجالش را
(داخل خیر اذی) میریضا بکوشش برنیا انداز د نقابش را

جب وہ جمال دلفروز صورت ہر نیم روز
آپ ہی ہونظارہ سوز، پردے میں منہ پھپھکے ہوئے
شعری چار برہر جھوٹوں میں تقسیم اور حسن بندش تو حضور قابل تعریف ہے، لیکن منطق جو با انشا
شعر کش ہوئی ہے، مضمون کی خوبی اور طرز بیان کے لطف میں غفل انداز ہو گئی۔

کیوں جل گیا - تاب رخ یار دیکھ کر
(غالب) جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

یہاں قوت تخیل قوت بیزمر کے قابو سے باہر ہو گئی، معشوق کے چہرے کی تابانی کا نظارہ کرنا
مسموع بھی ہے اور ذہین قیاس بھی؛ لیکن دیکھنے والے کا سزا پا چل جائے مسموع ہے نہ تو بین
قیاس۔ اگر پہلا مصرع یوں ہوتا:

کیوں جل گئی نظر رخ یار دیکھ کر

تو تخیل میں بے اعتدالی دہوتی اور طاقت دیدار کو قصور وار قرار دینے کا جو از بھی بہم
پہنچ جاتا۔

وہے انور نہیں دیکھا جاتا
(داغ) دیکھیں کیوں کر نہیں دیکھا جاتا

اس میں کلیدی لفظ انور ہے جس سے مضمون کی صراحت ہو جاتی ہے۔

صحت البواضا صحت کا شعر کیا حسن خیال اور حسن بیان کے لحاظ سے اور کیا سادگی اور
پُرکار کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔ آپ معشوق سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔
آپ کے حسن کی نظر سوز تابانگی نقاب کی بدولت محض ہلے نام چہرہ دیکھنے تو دیتی تھی مگر
اب نقاب اُتر جانے سے میری آنکھوں پر ایک اور ایسا پردہ پڑ گیا جو قطعاً مانع دیدار ہو۔

شاعری

تیرہ چھوڑ دیا، ایک جگہ پر دہ ترک کر دیا اور دوسری جگہ پر دہ ڈال لیا کے معنی یہ تو خوں سے استغاثی ہوا ہے کہ زبانِ قلم کو اس کی تو صیغ میں اعتراف بھرنے کے نہیں۔ علاوہ بریں الفاظ کی نحوی ترتیب ایسی ہی ہے جیسی نثر میں ہونی چاہیے بالکل کمال ہے۔

۴۔ اگر رسمِ دفا ہم سے نہیں بنتی تو کیا ہم ہیں
اگر قدرِ دفا تم کو نہیں سکتے تو کیا تم ہو

۵۔ جو کہ سکیں نہ ہم، وہ کہا ہی نہیں ابھی
جو سن سکو نہ تم، وہ سنا یا نہیں ہنوز

۶۔ نہیں ہوتا کسی سے چارہ وحشت نہیں ہوتا
نہیں جاتی ہماری چاک دامانی نہیں جاتی

۷۔ ان کی حادث کہ دفاؤں پہ ہوں چیں بچیں
اپنی فطرت کہ جفاؤں کا بھی شکوہ نہ کریں

۸۔ اک اک جھگڑا اُٹھانا یاد کر لیتے ہیں وہ
اک نہ اک شکوہ نیا ایجاد کر لیتا ہوں میں

۹۔ ایک تم ہو، جو مرے دل پہ بنا دیتے ہو
ایک دل ہے جو مرے دم پہ بنا دیتا ہے

۱۰۔ اک طرف عشق، اس قدر معصوم
اک طرف محن، اس قدر متفک

شاہی

ہا اشعار میں مصرعوں کے حُسنِ تقابل نے ہر شعر کو دو شاخہ بنا دیا ہے۔ فصاحتِ زبان،
فحیدِ بیان اور مراعاتِ کلام بہت تراد ہیں۔

۱۱۔ سجدوں سے ہو بڑھ کر سر تسلیم کا جھکنا

طااعت کی جگہ میری اطاعت کوئی دیکھے

توفیق میں تسلیم درخشا کو خب زندہ داری، سُبْحِ گردانی اور سجدہ گزاری پر جو فوجت دی
اُسے وہ محتاجِ بیانی نہیں۔ سر سجدوں میں جھکتا ہے اور تسلیم درخشا کے لیے بھی خم ہوتا ہے۔
سجدوں میں اس کے بار بار جھکتے اور تسلیم درخشا میں ایک یا دو خم ہو کر ہمیشہ خم ہی رہنے سے
لوں کا فرقِ مراتب سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ سجدوں میں سر جھکا کر یا بائی بھی
سکتا ہے۔ اس کے برعکس سر تسلیم خم ہونے میں ریا کا ذرا سہا نہیں ہوتا۔ یا ایک اور دلیل
ہے، طااعت (یعنی عبادت) پر اطاعت (بر معنی عبودیت) کے قاتی ہونے کی۔ عت
عت اور اطاعت ہر دو سے لغت ہم معنی الفاظ ہیں، طااعت کی جگہ اطاعت اور اطاعت
جگہ طااعت استعمال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ حضرت فصیح الملک کا شعر
ہے

نہیں ہوتی بندے سے طااعت زیادہ

بس اب خاد کا بادِ دولت زیادہ

غرض یہ کہ ان دو نون لفظوں کے معنی میں عمل استعمال کے لحاظ سے اختلاف
کھانے کے ساتھ ہی ایک قابلِ داد خوبی یہ رکھی ہے کہ ایک طااعت کے بعد دوسرے طااعت
بشرع میں الف کے اضافے سے ایسا آجنگ پیدا ہو گیا ہے جو ستار بجھنے کے دوران میں
لرب (چندر) لگنے پر سب نواذ ہوتا ہے۔

۱۲۔ فرادنگی عشق و محبت کوئی سبھے

دیوانگی دانش و حکمت کوئی دیکھے

جواب ہوا اس حسنِ بندش اور تقابلِ مصرعین کا جو حضرت فصیح الملک کے اس شعر میں ہے۔
نیز جی اندازِ صنم کو کوئی سبھے دانشِ مردانِ خب را کو کوئی دیکھے

شاعری

۱۳۔ حال دل اک دن سنا بیٹھے تھے ہم

وہ جزا قصہ کہ اب تک یاد ہے

شعورِ انتہائی صفائی اور عینِ تہمدادی ہے۔ اس ایجا پر ہزار خطاب قرآن ہے۔
ہیں۔ قصہ بیان کرنے کے باوجود اس کے مالذوا علیہ کا دامنِ کاف اظہار کر دیتے
ہو تو ایسا بھو۔

۱۴۔ تیرا دیدار گو نہیں ارزاں

جانِ دول کے عوض گواں بھی نہیں

یہ کہنا کہ شعر میں الفاظ ارزاں اور گراں نے صنعتِ تضاد پیدا کر دی ہے اور محض
بیان کی خوبی سمجھ لینا قصورِ فہم ہو گا۔ اس بیان میں کہ تیرا دیدار ارزاں تو نہیں ہے،
جانِ دول کے عوض اسے گواں بھی نہیں کر سکتے، حسن اور عشق کا بلند ترین معیار جس مادہ
بتایا گیا ہے اس کی تعریفیں زبان سے کھڑکانا لفظی الگن ہی ٹھہرے گا۔ ایسے نصیب
اشعاعِ حضرت نصیب الملک کے شاگردوں اور مقلدوں کے کلام میں تقریباً نایاب یعنی
کیا ہیں۔

۱۵۔ سخن جو مہرباں، یہ ممکن ہے

مگر ایسا کبھی ہوا تو نہیں

پہلے مصرع میں اثبات اور دوسرے مصرع میں نفی ہے۔ نفی سے اثبات کا عدم ہو گیا
کے معنی شاعر نے امکانِ قیاس کی نفی کا اثبات یا بعد اہمیت ہم پہنچا دیا۔ اس قدر
اور بلیغ بیان کا لطف خود لینا تو ذوقِ جو جان سے ممکن اور غیر کہ اس کا اندازہ کرنا
کے لیے محال ہے۔

۱۶۔ حاجت کے لیے بھی کو کہنی کر لوں گا

پہلے دنیا کی مصیبت کے تو بے قدر دھولوں

انسان کی فطرت ہو کہ وہ دنیوی مصلحت کی ذمہ داریوں کو مقدم اور حاجت کے قرار
معرض رکھتا ہے۔ اور جب دنیا کے کام کاج کے سے ذرا کجی فرصت نہیں دیتے، تو حاجت

شاعری
 بکلمنے کی تحقیر کرنے والے سے جھجھکا کر کہتا ہے کہ پہلے یہاں کی مصیبت سے چٹکا پاؤں
 وہاں کے لیے بھی کسالا کاٹ لوں گا۔ کوہ کنی کرنا اور پتھر ڈھونا ندیوں میں جاری رہنے
 شاعر میں روزمرے کی انتہائی صفائی کے ساتھ بندھ کر ایک معمولی مضمون کو آسمان
 پہنچا دیتا ہے۔ کوہ کنی اور پتھر ڈھونے میں جو لفظی رعایت ہو اس کی بیا خشکی کا کیا کہنا!
 اس شعر کو ناموزوں لوگوں کی طرح پڑھا جائے اور دونوں مصرعوں کے درمیان وقفہ
 رکھا جائے، تو یہ شعر جو جائیگا۔

۱۷۔ کیا تو نے اپنی مرضی سے چھوڑا ہے دنیا والوں کو
 یا دنیا والوں نے تجھ کو اے تارک دنیا چھوڑ دیا
 حقیقت تارک دنیا اکثر بد بشر ہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں دنیا کا کارہ سمجھ کر ان کی طرف
 بالکل بے پروا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے بڑے معنی سوال کو فنِ مباحثہ کی اصطلاح میں
 ال منوال المقصود کہتے ہیں

۱۸۔ آپ رہے جس سے بہت بخیر
 یعنی آج اس کی خیر آگئی
 روزِ روز مرے میں خبر کا ناموت کی خبر آنے کے معنی میں استقبال ہوتا ہے۔ 'خبر رہے'
 خبر آگئی' اے حسن بیان کچا رچا نہ لگا دیے ہیں۔ روزِ روز پر لکھی قدرت آج کے
 ہے۔

مطلب کا جو تھا حرفِ ازباں پر نہیں آتا
 مطلب یہ کہ تقریر میں خاموش رہا ہوں
 'مثنوی کو تقریر کا نظم البدل' کہ بہت سے عالی رتبہ شاعروں نے قرار دیا ہے مثلاً شکسپیر
 نے ایک جگہ لکھا ہے۔
 جہاں تقریرِ شاعرت نہیں کرتی وہاں خاموشی سے کارِ برآدی ہو
 جاتی ہے۔
 بے اپنا شعر تو یہاں پیش کرنا نہیں چاہیے مگر ہزار ہزار عدد کے ساتھ نقل کیے

بلند آہنگ ہے فریاد دل کی

فغان بے صدا سے خاموشی میں

حضرت ابوالفصاح کا تقریر کرنے کو خاموش رہنے کے معادی ثابت کر دینا اور لفظاً
کا دوسری میں استعمال کرنا قوتِ تخیل اور قوتِ بیانہ کے عمدہ ترین معنوی اور لفظی تصرفات
کی نادر مثال پیش کرتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان تصرفات کی بدولت مضمون میں
ایک انوکھی جدت پیدا ہو گئی۔

۲۰۔ یارب! کبھی تسلیم نہیں کی ہیں خطائیں

تیری ہی طرح میں بھی خطا پوش رہا ہوں

خدا کے اسمائے صفاتی میں ایک اسمِ ستائش یعنی خطا پوش بھی ہے۔ حضرت موصوف نے
خطا پوشی کی صفت اپنی اور خدا کی ذات میں قدرِ مشترک ٹھہرا کر خدا سے ایسی بُری لطف
شوخی کی ہے جس کا جواب نہیں۔

۲۱۔ اس دُور میں اے شرم گنہ! خوف ہی کیا ہے؟

چرچا بھلے چرمو گا، تودہ ہو گا کوئی دن کا

بد کا دلگ کچھ مدت تک تو غروبِ بدنام رہتے ہیں، پھر امتدادِ وقت کے باعث دوبارہ ان کی
بد اعمالی کا پھر چاکر ناچھوڑ دیتی ہے اور وہ معاشرے میں اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل
کے لیے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ عوام نے جن دزدیوں کی بدلے یا مانی کے خلاف شورش کر کے
انھیں زندان کی مندر سے اُتر دیا یا کچھ وقت محبوس رہ جانے کے بعد انھیں کو بار پہنائے اور
ان کا جلوس بڑی دھوم دھام سے نکالا۔ حضرت ابوالفصاح نے انہی نال کے حاطے
پر چوٹ لی ہے اس سے زیادہ بھی طعنے خیال میں نہیں آتی۔ بیان کی لطافت ناقابلِ جہل
ہے۔

۲۲۔ ادھر تو نزع میں کم ہو رہی ہے دل کی چھین

اُدھر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صحت ہوتی جاتی ہو

شاعری

عمرہ مضمون اور مدہ بیان کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ عاشق نے معشوق کی غلط فہمی پر غور نہیں کیا کہ وہ ہال کر اسے نا فہمی اور گافانی کے الزام سے بچا لیا۔ شریعت عشق میں ایسے فعل کو من جواز و اجبات ٹھہرایا گیا ہے۔ نظیری کے شعر کا مضمون اس سے مختلف تو ہے، لیکن اس میں بھی واجبات عشق کی بجائے غری کو نظر انداز نہیں کیا گیا، کہتا ہے:

ما منفصل ز رخس بجزان ہمیش

کی آدم احترام گستاخ بودہ

۲۳

۲۳۔ وہ جھلک اپنی دکھا کر خود بھی پہناں ہو گئے
اور مجھ کو بھی مری نظروں سے چننا کر دیا

۲۴۔ وہ تو خلو خاص میں بھی جا پہنچے

چشم مشتاق مری جو تماشا ہے ابھی

اس مضمون اور بیان کی داد دے دی جائے۔ عالم تخیل کی کیفیت جس ڈھنگ سے دکھائی گئی ہے وہ بجائے خود نہایت حیرت انگیز ہے۔ یہاں فصاحت اور بلاغت کی انتہا ہو گئی ہے۔

۲۵

میں قید زندگی سے مانوس ہو چکا تھا

یاد رہی رہائی کس جرم کی سزا ہے؟

جرم کی سزا میں جرم کی نوعیت کے لحاظ سے قید بے شکقت بلکہ خفت و قید با تعینت و قید با تعینت کا فرق ہے۔ یہاں قید رہائی سے رہائی جاتی ہے جس سے رہائی پانے کا ہر قیدی آزاد و مند رہتا ہے۔ یہاں قید رہائی سے رہائی کو کسی نامعلوم جرم کی سزا سمجھ کر خلا سے شکایت کی ہے کہ جرم بتائے بغیر ایسی سزا کو دے دی گئی ہے کہ قید زندگی سے مانوس ہو جانے کی بنا پر رہائی موجبِ راحت ہونے کی بجائے ہلکا کر دینا ہو گئی ہے۔ درحقیقت ہر شخص عمر و زمانہ کا طالب اور کون سے غلطی سے غلط ہے۔ اگر خیال کو ایک عجیب بچہ دے کہ وہ شکایت پیدا کر لینے کے ساتھ خدا سے

شاہری
ایسی پلٹن شوق کی گئی ہے۔ جس کی مثالیں اور دشواری میں بہت کم ملی ہیں۔ حضرت
قصیح الملک کے کلام میں شوقیوں کی بڑی کثرت ہے۔ مگر وہ زیادہ فرشتوں کے مقابلہ
رکب اور عوامی قسم کی پھیر چھڑا پر مشتمل ہیں۔ حضرت ابوالفضل صاحب جہاں شوقی کہنے پر
کہتے ہیں وہاں تقابلیت کی حد سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتے۔

۲۶۔ بدگمانی کی بھی حادث ہے زمانے کو بہت

بھوکو اچھا دکھو گے تو یہ اچھا ہو گا

مشتوق سے کہا گیا ہے کہ اہل زیادہ حادثا بدگمانی ہیں۔ اگر تم مجھے اچھا کہو گے تو مجھ سے
تعلق خاطر عوامی جائیگے جو تھوڑی دروانی کا باعث ہو گا۔ پس ابھی مناسب ہے کہ تم مجھ
برا کہتے ہو۔ مشتوق کی غیر ذہنی کی فرض سے وہ بھی عاشق اپنی برائی سنا کر اس کا رسکتا ہے
جس کا عیار عشق بہت بلند ہو۔ برا کہنے کو اچھا کہنا معنی خیز ہونے کے علاوہ لطف دیا
اور حسن بیان کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

۲۷۔ گلہ نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے

میرے خدا کو بھی حادث ہو بھول جانے کی

عاشق نے مشتوق سے دعا شگافی گلہ کرنے کے باوجود گلہ نہ کرنے کا ادعا جس انسان سے
ہے، اس کی خوبی قابل ستائش ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ کہنا کہ خدا جو تمام مخلوق کا دھیاں رکھتا
ہے، مجھے حادثا بھول رہا ہے، مشتوق کو شرمندہ ہونے کا درد بھی موقع نہیں دیتا۔ مضمو
ادب بیاں نیند لاغت، انصاف صاحب کا امتزاج اس خوبی کے ساتھ کم دیکھا گیا ہے۔

۲۸۔ باخدا غافل ہو نہیں رہا، موحسین ہو چکا

وہ تو قسمت تھی کہ اس پر سینا آگیا

یہ مضمون کچھ سے کچھ ہوتا رہا۔ سب سے پہلے سعدی نے لکھا

از در طشہ ما خبر ندارد

آسودہ کو پر کنارہ دریا سفا

اور نقل محل کے مطابق ابکا سے کام لے کر بغایت کی ایک بہت عمدہ مثال پیش

شاعری

اس کے بعد حافظ نے اظہارِ بچا کر کے اصول الفاظِ قلیل و معانی کثیر کی خلاف ورزی کی
شب تا ایک دہیم موج دگر دابے چہنِ حائل

کجا دانند حال با سبکبارانِ ساحلہا

اس کا مقصد یہ ہوا کہ الفاظ کی کثرت کے باوجود معنی کی عمدگی میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ پھر
غالب کی باری آئی۔ انھوں نے وہ کسر پوری کوئی جو حافظ سے رہ گئی تھی۔ ان کا شعر ہوا:

ہوا مخالفت و شب تار و موج طوفانِ خیر

گستہ سنگِ کشتی و ناخدا خفست

ظاہر ہے کہ مضمونِ اصلیت سے بعد بعد رکھنے کے باعث ناقابلِ پذیرائی ہو گیا۔
اس شعر کے متعلق حالی نے یاد کا بغالب میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہو کہ کھنڈ
کے ایک لائق شخص نے حافظ کے شعر پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے دوسرے مصرعے میں بھی
دیے ہیں خطرناک حالات بیان کئے جانے کی ضرورت بتائی، جیسے پہلے مصرعے میں مذکور
ہیں اور کہا یہ ایک بڑی کمی رہ گئی۔ مگر جب اسے غالب کا یہ شعر سنایا گیا تو وہ پھر ہلکا اٹھا۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو بھی اس شخص کی رائے سے اتفاق تھا۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ہو مخالفت، شب تار، موج طوفانِ خیر اور گستہ سنگِ کشتی تو ٹھیک
ہیں مگر ایسے حالات میں ناخدا کا میٹھی نیند سوتے بھنا کیوں کو باور کیا جاسکتا ہے! ایسی
مضمون آفرینی جو یقیناً تو درکنار گمان کے لیے بھی کوئی وجہ ہو اندر نہ رکھتی ہو شاعری کا
خون کو دیتی ہے۔

حضرت ابوالفضل صاحب نے نفسِ مضمون میں تبدیلی کو کے ناخدا کی غفلت، اُتار دواؤں
اور ہولناک موجوں کے باوجود کشتی نشینوں کی خوش قسمتی سے سیفِ ہما ساحل پر پہنچ جانا
اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ سفیہ یون کو بھی چوں و چرا کو نہ کی جرات نہیں ہو سکتی۔
یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ناخدا کو حافظ بتایا گیا ہے، سوتا ہوا اظہار نہیں کیا گیا۔ یہاں
حافظ سے خطرات کے بارے میں حافظ رہنما مراد ہے اور اس کی غفلت کو اس کے ناخدا پر
کار ہونے پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ یہ تاویل بیاں عبارت سے ذرا بھی منافات نہیں رکھتی

شاعری

کیوں کہ یہاں فاضل کا اور کوئی مطلب ہو ہی نہیں سکتا۔ خوفناک اور ہولناک دونوں ہم معنی اور ہوزن الفاظ ہیں۔ ان میں سے ہولناک کا انتخاب کرنا دوقیہ سلیم کا بدیہ ثبوت ہے۔

۲۹۔ تم سے بیدار کو چنگیز خانی کون کہتا ہے
ترے ڈر سے تجھے فتنوں کا بانی کون کہتا ہے

یہ مطلع فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ انتہائی بیدار کے امکان کا جیسا دہشت انگیز تصور لفظ چنگیز خانی استعمال کر کے کرایا گیا ہے دیا کسی اور اعتبار سے سے ہونا غیر ممکن تھا۔ کون نہیں جانتا کہ چنگیز خاں نے تاتاروں سے لٹل کر دجوانوں میں کشنوں کے پتے لگا دیے تھے اور متعدد ملکوں کو پامال اور برباد کر کے ہر اس پیدا کر دیا تھا۔ یہ مضمون لاکھوں بار بندھا ہوا لیکن جس خوبی اور خوشنوا سے یہاں باندھا گیا ہے اس سے نظم و نثر میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔

۳۰۔ حضرت داعظ اٹھائے منہ سے کیا بھڑنے بیچ ل

تم تو دوزخ کو بنا ڈال گے جنت کا جواب
اس پر طعنے شرمی اور دد بخشی بیان میں یہ نکتے غور طلب ہیں،

۱۔ داعظ خود را نصیحت و دیگران را نصیحت کا مصلوق ہونے کے باعث
دوزخ میں ڈالا جائیگا۔

۲۔ جنت گلزار ہمیشہ بہاؤ ہے۔

۳۔ داعظ کے منہ سے پھول پھرتے ہیں (منہ سے پھول جھوننا شیریں زبانی
خوش کلائی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہو۔ مگر یہاں عاویہ کے الفاظ حقیقی معنی میں استعمال ہوئے)
۴۔ داعظ اپنی کل انسانی سے دوزخ کو جنت بنا دے گا۔

ایک شعر میں اتنے نکتے اتنی صفائی اور تر زبانی سے ادا کر دینا اور داعظ پر ایسی کار
لگانا فصاحت اور بلاغت کی معراج ہے۔

۵۔ یہی صلا ہے وادوں کا تو میں باندھا بس اب معاف کیا اپنا پالیا میں۔

شاعری

وہ زمرہ کی زبان میں محاورے کا خوب ٹھوک کر بٹھایا اور پیش پا افتادہ مضمون کو بلند کر دیا داد سے مستثنیٰ ہے۔

۲۲۔ یہ جی میں ہے کہ تکلم بھی آزاد دیکھوں

خوشیوں کو بہت آزاد لیا میں نے

عاشق معشوق کے سامنے تمت مدیت تک اس امید میں چپ سا دھ رہا کہ اس کی خاموشی ہی تکلم کا کام دے جائیگی، مگر جب وہ بری طرح ناکام رہی، تو اسے خیال ہوا کہ تکلم کو بھی آزاد کر دیکھ لیا جائے۔ تجربے کا نتیجہ یا مثبت ہوتا ہے یا منفی جب ایک تجربہ منفیہ مطلب ثابت نہیں ہوتا، تو دوسرے تجربہ پر کیا جاتا ہے۔ انسان کی فطرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ حسبِ اوجہ و نشانہ براؤں کو براؤں کا یقین نہ رکھنے کے باوجود تضاد کی آزمائش کیے بغیر نہیں رہتا۔ تکلم بھی آزاد دیکھوں، میں لفظ ”بھی“ سے ظاہر ہے کہ عاشق کو تکلم پر بھی اعتماد نہیں تھا، ہم وہ تمت آزادی کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھا نہیں چاہتا، شعر کا مضمون ایک نفسیاتی تحریک سے تعلق رکھتا ہے جس کے بیان کے لیے اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا۔

۲۳۔ اے اجل! ہر خدا، تھوڑی سی جہالت دے دے!

اک تمنا کے بر آنے کی تمنا ہے ابھی

ہر تمنا کے بر آنے کی تمنا قابلِ کواہن سے گواہ گواہ کر مخلصان گئے پیچھے رکھ دیتی ہے۔ اس کے نفسیاتی بحران کا اظہار جس عمدگی سے کیا گیا ہے، وہ مضمر کے مرقم سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ زبان کی تعریف سے عہدہ بر آؤنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۲۴۔ یوں تو مجھ کو بھی ہے کھو گئے کی حالت، لیکن

دو دنوں آنکھوں سے ٹپکے کو دباؤں تو کھول

یہ شعر اس غزل کا ہے، جو حضرت فیض الملک کی غزل پر بھی لکھی تھی۔ حضرت برصوفی نے لکھا اتحاد

دل میں جو کچھ ہے، وہ کہتے ہوئے حق ڈرتا ہے

گدگداؤں تو کھول، پاؤں دباؤں تو کھول

شاعری

اس کی رلاکت اور روحانی ظاہر ہے مگر لوگوں نے اسے بہت پسند کیا اور بیت الغزل دیا تھا کیوں کہ اس زمانے کے معاشرے میں ثقافت بھی ابتذال کو کم ہی مانپند کرتے تھے۔ حضرت ابوالفضل صحت نے یہی کافیہ بڑی ثقافت اور فصاحت سے باندھا ہے آپ صحت سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں جیسی ہمیں میر کی بات سننے کی جلدی ہے، ویسی ہی بد بھی کہہ دالنے کی عجلت ہے، مگر میں کیلئے کو جو کھلا جا رہا ہے، دونوں ہاتھوں سے خوب د کے بعد ہی کہہ سکوں گا۔ یہ چند بڑی عمیق معنویت رکھتا ہے، جس نے فصاحت کے سانچے ڈھل کر بیان میں ایک عجیب لطافت پیدا کر دی ہے۔

۳۵۔ پوچھتا ہوں کہ تمہیں پاس دعا ہے کہ نہیں؟

کچھ کہو بھی، جو کھلا جانے سے متا ہے کہ نہیں؟

مدین نے زمین غزلی کو سنسلاخ بنا دیا ہے۔ اس میں ایسے تیور اور گرم گفاری رکھنے مطلع کمال لینا جو نے شیر لانے سے کم نہیں۔ روز قرے کی صفائی نہتے کمال پہنچے۔

۳۶۔ آدمی بھی ہے خدا سے دل لگی کرنے میں۔

آہی اہم جنس ہے۔ جہاں لوگ اوپری دل سے خدا کی عبادت کر کے اس کے ساتھ دعا کرتے ہیں وہاں خدا بھی انہیں لودس اور حمد و قصود کا دلخوش کن فریب دے گا تو دل لگی کہتے ہیں۔ بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے، بندے کا خدا سے کیا خطاب! اس باوجود بندے اور خدا کے درمیان دل لگی کرنے کی صفت کا اشتراک نہایت کم ہے۔ دونوں کو ایک ذیل میں رکھنے سے مضمون میں غیر معمولی جدت پیدا ہو گئی اور سلاسل اور انداز بیان نے اسے نہایت دل آویز بنا دیا۔

۳۷۔ مقصود مجھے رحمت، مطلوب تجھے طاعت

کچھ میں بھی سوالی ہوں، کچھ تو بھی سوالی ہے

اس میں شک نہاد ان کی قیامت سے بچنے کے لیے شعر کو چار حصوں میں ایسی غوی ہے تقسیم کر دیا ہے کہ ہر حصہ پہلے خود مکمل ہو گیا۔ مضمون میں خدا سے بڑی باخوشی

شاعری

گئی ہے جو خوشی ہونے کے باوجود متانت سے خالی نہیں۔ ایک طرف رحمت کی خواہش اور دوسری طرف طاعت کی طلب لے قائل اور خدا دونوں کو سائل ثابت کر دیا یہاں اتر بیٹا۔
کا ایک وقت مشورے اور متین ہونا عجائب سخن میں شمار ہونا چاہیے۔

۳۸۔ دہخ دل چکا، تو غم پیدا ہوا

یہ اندھیرا صبح دم پیدا ہوا
اور شعر نے استعارے اور تشبیہ سے بہت کم کام لیا ہے۔ بیان کی ایک بہت بڑی نوعیت
ہی جب کسی مضمون کے کما حقہ بیان کرنے میں بول چال کی زبان رو دیتی ہے، تو استعارے
اور تشبیہ سحر و سنوں کا کام کر جاتے ہیں۔ میں جس زمانے میں اپنے نانا کی ہدایت کے مطابق
ایران کے شعراء متاخرین کے خطی اور مطبوعہ دواوین کا وسیع اور دقیق مطالعہ کر رہا
تھا مجھے جلالائے آئیر شہرستانی کا شعر:

در دل از سستی فضاں غم کردہ ایم

بلبلے در آستیاں غم کردہ ایم

بہت پسند آیا اور اب بھی جب یاد آ جاتا ہے تو میں اس کے لطف میں کوئی کمی نہیں پاتا۔
اگرچہ فارسی اور اردو کے ان شعروں کے مضمون بالکل مختلف ہیں، لیکن استعارے کے
بلبلے استعمال اور حسن بیان کے لحاظ سے دونوں لطف انگیزی میں مساوی اور میزان سخن میں
ہموزن پاس جاتے ہیں۔

۳۹۔ بھر گیا آہ چراغ دل بسوزاں میرا

گور میں باد فضا، بعد فضا بھی آئی

مضمون میں حقیقی اور عالیٰ اصلیت ہونے کے باوجود الفاظِ باد فضا اور بعد فضا کے حاصل
واقع ہونے سے جو مخالف انگیز صوتی تلافی پیدا ہو گیا ہے، اس ضمن میں یہ کہہ بھی یاد رکھنے
کے قابل ہے کہ اگر مخالف انگیز صوتی تلافی پیدا کرنے والے الفاظ کے درمیان ایک لفظ بھی
آجائے تو تلافی کو خراب ہو کر مرضِ جہ میں نہیں آتی۔ صورتِ ابو الفضا صاحب نے جو حسن
مترکب کی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ قائل کے مرنے کے بعد بھی زندہ شخص کی طرح لکھو

شاعری

کہوئے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ شعر سخن طرازی کے ابتدائی زمانے کا ہو گا۔
۴۰۔ کہتا ہے وہ ظالم میری فہم پر یاد کو سن کر

مے طاقت فریاد، خستہ اوں زیادہ

گلے پر چھری پھیر دینے والا شعر کہہ دیا ہے۔ عاشق کی ناقابلِ برداشت باطنی اذیت اور مسلسل
فریاد اور معشوق کی میر جی اور ستم ظریفی کا ایجاز میں اظہار سے زیادہ وضاحت کے ساتھ
بیان کر دینا کارسے دارد۔

۴۱۔ کچھ پاس کر اس ضعف کا، لے رحمت باری!

اٹھتے نہیں اب دست دعا اور زیادہ

اس میں ہتھ دار معنویت ہے۔ فرماتے ہیں۔ میری ساری عمر متواتر دعائیں مانگتے میں گزر گئی!
حتیٰ کہ ضعف طاقت پر غالب آگیا جس سے اب دھل کے لیے ہاتھ اٹھانے تک کی سکت بھی
نہیں رہی۔ لے رحمت باری، تو اتنی بے لحاظ کیوں ہے؟ اب تو میری ناچاری کا کچھ پاس کر۔
اس بلیغ بیان میں دو کاشف الحجاب لفظ "ضعف" اور "اب" ہیں جن سے جملہ مقتدرات برحق
برہماتے ہیں۔

۴۲۔ میری ہی زندگی کی قسم کھاؤ آپ نے

جوابات کی خدا کی قسم پایدار کی

میں نے لڑکپن میں کسی کا یہ مطلع کہیں نہ پایا تھا تھا

پاپوش میں لگائی کر لں آفتاب کی

جوابات کی خدا کی قسم لا جواب کی

مجھے پہلا مصرعہ بڑا درد سرا اچھا لگا۔ پہلے مصرعے میں بعید از عقل واقعہ بیان کیا گیا تھا اور
دوسرے میں دردِ سر سے کی بڑی صفائی تھی۔ گمانِ غالب ہو کہ زیرِ نظر شعر انشا کرتے وقت حضرت
ابوالفضل صحت کے ذہن میں نہ گذرہ بالا مطلع تھا حضرت بھون کا ذو معنی شعر نہایت فصیح اور
بلخ ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ عاشق معشوق کی تعریف کو کہہ رہے کہ آپ نے
بہت سے عاشقوں کے ہوتے مجھے میری ہی جیسا تم کھاؤ، ستم کے سچے اور بھونے ہوئے میں کوئی شک

شاعری

نہیں کہوں کہ قسم ایمان یا کسی ایسے شخص کی کھائی جاتی ہے، جو عزیز ترین ہو تمہارے۔ پھر خود بھی خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ آپ نے اپنے شیوہ راسخ کے مطابق یہ پادری یعنی مینی برخلوص بات کر کے میرے ساتھ اپنا پیش از پیش تعلق خاطر واضح کر دیا ہے۔ یہ تو ہوا ایک مطلب اب دوسرا مفہوم دیکھیے جو اس سے زیادہ لطیف اور سراسر طنز ہے۔ عام مضمون ہے کہ جس شخص کی جان کی جھوٹی قسم کھائی جاتی ہے وہ مرجاتا ہے۔ اسی بنا پر عاشق معشوق سے کہتا ہے کہ آپ نے اور سب کو چھوڑ کر میری سی ناپایدا زندگی کی پایدار کو (بمعنی ناپاؤ اور دروغ) قسم کھائی ہے جس کا نتیجہ جلد ہی میری موت کی شکل میں نکل آئے گا۔ واللہ، آپ کی ہر بات تہہ در تہہ جوتی ہے۔ قسم کو جھوٹی سمجھنے کا قرینہ مصرع اول کے الفاظ میں موجود لینگا، بشرطے کہ اسے طنزیہ لہجے میں پڑھا جائے۔

۴۲۔ میرے دل نے پر بھی شکوہ ان کے لب پر آگیا

کہ رہے ہیں کیوں تمہاری آنکھ میں پانی نہیں

آنکھ میں پانی نہ ہونا محاذِ دہ ہے جو بیشری اور بھیائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس شعر میں محاورے کے الفاظ نے بیک وقت مجازی اور حقیقی معنی دے کر بیان میں دو گونہ لطف پیدا کر دیا۔

۴۳۔ داد و ستار ہوں تجھے، یا رب! میں اس شخص کی

ہر بات سب کے لیے، ناہر باتیں میرے لیے

خدا سے دور درگشت کائنات کرنے کی بجائے ہنسی ہنسی میں شواہ کو بے خوشی کی انتہا کر دی ہے۔ لطفِ زبان اور جن بیانِ سبحان اللہ۔ خدا سے ایسی طنز آمیز شوخیوں یا غالب کرتے تھے یا حضرت ابراہیمؑ کی فصاحت کرتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں الفاظ کی بندش اور طرزِ خطاب کا نکھار قابلِ دید ہے۔

۴۴۔ موت کی زد سے بچ گیا جو کوئی

اس کو عمرِ دراز نے مارا

موت انسان کو بے مارے نہیں چھوڑتی اور عمرِ دراز اسے مدت تک مرنے سے بچائے

شاعری

کھتی ہے۔ یہ ایسی صداقت ہے جو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر یاد
صدیغ اور دامن دنیا میں قید طولی کے شاید کو نظر انداز نہ کیا جائے تو اتنا پڑیکا
کہ جو شخص موت سے لفظ نہیں مڑتا اسے عمر دما دمنا مردہ کہہ دیتی ہے۔ گویا زندگی اور
موت دونوں باعث ہلاکت ہوتی ہیں۔ میں نے لڑا کچن میں نظامی گنجوی کی مثنوی شیریں
خسرو پڑھی تھی۔ اس کے یہ اشعار اب تک یاد ہیں،

نشأ با عمر باشد تا بہ سہ سال
چو چل آید، فرد نرید پرد بال
پس ادب چہ نہ باشد تند رستی
بصر گندی پزیرد، پایے سستی
چو شخصت آید نشست آید بد یار
چو ہفتاد آید، افتد آلت از کار
بہشتاد و نو دچوں سن رسانی
بود مرگت لبشکل زندگانی

لفظ اماما کے حقیقی اور مجازی معنی میں استعمال سے لطف زبان میں بہت اضافہ ہو گیا۔

۳۶۔ نقاب رخسے اٹھادی، مگر کمال یہ ہو

مری نظر کا بھی پردہ اٹھا لیا کوئی

یہ بلیغ مضمون رفیع و وسیع بھی ہے اور عمیق و دقیق بھی۔ اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا سب
کچھ کہہ دینے کے برابر ہوگا۔ جب ہا بھارت کے دو ذوق میں کرشن نے ادب کو اپنا دریا واپ
دکھایا تو اسے ان کی لامحدود ذات میں ہر سہ عالم ایسے نظر آئے جیسے بحر بیکراں میں پانی
کے تین قطرے گم ہوں۔ ذہب مصطفیٰ خان حسرتی دہلیفٹہ کہتے ہیں:

وہ تشخیص شخصی بھی جاتی رہی
کنارہ ایٹھے بھی جلباب کا

اس میں حضرت ابوالصباح کے شعر کے متعدد پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو دکھایا

۲۷۔ ان سے تو قیر محبت نہیں ہوتی، نہ سہی

اتنی تحقیر محبت تو خدا ارادہ کریں!

عاشق جس کا عشق بے تمنائی کی بدولت بلندی معیار کی حد آنسو پر پہنچا ہوا ہے، تو قیر محبت نہ ہونے کا شاک نہیں ہوتا، لیکن تحقیر محبت پر اسے معشوق سے کہنا ہی پڑتا ہے کہ وہ برائے خدا انتہائی تحقیر محبت تو نہ کرے۔ درحقیقت جس کی محبت اتنی بلند پایہ ہو، اس کا تحقیر محبت پر تملکا جانا قدرتی امر ہے۔ بہر حال التماس میں جو مجھ رہے وہ جزو نفس پر غالب نہیں آیا۔

۲۸۔ وہ ہیراں نہیں، نہ سہی، طفت تو ہیں

اُن کا ستم بھی ان کی عنایت سے کم نہیں

عاشق کو معشوق کا صرف التفات دکا رہے۔ اسے ہیراں اور ناہیراں کی فرق سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ستم اور عنایت کو ایک ہی درجے میں رکھتا اور سادگی سمجھتا ہے۔ مضمون زبان ادبیان تینوں کی خوبی یکجائی صودت میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

۲۹۔ اتنی خوشی ہوئی ہے ترے التفات کی

عمر گزشتہ مانگ رہے ہیں خلعت ہم

یہ بھی التفات کے مضمون پر ہے۔ معشوق کے التفات سے زیادہ دیر تک لطف امداد نہ ہونے کے لیے خدا سے عمر گزشتہ کی بازیافت چاہنا انتہائے احتیاط کا اظہار جس عمدگی سے کرتا ہے، وہ کسی ادیب پر ایسے بیان سے نہیں ہو سکتا۔ نظیری کہتا ہے:

از عین زمانے کہ یہ قیہ تو نمودم

در خود بفضیب بنیم و بر تو بہ تا شرف

یہ شعر حضرت ابو الفصاحت کے ارشاد سے اہل میں تھانس اور فرخ میں متوالف ہے۔ اس کا مفہوم مقدمات کے باوجود آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ تاہم میں زرا کھول کر بیان کیے دیتا ہوں:

اے معشوق! تیرے عشق میں گرفتار ہونے سے پہلے جو عمر اچھا لگتی تھی، اس کے نقصان کا خیال

شاعری

کہتے تھے اپنے اوپر غصہ آتا ہے رک میں اپنے آپ کیوں گرفتار نہ ہو گیا
افسوس ہوتا ہے (کہ تو نے مجھ کو اتنی مدت تک قید کی لذت سے محروم رکھا)
مومن نے جو شعر کہا ہے 'وہ حضرت ابوالفصاحت اور نظیری کے مضمون سے بالکل
ہونے کے باوجود مدت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ ملاحظہ ہو:

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے

اس کا نہ دیکھنا بجز التفات ہے

بہر حال حضرت ابوالفصاحت کے تغزل کی تہذیب و معنویت اور بیان کا حسن بیش
کاستی ٹھہرتا ہے۔

۵۰۔ اہل لکڑی دوستی نے اٹکھایا ہے یہ سبق

غیردوں کی دشمنی بھی غنایت سے کم نہیں

تہذیب و شعریہ۔ یہ بیان کرنے کے لیے کہ اپنوں نے بے انتہا آزادی سے اور بے شمار
غیروں کی دشمنی کو غنایت کہنا نہایت بلیغ اسلوبِ ابلاغ جو جس سے اندازہ کیا
کہ اپنوں نے وہ کچھ کیا ہو گا جو غیروں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ یہی مضمون کسی قدر
آتش مکنوی نے یوں باندھا تھا!

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر

دل سے دشمن کی عداوت کا ٹکڑہ حب تارم

شعر اچھا ہے اگر بیان میں وہ بلاغت کہاں ہے جو حضرت ابوالفصاحت کے ارشاد
جاتی ہے!

۵۱۔ مجھے رات بھر یاد کس نے کیا ہو

سحر ہو گئی ہچکیاں آتے آتے

یہ اس غزل کا شعر ہے جو حضرت فصیح الملک کی غزل پر لکھی گئی تھی حضرت فصیح
شعر ہے:

مجھے یاد کہنے سے یہ مدعا تھا نکل جائے دم ہچکیاں آتے

شاعری

اے مضمون آفرینی کون کہیگا۔ یہ تو مضمون تراشی ہے اور وہ بھی زبردستی کی۔ اس پر بحث کرنے کے ضمن میں ابر تفتیح طلب یہ ہے:

سوال ۱۔ کیا جس شخص کو یاد کیا جاتا ہے، اسے ہچکیاں آتی ہیں؟

سوال ۲۔ کیا ہچکیاں آتے آتے دم نکل جاتا ہے؟

سوال ۳۔ کیا معشوق عاشق کو ہلاک کر دینے کے لیے اسے یاد کرنے کا حربہ استعمال

کرتا ہے؟

سوال ۱۔ کا جواب یہ ہے۔ مظلون عام کے مطابق یاد کیے جانے والے شخص کو ہچکیاں

آتی ہیں۔

ایر مینائی لکھتے ہیں ۵

سا لہا سال ہوئے ہیں نہیں آئی ہچکی

مجھ کو غربت میں سزائے وطن بھول گئے

مگر ایسی ہچکیاں دو چار، پان سات یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ آتی ہیں۔ انہی ہچکیاں آنا کہ ان سے دم نکل جائے قطعاً بعید الوقوع ہے۔

سوال ۲۔ کا جواب یہ ہے۔ علم طلب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب بزرگے ماؤف ہو جانے سے چند روز چند چھپ رگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو ہچکیوں کا نازا بندھ جاتا ہے، جسے طبی علامت لدی کہتے ہیں اور مریض دن رات ہچکیاں لیتے لیتے بالآخر دم توڑ دیتا ہے۔

سوال ۳۔ کا جواب یہ ہے۔ کوئی معشوق عاشق کو ہلاک کر کے کچے لپے اُسے یاد نہیں کرتا اور بغرض حال کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت انتہائی حماقت ہوتی ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ معشوق پر جو افترا باندھا گیا ہے اسے کیوں یاد کیا جائے۔ شعر میں کسی خوبی کے بجائے متعدد نقائص ہیں۔ ایسے نقائص کا باعث اعموم زدوگوئی اور بسیار گوئی ہوتی ہے۔

حضرت ابو الفصاحت نے فی الواقع ایسی مضمون آفرینی کی ہے، جو چار پہر تک علی التوہر ہچکیاں کرنے کے متعلق کہیں نہیں دیکھی گئی۔ کسی کو شام سے صبح تک ہچکیاں اسی صورت میں آ سکتی

شاعری

تھا کہ اسے یاد کرنے والی بات بھر یاد کرتا رہا ہو۔ آپ نے یہ شعر پوری کو کے شعر کو خوب
اور محسن بیان کے بلند ترین درجے پر پہنچا دینے میں کمال کر دکھایا ہے۔ بدحقیقت اب اس
زمین میں یہ قافیہ ایسی لطافت اور لطافت سے جدا ہونا ممکن نہیں۔ پھر یہ امر بھی قابل
ہے کہ معشوق کا نام اس کی رسوائی کے خوف سے نہیں لیا گیا۔

۵۲۔ مدت ہوئی کہ باب اثر بند ہو گیا

میں نے دعا سے ہاتھ اٹھایا نہیں ہنوز

باب اثر بند ہو جانے اور دعا سے ہاتھ اٹھانے کے درمیان جو بعد زمانی واقع ہے اس
اندازہ ایسی صورت میں کرایا جاسکتا تھا کہ پہلے مصرعے کا پہلا لفظ "مدت" اور دوسرے
مصرعے کا آخری لفظ "ہنوز" ہوتا۔ تنویدیت سے مغلوب نہ ہونے والی رجا بریت ہو تو آ
ہو۔ ہاتھ اٹھانا محاذ ہے جسے اہل زبان حسب موقع کسی پر حملہ کرنے یا کوئی کام یا اور
ترک کر دینے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جو فارسی کے محاذ سے ترجمہ ہو کر "مدد کا جود"
گئے ہیں ان میں ہاتھ اٹھانا (مدت بردار شدن یا دست برداشتن) بھی شامل ہے۔ اس
شعر میں محاذ سے لے کے الفاظ اصولاً مجازی معنی میں استعمال ہونے ہیں۔ اگر ان کے حقیقی معنی
لیے جائے تو محاذ سے کا خون ہو جاتا۔ میر جہادی مجروح (شاعر غالب) نے اس محاذ
کو حقیقی مفہوم میں برت کر شدید غلطی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز
ہاتھ بے داد و ستم سے نہ اٹھانا ہرگز

ہاتھ اٹھانے سے نزاکت پر حرف ای صورت میں آسکتا ہے کہ ہاتھ جو جسم کا ایک حصہ ہے
لہذا واقع اٹھایا جائے۔ بیداد و ستم ترک کر دینے سے نزاکت پر حرف آنا ہرگز ممکن نہیں
حضرت فصیح الملک کا شعر ہے:

زلف آہستہ جھپکے! مجھے ڈر لگتا ہے

آپ کے ہاتھ کا جھٹکانہ کمر تک پہنچے

یہاں کوئی محاذ نہیں باندھا گیا۔ الفاظ کا استعمال ان کے حقیقی معنی میں ہوا اور خوب

شامی
 فافے گوئے دوسری بات ہے کہ رلف اور کر کے مضمون باندھنا اب شایستگی کے خلاف سمجھا
 جاتا ہے۔

۵۱۔ اسے شیخ! کس جگہ کو تیرا مقام سمجھیں

تو کچھ زمین پر ہے، کچھ آسمان پر ہے
 بیخ و ادھر مخلوق میں شامل اور ادھر خالق سے واصل ہونے اور محراب بین العالمین کی حقیقت
 رکھنے کا مدعی ہے اس کا خوب مضحکہ اڑا رہا ہے۔ پھر مصداق سوال میں جو خوشی ہے اس کا
 لیا کہنا۔

۵۲۔ ہر خوشی قربانی کی تھی میں نے کس پر، آپ پر

میری ہر خواہش کو ٹھکرایا تھا کس نے، آپ نے

اس حال جواب سوال کے طور، الفاظ کی بندش اور زبان کی روانی نہایت لطف انگیز ہیں۔

۵۵۔ کہیں دریاے محبت ہی نہ طوفانی ہو

ڈوبی جاتی ہے مری آج طبیعت کیسی

اس زمین اور مقامیہ دردیغ میں حضرت فصیح الملک کا شعر ہے:

آپ ہی جو رکویں، آپ ہی پوچھیں مجھ سے

یہ تو فرمائیے، ہے آج طبیعت کیسی؟

دونوں شعروں میں مضمون کی متانت اور خوشی کا فرق ظاہر رہا ہے۔ حضرت ابوالفصاحت

نے عمیق دردِ مین سے کام لے کر جو لفظیاتی تجوید نکالا ہے، اس کی بلحاظ دقیقہ سی کیا تعریف ہو!

بیت: ڈوبنا کا اور ہے۔ طبیعت ڈوبنے کے متعدد اسباب ہیں سے دریاے محبت کے طوفانی

لے کو سبب قرار دینا ایسی لطیفیض ہے جو تشکیک آمیز ہونے کے باوجود حکیم بوعلی سینا کی

بعض مشہور بحالہ تشبیہات سے ہرگز کم نہیں۔

۵۶۔ اس تند خو سے شکوہ بیدار کیا کریں

کچھ اپنی جان سے تو مجھے دشمنی نہیں

مضمون غالباً غائب کے اس شعر سے سوجھا ہے:

شاہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی تھی

یہ شعر غالب کے نہایت عمیق، دقیق اور لطیف اشعار میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اس
برسبیل ریکارڈ حافظہ مقدار رکھے ہیں، وہ عیادت میں مذکور قرآن پر غور کرنے سے!
دکھتے اور سارا غلا پڑ کر دیتے ہیں۔ یہی مضمون اسی انداز سے مگر ایک بار ایک فرق کے
حالی نے یوں باندھا ہے:

حباں بچتی نظر نہیں آتی

غیر الفت بہت جتانے لگے

حضرت ابو الفصاحت کے ارشاد میں بھی تہداری ہے، جسے بلاغت کی جان سمجھنا چاہیے
یہ جہر ایسی نہیں کہ غواص کو اس تک پہنچنے کے لیے اپنے جسم سے بہت بھاری پتھر باندھ
خوٹ لگاتا ہے۔

۵۷۔ نصیبی بد نصیبی ہے، مگر اتنی بھی کیسا!

کوئی دن، کوئی ہینا، کوئی سال اچھا نہیں

روانی، انتہائی روانی، صفائی، انتہائی صفائی اور جزالت، انتہائی جزالت ہے۔ اس
اعتراض ہو سکتا ہے، مگر اعتراض کوئی سخن فہم ہی کر گیا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ جب کوئی دن
نہیں کہ دیا، تو پھر کوئی ہینا، کوئی سال کہنا نظویل لاٹاٹل ہے۔ اس اعتراض کا جواب
یہ ہے۔ سال کے بارہ مہینے اور ہر مہینے کے تیس دن ہوتے ہیں۔ تمام اول سے بد نصیبی
شکایت کا مطلب یہ ہے کہ کسی سال کا کوئی ہینا اور کسی مہینے کا کوئی دن اچھا نہیں ہوتا۔
سادہ عمر چالی میں گئی ہے، اور جواباتی رہ گئی ہے وہ بھی اسی طرح گئی۔

۵۸۔ کچھ تلخ تو ضرور ہے یہ، اے جناب شیخ!

بچنے کے بعد اس کا مزہ کچھ نہ پوچھیے

یہ شعر حضرت فصیح اللک کے اس شعر کے پلے کا ہے:

لطف ہے تجھ سے کیا کہوں ز اہل ہائے کم نجات! تو نے پی ہی نہیں

شاعری

حضرت موصوف کے شعر میں شراب بھی تلقی کا ذکر نہیں آیا، حال آنکہ شراب کا تلخ ہونا لازمی ہے جس کے باعث اکثر طبائع شراب نوشی سے متجنب رہتی ہے۔ حضرت ابو الفصاح صغریٰ نے یہی نہایت عمدگی سے پوری کر کے شعر کو پی لینے کی ابر دست تر غیب دی ہے۔ فصیح روزمرہ اپنا جواب نہیں لکھتا۔

۵۹۔ ناکر وہ گناہی میں گرفتار ہوا ہوں

اب دیکھیے اس جرم کی مٹی ہے سزا کیا!

یہ عسکر لڑائی سے پہلے برطانیہ کی استبدادی حکومت کے قہر و غضب اور جوہ و دم کی مثال بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ خیر اس سے قطع نظر کر کے دیکھ لیں کہ تو معلوم ہو گا کہ اس شخص کے ذہنی کرب کا کیا عالم ہے جو بیگناہی کے جرم میں ماخوذ ہو کر عقوبت کی نوعیت سے قطعاً بیخبر ہے اور جسے طرح طرح کے ہشتناک خیالات نیم مردہ کیے دیتے ہیں۔ فصاحت نے نظم و نثر میں حیرت انگیز نگرانی پیدا کر دی ہے۔

۶۰۔ خون کی شان یہی ہے کہ وہ فاحش ہی ہے

تم کو زیبا نہیں مطلوب غضب ہو جانا

نکتہ آفرینی اسی کا نام ہے۔ معشوق کو دردِ داسی بات پر غضبناک ہو جانے سے باز رکھنے کے لیے کیا لاجواب منطقی استدلال کیا ہے اور اس کو ناقابلِ تردید بنا دینے کی فرض سے کیسے موزوں اور مناسب الفاظ استعمال کیے ہیں!

۶۱۔ سیرت کے ساتھ حقے میں صورت بدل گئی

پوشیدہ خود وہ ہو گئے دل کے مباریں

یہی مضمون حضرت فصیح الملک نے بھی باندھا ہے،

نقشہ بگڑا رہتے رہتے خشناک

کھنکھنی قاتل کی صورت ہو گئی

مجھے فقط کھنکھنی بہت بڑی طرح کھنکھاتی ہے کیوں کہ کھنکھانا اور کھنکھنا کتے اور کتیا کے لیے لے لے جاتے ہیں اور اس شرمناک نقلی نے معشوق کو جس شکل میں دکھایا ہے، اس کے نہایت فصیح ہونے میں

شاعری

دعا بھی شک نہیں۔ اس کے برعکس حضرت ابو الفصاحت نے معشوق کی صورت کو بدل گئی ہے، دل کے خبا میں پوشیدہ ہو جانے سے عبارت کہ کے پاکیزہ گوئی کی حد

۶۲۔ اسرار حقیقت کے سمجھے نہیں فرزانی

تکصیر نال کی تھی مارے گئے دیوانے

دنیا کا دستور عجیب ہے۔ قصود فہم فرزانوں کا ہوتا ہے، اور اس کی سزا دیوانہ ہے۔ مقصود راد قفس تبریز کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ صعب کو معلوم ہے۔ حال کہا ہے:

سخن حق کی داد لوں کس سے !

سن چکا ہوں فائدہ منظور

حضرت ابو الفصاحت نے یہ مضمون جس انداز سے بیان کیا ہے، وہ آپ ہی کا "مارے گئے" کی معنویت اور فصاحت روزمرے کے استعمال کا بہترین نمونہ۔ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و شیفتہ کے شعر کا مضمون اس کے بالکل برعکس ہے:

صد گونہ اعتراض بر گفتار و علیست

تقریض۔ ہر طریقہ، بجنوں نکرہ کس

ہر مسئلے کے کسی کو پہلو ہوتے ہیں، جنہیں مختلف لوگ زاد یہ ہائے نظر سے دیکھ کر الگ کہتے ہیں۔ حضرت ابو الفصاحت جس خیال کے حامی ہیں اس کے مؤیدوں کی کثرت رہی ہے اور سبکی۔

۶۳۔ سزائیں سوز محبت کی لدا ہی ہیں مجھے

لگی ہوئی ہے تمھاری یہ دل لگی کیا ہو

ایسی ہی پاکیزہ زبان کو اب کوثر سے دہلی ہوئی زبان کہا جاتا ہے۔ "دل کی لگی" سے دل لگی کا لفظ دہلی لے سکتے ہیں، جنہیں روزمرے کے رجسٹر استعمال

۶۴۔ کوئی ہے دیر کا بد خواہ، کوئی کہے کا

ہم دعا کہتے ہیں آباد رہیں گھر دونوں

شاعری

جو ان مکتبہ مذہب و ملت کے اقتیاد سے بالاتر ہو نا اور ہر محاسن اور ہر قسم کی خیر خواہی کو نا ہی صحیح معنوں میں آزاد بخالی ہے۔ یہ شعر اس مسلک کی توضیح کرتا ہے، جس پر حضرت ابو الفصاحت عمر بھر کا وزن رہے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی میں ایک شعر ہے جس کا مختار طلب خدا اور مختار طلب حضرت ہوئی ہیں :

تو برائے وصل کو دن آمدی

لے برائے فصل کو دن آمدی

۶۵۔ حریم ناز سے باہر نکل کچھ داد دے اُن کو

تو دے دیک جو آ بیٹھے میں منزل آ بیٹھے ہیں

"منزل آ بیٹھے ہیں" جہاں استعمال کیا ہے اور جس خوبی سے استعمال کیا ہے اس کی کیا داد دی جائے۔ محاورے اور روزمرہ کا ایسا انتراج حضرت ابو الفصاحت کی بے نظیر اور نکلا کی شہادت دیتا ہے۔

۶۶۔ دل کو سوداغ مرے عہد جو اتنی نے دیے

شب تار یک میں روشنی یہ سپہ خانہ ہوا

جوانی دیوانی مشہور کہادت ہو۔ عہد جو اتنی میں انسان کو کچھ بھلا بڑا نہیں سوچتا۔ گویا عہد جو اتنی تانہ ناعاقبت اندیشی ہوتا ہے۔ اس سن میں عشق کا سودا اچھلتا ہے، اور اپنے نیک بد کی کچھ خبر نہیں دیتی۔

بقول حضرت فصیح الملک :

دل اندھا دھند سی آتا ہو، جب بھلا تا سوداغ !

چھان بین اس میں نہ کچھ چھان بھٹک ہوتی ہو

حضرت ابو الفصاحت نے عہد جو اتنی کو شب تار یک اور دل کو سپہ خانہ کہ کر استعاروں کا ایسا عمدہ استعمال کیا ہے جس کی تعریف کا حق ادا کرنا آسان نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عہد جو اتنی میں کئی خوش حالوں کے عشق میں مبتلا ہوا مگر اُن کا قرب حاصل نہ ہونے سے میرے دل میں دماغ حسرت پڑ گئے۔ ان دماغوں کے جلنے کی روشنی سے شب تار یک (عہد جو اتنی) ہیں

میرا یہ خانہ (دل) روشن ہو گیا۔ ایک شعر میں اکٹھے دو استعارے لاکر زبان کو
لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

۶۷۔ سکون دل تو جہاں میں کہیں نہیں لے جو شہزاد
پھر اس سکون کے لیے اضطراب کیا آئی؟
منطقی استدلال بالعموم شعر کش ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں اس شعر میں جان بھی پڑ
مثلاً سالک شاگرد غالب نے لکھا ہے۔

کچھ تغیر مرے احوال پریشاں میں نہیں
ایسے عالم میں ہوں جو عالم انجان میں نہیں
شعر زیر بحث کا سارا لطف اسی منطقی استدلال کا رہیں منت سمجھنا چاہیے۔ سکون
کے تضاد کی غویٰ محتاج بیان نہیں۔ جو شے معدوم ہو اس کو موجود خیال کر کے
رضا ایسا ہی ہے جیسے

بار بار آمد مہما در دام ما
باز سردادیم و عنقا خواستیم (غالب)
۶۸۔ جس جو سے عقل انساں اور سوائی ہوئی
ہر شناسائی سے پیدا نا شناسائی ہوئی

عرفی میں ایک مقولہ العلم حجاب الاکبر لسانی زبان سے ترجمہ ہو کر بہت مشہور۔
کو اسی کی تفسیر سمجھنا چاہیے۔ حضرت ابوالفتح صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہے
پہلے ہی سودائی کئی اسرار کی کریم میں اور بھی سودائی ہو گئی اور اس پر جو کچھ آگیا
انھوں نے حقیقت پر اور بہت سے پردے ڈال دیے۔ دواں انسان کے علم پر
بڑا ماحول ہے اس کے باعث جبل میں اتنی ہی بیشی ہوتی جاتی ہے۔ عرفی کہتا ہے
ہر کس نہ شناسندہ رازست و گزند

ایں ما ہمہ رازست کہ معلوم معلوم است
مطلب یہ ہے کہ مخلوق جو اسرار کو منکشف خیال کرتی ہے وہ بدستور مشتعل ہیں۔

شاعری

اسے دیکھی ہوگا۔

پلائیے جگہ پر اپنا ایک شعر بسبیل پیش نقل کیا ہے۔ اب پھر
ایک اور شعر نکلتا ہوں:

رو نہ آگئی پر گامزن ہوں

تجلاے چراغِ آگئی میں

ابوالفضل نے عقل کا سودائی ہونا اور شناسائی سے نا شناسائی لازم آنا کہ کر
یاں کو چاہا جان لگا دیے ہیں۔

۶۹۔ دل پر وہ ترے ستم، تیری جفا، تیرا غضب

عمر بھر یاد رہا، یاد ہی، یاد رہے

صنعتِ بندِ نشتر حکوس الترتیب پر لطفِ زبان کا مستزاد ہونا فراموش نہیں ہو سکتا۔
جامعِ الہک نے بھی کہیں کہیں ایسے اشعار ایسی ہی غولی سے کہے ہیں۔

۷۰۔ دیکھنا اُمیدِ راحت کے کوشش سے دیکھنا

مجھ محمّی ہے فصیح، پھر بھی روشنی کچھ کم نہیں

دل اور کیا بیان دونوں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ دردِ مینی اور تجریئے نفس کا اس
نمود کیا ہوگا۔ ایک نفسیاتی حقیقت کہ اُمید مٹ جانے کے باوجود نہیں مٹتی۔ گو یہ
بات ہے کہ شعوری طور سے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ معدوم کا موجود ہونا بظاہر ممکن
لیکن جہاں تک انفعیات کا تعلق ہے عدم اور وجود کے مٹنے مٹنے رہتے ہیں۔ یہ کہنا کہ
مجھ محمّی ہے، مگر اس کی روشنی باقی ہے، قوتِ تخلیق کی نادرہ کاری ہی کہی جائیگی۔
لی سرہندی نے بھی اسی انداز کا ایک مطلع کہا تھا جس کا مضمون شیرزیرِ بحث سے مختلف
کے باوجود تمدنِ طرزی کا ناقابلِ انکار ثبوت پیش کرتا ہے:

خاکِ گزِ دیدیم دی رقصِ ہنوز افغان

حتمِ شکستِ آئینی ریزہ ہے جو شانِ ما

یہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ناصر علی کے مضمون کی بنیاد ایک بے بنیاد ادعا ہے اور حقیقت

شاعری

ابوالفصاحت نے ایک تختِ اشوری احساس کو شعور کی سطح پر لا کر آتشکار کر دیا ہے، تو آپ کے مضمون کی فوقیت تسلیم کرنے میں ذرا بھی تاثر نہیں ہوتا۔

۱۔ - علم کا اتنا بوجھ یا رب! کیا سمجھ کر رکھ دیا
آدمی پر زندگی کا بوجھ ہی کچھ کم نہیں

مضمون کی لطافت اور زبان کی فصاحت دیکھنے کے ساتھ ہی آپ کی عمر کے ابتدائی مسائل کی فلاکت اور زلزلوںِ حالی کا خیال کیا جائے، تو محسوس ہوگا کہ شیرِ زیرِ بحث اگرچہ اس زمانے کی تصنیف نہیں، مگر اسے انہیں آیام کی غنائی کے لحاظ سے حسبِ حال کہا جاسکتا ہے۔
آپ کا بیان ہے:-

عیرِ الحالی میں بار بار ایسا معلوم ہوا کہ اس خاطرِ گراں بخانی بن گئی اودما میرِ مینائی کا
یہ شعرِ بادِ زبان پر آیا۔

غمِ اٹھانے کو بہت تھکے ترے بندِ یارب!
کیا کمی تھی، اگر انک مجھ کو نہ پیدا کرتا

بیس سال کی ایک مسلسل فلاکت اور زلزلوںِ حالی میں بچپن کے کھیل تماشے خواب و خیال رہے
اور غمخوارِ شباب میں بھی رنگینیِ صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

امیرِ مینائی کے شعر سے ظاہر ہے کہ انہیں اپنے غم کا تو غم ہے مگر باقی بندگانِ خدا کے غموں سے
کوئی سروکار نہیں۔ یہ روشِ انسانی ہمدردی اور حسنِ خلقی کے منافی ہے۔ اس کے برعکس حضرت
ابوالفصاحت نے انسانیتِ بکری کے ہر فرد کی تکلیف پیش نظر رکھی ہے۔ تمام لوح کی من
حیث المجموع وکالت کی ہے اور زندگی کے بھاری بوجھ پر ایک اور بوجھ رکھ دینے کو خلافِ انصاف
بتایا ہے۔

۲۔ - مجھ کو محوِ لذت دیدار رہنے دیجیے
دل اگر دہریا تو آنکھیں چاہ رہے دیجیے

لے غبارِ کارِ حال، مطبوعہ آج کل، شمارہ جنوری ۱۹۶۱ء

خامی
اس کتاب ہے کہ یہ مطلع نوح ناردی کا مطلع دیکھ کر کہا گیا ہو گا۔ نوح کا مطلع ہے،

مجھ کو محو لذت آ کر اور رہنے دیجیے

میری گردن پر ورا تلوار بنے دیجیے

یہ میں نے ۱۹۱۹ء میں خود ان کی زبان سے سنا تھا۔ جب میں اس کو خاموش رہا تو انہوں نے میری خاموشی کی وجہ دریافت کی۔ اس پر مجھے بادل ناخوار سے اپنا خیال بوضاحت بیان کرنا پڑا جس کا لٹ لباب یہ تھا کہ لنت آزار میں محو رہنے کے لیے امتداد وقت ضروری ہے۔ آپ نے لفظ "پہنبر" کی جگہ لفظ "دور" لکھ کر شعری معنویت بھرج کر دی۔ وہ بے آپ نے مجھے اس نقص کی طرف متوجہ کر کے بہت اچھا کیا۔ اگر میرے اس پہلے دیا ان کے دوبارہ شائع ہونے کی نیت آئی، تو میں یہ تبدیلی کر دوں گا۔ خدا انصف مزاج نوح کو غریق رحمت کرے! بخود دہلوی میں ایسی انصاف پسندی نہیں تھی۔ ان کے ایک شعر کا پہلا مصرع تھا۔

دشمن نے پاس رہ کے بجا دیں سب عاداتیں

میں نے ان سے کہا کہ اپنے صین کو الف وصل کی طرح تلم کر دیا تو وہ چپک کر ملے، صین بول چال میں اس طرح بولا جاتا ہے۔

حضرت ابوالفصاحت کا مطلع، مضمون کی لطافت اور بیان کے حسن کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

۷۳۔ کس طرح میں نے بسر کی ہے تراغم۔ کہ

مانجنے بیٹھ کے اب زہر بھی کھالوں، تو کہوں

اس کی دلدینے کے لیے یہ فی البدیہہ مصرع کافی ہے۔

مارٹھا، مارڈولا، باسے، باسے

۷۴۔ وہ بشر تھا جس نے سنگِ قہم کو آرا کر لیا

ورنہ اس کی چوٹ پتھر بھی اٹھا سکتے ہیں

چوٹ اٹھانا عاویہ ہے جس کے لطف زبان دو چند کر دیا۔ حسن بیان اور دودھ ترے کی صفائی

قابلِ دید ہے۔ غالب کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا ہے!

رنگِ جنگ سے ٹپکتا وہ ابو کہ پھر نہ ٹھنٹا جیسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شہزاد ہوتا

شامی
یہ شعر بحرِ مدّی مشکلِ لعل ہے۔ اس دوسرے مصرعے کے پہلے حصّے فعلاتِ مفاعلات کے الفاظ مصرعتی
کے ہیں جنہیں محض وزن پورا کرنے کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ بہر حال مضمون اچھا ہے، گویا ان مشکل
سے خالی نہیں۔

۷۵۔ اس زمانے میں تو رنرل ہی سے پوچھو یہ باعث

بھولے بھوکوں کا کوئی راہنما ہے کون نہیں!

یہ شعر ان دینی اور دینی رہنماؤں پر لٹھی غلات چڑھا ہوا اتنا زیادہ ہے، جو صدق و صدا کا جائز
ہمیں کر خدا کے ساتھ لوح بندوں کو اپنا آلہ کار بناتے اور خوب کائی کرتے ہیں۔ مضمون اتنا
بلخ اور بیانی فصیح ہے کہ سنسنے یا پڑھنے والے کی زبان سے شکرِ ارواحِ داکھتی ہے۔

(ب) رباعیات

تقدیر جب آبِ زر سے منہ دھوتی ہے آلودہ وہ مگر دغم سے کب جوتی ہے
لہذا کے گھوٹوں رنج و غم ہنستے ہیں تادار کی دنیا میں خوشی روتی ہے

بقض میں یکسر گنجِ قماروں نہ سہی تاجِ سیرکڑس و فریادوں نہ سہی
لے بھر کرم! کچھ تو عطا کر مجھ کو قطرہ ہی سہی، فرات و جیہوں نہ سہی

ہر ایک کے دل میں کب سہرہ ہستی دیکھا ہر ایک کے دل میں شوہرِ مستی دیکھا
پانی نہ کہیں خدا پرستی ہم نے ہر ایک میں رنگِ خود پرستی دیکھا

مشکل کا یہ اصرار کہ اب کام دکھ مقصد کی یہ تاکید کہ آرام نہ کر
اٹھ بانہ لے بہت کی کمرے نادانانہ آواز کو سر مندہ انجم نہ کر

شاعری

یہاں میں جسے کسبِ کمال آتا ہے دولت ہی سے قدر و منزلت پاتا ہے
ارکے عیب میں بھی ہے حسنِ قبول بے زر کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے

یہ درمیان تو دورِ کمالِ ایشِ دل پاکیزگیِ دل سے ہے زیبائشِ دل
ایشِ تن کا ضبط رکھنے والے! آرایشِ تن، نہیں ہے آرایشِ دل

ح (نظمیات)

میں قطعاً، اشتغالیات، محضات اور مسدسات شامل ہیں، جن سے آپ کی شریںِ ذہانی،
پریانی اور قافدا لکھائی حسبِ معمول نہایت نمایاں طور سے آشکار ہے۔ میں اور بابِ ذوق کو
یہ نظموں کی طرف خصوصی توجہ دلانا چاہتا ہوں ان کے عنوان یہ ہیں:
یہ کلام کو الوداع، دعوتِ عمل، معراجِ انسانی، انقلابِ زمانہ، مفلسی دیے چادگی،
ماہِ جوانی، آئینہ، قوی انتشار، مفلس کی عید، غلامی، فسادات، دستِ کاڈ،
ہمدانِ وطن، یومِ آزادی، تیرا دیوانہ، خدا کس جگہ نہیں، غریبوں کی دنیا،
ششِ طلب، ابناءِ وطن کا حالِ نادر، ان مینت، ابلا کا جلال، بہادر،
مادہ نگہ، قوی جھنڈا، مبارک یومِ آزادی، جہاتِ گاندھی کی عظمت، بیفت،
وطن۔

د (تاریخیں)

ہاں چند مادہ ہست تاریخِ نقل کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ تاریخِ گوی میں مادہ تاریخ ہی قابلِ ذکر
نہاں ہے۔ ہر مادہ تاریخ پورے پورے مصرعے میں ہے جس میں بھرتی کا کوئی لفظ نہیں آیا۔
۱۔ تاریخِ وفاتِ حضرت فصیح الملک داغ دہلوی:

شاعری
بلبل ہندوستان آج اپنے گلشن میں نہیں
۱۳۶۲ ہجری

۲۔ تاریخ قیامِ جہدِ ہند
اہلِ وطن کا طوقِ غلامی اتر گیا
۶۱۵۵۰

۳۔ تاریخِ وفاتِ شاعرِ اعظمِ مینگو
کچھ اٹھ گیا ہے شاعرِ مجزبیاں مینگو کھجڑا!
۶۱۹۴۱

۴۔ تاریخِ وفاتِ حضرتِ فرحت
فرحت نہیں گلشنِ جہاں میں
۱۳۶۲ ہجری

۵۔ تاریخِ عیدِ مبارک
نویہِ خرمی و خردہ عیش و نشاط آمد
۱۳۳۷ ہجری

۶۔ تاریخِ طبعِ دیوانِ شعاعِ ہبر
حسنِ مثنوی کی غنچہ نظر آئی کیا کیا!
۱۹۹۴ ہجری

۷۔ تاریخِ شاعرتِ گلستاںِ شاد
جو کہا، وہ خوب ہے، مرغوب ہے
۶۱۹۳۲

(۵) مزاحیہ اشعار

۱۔ پچھالی کا میں ولادہ نہیں ل ساقی اٹھا میڈا اگر ہے تو بتا کر نہی ہے!

- شاعری
- ۲۔ تپش دل میں ہے آہِ سرو کے ساتھ
ہینا جون کا ہے جندری میں
- ۳۔ شعروانی ہنوائے چنگ ہے
داد لینے کا یہ اچھا ڈھنگ ہے
- ۴۔ فرنگی کا نگہ ہر بات پر کیوں
طوطی کی بلا بند کے سر کیوں
- ۵۔ اپنا ہے میں عورتوں نے مردوں کے نشان
مردوں پر بھی عورتوں کا ہوتا ہے گمان
آیا کس کو کھینکے، آئی کس کو
کچھ اس کا جواب دیں مجھے، اہل زبان
- ۶۔ اسیرِ حرص نہ کیوں ہو حریفیں طولِ اہل
وہ چاہتا ہے کہ رستی دراز ہو جائے
اے شیخ! اگر نہیں ہیں کوئی ذی شعور ہم
اتنا تو جانتے ہیں کہ تم بے شعور ہو
- ۸۔ ٹوٹ پر یہ ٹوٹ کر دو جو خوش تم
دولت اب کا فذلکوارہ عجبی
- ۹۔ حسینوں کی طرف تو پیٹھ ہو گی
دھرا کیا ہے فتن کی ذکر ی میں
- ۱۰۔ دل لے کے کہتے ہیں کہ زشت اس کی دیجیے
ایسا نہ ہو کہ بعد میں مجھ کو داغ لے کوئی
- ۱۱۔ دماغِ اتری بے ربط کہانی کو سننے کو نہ
یہ اینٹ کہیں کہ ہے، تو ردِ اسے کہیں کا

۱۲۔ جنگ پر موقوف ہو گئے مرنے والوں کا شمار
اس کے عالم میں بھی اس رن کچھ کم نہیں

۳۔ خاتمہ

مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس مقالے میں حضرت ابوالفضل کی شخصیت اور شاعری کے بہت کچھ جانک پہلو بیان ہونے سے روکے اور میں ان کی خفیت سے بھلاک دکھانے سے بھی قاصر رہا۔ درحقیقت کتاب کی شخصیت اور شاعری دو قلم ہیں نہ پیدا کن و بہن کی سمائی ایک کوزے میں ہونی امر محال تھی۔ اگر آپ پر ایک بسوڑ کتاب بھی جاتی، جس میں چاس ساٹھ باب ہوتے اور ان کی توجہ بجداجہ الامور کے جداجدایان پر موقوف نہ کھ کر عمل میں آتی، تو یہ دونوں موضوع تشنگی نکیل کے شاکی نہ رہتے۔

میں شرمندے میں کچھ چکا ہوں کہ آپ کو قدرت کی طرف سے تصفیہ زبان دیان اور تذکرہ شعردن کے کارہائے عظیم کی انجام دہی کے لیے عالم وجود میں آئے تھے آپ ان اہم فرائض سے جس غیر معمولی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہمہ براہ ہوئے ہیں اس کی نگاہ حق داد نہیں دی جاسکتی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے جو کارہائے دشوار آپ کو تفویض کیے وہ کسی اہل زبان کے سرکوں نہ رہے؟ اس کے جواب میں میر اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ قدرت کا ملہ بعض اوقات ہفت خواں طے کرنے کے لیے ایسے افراد تخلیق کرتی ہے، جو ظاہر بہت حقیر اور باطن بڑے صاحب تدبیر ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی، تو پنجاب کے ایک دیہاتی اور خواندہ بہمن خانان کے گھر کا سوانح آفتاب کی طرح حال حاضر نہ ہوتا۔

پچھلے صفحوں میں کتاب کے جن حیرت انگیز کمالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہاں تک

فخاری

اصل کر رہے ہیں کہ بیوی صدی کی تاریخ اور دین زبان کی اتنی تطہیر اور مضامین کی ایسی
عزیزہ آپ کے کلام میں نظم و نظام کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اگر میں مومن کے ان دو فخریہ
شعروں میں خفیف مبالغہ کرتے "میری" اور "میرے" کی جگہ "ان کی" اور "ان کے" لکھ دوں
تو یہ آپ کے لطف زبان اور علوم مضامین پر ایسے چپ پاں ہو سکتے ہیں جسے فی الواقع آپ ہی
کے اشعار و زنا کے متعلق رقم پیر ہوئے تھے:

سامنے ان کی تر زبانی کے نطقِ الکن حدیثِ بھائی
اللہ کے گوہر تمام نا سفتہ ان کے یا قوت سب بخشائی
اکثر شعراے کبار نے اپنے کمالِ فن پر تفاخر کرنے میں متکبرانہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً:
گوہرِ یں ندرتِ بدر اندر کسے گوید دوست
لا فرم دار القمار مسجدِ اقصاے من (خاقانی)

دودمانِ شعر را از من مگر ای تر ز زار
جوہر من کرد روشن گوہر آبا سے من (عرفی)

ایک عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا سر مایا ہوا (میر)

مومن! اسی نے مجھ پر دی برتری کسی کو
جو بہت فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا (مومن)
مگر آپ کو اپنے فطری انکسار کے باعث بھی خود ستائی کا خیال تک نہیں آیا۔ آپ نے
اپنے کلمات کے متعلق حرف اٹھا کہا ہے:
انکار کیجیے نہ کمالِ لب جو شس سے کم گو سہی، مگر وہ سخند و ضرور ہے
لہذا وہ تمام ایک جگہ تھا۔ شہ آبا سے آبا سے معنوی یعنی شعر لے معنوی مراد ہیں۔

شاعری
 آپ نے ہمدردی کی پابندی کی وجہ سے لکھا تھا، مگر میں نے ہمدردی کے ذریعہ حیات
 زندہ ہاویہ ہمدردی کے لیے اپنی مطلق کے صیغہ واحد غائب کی جگہ حال کا صیغہ
 غائب تک کر فال بد کا ازالہ کر دیا ہے۔ آپ کم گو کیسے کہے جاسکتے ہیں۔ عظیم ہمدرد
 جنوں دہش افروشی اور مجبور رہا بیات (زیرو جیب) کم گوئی پر دلالت نہیں کرتی
 آپ اپنے کبر سن اور اس اردو کش زمانے میں سخن نہیں لکھتے ہوئے کہ وجود حسبِ معمول
 فیض و بلخ اشعار کہے جاتے ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے:

کوئی جو ہری، جو شخص! ہو یا نہ ہو

سختو، جو اہر اگلتا رہے

اب میں آفریں آپ کی پیشال شاعری کے متعلق ہمدرد شاعر اور پاکستان کے تمام اہل
 ادب میں جہانی اربابِ ذوق کی رے ایک شعر میں نظم کیے دیتا ہوں۔

شاعری جو شمسِ لبانی کی

ہے نوا ساز آسمانی کی

کلام جوش ملیانی

سرسری جائزہ

جوش ملیانی شعرا کی اس لہجہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں باقیاتِ صالحات کے نام سے پکارا جائے تو بجا نہ ہو گلاں کا کلام از اول تا آخر نکالی ہے اور اس میں جو صلاحیت، پختگی اور اثر افزائی ہے وہ شعری ذوق کی تمام تبدیلیوں کے باوجود ہم سے غراجِ نحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتی۔ یہاں میں شروع ہی میں اس ادب کی جانب اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جوش کی غزلیں ان کی نظموں پر ہر طرح سے فوقیت رکھتی ہیں اور ان کے خواننے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا ذہن اور شعری مزاج جس طرح غزل کے مقررہ سانچوں میں اپنے لیے اظہار کی نئی راہیں نکال لیتا ہے، وہ ان کے لیے غزل کی نسبتاً آزاد فضا میں ممکن نہیں۔ اس سے جہاں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غزل کی آگوست ہمارے شعرا پر اتنی مضبوط ہے، کہ ان کے لیے اس سے کسی حال میں غفلت ممکن نہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے موزون علائم میں تحریر کے مختلف پہلوؤں کی طرف لطافت و ذوق کے ساتھ اور طبعِ انداز میں اشارہ کرنا ممکن ہے۔ جوش کی نظمیں عموماً ذوقی دلچسپی کے موضوعات سے متعلق ہیں، یہ سب وطن کے جذبات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں قدرتا شاد ہے اور تجربے کی اندرت ایسا بھی کی کمی ہے؛ خیال اور احساس کی جدت اور جھپٹائی بھی خال خال ہے، جس سے قاری کی نظر ان نظموں پر چبھتی ہوئی سجاوٹ

کلام میں مسیحا

ہے اور زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ لیکن اس کے برعکس ان کی غزلیں کا معاملہ اس سے
یکسر مختلف ہے۔ رنگ غزلوں کا بھی بیشک پُرانا ہے، لیکن اس پر آنے والے انداز میں ایک
بھراؤور کیفیت ہے۔ دروں میں غزل کی نمایاں خصوصیت یہ ہے، اور غزل گو شعرا
شاہدے اور تجربے سے کہیں زیادہ تخیل کی جبر پر داندی پر بھروسہ کرتے رہے ہیں، اگر
کہ ان کے نزدیک حقیقت کے داخلی پہلو اس کے خارجی پہلوؤں کی بہ نسبت زیادہ
وقع ہیں، یا یہ کہنے کو جلدی مشاہدات اور جتنی تجربے اس وقت تک وضع ہیں ہی
سکتے ہیں جب تک کہ اندرون کی آگ میں تپ کر ان کی قلب باہت نہ ہو جائے، لیکن
چونکہ ہر کیف ہم خامچ کر دنیا سے اپنا تعلق یکسر قطع نہیں کر سکتے، اور حشر و محبت
اور ہر طرح کے انسانی جذبات کی آماجگاہ انسان کا وہ باطن ہے جو اس خارجی
کائنات میں پیوست ہو۔ اس لیے ہر اٹھ لہریں کے باوجود خارجی حقیقت کی چھوٹ
اس باطنی کائنات پر رہ کر پڑتی ہے۔ اسی باعث غزل گو شعرا پر یہ الزام کہ وہ
کلیتاً اپنے تخیل کی دنیا ہمیں سانس دیتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے
کہ اندرونی کائنات ہی وہ نقطہ اذکار ہے جس کے ذریعے سے ہم ان کے فکر
فن کی جہت کا تعین کر سکتے ہیں۔

اوپر میں نے کہلے کہ جوش مسیحا کی شاعری کا رنگ پُرانا ہے۔ اس سے دراصل یہ اثنا
کرنا مقصود تھا کہ ان کی آواز اور شعری لب و لہجہ فانی، اصغر، جگر اور حسرت سے
بھی پہلے کے شعرا کے مماثل ہے۔ کیونکہ ان چاروں شاعروں کے یہاں بھی ہمیں
ایک حد تک نئے دور کی آواز کی تحریر اہل محسن ہوتی ہے۔ فانی اور حسرت اس
نمائندگی سے زیادہ ممتاز ہیں۔ فانی نے خاص طور پر اظہار بیان کے سانچوں میں
یعنی تالیف کی پابندی کے باوجود اپنے صوتی تجربات سے ایسی جھلکا پیدا کر دی کہ
ان کی شاعری ایک مخصوص انفرادیت کی حامل بن گئی۔ اسی طرح حسرت بھی
پہلے ہوتے ہوئے بھی بھگتے معلوم ہوتے ہیں جوش مسیحا کی غزلیں ہمارے
یہ دفعتاً امیر اور ادب کی یاد آ رہی ہیں۔ جن کے یہاں ہمارے اور بندش

کلام جوش لمبانی

جوشی ہر مقدم پر دواؤ تحسین طلب کرتی ہے۔ یہاں کوئی آواز چاؤ نہیں، نہ خطابت کی جذبہ پہنچتی۔ نہ یہاں فکر اور نگاہ کے کوہنٹے پکٹتے ہیں۔ یہاں شاعر اور اس کے محبوب کے درمیان مفاطعہ کے اظہار میں کوئی طنز نہ عنصر نہیں ملتا۔ آپ کو یہاں استاد فرد کی کیفیت ملتی ہے، نہ محبت کی اس داد و ادات میں کسی کشمکش، اضطراب اور تلوؤ کے اظہار کا عکس نظر آتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ جس تہذیبی پس منظر میں یہ غزلیں کہی گئی ہیں، اس میں محبت کے کاہل و بار میں عاشق اور محبوب کے مٹھب اور مٹھلا پہلے سے متعین اور مقرر ہیں۔ مثلاً عاشق کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ فراق کی جانگھل آگ میں جلتا، تر پتا رہے، اور اس کے باوجود اپنے جذبات کا ہر یہ انتہائی فردنی کے ساتھ عاشق کی بارگاہ میں پیش کرتا رہے؛ اور محبوب کا طرہ امتیاز ہی ہے کہ وہ انتہائی شیرینی اور بلے نیازی کے ساتھ اس پورے معاملے پر زیر لب مسکراتا ہے، اور مائی حفاظ اور دم شہادیں کو باقی رکھتے ہوئے عاشق کو ذمہ اتھا را دہ نفسیاتی پراگندگی کی کیفیت میں مبتلا رکھے۔ دراصل اس پورے عین دین پر جاگیر داماد معاشرے کی چھاپ پوری طرح مرتسم معلوم ہوتی ہے۔ یہاں گفتگو اور مکالمہ دو ایسے افراد کے درمیان نہیں ہے، جو کسی تجربے میں ہراری کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بلکہ یہاں عاشق ہمیشہ اور غلام و ستم رہتا ہے، اور بیشتر ماکام بھی؛ اور محبوب کا تخیل اور اس کی بے اعتنا کسی نہ کسی دامادی اور ملک ٹوک کے بغیر جاری رہتی ہے۔ یہی یہاں سارا معاملہ یک طرفہ ہے۔ بلکہ یہاں محبوب کی تصویر بھی پورے طور پر ابھرنے نہیں پاتی۔ وہ ایک جامداد و رجول اکائی کی طرح سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اس کے خد و خال کی تشکیل دیکھ سکتے ہیں نہ اس کے عجوبی برتاؤ کی گے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں نہ کوئی کردہ خود اپنے احساسات اور تبدیلی کے آئینے میں کبھی پیش ہی نہیں کیا جاتا۔

ایسا اور عارض کی خسرو دہانت جس کے جوش لمبانی زمین اور دواش معلوم ہوتے ہیں اپنے اندر یہ وصف لکھی ہے کہ وہ جذبات اور احساسات کے اظہار میں کسی تعقید اور تعقید کی محتاج نہیں ہے۔ بلکہ واضح اور مبہمتہ دلائل کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

کلام خوش لیاں

دو مہل پہ دونوں شاعروں کو کشش کی ایک کڑی میں جس کا مرکز و محور زمان کی اصطلاح
 ہی نہیں بلکہ اس کی تطبیق اور توسیع بھی تھا۔ دونوں شاعر مطلقہ بندی کے پے نہیں چڑھے
 مشہور ہیں، جو جو باچائی اس کی ایک ہندب شکل ہے یعنی اس میں ایک چو پھلا، ایک
 چھیر اور دل لگی، ایک طرح کی آنکھ چولی پائی جاتی ہے۔ ایمر اور داغ دونوں ہی کے
 یہاں ایک طرح کی طاری اور دھول و دھبیا بھی ملتا ہے۔ داغ کے یہاں یہ رنگ بہت
 فروغ و شگ ہے۔ ایمر بھی اپنی نئی زندگی میں اتفاق کے باوجود شاعری میں تھل کھینٹنے
 سے بہرہ نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ دونوں کے یہاں (اور داغ کے یہاں ایمر کی بنیاد
 پر کس زیادہ) زبان اور محاورے کی سادگی چستی اور صیقل بہ رجز اتم ملتا ہے۔ خوش لیاں
 کو بھی لپافہ و بیان پر جو قدرت کا طرہ حاصل ہے، وہ ان کے سر و تن پر بجا کی پیداوار
 ہونے کی وجہ سے، واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کے داغ
 سے شرفِ طہ کا نتیجہ رہا ہو۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ خود شاگردیں یہ خداداد عکس اور زبان
 سے مناسبت پہلے سے موجود نہ ہوتی تو استاد اس میں کیسے معاون ثابت ہو سکتا تھا۔
 بہر حال انہوں نے غزل کی شاعری کی ندایت کو اسی طرح برتا ہے۔ جیسے داغ کے کتب
 کے اور دوسرے شعرائے۔ یعنی ان سب شاعروں کو بڑھ کر یہ اعلاہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر
 تجربے کی صداقت کی اس حد تک ضمانت نہیں کرتی، جتنی مرد و معنائین کو چاہے کہتی
 اور ہر مدحی کے ساتھ برتنے کی۔ بالفاظ دیگر یہ شاعری واردات یا آپ بیتی کی شاعری
 نہیں ہے، اور ان کا یہ اس میں ایک نوع کی بے چکی پائی جاتی ہے۔ اس قسم کی شاعری
 کے ٹھٹھنے سے جس طرح فضا کا تاثر ابھرتا ہے، وہ نہ صرف زبان کی فائیں، لفظ کی
 گرا گری اور نوک جھونک، مسابقت اور تقویٰ حاصل کرنے کا جذبہ، رقابت اور ٹالک
 لپیٹ، اور ان سے منسلک جذبات کے بڑا اظہار کا تاثر ہے۔ یہاں زندگی کے اہم مسائل
 کے شعور اور ان سے دست و دگر بیاں ہونے کا کوئی احساس نہیں ہوتا، اس فضا میں وہ
 آواز مہکا ہے جو خانقاہِ اقبال سے پیدا ہوتی ہے، اور جسے زندگی میں غم اور موت کا
 دینگا جو احساس بھی نہیں بھرتا۔ یہاں آئینوں میں بھی چہروں کی جھلک اور سانس کی جھلک

کلام جوش ملیحانی

یہاں شکوہ شکایہ عام ہے یہاں ہلکیاں اور گدگدیاں ہیں یہاں اپنی لہتی اور فروتنی کے
 اظہار میں بھی تعلیٰ کی شان اور جذبہ تفاخر پایا جاتا ہے۔ یہاں مغنوں کی یا تو ریل جذبات
 سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ایک طرح کے تسلسل و دایہ پر زور ہو۔ امیر اور دروغ کے انداز کی
 جو غزلیں جوش ملیحانی کے یہاں ملتی ہیں ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

مخو زخمی تو مشکل ہو گئی بسر ہوتے ہوتے بسر ہو گئی

آئندہ جب تیر بن کر رہ گئی جان بھی نچیر بن کر رہ گئی

اگ ہوا گتری تیج ادا کا پانی ایسے پانی کو میں ہرگز نہ کہو گلا پانی

مے نہیں بڑھتا تھلی ہے یہ پیاسے میں سینکڑوں ٹوکہ نظر آتے ہیں میخانے میں

دعاؤں میں ہو گا اثر ہوتے ہوئے فب غم کی ہو گی سحر ہوتے ہوئے

کچھ تو منہ سے نکل گئی ہو گی باتوں باتوں میں چل گئی ہو گی

نہایت مشکل تم ہو، نہایت پر جفا تم ہو تعجب ہے کہ پھر بھی قابلِ صدمہ رہا تم ہو

اتنا گراہ نہ کر، صبح ناداں بھ کر بڑھ کے ایساں سے ہو وہ دشمن ایساں بھ کر

ہم نے وہ بہاں بھ پیسب کہنے کی باتیں یہی دسازیاں دم پر بنا دینے کی باتیں ہیں

ہلا چکا ہونے مارا سوزِ الفت کے مارنے مارا

ان پوری پوری غزلوں کے علاوہ اسی رنگ کے چند متفرق اشعار بھی غور طلب ہیں:
 اپنے دل اتنے کچھ پا مال تو نچی رفتار بھی شرا گئی

باد تندر کی موجوں سے یہ کٹ کا ہے مجھے کہ درد و دہانہ جانے کہیں بیانے میں

وہ مجھ خویش کن سے پوچھتے ہیں کہاں جانے لگے ہون سنورک

برسِ تسلیم کا جھکنا تھا لازم جھکی جاتی ہے قاتل کی نظر کو

مٹا عدل کا تم نے چھپا یا بھی، تو کیسا اپنے ہونٹوں کا تبسم جب چھپا سکے نہیں

دم پر بھی بنے، تو جی دھوٹے ہوتا ہے یہ دل کسی کسی کا

دور و دورے کہ چہرے میں ستم کا ہے آج ایک فریاد مرے دل کی تمنا ہو آج

ہمارے زخمِ دل سے کھل گیا یہ راز کیا تمہارے کسی علاوہ کے ترکش میں پتھر بے خطا تم ہو

گرم آہوں کو تورو کو کھلا، مگر خوف یہ ہو گرم اشکوں سے دھیل جانے دشمن میرا

کہا تم نے مناسب نے اب اور اتنا بتا جاؤ یہ دھسے میں کہ فقرے میں باتیں ہیں کھائی

یہ آتی ہے جب ان کی نگہ ناز مجھے ایک بوجھ مرے سینے پہ تنی ہوتی ہو

کلام ہوشِ مہمانی

بہت مرد میدان بھی دنیا میں تھے شجاعت پر نادرال بھی دنیا میں تھے
 مگر چوٹ مہ جائے تیر نظر کی ؛ یہ دل یہ کلیجہ کسی کا نہ دیکھا
 ہوشِ مہمانی کی غزلوں کی ایک خصوصیت جو زہرہ کو بہادی توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہو،
 وہ ہے صنعتِ تضاد۔ انھیں تضادات کے برتنے کا خاص سلیقہ حاصل ہو۔ اور وہ اس
 معنوں آفرینی کا کام لیتے ہیں یعنی اس کے ذریعے سے کسی مخصوص حقیقت کے متضاد پہلو
 نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ غزل کا ہر ایک شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے یہ اس کی خوبی
 بھی ہے اور خامی بھی۔ خوبی اس لیے کہ ہر شعر ایک مکمل مفہوم کا احاطہ بھی کرتا ہے، اور خود
 کفنی بھی ہوتا ہے، مباحثہ وہ مانتے ہیں جلد پیوست ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔
 خامی اس پہلو سے کہ ہر شعر کو ایک معینہ سانچے میں اپنی جگہ رکھنے کے اعتبار سے اپنی ساخت
 کے لحاظ سے اہم ہونا چاہئے، تاکہ تمام اشعار مل کر ایک بھرپور تجربے کی شعری و تعمیری عظیم
 میں مدد دیں۔ بیشک بعض غزلیں مسلسل بھی ہوتی ہیں۔ اور مسلسل غزل میں یہ وحدت اور
 صاف طرزِ بھگتا ہے۔ مگر غزل کے لیے بحیثیت ایک صنف یا سلسل لازمی نہیں
 یہ بھی ممکن ہے کہ کئی اعتبار سے چاہے ہر شعر اپنی جگہ جدا گانہ مفہوم کا حامل ہو، لیکن جذباتی
 منطق کے اعتبار سے، جو ہر غزل میں مین اسطورہ پائی جاتی ہے، وہ دوسرے اشعار سے
 علیک اور متصل ہو۔ ہر شاعر کے یہاں تضاد کی یہ صنعت ممکن ہے، بادی النظر میں یہ
 تاثر پیدا کرے کہ وہ محض ایک طرح کی لفظی بازی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اصل
 غیر شعوری کوشش ہے تاکہ مخصوص تاثر یا تجربے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی تاک اس
 سے دوسرے امکانات بھی واضح کیے جاسکیں۔ اس سے شاعر کو یہ فائدہ حاصل ہوتا ہو
 کہ وہ ان تضادات سے ایک ہی تاثر کے دو مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے کے مقابل
 رکھ سکتا ہے۔ اس سے شعر اک دم چمک اٹھتا ہے، اور ایک غیر مشتبہ حقیقت کو ہمارے
 سامنے پیش کر دیتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے،
 ہم کہتے ہیں غم ہی سے کچھ آباد ہے دل غم کہتا ہے برباد یہ گھر بڑے کے ریگا

سکھم ہر خیالیان
جس کا دل رنج و الم میں شاد ہے
وہ خواہش میں بھی بہار ایجاد ہے

نادیوں اہل جنوں گریہ خویش کی مجھ
میں نے گلزار کھلائے ہیں بیابانوں میں

دور کردیتا ہے راہ شوق کی تارکیاں
شمع بن جاتا ہے ہر ہوا درجہ جل جلالہ

بالآخر انھیں رحم آ ہی گیا
یہ بھاری گی چارہ مگر جو گئی

نڑے میں حیات بجاوہ ان کے ڈھونڈنے دے
خبر بھی ہے کہ مرگ ناگمان تکلیف پہنچی

میرے اشکِ خویش کی ٹھکڑیوں سے
جنونِ محبت کا یہ فیض سمجھو
نارے کو زنجیں تباہیں ملی ہیں
بیابان میں بھی ہیں جن کے نظارے

لے خود آتے ہیں نیراز جنوں میں توڑوں
تیرے بڑھتے ہوئے دعوں کا بھرم تو کھو ل

پردہ داری را زلف کی بہت سی لطف تھی
دوڑاقتاد ہے مرگ پر دھین ہم کو حیات
دل کی مینا بی نے یہ مضمون سراں کدیا
بہی حال ہم درجہ میں کبھی جی اٹھے کبھی گرے

انھیں کے دیدہ باطن کو روشن ہم سمجھتے ہیں
ہر اک صبح سترت کو جو شام غم سمجھتے ہیں

مگر کی دیرانی جو یاد آئی مجھے
دشت کا دھوکا ہوا مگھواری پر

مگر ادھ ہوں کہ جس کی تشریف
چارہ ہے جنونِ دیر کا

کلمہ خوش مسیان

یہ نئے آپ اللہ کا نونہ سے ہرگز سن نہیں سکتے

مرے سادہ غموشی کی صدائیں اودھ ہوتی ہیں

پڑ گیا بہرہ وفا پر بھی جفا کا سایہ دوستی دشمن ایمان بھی ایسی تو نہ تھی

قضا کی زد سے باہر ہیں محبت کی تمناؤں مری دنیا کے لافانی کو فانی کو کون کہتا ہے؟

توڑنی ہے ابھی دیوار گلستان مجھ کو ترک صحرا پر نہیں ختم مرا عزم صمیم

ہوں صحن گلستاں ہے، خدا خیر کرے! خواب میں بھی نظر آتے ہیں یہاں مجھ کو

ستم کو بھی کوہ سمجھا، جفا کو بھی دف سمجھا مگر اس پر بھی ان کی چین پشیمانی نہیں طاقی
میں نے شریعت میں یہ اشارہ کیا تھا کہ خوش مسیان کی شاعری غزل کے مرد و موضوعات
اللہ سالیب کی پابندی ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ غزل کے اس مکتب طبع سے
نزدیک قربت اور ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں جسے امیرادب خان کا مکتب کہا جاسکتا ہے۔
اس مکتب کے خاصا نفس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ اس کے اوپر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ
سلک ہے کہ اس روایت کے اتباع کے باوجود خوش مسیان کے کلام کا خاصا بڑا حصہ
وہ ہے جو ان کی اپنی القادسیہ کی غازی کو تا ہے۔ ہر چند غزل کے روایتی معیار میں
ظاہر ذکر اضافہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو میں نے انھیں پامال شاہراہوں کے
دوریاں اپنی راہ خود نکالنے کی کوشش کی ہے اور وہ سبھی بہت کامیاب بھی رہے ہیں
شہور راہنمائی تقادفی، ارس، ویلٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جدت کی تعریف ہی ہے
کہ حاجت کو اپنی طرح جذب کرنے کے بعد سلسلہ سالیب میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو
قدح کی تازگی اور خوشنوازی پر دلالت کریں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے
کہ طبیعت کو نیا دینے کے بغیر کسی طرح کی جبر و طردی کا وجود دیں لانا کسی کوشش

کلام پیش طبعان

مراد ہے جو نامتحن بھی ہے اور ناشکور بھی ہوتی ہے اس جدت طرازی کی پر
کہ فرسودہ کار باسی مضامین کو باندھنے اور معروف زمینوں میں طبع آزمانی کے
کسی ایسے شعر سے دوچار ہوں جہاں مشاہدے کا صداقت اور شگفتگی کا احساس
کے لئے پن کا، یا کسی ایسے زاویہ نظر سے حقیقت کو دیکھا گیا ہو، جو خلاف معمول
کی قوت اور پاک اور قوت تخیل میں کسی ایسی فضل سے ہمکنار کر دے، جو اچھوتی ا
ہونے کے باوجود لذیذ ہو اور کشادگی و حسن و نظر کا وسیلہ بنے۔ غزل کی عشقیہ
تین مختلف نقطہ نظر سے رکھی جاسکتی ہے، یعنی اس میں یا تو معاملہ بندی اور سرا
ہندہ ہوگا، یا محبت کی نفسیات کے پیش کرنے پر یا عاشق کے جذبات کی مرقع نگاری
کا مدخل عشق کے سلسلے میں کیا ہے، کیا ہو سکتا ہے اس کی ہماری غزل میں اف
حد تک کی ہے، کیونکہ اس میں کسی ڈرامائی عنصر کی نگاہ پیش ہی نہیں ہے۔ یہاں
سرا پاؤں ملتا ہے، لیکن محبوب کے احساسات کے آثار چٹھاؤ کا اندازہ ملتا
غزل کی شاعری پر الزام تو ایک حد تک صحیح ہے کہ اس میں واقعی تجربے کی تر
نسبت قائم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس میں محبت کی نفسیات کی حکاکسی
پیش طبعی کی انفرادیت و اصل ان متفرق اشعار میں نمایاں ہوتی ہے، جو
اندازہ بیان کے درمیان جا بجا بکھرے پڑے ہیں اور پڑھنے والے کو چوٹ کا دیتے
سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہر شتاور کو ہے ساحل کی طاق کون جانے عشق کی گہرائیاں

اب بھی ہر دینے میں عکس ان کا نظر آتا ہے چور ہو کر بھی مراد شدہ دل

دادیں اہل جنوں گریہ غوغا کی بجھے میں نے مغلوار کھلائے ہیں میر

مری دیوانگی جز حق ہوئی دیر انکی سبھو یہ عالم ہے کہ ملیے سے بھی وحش

گھر کی دیرانی جو یاد آئی مجھے ^{کلمہ پوش لبانی}
دشت کا دھوکا ہوا سگڑا ہوا

یہ بے نیازئی و در شباب تو دیکھو ^{دول کے آنے کی ہر دوائی نہ دل کے جانے کی}

لاہ صحن باغ ہوں گو ہر شب چراغ ہوں ^{پھر بھی میں ایک داغ ہوں دیدہ انتظار میں}
جلد مع دکھا کہیں دل کی خلش شاہیں ^{نیند ہی بن کے کہیں دیدہ انتظار میں}

وہ یہ کہتے ہیں سرے گلپوش آنسو دیکھ کر ^{پیر بھی اب ترا گل پیر بھی ہو جائیگا}

قبضہ گر ہے کہیں چاک دہو جائے جگر ^{رند آنسو کی بھی میرے کی کنی ہوتی ہے}

مگر وہ ہوں کہ جس کی شورش ^{چادہ ہے جنون رہبری کا}

ایک دھنست سی ہوئی جاتی ہے طاروں لگا ^{ان کی دیوار کا سایہ کوئی سایہ تو نہیں}

مگر غم دل پہ نمایاں کبھی لسی تو دھکی ^{دندگی خاک بد اماں کبھی ایسی تو نہ تھی}

نک نقط میں ہی تو ناکام نہ آیا ظالم ^{خاک ادا تی ترے کپے سے صبا کی آئی}

ذہبے و سہ پر بھی جاتی ہوا آفتی ہی نہیں ^{چشم حیراں نے کیا اور بھی حیراں مجھ کو}

دل کی محفل میں دل پر اضطراب ^{ایک شعلہ تھا جو حقرا آرا}

کلام جو فرمایاں
 کیا کر امعا ہونہ آنکھوں میں سمٹ کر گیا
 ہر شام پر گمان تھا صبح نشاط کا
 کیادں تھے وہ خوشی کے لہو

سوزش و دغ دردوں سے نظر آتا ہو مجھے
 بھونک دیکھاپہ جو ارب تہ دا
 جوں سیر گشتاں ہے خدا خیر کرے!
 خواب میں بھی نظر آتے ہیں

ماؤں وہ کیا ہوں مری فریاد و فغاں سے
 ہر نالا غم سا و شکستہ کی

تمہے غم میں ذول کی وہ سر رختا نیاں ہیں
 کہ اثر بھی جل چیا ہے مری
 ان شہاد میں سے تقریباً ہر شعر تجربے کے کسی نہ کسی ایسے گوشے کو روشنی میں
 غیر متوقع ہوا اور گرجا ہوش ملیحائی گو زبان اور محاورے پر پوری قدرت
 کسی قدرت جو کسی بھی اہل زبان کو ہو سکتی ہے۔ لیکن ان شعرا میں محض زبان کا
 اصل چیز نہیں ہے، یہاں خیال اور احساس کی پیچیدگی بھی نہیں ہے، ہمیں وہ
 کے پیل میں شہر ملی ہو کہ چشم کے ان خیال اور جذبے کی بھر پور قدرت اور
 روحانی اندیشہ کا طرہ امتیاز ہے۔ امیر اردو داغ کے دوسرے کتابت
 نے بہت سی کویش بدلی ہیں۔ مگر کو ہم ہر چند داغ کی زوایت سے منک کوں
 نے بھی اس وحدت کو ہر کیف آگے بٹھایا ہے اور حسرت اور فانی کا لگ تو
 ہر تقدیر سے یقیناً مختلف ہے۔ اقبال کا کا نام سب سے ملک اور مغرور
 فیض ازل کے بعد ہے اور نام کا کلی نے غزل کے رنگ وہ ہیں ایک نیا پا کھنچ
 اعتبار سے دیکھیے، تو جو شخص ملیحائی مثنوی کی آواز بارگشتہ معلوم ہوتے ہیں
 انہیں غالب کے کینٹے رجو حیرت انگیز تصوف حاصل ہے اور اس کی لگ بھگ
 والدین میں، وہ بلاشبہ قابل ستائش ہے، اور اگلے لگوں کے ہشتاں کا

میرے والدِ محترم

ہندی کے کنارے جس کا نام مہین سفید ہے، ملیان کا قصبہ آباد ہے تقسیم ملک سے پہلے
 مکی مشیر آبادی مسلمانوں کی تھی، جن میں سید بھی تھے راجپوت بھی، الراجپوت بھی، اور پیشہ ور
 بھی۔ کچھ خوب تھے جو سیپ کا کام کرتے تھے۔ ان کا یہ کام دور دور تک مشہور تھا۔ کچھ سنا
 ہو جو کھوٹے سنگے بناتے تھے، ہیے لوگ انھیں سنا کے بجائے کھٹیا رے کہتے تھے۔ یہ سب
 ان آباد تھا۔ اس لیے کئی مشمولات تھے جس حق میں ہمارا گھر تھا اس کا نام عاقل پور تھا۔
 میر ہندوں کے گھر دو چار ہی ہونگے۔ مسجد سے اذان کی آواز ہر وقت سنائی دیتی اور اللہ اکبر
 میں کئی بار سنتے۔ پڑھا کھا یہاں کوئی نہیں تھا۔ جموں کی دستخط کرنے والے لوگ تھے۔ در نہ
 یادہ ترانگو ٹھا ہی لگاتے تھے۔

صوبہ ایک زمانے میں بیدوں کی جاگیر تھا۔ بابا سکھ سنگھ بیدی انیسویں صدی کے آخر میں ہیں
 نقل مکان کر کے راولپنڈی چلے گئے تھے۔ ان کے خاندان کی انگریزی دربار میں بڑی عزت
 تھی۔ کچھ بھائی کے پوتے جج کٹنر اور اسی قسم کے متنازعہ ہڈوں پر فائز ہیں۔ ان کی باہو درنی
 کے بھائی۔ طیلے اور دوسری عمارتوں کے کھنڈریں نے بھی اپنے بھین نہیں دیکھے ہیں

میرے والد محترم
 میں ایک برہمن خاندان میں میرے والد کا جنم ہوا۔ میرے دادا کا نام پنڈت موتی رام تھا
 اور پیرا دادا کا پنڈت نہال چند۔ والد کا نام مہورام رکھا گیا۔ اسی زمانے کے یہ ان پڑھ لوگ
 ناموں کی نفسیاتی اہمیت نہیں جانتے تھے۔ میرے مایا کا نام دیا رام تھا اور والد سے عمر
 میں سات اٹھ سال بڑے۔ ایک چھوٹی بھینس جن کی شادی ہو خیا پور کے قریب کے ایک
 قصبے خاپور میں ہوئی تھی۔ وہاں ہی جلد ہی آلام زندگی کا شکار ہو گئیں۔ سنا ہو کہ اس
 بانجھا شادی سے میرے دادا اور دادی دونوں نکلاں تھے۔ سارے خاندان میں صرف ایک
 فوتھا جس میں انسانیت کا جو ہر درجہ اتم تھا؛ اور وہ تھی میری دادی۔ میں صرف تین
 چار مہینے کا تھا جب اس کا انتقال ہو گیا۔ اس فرشتہ سیرت عورت کہ میں نے نہیں دیکھا
 والد اس سے بہت مانوس رہے اور اس نے محنت مزدوری کر کے والد کے اس زمانے
 کے مطلق چھی قلعہ دلائی، یعنی درٹیلارڈل ایک پڑھا دیا۔

بڑے بوڑھوں سے سنا ہو کہ میرے دادا اگر دکانیں بنا کرتے تھے۔ ان کی کشتیاں ریاست
 بھاپور کے قریب دریا میں طوفان کی نذر ہو گئیں اور انھیں مسرت نے اگھیرا۔ میرے دادا
 پشاور میں مہری تباشو کی دکان کرتے تھے۔ ان کی دکان قصہ خوانی بازار میں تھی۔ کہنا
 یہی چاہئے کہ ان کا پیشہ حلوائی کا تھا۔ لیکن ان کے والد قبیلہ کی تجارت کرتے تھے۔
 اور یہ قند سفید کی۔ ان کے فرزند یعنی میرے والد جناب جو ش لمبانی سعدی کے قول
 عمل کرنے لگے بچوں نے بھان کی پہلی نظم "سبب نظم کتاب" میں لکھا ہے:

بدل گفتم از مصبر قند آورند برد و ستال اور مغا نے برند
 مرا گر تہی بود از قند دست سخن پائے شیریں تر از قند دست
 دقندے کہ مردم بصورت خورند کہ اور باب معنی بجا غد برند

میرے آپدیس سے کوئی پختہ در بہمن نہیں تھا۔ پوجا پاٹھ میں شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ دادا
 نے البتہ برہمن پن کی رسم کو خیر باد کہہ کر پشاور کی بودا باش کے زیر اثر گوشت کھانا شروع
 کیا اور ضرب پیٹنے کی بھی عادت دہلی لی، لیکن شکوہ کہ ان کا لکھا یا ہو اور خاندان میں
 پھلا نہیں، ان کی بات انھیں تک وہ گئی۔ پشاور سے نکلا کرتے اور دو چار مہینے میں اسے

فرق ہے ناب کم کے اور اسپیکر کا کہ ایہ ادھار لے کر پشاور چلے جاتے۔ بڑا لڑکا ان کے پاس رہتا تھا اور میرے والد اپنی ماں کے پاس۔ والد جب ان کی محبت کی داستان سناتے ہیں تو جی بھر آتا ہے۔ لسیان سے شاہوٹ تین میل کے فاصلے پر ہے۔ سر دیوں میں اس اسکول میں رات کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ اتنا محنت کون سے تھے اور بچوں کو پڑھاتے تھے۔ کھانا لے کر نصف راستہ ماں لے جاتی اور نصف تک ادھر سے والد خود آتے، اور دو وقت کا کھانا ساتھ لے جاتے۔

والد نے ۱۸۹۰ء کے شروع میں ویکٹر ٹل کا امتحان اٹیا سے پاس کیا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں اپنے والد کے پاس پشاور چلے گئے۔ دادا صاحب بیمار ہو گئے، تو ان کے ساتھ ۱۸۹۹ء میں واپس آئے۔ اسی سال دادا کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی، اور دادا مرحوم کی ۵۲ سال کی۔

۱۹۰۱ء میں انھوں نے نارمل اسکول پاس کیا۔ ڈویژن بھر میں اول رہے۔ ۱۹۰۲ء میں لاہور ٹریننگ کالج سے سینئر ویکٹر ٹریننگ کا امتحان پاس کیا۔ نارمل اسکول کے بعد پہلے پہل وکٹر ہائی اسکول، بعد ازاں مدرس مقرب ہوئے۔ تنخواہ صرف دس روپے ماہوار تھی۔ لالہ رام داس اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، جو بعد میں گورنمنٹ کالج میں فارسی کے گورنر بنے اور اچا رہے رام دیو کے نام سے مشہور ہوئے۔ موسون کالج میں فارسی کے طالب علم رہے تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ "فوت" کو "توت" سمجھتے تھے۔ لالہ گور بخش رائے بھی اسی اسکول میں مدرس تھے۔ وہ ہندستان کے مشہور شطرنج کے کھلاڑی ہوئے ہیں اور ایک دفعہ بابا جیمین بھی رہے تھے۔

ابتدائی زندگی کا یہ مختصر سا خاکہ ہر کو دیکھا کہ کس طرح عسرت میں دن کاٹے، کیسے تعلیم حاصل کی، اور ہر یاد کی اس سہارا کو اتنا اچھا سہارا ثابت ہوا۔

لاہور میں ایک سال قیام رہا تھا۔ وہاں کے مشاہیر دیکھے۔ اقبال اس زمانے میں ابھی غریب تھے اور مشاہدوں میں شامل ہوتے تھے، وہیں آپ نے میرزا ارشد گورگانی اور مولوی نذیر احمد پلوئی کو بھی دیکھا۔ کالج میں پنڈت دلا رام اور دادا فارسی پڑھاتے

انتخاب کلام

غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب

نا کردہ گھا ہی بھی ہوتی کردہ گھا ہی
عشر میں تھیں جو کی پیش کا ہو کیا تو
یہ حال ہے دنیا کا تو حلقہ جو خدایا
تم کو تو بچا لیگی یہ معصوم نگاہی

اہل دنیا سے جواب مطلب دنیا سے عرض
تم نہیں شیش نہیں پتھر بھی پئے جاتا ہو میں
اپنے بادل میں بسائی ہم نے اک دنیا
میرے سانس سے نہیں ہوتی کبھی صبا

ساغر کو تو دنیا کی نگاہوں سے چھلا
ہم جلوہ گرہ ناز کے پردے تو اٹھا دیں
ہاس کے جو جتنے ہیں پھیلتے نہیں جاتے
انکھوں کے جو پتھر ہیں اٹھک نہیں

ابھی تو انک ہی ٹپکے ہیں دیدہ تر سے
عجب نہیں کہ جوں اعد بھی کو سے جھٹک
لگ جیات سے ٹپکا ہوا تو کیا ہوگا
ہمارے صبر کا دامن رُو تو کیا ہوگا

موت کی روک تھام کر یا دینا
سارے گھٹنے سے تھوڑ کر کیا ہوگا
یہ تو ہر ایک پر چھپتی ہے
کھٹے کھٹے ہی رات کٹتی ہے

لہجہ کی تو کسی بات پر حرف آ نہیں سکتا
اسرارِ حقیقت کوئی جانے بھی تو نہ کر
مرد مردہ باطل کو بھی جھٹلا نہیں سکتا
وہ ان کو سمجھتا ہے وہ نہیں سکتا

والد یہاں ڈسٹرکٹ بورڈ دہلی اسکول کے ریٹائر ہوئے تھے۔ حقیقت میں انکی عظمت کا صحیح زمانہ ملازمت کے بعد ہی شروع ہوا۔ اس سے قبل تو لوگ انھیں پہچان ہی نہ سکے۔ زبان کی عظمت ہی کو جان سکے۔ زبان و بیان پران کی قدرت کو بھلا اس علاقے میں کو سمجھتا۔ حیرت اس پر ہے کہ وہ عمر بھر اس علاقے ہی میں مقیم رہے، لیکن دلی اور لکھنؤ کی ملکالی زبان نہ جانے، کہاں سے سیکھی۔ کہا کرتے ہیں کہ جب پندرہ روپے ماہوار تنخواہ تھی تو ان میں سے پانچ روپے کتابوں اور رسالوں پر صرف کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں پیام یاد (لکھنؤ) کمال دہلی، حلیۃ یاد (میرٹھ) اور نہ جانے کتنے رسالوں کفایت دیکھے ہیں۔ پیام یاد میں آپ کا طرحی کلام ۱۹۰۶ء کے قریب سے چھپنے لگا تھا۔ کتابوں کے سنبھالنے کی انھیں عادت تھی لیکن سلیقہ نہیں تھا۔ اب ان میں سے ایک پر ذکر کا قند بھی باقی نہیں رہا۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کا مجموعہ جنون و ہوش ۱۹۵۲ء میں پہلی بار چھپا، تو اس کے بعد انھوں نے اپنی تمام بیاضیں ایک لفظ میں بند کر کے رکھ دیں اور دو تین سال انھیں ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک دن جب اٹھکے دیکھا تو لفظاں باقی تھا اور کلام کی بیاضوں کو دیکھ اس طرح چاٹ گئی تھی کہ کاغذ کا دوا برنج پردہ بھی نہیں ملا۔ میں نے تو ان بیاضوں کو اول سے آخر تک نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھا تھا۔ ان میں کتنا کلام تھا جو ضائع ہو گیا۔ وہ تو کہیے کہ بادہ سرخوش اور جنون و ہوش وہ مجموعے چھپ چکے تھے، مدد یہ کلام بھی ضائع ہو گیا ہوتا۔ بہت سی تقویٰ اور فراموشی نظیں تھیں، قطعات نامیخ تھے، پرانی فوٹوئیں تھیں۔ مشکل زمینوں میں حقیقہ غرضیں بھی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم سے متعلق بیویں نظیں تھیں۔ ایک مدرسہ تھی تو میں پچیس بیڑوں پر خوش تھی، ایک گھر لگا کا تراد، ایک نظم کاسے کی فریاد، اور بہت کچھ تھا۔ کہیں سے ایک مصرع یاد ہے اور کہیں سے دوسرا۔ دیا سلائی پر ایک نظم تھی۔ ایک خوبصورت نظم لب دیا کے عنوان سے تھی۔ اس کا ایک شعر یاد ہے،

حسب متاع ہر سودا حیا رکت ہر کوئی
نظر یاد ساحل جا بجا دیا ہی چلنا تھا

نظم دیا سلائی کا بھی ایک شعر یاد ہے۔

تباہی خیزوں تو یکڑوں طوفان مارتے ہیں
 لکھو قیصر و خاقان کی عظمت ہم نہ مانگے
 کبھی ایسوں کے وار پر سبنا زخم نہیں
 کبھی مظلوم کا آنسو بھی اس سے کم نہیں

عیاں ہو کر سجا وہ ستون کھنڈ ہو ہم نہیں سمجھے
 سر منزل بھی دلتی دور ہے کیوں ہم نہیں سمجھے
 جگر کے داغ ڈال کے داغ لبِ سخن میں سینے میں

چراغِ زندگی بے لبت کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
 لڑوں اپنے دل سے کہ ایک کی نظر سے
 تمہارے سننے سے ہوتا ہی کیا ہے
 ادھر سر بدگمانی، ادھر بدگمانی
 زما دے گا، ہماری کہانی

خستگی میں بھی جو گر گر کے سنھلتے دکھا
 کلاں کے پات کہ خود دل کو میں سمجھا اٹھا
 آفریں کہنے لگی دھڑکی منزل مجھ آ
 آج یہ کیا ہو کہ سمجھائے نگاہوں مجھ کو

جس زب پر یہ زاہد کہ ہو رحمت کی توقع
 مادار کی توقع نہ ہوگی نہ ہوتی ہے
 کچھ کم تو نہیں اس سے ملاد میں تیرا
 دنیا میں تو ہے عیب غریبوں کا ہر جگہ

صل و مجرہیں دور دراصل و گھر کو کیا کروں
 دھاتو میں نے سن لیا اب یہ مجھے بتائے
 نے تو نہیں ہو بد بھر سا غرور کو کیا کروں
 آئیں اگر وہ سامنے کو وقت نظر کو کیا کروں

برا کہہ دیا، یا سبلا کہ دیا
 بڑی چیز ہے جو شمس ایہ زندگی
 بس اب ہم نے جو کہ دیا کیا
 جیسے آپ نے اک سزا کہ دیا
 دینے دہم، درد، آرزو، حیرت
 یہ نہیں جو قصہ کہ نہیں
 حق ہو ہر راں یہ ممکن ہے
 مگر ایسا بھی ہوا تو نہیں

میرے دل پر گھر
 کے اعلان لڑائی کا ہوا غوشِ قہر
 اس کی توپوں سے دھواں نکلا کہ لہان نکلا
 جس جگہ پیرنگا ہوں کے در پہ جاتے ہیں
 لے وطن! تیرے فدائی وہیں ٹوٹ جاتے ہیں
 امان کو نظم کرنے کا ارادہ تھا۔ دوسرے ہی قلم کیے تھے۔ ایک کے چار بند اور ایک کا
 رت ایک بند یا د ہے :

مختار ام کو چودہ برس کا جب بن اس
 بھکا دیا سر تسلیم اس نے بے دوس اس
 سنایہ ہر کس دنا کس نے بادل پر یاں
 شکستگان محبت کے دل کی ٹوٹی اس
 کہا یہ سیتانے میں ساتھ بن میں جاؤ گی
 اٹھانی ہوئی جو کڑیاں وہ سب اٹھاؤ گی

بات سن کے کہا رام نے کہ بے پیاری!
 کسی طرح نہیں واجب یہ شوقِ تیاری
 عین تو کجست محل کا بھی بوجھ ہو جاوے گا
 کو چکا کون سیاہاں میں ناز برداری
 پھینکے دل میں بھی کانٹے بول کے اکثر
 سونگی نالے بھی جانِ ملول کے اکثر

نہ ہنسن کوئی ہو گا، نہ ہنسنا ہو گا
 پناہ کے لیے بس ایک بھونپڑا ہو گا
 دم قدم پہ مستخر کا سامنا ہو گا
 تمہیں بتاؤ کہ ایسے میں حال کیا ہو گا
 زباں جو کھولینگے مرغان کو ہی دراغی
 کہینگے لالہ کو داعی، تو سرو کو باغی

س بند میں پختگی کی شان دیکھے
 بی رات اپنا رختِ سفر باندھنے لگی
 عبا سیوں کی فوج کر باندھنے لگی
 دل میں خیالِ فتح و ظفر باندھنے لگی
 میدان کی طرف جو بڑھے جو کتر تیز گام
 سب کی زبان پر تھا فقط رام ہی نام

اب کچھ خدوئوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:
 بے سرو سامانی ہوں لیکن ہر سامان نہیں
 ساتھ لے کر اپنی بے سامانیاں آیا ہوں میں

میر سعد الدہلوی

قدم لے اذ وہام یاس! دل میں دیکھ کر کھٹنا
کسی گوشے میں مری عمر بھر کی آرزو ہوگی
اے اہل اتیرے گونے سے اگو گوجہ بھی گئے

دوش اعیاب کا اٹھینکے سہارا لے کر
میرے شورِ جنوں کی آسماں تک بات جا پہنچی

جہاں میں جا نہیں سکتا، وہاں تک بات جا پہنچی
۱۹۹۹ء میں جلیان والا باغ دار قس کے حادثے کے بعد پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں
بڑی زبرد دار ہڑتالیں ہوئیں۔ ننگور کی ہڑتال کا وہ پرجوش تقاضہ مجھے یاد ہے۔ غلام
غوث کے باغ میں ہندو مسلمانوں کا بڑا زبردست اجتماع ہوا۔ والد نے بھی چار پانچ
شعر پڑھے تھے ان میں سے دو تین شعرا میں:

کو گئی دعدہ جاوید محبت، ہم کو
کس کی ہستی کو مٹائیں گے مٹانے والے
ہیں گے سرِ صفت پھر بھی رہا دل کا غبار
اور ہونگے کوئی آنکھوں میں سامنے والے

چار پانچ سال کے بعد ننگور میں ایک سب میج آئے، نام غالباً سید حفیظ الدین تھا۔ ان
کے والد کے استاد میر نثار علی شہرت بھی ان کے ساتھ تھے۔ شہرت صاحب مجھوں و کشمیر
کے سرِ رشتہ تعلیم میں انسر کے چکے تھے، جیہود میں بھی رہے تھے۔ متعدد اخباروں کے مدیر
بھی رہے۔ وہ جیل علی فرحت کے بیٹے تھے، بوشاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شہرت خود وہ
بخش قلع کے شاگرد تھے۔ کہا کرتے تھے کہ بہادر شاہ کے صاحبزادے پڑھ چکا ہوں۔

میر سعد الدہلوی کے درمیان عمر ہو گئی۔ آدھا اس وقت بھی کو لدی تھی۔ دارغ کے انتقال پر

۱۹۰۵ء میں انھوں نے ایک کتاب اُمینہ دارغ کے نام سے لکھی تھی۔ والد سے ان کی اکثر

ملاحظاں رہیں۔ ننگور ہی میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ بات ۱۹۲۲ء

کے قریب کی ہوگی۔

اُمی زمانے میں ان کے اہتمام میں ننگور میں ہر پندرہ دن کے بعد بزمِ مشاعرہ منعقد ہوا
کوئی تھی۔ رات آٹھ بجائی شاعر اس میں حصہ لیتے تھے۔ مفتی سید محمد حنیف سید اس

بزم کے صمد تھے۔ بزم کا نام تھا "دیا حق سخن" اس بزم کا سالانہ مشاعرہ ۱۹۲۴ء کی محرم میں نکودہ میں منعقد ہوا۔ جالندھر اور کپور تھلے کے علاوہ بعض دوسرے مقامات سے بھی شعراء تشریف لائے تھے۔ حفیظ کو در صاحب لاہور سے ملے آئے تھے۔ وہ حفیظ کی اٹھان کا زمانہ تھا۔ دو مصرع اسے طرح تھے۔

۱۔ آئینہ کوئی رکھ دے ہمارے مزار میں

۲۔ جو کوئی دنیا میں آیا، اس کی رسوائی ہوئی

محمد علی آذر جالندھری، کیر خاں دسا جالندھری، سرور کپور تھلوی، سوہن لالی ساحر کپور تھلوی، فانی کپور تھلوی اور نہ جانے کتنے شعراء تھے۔ سب سے دلچسپ آمد علی سکندر جگر مراد آبادی کی بھی جو پیرزادہ عبدالحمید وکیل، جالندھر کی واسطت سے آئے تھے اور جالندھر میں چشموں کی تجارت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ پیرزادہ صاحب بڑے سخن پرور شخص تھے۔ ان کے والد محترم غلام قادر اثر اپنے ہمنام گوامی کے بعد اس تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ پیرزادہ صاحب کے مکان پر اکثر شعور سخن کی محفلیں ہوتی تھیں۔

اس شاعر کے انتظام و انصرام میں والد کے دو مقرب اور پرانے شاگردوں لالہ گلشن ناتھ کمال اور ذہیر یادام در کا ہاتھ تھا۔ شاعر کی دو تین نشستیں ہوتیں۔ نکودہ میں دھوم مچ گئی۔ جس کو دیکھتے شعور سخن کا دلدادہ نظر آتا تھا۔ جگر نے طری غزل "بہاریں" سنائی، آذر نے بھید یک قافیہ بہار۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے:

اپنی بہاؤ میں ہی اپنی بہاؤ تھی نام بہار ہم نے سنا تھا بہار میں
سب نے دواؤ سخن دی اور دوسری زمین میں حفیظ کا مطلع تھا:

کسیا ہوا؟ کون آگیا؟ کیوں مل گئی؟ آئی ہوئی؟

موت کے رخ پر بھی ہو کیوں مرونی پھانی ہوئی

غیر طرعی دہر میں حفیظ نے ٹوٹن کھیا اور برسات کی دلداز نظیں سنائیں اور شری فی ماہوں سے شعراء ادعا میں کوا نکا کیا۔ سرور کپور تھلوی عجیب دھن میں گاتے تھے۔ احبار کا کہا کوٹے تلے کرو باکوٹس آگئی۔ انھوں نے اپنے والد ماجد شمس احمد بخش بنو کپور تھلوی شاگرد

میرے والد المصطفیٰ
 داغ کی دو غریبیں سنگلاخ زمینوں میں سناٹیں۔ ایک تو ذرا سہل تھی، دوسری کے
 سانوں کے ہاتھ۔ دوسری روایت تھی، پر طاؤس اودقافہ تھا: داغ اور ایاغ۔ کیا
 تحت اللفظ پڑھتے ہوئے بھی اُسے فطرت میں پڑھ رہے تھے۔ والد کی غزل بھی سہل
 میں ہے۔ کیا شعر کہا ہے:

میرے نغمے سُن کے بھولنے کی ہر مدت ہو مست

بھول ہر سانس میں مجھ پر سینکڑوں تپوں کے ہاتھ

اس شاعر کا حاصل یہ رہا کہ چند دن کے بعد چٹا چلا کہ یہ جگر صاحب کوئی جلی
 جالندھر سے بے اطلاع کے بھاگ گئے اور پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ جب اصل
 صاحب سے کچھ ریتھ میں ملاقات ہوئی، تو والد سے اس کا طبع وغیرہ پوچھتے رہے۔
 قیامت تو یہ تھی کہ انھیں کلام پڑھتے؟ انھیں کا مجموعہ داغ جگر بیٹے؟ انھیں کی طبع
 کا بھی بہت شوق تھا، اور شعر کا اچھی کھیلتے تھے۔ شاعر کے بعد بھی لکھ دیتے
 والد سے رات رات بھر شعر کھیلتے رہے۔ عجیب عجیب سون کا شوق تھا۔ طب
 اچھی دسرس تھی۔ لوگوں کی ستم ظریفی دیکھی کہ اصل جگر کو نقلی اور نقلی کو اصلی سمجھتے۔
 والد بالعموم اساتذہ کے اشعار پر شعر نہیں کہتے لیکن کبھی کبھی مضمون میں ترقی،
 سو بھج جائے، تو معذرت سے پیش کر دیتے ہیں۔ خلاؤ ذوق کا ایک شعر ہے:

ذوق! اس بحرِ فنا میں گشتی عمر جاوداں

جس جگہ نہر جائیگی، وہ ہی کنا رہا ہو گیا

یہ شعر پڑھ کر آپ کی محسوس ہو کہ حضرت ذوق نے کنا رہے کا قیتم نہیں کیا
 جس جگہ پر جا آئی، ایک غیر مطمئن بات ہے۔ اس احساس سے آپ نے یہ

آگئی جب ہاں لب بڑے مسافت ہو چکی

لب ہمارا بحرِ سستی کا کنا رہا ہو گیا!

لب کو کنا رہا، کہنا یوں بھی خوش بیانی کی معراج ہے اور پھر کنا رہے کا قیتم
 کیا۔

سحر کے قانی :

امیر سینائی :

شب وصل بوجہ سے اُسے ہو گئی بدلتے ہی کوٹ سحر ہو گئی
شب وصل کیا مختصر ہو گئی کہ آتے ہی آتے سحر ہو گئی
میں حیراں ہوں نہ لٹخ دیکھ کر سیر شام کیوں کہ سحر آ گئی

دماغ :

شب وصل ایسی کھلی چاندنی وہ گھبرا کے بولے : سحر ہو گئی
والد نے یہ قافیہ دونوں واجب انتظام اساتذہ کے اسلوب بیان سے نکال کر اس طرح
سے کہا :

بلا تھیں شب غم کی تار یکیاں خدا جانے کیوں سحر ہو گئی
حضرت ریاض خیر آبادی کا مشہور شعر ہے :

اے جنوں ! کچھ دھجیاں میرے گلے میں ڈال دے

جس میں کوئل بچھرتی ہے ، وہ جہینا آگیا

آپ نے بھی یہی قافیہ اس انداز بیان سے نکال کر اور بالکل الگ ہو کر اس طرح لکھا ہوا :

گھر سے نکلو ، رنگ رخ چھڑ کو ہر اک مشتاق پر

جس میں ہوں کھیلے ہیں وہ جہینا آگیا

ان مثالوں سے یہ مقصد نہیں کہ کسی استاد یا کمال سے آپ کا مقابلہ کیا جائے ، بلکہ اس سے
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی فکر اور بیان دونوں میں عربت بھی ہو اور قادر و بھلائی بھی۔
والد کے ایک ذہین اور ہونہار شاگرد تھے ، نوہر یا رام ورد۔ وہ مجھ سے عمر میں کئی تین
چار سال بڑے ہوں گے ، تریخ کمار شاہ انھیں کافر دے تھا۔ وہ جب لاہور کالج میں تعلیم
میں کوئے کے لیے گئے ، تو وہاں کے ادبی حلقوں میں اپنے استاد کا نام اچھانے میں مصروف
رہے۔ میں سے بھی اساتذہ مثلاً ناجور نجیب آبادی ، اربان دہلوی ، پنڈت گنیشی ، اور کچھ
نوجوان شاعر بہت متاثر تھے۔ لیکن آپ تو اپنے گوشے سے نکلے ہی نہیں تھے۔ وہ صاحب

میر علی محمد

نے ایک ترکیب سوچی۔ ہانگہ دراکا ایک نکلوانے اور والد سے کہنے لگے کہ اسی میں سخن ہیں، ان پر ایک مضمون لکھ دیجئے۔ یہ سادہ مزاج اور سہولے تو ہیں ہی، بھڑ گئے، مگر ایک ہی نشست میں نشان لگالیے اور لاکھ کوم چند کے اخبار ہفتہ وار پندرہ دس کے قریب قطیں جو رح کے نام سے چھپ گئیں۔ لاہور میں بڑا شور ہوا۔ جو لوگ کے قدر شناس اور ان کی طرے تھے، وہ بھی مخالف ہو گئے۔ ان میں ایک تو خبیث ہی تھے۔ یہ مخزن کے دوسرے دور میں اس کے مدیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے والد کی تصوی حالات اشاعت کے لیے منگوائے تھے۔ جب یہ اقبال کے بارے میں مضمون شائع انھوں نے ان کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا اور نہیں بھایا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سبب میری ان سے بڑی تلخ خط و کتابت ہوئی تھی، اور وہ مجھ سے سخت ناخوش بھی رہے۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں مجھے مخاطب کر کے یہ شعر پڑھے:

بھجانا کسی نے کبھی وطن میں سمجھتا تھا، بہت مشہور ہوں میں

نہیں کو تاجر، زون کی شکایت عزیز و اہل بہت مفرد ہوں میں

درد نے یہ تغیری مضامین کتابی صورت میں بھاپ دیے تھے۔ جب نیا ڈیپوڑی، ناروی اور دیاض خیر آبادی کو کتاب میر نے بھیجی، جس نے بہت پسند کی۔ چھار میں دیو پو تھا۔ نیاز نے مجھ سے والد کا کلام بھیج دیا۔ اس کتاب کا نام تھا: اقبالیات، اس کے بعد گوجرانوالہ کے کسی گوشہ نشین نے، حقیقت کی خامیاں، لکھ ڈالی اور دی۔ بات دو ماہ پہ پہنچی کہ پھر طنو ہاں سے چلی جائے، اسد!

اب مشاعروں کی گہما گہمی رہنے لگی۔ کچھ تھکے اور شملے کے مشاعروں میں والد سنا وقت سے متعارف ہوئے۔ والد بھی لڑے اور انھیں اساتذہ کی صفوں میں اپنا مقام کمال کیا۔

ان مشاعروں میں قابل ذکر اشعار بہت ہیں، لیکن صرف چند کا ذکر کرتا ہوں: پربت امرتا، مسعود لہری کا مشاعرہ صلوہ جلی، دسمبر ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ اسے ہندوستان کے ہر گوشے سے شعراء جمع ہوئے تھے۔ اس کی تاریخ نشستیں ہوئی تھیں۔ فلا

انخاب کلام

یہ بھی بول ساتی بھی ہو سافر بھی ہو صبا بھی ہو

چادوں کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی ہو

عشق کا جو ہر تہ ہے اس کی اداسے دلکشی

اس کے کیا معنی کہ وہ آفت کا پرکالا بھی ہو

اُن کی باتوں میں اب وہ بات کہاں — اب وہ پہلو سا اشتیاق کہاں

چوشتِ بزمِ غمزدوں کی قسمت میں — عیش کا دن خوشی کی رات کہاں

نغمہ بودِ اضطراب، ناممکن — عیش ہو کا میاب، ناممکن

لاکھ چمکا کرے سرِ کمال — اُن کے رُخ کا جواب ناممکن

ے دیا دردِ لا دوا مجھ کو — میرے خالق یہ کیا دیا مجھ کو

ہوت نے آگے کھول دیں آنکھیں — نظر آنے لگا خدا مجھ کو

اہل ہے یہ تظارہ دنیا مرے آگے — آتا ہو چین بن کے چھلا د امرے آگے

بے غش سے بھی دردِ تخیل کی رسائی — چلتا نہیں جبریل کا دعو امرے آگے

بھولے سے یاد آتا ہو گا نامِ خدا کا لوگوں کو

ان کو دیکھ کے ساری دنیا کا فر ہوتی جاتی ہو

دن پڑیگا کوئی سینکا، اس مکتوبِ محبت کو

بوفی تمہاری عرض تمنا و فتنہ ہوتی جاتی ہو

کیا حیات

جب کوئی غریب فوج خواں ہوتا ہے

یارب! اس وقت تو کہاں ہوتا ہے

جب غلام کا سیلاب نہاں ہوتا ہے

ظلم کی محو دن پہ پھر کھلتی ہو جب

کہ داغ بھی کاکلام ہے۔ یہ خود ستائی کی بات نہیں بلکہ والد کی تعریف ہے کہ ان کے
 تربیت میں ہل کر میں اس قابل ہو گیا تھا حال آنکہ ان سے اصلاح نہیں لیتا تھا
 دہلی دار ٹنگ لائبریری کے مشاعرے فصیح الدین احمد کے اہتمام سے بڑی شان
 ہوئے۔ ایک مشاعرے میں انگریز ڈپٹی کمشنر سٹراٹون نے شعر کا استقبالیہ فارسی
 میں پڑھا تھا۔ ایک اہل مشاعرے کی چار شستوں کی صداقت سر بیج بہادر
 فہد رامپور سر رضا علی اور رائے بہادر ام کشور نے کی تھی۔

اس کے بعد سید نقاد حیدر زیدی ڈپٹی کمشنر کے اہتمام سے دیوبند اور سہارنپور میں
 معرکے کے مشاعرے ہوئے۔ وہ صنفی تنگ کولے آئے تھے، یوشاویوں میں نہیں
 تھے اور نہ جانے کے قابل رہے تھے۔

لائس ایڈکاشن لڑ میں رملی دھڑا کے اہتمام سے کئی سال مشاعرے ہوئے، شاد موان
 اصناف کی امتداد ان خاص طور پر بٹائی جاتی تھی چونکہ وہ خود بے تحاشہ دہلوی
 شاگرد تھے۔

امرت سر کا مشاعرہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو سٹریٹون ڈپٹی کمشنر کے اہتمام سے ہوا تھا۔
 خود بھی ایک نئی خیر روانی اور شلوار ہیں کو شابل مشاعرہ ہوئے تھے۔ ریاض قرین
 سٹی مجسٹریٹ نگران تھے۔ یہ بہت بڑا مشاعرہ تھا۔ جوش ملیح آبادی اور مجرم راؤ
 بھی آئے تھے۔ اس مشاعرے کی مدد اور بعد کو بہادرستان کے عنوان سے شائع ہوئی تھی
 نومبر ۱۹۳۱ء میں شیلے کی دم اردو کا مشاعرہ دہلی میں ہوا۔ یہ مشاعرہ ٹاؤن ہال
 تھا شاہیر کے ساتھ والد تھے ہی، میں بھی حاضر تھا۔ میری مری خولن مفاہیلین
 آئی ڈی سر سبز ہوئی۔ مسٹر غلام محمد بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے۔ اس
 کے سرپرست تھے۔ بہت خوش ہوئے اور اس کے محلے میں مجھے لے لے لے لے لے لے لے
 آئے۔ میں حکومت ہند کی ملازمت میں ان کی کوشش سے آیا۔ پھر تو کھلا میدان
 چلتا گیا، بڑھا گیا، والد بھی بہت خوش ہوئے۔

پاکستان بننے کے بعد والد ایک بار مولوی عبدالحق کی دعوت پر کوہ پی بھی تشریف لے

میرے والد محترم

وہاں بھی آپ کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں، جب غصہ پیشانی اور احترام کے پیش آئے۔
 فرماتے ہیں کہ گاڑی میں مسافروں کو جب میرے نام کا علم ہوا تو وہ میرے خاطر مدارات شروع
 ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ۱۹۴۰ء میں کوچی جزم غالب کی دعوت پر تشریف
 لے جا چکے تھے۔ لیکن اب تو دوسرا ملک تھا۔ البتہ لوگ غیر نہیں تھے۔ یہ لہو کی کوہستہ تھی۔
 تقسیم ملک کے بعد آپ ہندوستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔
 جشن جمہوریت کے مشاعرے میں دہلی مقدہ بار شامل ہوتے۔ ایک بار تو اس عظیم الشان
 مشاعرے کی صدارت کا اعزاز بھی آپ کو ملا۔ دوسرے اعزازات کا ذکر منور بہلے سے
 انور نے اپنے مضمون میں فرما رہے ہیں۔ پنڈت گووند بھوپنت نے جب ۱۹۵۰ء میں
 آپ کو انجمن ندن گورنمنٹ پیش کیا تو آپ نے اس موقع پر دو شعر کا یہ نظم پڑھا:
 پوچھا کسی نے مجھ سے کہ یہ شاعری کی قدر مند امام کی ہے کہ گدی جنت کی
 میں نے کہا، یہ دونوں ہی باتیں ہیں ناںد جو کچھ بھی قدر ہو وہ عنایت ہو پنچ کی
 ۵۵۰۰ میر شیخ محمد بدایہ شکر کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ بڑے سادھے آدمی تھے۔ جوش ملیح آبادی کے باپ سرنگ
 میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا۔ ایک ٹکڑے کو جو ذکر بانی سب سے پہلے پڑھا دیا۔ جوش بلکہ
 نے لکھے کہ جوش ملیح آبادی اور ملیان 'زاق' خواجہ ہری چند اختر، بھادھنڈی، مدھی، گدھ و غیرہ
 اب سب قلم لکھ کر کہاں یاد آئیں گے۔ دلی سے سب لوگ بھائی بھانڈے گئے تھے۔ ولادت بہت بہت لیٹا
 لعل کو تھے، لیکن بالآخر میں انہیں جوانی بھادے لے بیٹھ گیا۔ واپسی میں انہوں نے جوانی بھادے سے
 کہنے کا کار کر دیا، اس لیے میں اندر دل سے آنا پڑا۔

دو سال چوتھہ حکمت کلام مذکور لکھنے کی دعوت پر گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ جوانی بھادے سے
 نہیں ہائیں گے، اس لیے دہلی گاڑی سے فرسٹ کلاس میں آرام سے جا بٹا تا ہوا۔ اس وقت آپ کی
 عمر سو برس سال میں تھی۔ اور لوگ آپ کو دیکھ کر حیرت میں تھے، مشاعرے کے بعد کچھ تاجمردوں نے
 ایک لٹری تقریب میں آپ کو خوش آمدید کہا اور ایک مثال شدہ لکھ

آپ نے احباب کی جیٹا رنظوم کتابوں پر مضبوط تبصرے کیے ہیں۔ جن میں کاو نامہ، غم
 مستند، احسان، ہرودی، نغمہ فردوس از خوشی محمد ناظر، گنج معانی از محروم، آیات مصداق

میرے والد محرم

دو جگہ چنگیزی، مطلع انوار از برق دہلوی، شعاع ہزار ہر گواہی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فوج ناردی، امیر مینائی، دل شاہ ہوا پوری جگہ قر باونی، بخود بدایونی، احسن مارہروی پر سیر حاصل طویل مضامین بھی لکھے ہیں۔

علی مضامین میں اٹاکی غلطیاں، شکست ناردی، اڑنا اڑنا، شعر میں شخصیت الفاظ، ششاد بھنوی، فارسی کی شنی سستی پتوں کے مصنف منشی اندجیت کی سر جو شست اور مثنوی کا جائزہ، ذوق سے نا انصافی اور بیسیوں دوسرے مضامین ہیں جو مختلف رسائل میں چھپے ہیں۔

مشاعروں کی کیفیات اور مضامین کے مجموعے مرتب شدہ موجود ہیں، لیکن ہنوز شرمزہ اشاعت نہیں ہوئے۔

آپ کے پورے علمی اور شعری کام کا احاطہ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ آپ کو اردو کی خدمت کرتے، تقریباً ۷۰ سال ہو چکے ہیں۔ پورا کارڈ بھی موجود نہیں اور یادداشتیں بھی نہیں۔ یہ توجہ میں لے ہوش سنبھالا تو کچھ نہ کچھ جمع کرنا شروع کیا۔ انہوں نے کمر سہ کلام کی حفاظت میں بھی نہ کر سکا اور نہ جانے کتنی قیمتی اور اہم شہادے دیک چلا گئی۔ آج کل زیادہ توجہ بریالھی پر ہے۔ جب کبھی طبیعت روح میں آجائے تو دو چار نئی بریالیاں لکھ لیتے ہیں۔ امید رہنی چاہیے کہ بریالیوں کا ایک مجموعہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔

آپ نے ۶ جنوری ۱۹۵۱ء کو ایک نظم بھی لکھی۔ عنوان تھا: اپنے کلام کو الوداع اس کا پہلا بند تھا:

اے عزیز! اب مجھ اسی! تم کو رخصت آج سے

شوق سے جاؤ جہاں چاہو، اہانت آج سے

میں نہیں سمجھو، نکات کو اک امانت آج سے

چھوڑ دی اپنی برائیوں کی حفاظت، تہج سے

شاید یہ پیشگوئی تھی کہ برائیاں ہی باقی نہ رہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جنوں ہوش

کے بعد جس میں یہ نظم شائع ہوئی، "فردوس گوشت" شائع ہوئی، "آئینہ اصلاح" شائع

ہوئی، جس میں شاگردوں کے کلام پر اسکا حیرت منہ تو جہہ درج ہیں۔ اس کے دواپنشن
 ٹیکلے "دیوان غالب مع شرح" شائع ہوا۔ اس کے پانچ ایڈیشن ٹیکلے ہیں۔ اب
 ہیں رباعیات اور نثری مضامین کی اشاعت کی توقع رکھنی چاہیے :
 میں نے اس مضمون میں زیادہ تر وہ باتیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے جو دوسرے
 مضمون نگاروں کے علم میں نہیں ہونگی۔
 ہم سب کو دعا کرنی چاہیے کہ قبلہ ابھی گیسوئے اردو کو تادیر سنوارتے رہیں۔ اب وہ
 داغ کے واحد زندہ شاگرد ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود نے ۱۹۵۷ء میں کہا تھا کہ کون کہتا ہے
 داغ مر گئے۔ جناب جو شمس لسانی زندہ ہیں اور جب تک وہ زندہ ہیں، داغ
 زندہ ہے۔

جوش ملیانی

۱۹۳۶ء تک میر تقیام پنجاب میں رہا، اور وہ بھی بیشتر لاہور میں۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ اس دوران میں کبھی کسی جگہ حضرت جوش ملیانی سے نیا ز حاصل نہیں ہوا۔ حال آں کہ وہ بھی اسی پنجاب کے رہنے والے تھے اور کبھی کبھار لاہور بھی ضرور آتے ہوں گے۔ اسے آپ میری بد قسمتی پر محمول کیجئے یا غرض۔ ملت گزینی کا نتیجہ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید عمر کے تفاوت کے باعث ہمارا کوئی مشترک دوست نہیں رہا ہو گا جس کے ہاں ملاقات ہو سکتی۔

ایک زمانے بعد پہلی ملاقات یہیں دہلی میں ہوئی، اور وہ بھی کچھ عجیب طے پھر پر۔ ماہنامہ الجنگل حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات نئی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ یہ آزاد دہلی سے پہلے نومبر ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہ جیڑہ روز تھا۔ آزاد دہلی کے بعد اس کے مدیر جوش ملیانی کی آبادی مقرر ہوئے اور نائب مدیر جوش ملیانی جوش ملیانی سے میری پرانی یاد اللہ علی یہی زمانے میں ہم قردل باغ میں ایک دور کے پڑوسد میں رہے تھے۔ پھر جب انھوں نے پبلیکیشنز کے سرانجام سے جاری کیا، ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور دریائے گنگا اٹھ گئے، تو وہاں بھی میر والاں کے ہاں آخر جانا آنا رہا۔ بعد کو ان سے چند خط و کتابت بھی رہی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں جب

جوش ملیانی

میں حکومت ہند کی ملازمت میں شامل ہو کر ہندوستان سے باہر چلا گیا، تو یہ تعلقات
منقطع ہو گئے۔

جناب عرش کی روایت یہ ہو کہ ایک دن جوش ملیح آبادی نے ان سے کہا، عرش صاحب! ہمارے ایک ملنے والے مالک رام تھے، خدا معلوم وہ آج کل کہاں ہیں! بھئی، کہیں سے ان کا کھوج نکال لیں اور ہر سکے، تو ان سے آجکل کے لیے مضمون حاصل کیجیے۔ عرش صاحب کو اس طرح کے پنجابی کا موں کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ قصہ کہتا ہوں، انہوں نے پوچھنے سے مجھے ڈھونڈ نکالا۔

مارچ ۱۹۵۰ء میں میرا مصر سے عراق تبادلو ہو گیا، اور میں بغداد چلا گیا۔ یہاں ایک دن عرش صاحب کا خط ملا۔ اس میں اولاً کچھ اپنا، کچھ ”آجکل“ کا تعارف تھا۔ اور دیکھا تھا کہ جوش ملیانی صاحب کی فرمائش پر یہ خط لکھ رہا ہوں، وہ سلام کہتے ہیں اور مضمون مانگتے ہیں۔ انسان کی نمود و نمائش کی خواہش فطری ہے۔ ہم لکھنے نیازی اور استغنا کا اظہار کریں، لیکیں یہ واقع ہے کہ اگر کوئی شخص باری تعریف کرتا ہے یا ہمارے قول و فعل کو پسند کرتا ہو، تو اس سے ہمیں خوشی ہوتی ہے اور جذبات پسند اور غور پیدا ہو جاتے ہیں کہ ماشاء اللہ، ہم کئی کچھ ہیں۔ جب مجھے یہ خط ملا، تو حقیقتہً بہت خوشی ہوئی کہ اگرچہ دس بارہ برس سے جوش صاحب سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا، لیکن وہ مجھے بھولے نہیں۔ میں نے عرش صاحب کا شکر یہ ادا کیا، اور مضمون کا وعدہ کر لیا۔

ہمارے ایک دوست تھے، عبدالحمید حسرت شملوی۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، وہ بہت اچھے شاعر اور بڑے محبت کے آدمی۔ وہ حکومت ہند کی پرانی سبیلیٹو سبلی میں مترجم کے عہدے پر فائز تھے کہ پچھارے عہدے پر آیا کہ بیمار ہو گئے، جس سے ان کا کمر کے نیچے کا حصہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا۔ مجبوراً انہیں قبل از وقت ملازمت سے دستبردار ہو کر پینشن لینا پڑی اس کے بعد اولاد توں موڑ کر (مدھیہ پردیش) میں قیام کے بعد وہ لاہور چلے گئے۔

پھر بعض خانگی مجبور یوں کے باعث انہیں بالآخر پاکستانی جانا پڑا۔ وہیں ستمبر ۱۹۶۴ء

جو خوش لمسانی

میں کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا واحد مشغلہ شعر گوئی اور احباب سے خط و کتابت رہ گیا تھا۔ میری ان سے قلمی ملاقات تھی ایک جملہ میں انھوں نے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک اردو کی سب سے بہترین کتابیں کونسی ہیں؟ یہ سوال دیکھنے میں مختصراً ہو، لیکن اس کا جواب اتنا آسان نہیں۔ طے ہر ہے کہ جب تک موضوع کا تعین نہ ہو، کتاب ان کی فہرست بنانا مشکل ہے۔ میں خود کر رہا تھا کہ ان کے سوال کا جواب کس نتیجہ میں دوں کہ اسی زمانے میں خوش صاحب کا شمار اذیہ خط ملا۔ اس پر میں نے خیال کیا کہ کیوں نہ ایک تیر سے دولٹا لے کیے جائیں۔ چنانچہ میں نے ایک مہینہ مضمون "میری پسند کی کتابیں" (اردو) کے عنوان سے لکھا۔ یہ "جنگل" کے فردری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ میں نے اس میں نثر اردو کی تاریخ پر اچھٹی سی نظر ڈالتے ہوئے مختلف موضوعات کی ممتاز مطبوعات کا ذکر کیا، اور مضمون کے اخیر میں ایک سو کتابوں کی فہرست دے دی۔ یہ گویا حیرت کے سوال کا جواب تھا۔

میں جنوری ۱۹۵۲ء میں پھٹی پردی آیا۔ چونکہ "جنگل" والوں سے تعارف ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ خوش ملیح آبادی دہلی میں، دو چار دن بعد فرصت ملنے پر میں پہلے سکر خانے گیا۔ جہاں میں اُس زمانے میں "جنگل" کا دفتر تھا، وہاں خوش صاحب اور اُس کے علاوہ جتنے ناخند آزاد سے کبھی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں سے میں پہلی مرتبہ اسی دلی ملا تھا۔

دوسری ملاقات پر خوش صاحب نے مجھے اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی۔ یہ اسی زمانے میں پرانے سکر خانے سے آگے تیار پور کے ایک سرکاری مکان میں مقیم تھے۔ حسب قرار میں انوار کے دن حاضر ہوا۔ گھنٹی کی آواز سن کر خوش صاحب نکل آئے۔ ہم صحن میں داخل ہوئے، تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک صاحب کرسی پر دھوپ میں کرسی پر بیٹھے دھوپ اپ رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں حقے کی تہہ اور دوسرے میں کوئی کتاب جس کے مطالعے میں وہ محو تھے۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی۔ سرخس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میرے والد صاحب ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر آداب عرض کیا

جوش ملیح

اور عرض نے میرا تعارف کر لیا۔ جوش صاحب کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ سکرا کر ہاتھ تلایا اور پاس کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔

یہ روز تیرہ کا بھر ہے کہ جب ہم کوئی کتاب پڑھتے ہیں یا نظم کا مجموعہ دیکھتے ہیں، تو غیر شعری طور پر مصنف کی ایک تصویر ہمارے ذہن کے پردے پر درخشاں ہو جاتی ہے۔ اگر بار بار اس شخص کی تصنیف دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہے، تو دل لے کر ساتھ یہ تصویر اور بھی بخیر ہو جاتی ہے، ورنہ اس کے بالعکس مدھم پڑتے پڑتے مٹ جاتی ہے۔ اگر کبھی بعد کو ہم مصنف سے دوچار ہو جائیں، تو یہ اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جو ذہنی تصویر ہم اتنے دن لیے پھر رہے ہیں، وہ کس حد تک اصل کے مطابق یا اس کے مخالف تھی یا اب کے بھی رہی ہو۔ مثلاً مدت سے جوش ملیحانی کا کلام پڑھتا آیا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ اجلاس کی مجلس میں کسی دوست نے ان کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس لیے میرے ذہن میں ان کا نقشہ ضرور موجود تھا۔ اب جو ملاقات ہوئی، اور میں نے انہیں اپنے سامنے دیکھا، تو واقعی کچھ تعجب سا ہوا۔ میرے سامنے ایک مختصر لیکن صمیم اور میٹھا چھوٹا سا قدرے مشکل سے پانچ فٹ یا شاید اس سے کچھ ہی زیادہ، بھری بھری کزوال ڈاڑھی جس پر بال خال خال سیاہ بال کھپاتے، صاف ستھرا رنگ، نرم مزاج اور نرم گفتار۔ اور سب باتیں تو درست تھیں، لیکن میرے خیال میں انہیں اس سے کہیں بڑا ہونا چاہئے تھا۔

بات چیت شروع ہوئی، تو گویا دبستان کھل گیا۔ مختلف مشاعروں کی روداد سنائی۔ اپنے استاد بھٹہ بھٹوں اور اساتذہ عصر کے قصے بیان کیے۔ داغ کے بعض فراگردوں سے میرے بھی مراسم ہیں۔ سائل صاحب، بیخود ملوی، احسن مارہروی، نوح نامدی کی خدمت میں مجھے نیا دراصل زرا ہو، بلکہ سائل صاحب سے تو میرے بہت قریب کے تعلقات تھے۔ چونکہ جوش صاحب ان اصحاب کے خواجہ تاش تھے، اس لیے وہ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے، اگرچہ یہ عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے۔

میر سے اس قیام کے دوران میں شاید ایک اور ملاقات ہوئی۔ میری رخصت ختم ہوئی،

تو اس واپس چلا گیا۔ جوش ملیانی

اس کے بعد میں ۱۹۵۴ء کے دور میں وطن آیا۔ اب کے میرا تبادلہ ہوا تھا
 نتیجے میں یہاں کا طویل قیام لا بد تھا۔ چنانچہ میں یہاں تین برس سے کچھ
 ۱۹۵۸ء تک رہا۔ صبح معنوں میں میری پوری ملازمت کے دوران میں
 قیام طویل ترین رہا۔ اس زمانے میں مجھے ان تمام تعلقات کو جو میری لہجہ
 کے باعث کچھ منقطع سے ہو گئے تھے۔ از سر نو بحال کرنے کا موقع ملا۔
 علاوہ کچھ نئے تعلقات قائم بھی ہوئے۔ اسی زمانے میں حضرت جوش ملیانی
 بھی اکثر نئے لا اتفاق ہوا، جب مجھے خود ان کے سوانح کی بیشتر تفصیلاً
 اور مختلف موضوعات ادب کے بارے میں ان کے خیالات دریافت کرنے
 جیسا کہ ملیانی کی نسبت سے ظاہر ہے، حضرت جوش ضلع جالندھر
 ایک گاؤں ملیانی میں پیدا ہوئے۔ آج بھی یہ گورہ دیہ ہے۔ اس سے
 کہ اسی سال اُدھر جوش صاحب کے بچپن میں اس کی حالت کیا ہوگی!
 کہتے ہیں کہ اس زمانے میں پورے گاؤں میں شاید دین آدمی ہی کسی قدر
 اپنی تعلیم کے اختتام تک تو یہ وہاں مقیم رہے، لیکن جب ملازمت کے
 نظر نہ خود کریں ہوا، جو ملیانی سے سات میل دور ایک قصبہ ہے، تو وہ
 مستقل سکونت بخود رہی میں اختیار کر لی اور آج تک وہیں کے کبھی میں
 کوئی مکان بھی تعمیر کر لیا ہے۔ ملیانی سے متعلق ان کا ایک منقطع ہی

کیا کر دے کہ جوش صاحب کا کردار

ملیانی، اب بھی خراب آباد ہے

چونکہ ان کے اکلوتے صاحبزادے عرش دتی میں رہتے ہیں، اس لیے جوش
 جب بھی ان کے پاس آتے، اطلاع ملنے پر میں حاضر ہوتا ہوں۔ ان ملاقاتوں میں
 سے لطف اندوز اور علم سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ خود ان کی زندگی
 واقعات ان سے سننے میں آئے۔

جوش لمبانی
 جوش صاحب کا کٹا "خود ساختہ" آدمی ہیں۔ ان کا خانان تعلیم کے پہلو سے تو عمارت
 تھا ہی، مالی لحاظ سے بھی بہت نادار تھا۔ خوش قسمتی سے ان کی والدہ بہت حوصلہ مند
 خاتون تھیں۔ انھوں نے ہر طرح کی کڑی تحصیل کرائیں۔ ابتدائی تعلیم دوائی۔ ان کا
 حال انھوں نے خود سنایا تھا۔ جیسا کہ چکا ہوں، جوش صاحب کا حکم بہت صحتمند
 اور گنجلک ہے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ ماشاء اللہ، آپ کی صحت اس عمر میں
 بھی قابل رشک ہے، تو فرمایا: یہ ابتدائی محنت مشقت کی زندگی کا نتیجہ ہے....
 میں نے گیارہ برس کی عمر میں ملیان کا پرائمری اسکول ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد مزید
 تعلیم کے لیے شاہ کھوٹ کے وینکٹر ٹل اسکول میں گیا، جو لمپان سے ساٹھ تین
 میل دور رہی۔ گرمی بھاڑا۔ برسات — کوئی موسم ہو، میں روزانہ جانے لے
 کے یہ سات میل پیدل طے کرتا تھا۔ یہ معمول تین برس تک رہا، یعنی جب تک میں
 نے انھوں میں درجے کا امتحان پاس نہیں کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحت تو ابھی ہونا
 ہی چاہئے تھی۔ اس کے علاوہ حالات کی مجبور ری سے خوراک بھی ہمیشہ سادہ رہی۔
 شراب نامرادو تو ایک طرف رہی میں نے کبھی چائے بھی نہیں پی، جیٹھا سا ڈھس
 بھی جب گرمی کا خواب ہوتا ہے میں نے کبھی برف استعمال نہیں کی، دہی کے سوا
 اور کوئی فرنی یا تیز ذائقے کی چیز نہیں کھاتا، لیکن بھی نہیں پیتا۔ شاید اسی لیے
 میری صحت عموماً اچھی رہی ہے۔ اب بھی کہیں مجبور ری سے چھ سات میل پیدل
 چلنے کی ضرورت پیش آجائے، تو مجھے کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

آج کل ہر لائینر شاعر اپنے آپ کو تلمینا الرحمن سمجھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ شعر
 اس پر براہ راست نازل ہوا ہے۔ (اس صحت میں اسے کسی استاد کے سامنے ناؤ
 تلمذ کرنے یا زبانِ دہن کے حصول پڑھنے یا کسی سے پوچھنے یا حاصل کرنے کی کیا
 ضرورت ہو انبیادی طور پر یہ خیال جتنا غلط ہے، اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت
 نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ادب کی بیشتر ہرادی اورادیوں کی ادھ کچی
 تخلیقات اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ عروض داہما شکلِ علم ہے،

جوش ملیح

اور اس میں ہمارے حاصل کرنے کے لیے کافی دواؤں کی ضرورت ہے۔ اور
ہمارے نئے ادیب اگر بڑھ کر رہیں۔ مگر یہ ہے کہ کھسائی ملی کھسائی ہے۔
اپنی جہالت کو وہ تلخ ذرا محض کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں نتیجہ معلوم!
حضرت محض کی عروض میں ہمارے کے سب قائل ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں
کھسائی کے لیے اپنے حالات قلمبند کیے تھے۔ ان میں بھی ان کی عرو
سے متعلق بعض اشارے ملتے ہیں۔ ایک دن زبان اور فن کی بات ہو رہی
نے پوچھا آپ کو عروض کی طرف توجہ کیونکر ہوئی؟ فرمایا: مجھے بچپن ہی
آسانی سے یاد ہو جاتا تھا۔ پوری کی پوری نظم اشعار کی اسی ترتیب سے
مرتبہ پڑھنے کے بعد نہایت تھا، اور اس کے لیے مجھے کسی خاص کوشش یا
ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میں انھوں درجے میں تھا کہ شعر گوئی کا
بیدار ہو گیا۔ اس درجے میں میرے استاد ادا جگت سنگھ بیدی صاحب
شعر نہیں کہتے تھے لیکن ان کا ادبی ذوق بلند تھا اور وہ سخن فہم بھی خاص
پڑھاتے وقت آسان بحر کے شعروں کی تقطیع بھی کرتے تھے۔ چونکہ میر
تھی، اسی کے سہارے میں بھی آسان بحر کی تقطیع سیکھ گیا۔ ایک دن میر
کے شعر کی تقطیع ایک ہم جماعت کو بنا رہا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا کہ کیا
کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے اور اسے کہاں ختم کر
میں نے جواب دیا کہ یہ بات میں تجھے سمجھا نہیں سکتا، میری طبیعت ہی مجھے
کہ ایک قول کہان ختم ہو گا۔

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اسی سے میرا رشتہ رفتہ رفتہ کمزور
اگرچہ مجھے عروض کا باقاعدہ علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن اس
جو شعر بھی میری زبان سے نکلا، وہ بھی نامزد نہیں ہوا۔ خود ہی کہتا اور

کیے اس بیت کا غزل؟

تو کے بنوی نادر داد خواہ

میں سے غلط لیتا، کیونکہ تعلیم کو کم تھی ہی، اگر کی سماجی حالت بھی جو تھی اس کے
 پیش نظر کسی اور کو مرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ غرض بعد کو جب جو نیرودیکل
 تعلیم کے لیے نارن اسکول بنایا، تو میں نے عرض کی بعض کتابیں خاص طور پر مطالعہ
 کریں۔ پھر جب نیرودیکل کلاس کے لیے ٹریننگ کالج، لاہور میں گیا، تو یہاں میرے
 استادوں میں ایک صاحب پنڈت رلام تھے۔ وہ ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ
 خود بھی اوسط درجے کے شاعر تھے، عرض بھی جانتے تھے۔ پہلے ہی دلی جمعہ جس
 کا سبق پڑھانے لگے، تو بحر متقارب سے ابتداء کی۔ فرمایا کہ شعر میں آٹھ بابوں میں آئے،
 تو اسے بحر متقارب مشن سالم کہتے ہیں۔ اس پر میں پوچھ بیٹھا کہ اگر کہیں ۶ ابا فوٹوں
 آجائے، تو اسے کیا کہینگے؟ اس سوال پر وہ کچھ جزم بڑھوئے، لیکن بتایا کہ اس صورت
 میں اسے المضاعف کہتے ہیں۔ چونکہ جواب درست تھا، میں خاموش ہو گیا اب
 انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے سوال پوچھ تو لیا، لیکن کیا ۱۷ ابا فوٹوں
 دیکھا بھی ہے؟ تمام جماعتوں کی نظریں مجھ پر جمی تھیں اور انھیں یقین تھا کہ اب
 مجھ پر امتحان پڑیگی لیکن میں نے فوراً جواب دیا: جی ہاں، دیکھا ہے۔ اور ذوق کا یہ
 شعر پڑھ دیا۔

تو نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مودِ قساق ہو
 یہی حق ہے، قابلِ اگر حق دلا دے، یہ سبیل تھے پاؤں چاچن حق ہو
 اس پر میرے ہم جماعت دم بخود ادا پندت جی مطمئن ہو گئے۔ اب انھوں نے درجے
 کے دوسرے طلبہ سے متقارب مشن سالم کی مثال طلب کی۔ جب کوئی جواب نہ دے
 سکا، تو مجھ سے فرمایا کہ تم نے شانزدہ کوئی کی مثال دی تھی، اب آٹھ کوئی کی بھی شاد۔
 اس پر میں نے حالی کا یہ مطلع پڑھا۔

بڑھاؤ نہ آپس میں قلت زیادہ
 مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
 اس کے بعد بھی دو ایک مرتبہ اور اسی طرح کا واقعہ پیش آیا، تو انھوں نے مجھے اجازت

دعہ دی کہ عروض کے سبق میں میری حاضری ضروری نہیں ہے بچا ہوں، تو آؤں
چاہوں نہ آؤں۔

اس کے بعد خاموش ہو گئے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فرمایا، اس پر ایک اور واقعہ
یاد آگیا۔ ایک دن اپنا کلام سنا رہے تھے۔ قوی رنگ کی نظم تھی۔ اس میں شعر
پڑھا

زور ہے یہ ترو جو رکی، رد کے سے کہی

ہٹ جاؤ، یاں حقیقت ہو کیا گھاٹھ لکھی

اس پر میں نے مؤذبانہ عرض کی کہ دوسرے مصرعے میں حقیقت کی تے، تقطیع سے غامض
ہو گئی ہے، مصرع "حقیق" پہر پڑھنے سے موزوں ہوتا ہے اس پر پوچھا: بھلا میر کیا
بجھ رہے، اور اس کی تقطیع کیا ہے؟ میں نے جواب میں کہا: یہ بحر مضارع مشن اخب
مکھوف ہے اور اس کے ارکان تقطیع ہیں: مفعول، فاعلات، مفعیل، فاعلن۔
میر یہ کہتے پر سب کو بہت حیرت ہوئی۔ پنڈت جی نے اس پر مصرعے کی خود
تقطیع کی، تو انھیں معلوم ہو گیا کہ واقعی حقیقت کی تے تقطیع سے باہر رہ گئے
اس کے بعد وہ ہمیشہ میرے تلامذہ رہے۔

فرض جب بھی حضرت جوش سے ملاقات ہوئی، اسی طرح کا کوئی علمی ادبی مسئلہ چھڑ
جاتا۔ ایک دن شعر گوئی کی بات ہونے لگی۔ مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کو ادب اور
شعر سے اتنا شغف ہے، تو یقین ہے کہ آپ خود بھی ضرور کہتے ہونگے۔ میں نے
عرض کیا کہ میں نے کسی دانے میں چار غزلیں کبھی نہیں، لیکن اب ان کا
کوئی شعر حافظے میں محفوظ نہیں ہے۔ تذت ہوئی وہ کچھ چھوٹ گیا، اس کے
بعد ساری توجہ نثر پر مرکوز رہی۔ اور میں واقعی خوش ہوں کہ میں نے اپنا
وقت ضائع نہیں کیا۔ مسکرا کے چپ ہو رہے۔

اب میری باری تھی۔ میں نے پوچھا کہ بھلا، آپ کو شاعری کا حقوق کیونکر پیدا
ہوا کہ فرمایا کہ ہمارے اٹھویں درجے کے نصاب اردو میں ذوق کا کچھ کلام

بھی تھا۔ اس کا بیشتر حصہ مجھے زبانی یاد تھا۔ میرے استاد، خدا بخشے، شعر کے
 رسیا آتے تھے ہی، فرصت کے اوقات میں مجھ سے ووق کی یہ غزلیں سنا کرتے تھے۔
 انھیں بار بار پڑھنے سے خود میری طبیعت غزل کی طرف مائل ہونے لگی۔ بعد کی
 تعلیم نے اس میلان کو چلا بخشی۔ یہ بات بھی تھی کہ اب میری عمر ۷۰ سال کی ہو گئی
 تھی۔ اس بلوغ میں غزل کے مضامین کی کشش کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ
 میں نے چند کوئی چھوٹی غزلیں کہیں۔ اس زمانے کے دو تین شعرا کچھ بھی یاد ہیں۔
 مثلاً :-

وعدہ وصل پر کیونکر ہوتی مجھ کو
 کوئی اقرار نہ ثابت ہوا سچا تیرا

جان کلی بھی تو کچے میں حد کے نکلی
 ہائے افسوس کہ مرنا بھی نہ آیا مجھ کو

جس زمانے میں وکٹر بائی اسکول، جالندھر میں ملازم تھا، یہاں بعض اصحاب ذوق
 کی صحبت میں آئی۔ وہ میرا طام سنتے، تو اچھے شعر کی داد دیتے۔ اس سے میرے
 ادبی ذوق کی تربیت ہوئی اور کلام کے حسن و قبح کا شعور پیدا ہوا۔ یہیں ایک
 دن کہیں سے نسیم بھوتوری کا دیوان میرے ہاتھ لگ گیا۔ نسیم، حبیب کہ آپ کو معلوم
 ہوگا، داغ کے امور شاگرد تھے۔ میں نے ان سے خط و کتابت شروع کر دی۔ جب
 کبھی زبانِ یافن سے متعلق کوئی بات پوچھنے کی ہوتی، میں ان سے دریافت کرتا اور
 وہ لطفِ جواب عطا فرماتے۔ یہ سلسلہ کوئی سال بھر رہا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ انھوں
 نے میرے اس شعر کی بھرپور داد دی تھی :-

نہیں ہے تابِ عالم کو بیانِ سوزِ مہیاں کی
 ہمارے عشق کا دنیا میں چرچا ہو نہیں سکتا

انھیں تاہم میں کسی جگہ میں نے لکھنؤ کا گلدستہ دپیام یاد دیکھا۔ میں اسے منگوانے لگا

جوش ملیح

اس میں حضرت داغ، امیر مینائی، جلال ٹکھنوی، شمشاد کھنوی، ریاض، بیجو،
استادہ وقت کا طرحی کلام شائع ہوتا تھا۔ میں بھی اس میں طرح پر اپنا کلام بھیج
لگا۔ اگرچہ میری غزل کے دو میں شعر ہی انتخاب میں آتے تھے، لیکن میں اس پر مطمئن
اور خوش تھا۔ اور جو شعر انتخاب میں نہیں آتے تھے، مجھے ان پر غور کرنے کا موقع
ملتا کہ آخر یہ کیوں اشاعت کے قابل نہیں سمجھے گئے۔

اب میں خاموش تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے دیوان باضی کے دروازے کھل گئے ہیں،
اور ان کی یادداشتیں ایک ایک کر کے باہر نکل رہی ہیں۔ اب انھیں میرے قلم کی ضرورت
نہیں تھی چنانچہ فرمایا:

پیام یاد، میں حضرت داغ کا کلام مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اپنے
کلام پر ان سے اصلاح لینا چاہیے۔ لیکن ان تک رسائی کیسے ہو؟ ڈیرہ تھا کہ ممکن
ہے، وہ میری درخواست منظور نہ فرمائیں۔ اس کے لیے میں نے جناب نسیم بھرتوری کو
واسطہ بنایا۔ انھوں نے لکھا کہ اپنی غزل میرے پاس بھیج دو۔ یہ انھوں نے اپنے
سفارشی خط کے ساتھ استاد کی خدمت میں حیدر آباد روانہ کر دی۔ یہ ۱۹۰۲ء کے آغاز
کا قصہ ہے۔ بارے حضرت داغ نے مجھے اپنی شائردگی میں قبول فرمایا۔ پہلی غزل جو
میں نے اصلاح کے لیے استاد کی خدمت میں پیش کی تھی، اس کا مطلع تھا،

بندہ جہر لب ہوں میں فشا خواں تیرا

دل میں رکھتا ہوں مقفل غم نہ ہاں تیرا

اصلاح کا یہ تعلق کوئی تین برس یعنی ۱۹۰۴ء کے اخیر تک جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء کے شروع
میں وہ رحلت فرما گئے اور یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے
کسی سے مشورہ نہیں کیا، اپنی طبیعت ہی کو رہنما بنا کر کتا رہا۔

پھر کہنے لگے، میں نے اپنے کلام پر استاد کی اصلاحیں سننے پہلے دیوان "بادہ سر جوش"
میں درج کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور اصلاح یاد آگئی ہے بشعرتھا،
جوہر پر کیا مراد دل، نہ پری پر آیا۔ پر توں پر نہیں معلوم کہ کیوں محکم آیا

جوش میانی

استاد نے دوسرے مصرعے کا پہلا لفظ بدلی کر اس کی جگہ "ان" بنا دیا یعنی

انہوں پر نہیں معلوم کہ کیونکر آیا

اس اصلاح سے مصرعے کو چار چاند لگ گئے اور اس میں محاکاتی پہلو بھی پیدا ہو گیا۔ یوں بھی "پر" بمعنی "لیکن" متروک تھا، اس لیے اسے خارج ہونا ہی چاہیے تھا۔

حضرت جوش نے اپنے دیوان "جنونی ہوش" کے شروع میں اپنے کلام کو ارداع کے عنوان سے ایک نظم شامل کی ہے، جس میں دو دو شعر کے ہر قطعے میں ان میں ایک قطعہ ہے:

یاد رکھنا تم جناب دماغ کے احسان کو یاد رکھنا اس جہاں استاد کے فیضان کو
یاد رکھنا اہل فن کی اتسارِ شان کو یاد رکھنا اپنے متردکات کے میلان کو
جب انھوں نے کہا کہ "پر" بمعنی "لیکن" متروک ہے، تو مجھے یہ بند یاد آگیا۔ نیز یہ کہ انھوں نے "جنونی ہوش" کے شروع میں اپنے متردکات کی طویل فہرست خال کی ہے۔ اس پر میں نے سوال کیا کہ آپ نے اپنے متردکات کے ۶۰ سے اوپر عنوان دیے ہیں، یہ کس اصول پر مبنی ہیں؟ کہیں اس سے آپ زبان کا دائرہ محدود تو نہیں کر رہے ہیں؟ اس پر فرمایا کہ میں فارسی اور ہندی کو غلط ملط کرنے کے خلاف ہوں۔ ہندی اپنی جگہ ہے، فارسی اپنی جگہ، ہمیں انھیں الگ الگ رکھنا چاہیے۔

میں نے اس وقت بات بڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، اور خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اصول ہر جگہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر اس پر سختی سے عمل کیا گیا، تو ہمیں کئی لفظ زبان سے خارج کرنا پڑینگے، جو اس وقت زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ مثلاً سمجھدار، میز پرکش، چھردانی، ناخدا وغیرہ۔ اس اصول کی نوبت یہ سب لفظ غلط ہیں اور ہمیں انھیں زبان سے خارج کر دینا چاہیے۔ اور اب آگے ایسے لفظ تو بنائے ہی نہیں جاسکتے جن کا ایک جزو ہندی ہو اور دوسرا

چشم لیاقت
 کما، اسی یا عربی۔ اس سے زبان کو جو نقصان پہنچا، اس میں شبہ ہو سکتا ہے؛
 ترقی پذیر زبان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں سے بھی جو کچھ لے سکتی ہے، اسے لینے میں
 دریغ نہ کرے، نہ صرف بلکہ وہ سری زبان کا کوئی لفظ اپنا کر اسے جیسا چاہے،
 اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لے۔ میں انشا کا یہ اصول اردو زبان کے دستور
 کا بنیادی پتھر سمجھنا چاہیے کہ جو لفظ بھی اردو میں رائج ہو گیا، وہ اپنی اصل میں
 عربی ہو یا فارسی یا ترکی یا کسی اور زبان کا؛ اپنی اصل میں وہ صحیح تھا یا غلط،
 میں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ سہا وہ اردو کا لفظ ہے، اب ہم اس کے صحیح یا غلط
 ہونے کا فیصلہ اردو کے اصولوں کے مطابق کریں گے۔ یہ اصول بہت محمول اور مفید
 اور معتددا ہے اور ہمیں اسی پر قائم رہنا چاہیے۔

حضرت جوش، جیسا کہ بیان ہوا، داغ و بھلو کی شاگرد ہیں۔ داغ کے کلام کی خصوصیت
 کسی سے مخفی نہیں۔ زبان بر قدرت، اور ترہ میں ہمارے، محبوب سے جھڑپھاڑ
 چو پھلاپن، معاملہ بندی، محاکات۔ ان کے کلام کے اجودانے تمکھی ہیں۔ ان کے
 شاگردوں میں سے بھی بیشتر زبان کے پہلو سے ان کے متبع رہے، اور ان کی تعداد کچھ
 کم نہیں ہے۔ زبان کا چھڑ چھاڑ، ٹکاوٹ، چو پھلاپن کا انداز تو ایک آدھ کر چھوڑ
 کوئی اس میدان میں ان کا حریف نہ ہو سکا۔ جو اصل یہ ممکن بھی نہیں تھا۔

داغ و بھلو میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ دیر بیگم (عرف چھوٹی بیگم) نے جب
 بہادر شاہ ظفر کے دلی عہد غلام فخر الدین (عرف مرزا فخر) سے نکاح کر لیا، تو یہ
 بھی ان کے ساتھ قلعہ معلیٰ میں آٹھ گئے، قیمت نے یاد رکھی، یہاں سے راجپور
 پہنچ گئے۔ پھر خدا کے کچھ بعد مستقل راجپور میں ملازمت مل گئی۔ قلعہ معلیٰ کی
 زبان اور خاص طور پر خاندان شاہی کی خدمات اور مستورات کی زبان، اور
 علیٰ زور کا مضمون ہو گیا۔ جب داغ کو بچپن میں وہاں رہنے اور ان سے بات چیت
 کرنے کا موقع ملا، تو انھیں زبان اور وہ ترہ پر قدرت حاصل چو ناہی چاہیے تھی۔
 لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس آخری وہ کمال قلعہ اخلاقی بہت

جوش ملیح

انتہائی درجے پر پہنچ چکا تھا۔ ایسی اور پردہ کی موزوں نے اس زمانے کے جو حالات کچھ دیے، وہ ناگفتہ بہ ہیں۔ داغ نے شعور کی آنکھیں کھولیں، تو اس ماحول میں جہاں جنس کا انتہائی گھٹاؤ نادہ رود رہا تھا۔ قعر دریا میں وہ مرد امن تردد کرنا داغ کے بس کی بات نہیں تھی ابھی ان کا مزاج بھگیا اور اس کا ان کی شاعری پر بھی اثر پڑا۔ رہا سہی کسر راہمہ اور حیدر آباد کی ملازمت اور وہاں کے طویل قیام نے پوری کر دی۔

اس پس منظر میں داغ کے کلام کی یہ خصوصیات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں، اولاً کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ کم و بیش ان کے ذاتی تجربات ہیں۔ لیکن ان کے شاگردوں میں کون تھا جو ان تجربات سے محروم رہا تھا؟ پس اگر یہ رنگ داغ ہی تک رہا اور انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا، اور اس میں اتنا شائبہ کون ان کا متبع اور بانٹیں نہ ہو سکا، تو یہ بالکل حقیقی بات ہے!

یوں تو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح پنجاب میں بھی داغ کے شاگردوں کی کمی نہیں تھی، لیکن ان میں سے تین نے خاص شہرت حاصل کی۔ یہ ہیں: اقبال، ظفر علی خان جو جس ملیحیاتی۔ اقبال نے ابتدا میں غزلیں کہیں، اور بیشک اس زمانے میں انھوں نے بہت حد تک داغ کی زبان و بیان کا متبع کیا۔ لیکن جلد ہی وہ یہ میدان چھوڑ گئے اور فلسفے اور مذہبیات کی طرف چلے گئے۔ اس میدان میں انھوں نے جو کامیابی حاصل کی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن بہر حال یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کسی پہلے سے داغ کے شاگرد یا وارث یا نام لیا نہیں کہے جاسکتے۔

ظفر علی خان نے ابتدا میں غزل بھی ہوئی تو میرے علم میں نہیں۔ بعد کے انھوں نے اپنے آپ کو صرف نظم اور وہ بھی صاف متی اور ہنگامی نظموں کے لیے وقف کر دیا۔ اور اس صنف کلام میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ فی البدیہہ اور ارجحاً نظم کہنا ان پر ختم ہو گیا۔ تالیف کے وہ بادشاہ تھے۔ مشکل سے مشکل زمین میں انھوں نے وہ گل بونے گائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اکبر آبادی کا اس پہلو سے شہرہ سجادہ

بہا، لیکن وہ ایک آدمی شعر کہہ کر مر جاتا ہے جس کے بالعکس ظور علی خاں لمبی لمبی
 قطیں بکھتے ہیں باور کہیں شگفتگی اور حبیبی کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔
 رہی زبان! تو زبان کی صفت میں وہ اقبال سے زیادہ مستند ہیں۔ بڑے سے بڑا
 نامور زبان کہیں ان کے کلام میں اٹھلی نہیں رکھ سکتا۔

جوش ملیحانی نے کوئی پیغام نہیں اپنایا، فلسفہ نہیں بگھارا، صاف کا پیشہ
 نہیں اختیار کیا۔ اگرچہ انھوں نے قصیدے کے علاوہ اور تمام اصناف سخن میں
 کہا ہے، لیکن ان کے کلام کا مقصد بہ جملہ غزل پر مشتمل ہے۔ اور اس میں انھوں نے
 جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کا اعتراف بڑے بڑے سخت گیر نقادان فن و سخن
 نے بھی کیا ہے۔ تعجب تو اس کے پنجاب کے ایک کو رو بہ میں پیدا ہونے والا ایک
 شخص جس نے پنجاب سے باہر بھی قدم نہیں رکھا تھا، جسے اساتذہ فاضل و اہل
 کی صحبت بھی نہ ہونے کے باوجود نصیب ہوئی، کیونکر یہ درجہ کمال حاصل کر سکا
 اور تو اور انھیں داغ سے استفادے کا موقع بھی بہت کم ملا۔ جوش صاحب فروری
 ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں شاعری شروع کی۔ ۱۹۰۲ء کے شروع
 میں انھوں نے داغ کی شاگردی اختیار کی۔ فروری ۱۹۰۵ء میں داغ ان کے استاد
 ہو گئے۔ دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ انھوں نے خط و کتابت سے اصلاح
 لی، اور اس کی مدت بھی ملے دے کے صرف تین برس کے قریب ہے۔

واقعی بجا طور پر حیرت ہوتی ہے کہ جوش کو اگر زبان پر ایسی قدرت حاصل ہوئی،
 تو کیونکر! خدا بخشندہ کی ودیعت کی ہوئی سعادت سے انکار نہیں ہو سکتا۔
 لیکن اس میں جوش صاحب کو جتنا زور و بار صرف کرنا پڑا، چوہکا، اس کا اندازہ
 کون کر سکتا ہے! زبان کے علاوہ ان کی عرصہ میں جہالت بھی کامل اور راستہ
 ہے، اور یہ محض ان کی ذاتی حدود و حدود محنت کا ثمر ہے۔

وہ اسی وقت داغ کے سینکڑوں شاگردوں کے آئینہ نما ہیں۔ پنجاب میں
 وہ انہی کا سیکہ اور شاہ ہیں۔ شاعری کا رنگ بدل گیا، لوگوں کی پسند

جوش میانی

ہاں پسند کا معیار بدل گیا ، دباں کہ جس انقلابی دور سے گزر رہی ہے ۔ اس
یہ امید نہیں کہ ان کا معیار کوئی اور شاعر اب پیدا ہو سکے ۔

چند خطوط

استاد عجم قبلہ جو شش لمبائی سے میری خط و کتابت ۳۵ - ۴۰ سال سے ہے۔ مجھے بھی افسوس اور قلق ہے کہ میں نے موصوفی کے بہت سے خطوط پڑھیں ضائع کر دیے۔ کچھ تو تقسیم وطن کے بہ مجھے اپنے معاملات کی وجہ سے شہر بدر ہونا پڑا یہ طولانی قصہ ہے اور اس میں میرے خواب کی نگین کاریوں کو بڑا دخل ہے۔ لیجو پڑکا تیر کچھ ایسا شست پر چلا کہ میں دنیا و مافیہا کو بھول گیا، خطوط کہاں یاد رہتے پہلی زندگی ہی گم ہو گئی۔ آخر جابے اماں ملی، تو میں کاپڑوں کے لمبک رسالے "چند ن" جادی کیا۔ زلفش کار میرے ساتھ تھا۔ جلد ہی اس نے بھی دم توڑ دیا۔ پھر دلی آیا تو پرانے رفیق کنور ہند رنگہ بیدی صاحب مل گئے۔ ان سے وابستہ ہوا، تو یہ سمجھ لیجیے کہ پھر دلی نہ چھوٹی۔

یہاں سے پھر قبلہ کے ساتھ مراسلت شروع ہوئی۔ کلام پر اصلاحات کے نمونے تو "آئینہ اصلاح" میں درج ہیں۔ پرانے خطوط میں سے مجھے ایک خط کے ضائع ہونے کا خاص افسوس ہے، اس میں آموں کی رسید کے طور پر ان کی ایک مشہور رباعی تھی، جو قبلہ کے دیوان ادل میں طبع بھی ہوئی ہے اور اس بات تک احباب کی زبان پر ہے:

میں گوشہ نشین ہو کے بھی گنہام نہیں میخانہ شہرت میں بھی حساب نہیں
ساحر نے بھی اقیانوس سے کام لیا بھیجے ہیں جو آم خاص ہیں عام نہیں
اس رباعی سے میرے اپنے باغ کے آم تو ایک طرف میں خود غنمہ جادید ہو گیا۔ بعد کے

چند غلط

کچھ غلطیاں تحریر کے خاص نمبر کے لیے پیش کرتا ہوں۔

خط نمبر ۲۰ تو عام خط ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمبر ۲ میں میری پریشانیوں سے قبل خود پریشان نظر آتے ہیں۔ غزلوں کی اصلاح بھی موجود ہے۔ نمبر ۴ میں بھی ایک شعر کی اصلاح کرتے ہوئے جولا جو اب ہو۔ نمبر ۵ میں ریش کا رشا کی مینوشی کا ذکر ہے سخت بجا رہنے کے بعد جب شاد کی جان بچ گئی، تو اس نے پھر مینا شروع کر دی تھی۔ خط نمبر ۶ میں بھلند کے مٹا کرے کا ذکر ہے، جہاں آپ نے اپنے عزیز شاگرد ہما ہرنالوی کو بھکتے دیکھا۔ اردی نے اسے جرم میں خود بھی شامل تھا، پانی ملائے بغیر پلا دی تھی۔ مجھے بھی قبلہ نے سرکش کا خط دکھا تھا۔ خط ۷ میں میری اور ہما کی معذرت کا ذکر ہے۔ خط نمبر ۸ میں حکومت پنجاب کی طرف سے ادیب اعلیٰ کے انعام اور صلحت پانے کا ذکر ہے۔ یہ انعام سب سے پہلے پنجاب میں آپ کو ملا تھا، حال آنکہ بعض پرورد غلط حاسد خود غرضی کی بنا پر اپنے لیے کوشش کرتے رہے اور قبلہ کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ نمبر ۹ میں علالت طبع کا ذکر ہے اور ساتھ ہی حکم گورداس پوری مرحوم کی ایک تنقید کا بھی جو انھوں نے قبلہ کی غزل پر کی تھی۔ حکم صاحب کو صحیح شعر لکھنے پر بھی قدرت حاصل نہیں تھی۔ یہاں بھی پردہ زنگاری میں کوئی مستحق تھا۔

میں ایک رسالے ماہ نو، کا اڈیٹر تھا۔ اس کیلئے قبلہ نے "پرانی یادیں" مضمون میرے ایما پر لکھا۔ وہ رسالہ بھی جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اس میں مضمون کی شاید تین یا چار قسطیں شائع ہوئی تھیں۔

خط نمبر ۱۱ اور ۱۲ میں ایک فی البدیہہ مطلع کا ذکر ہے، جو قبلہ نے کہا تو تھا، لیکن ان کے حافظ میں محفوظ نہیں رہا تھا۔ چونکہ میں پوچھا بھی کیا کرتا ہوں اسی لیے میری مینوشی اور پوچھنے کے تھ کو دیکھ کر آپ نے مطلع کہا:

ساحر کا یہ تعنا د بھی کیا لا جو اب ہے پوچھنے کے ساتھ ساتھ میں بجا م فراتہ بعد کو جگر جانندہ ہری نے تصدیق کر دی تو قبلہ کو بھی یاد آ گیا۔

نمبر ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵ اور ۱۶ میں غزلوں کی طرف اشارہ ہے، جس کی لاف

شواہد کی بنا پر جزنا پانی ہی کو اس تہذیب کا سب سے شگلی نقطہ تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اگرچہ محکمہ اثریات نے زیادہ تر ملک کے ماقبل تاریخ دور اور خاص کر تاریک عہد سے (جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ ہو چکا ہے) متعلق معلومات کے حصول کو اپنی توجہات کا مرکز قرار دیا ہے۔ تاہم تاریخی عہد کی طرف سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ ادھر تاریخی عہد کے بارے میں بھی متعدد کھدائیاں ہوئی ہیں، جن کی مختصر فہرست یہ ہے:

اٹلیہ میں رتناگیری، اودے گیری، جوگڈا اور شیٹوپال گڑھ؛ بہار میں انٹی چک؛ مغربی بنگال میں تالوک، چندر کیٹو گڑھ اور بن گڑھ؛ گجرات میں شالاجی، دینی موری، بڑودہ؛ اتر پردیش میں کوسامبی، (ڈیرہ دون کے قریب) جگت گرام؛ راجستھان میں نگل؛ ہمارا شتر میں کندن پور اور پاڈنی۔ ان مقامات کی کھدائیوں سے بڑے بودھی علمی اور مذہبی اداروں کے وجود کا پتا چلا ہے۔ مثلاً ناگارجن کسٹ میں جس کی کھدائی کا اوپر ذکر ہوا ہے، نہایت اہم اور معرکہ آرا دیافیتیں ہوئی ہیں۔ یہاں نہ صرف مختلف بودھی آثار بینقاب ہوئے، بلکہ انھیں وہاں سے ہٹا کر ناگارجن پہاڑی اور ناگارجن ساگر کی مصنوعی جھیل کے کناروں پر منتقل کر کے ان کی اصلی حالت میں رکھا گیا ہے۔ ان آثار میں کئی استوپ، خانقاہوں، مندروں، نہالے کے گھاٹ، جنمانی ویش کے میدان، کشا کو راجاؤں کا دارالعلوم اور ہندو آثار میں پشپ بھدرا موی سرد پور اور کارنگیہ وغیرہ کے مندروں اور شریعہ یئہ کی قربان گاہ کے نشان ملے ہیں۔ یہاں کے آثار میں ایک اور اہم دریافت درود تماشا کی ہے، جو ملک بھر میں اپنی نوعیت کا ایک ہی ایسا مقام ہے۔ ان کے علاوہ ایسی بیشمار مورتیاں اور کتبے ملے ہیں، جن سے جنوبی ہند کی اس عہد کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کے کئی پہلو اجاگر ہو گئے ہیں۔

اسی طرح مذکورہ بالا جگت گڑھ سے بھی اس اثر میدھ گیہ کے آثار ملے ہیں، جو تیسری صدی عیسوی میں راجا سیلورمن نے کٹی بار کیا تھا۔ کوسامبی سے ہاتما بھ کے زمانے (چھٹے صدی عیسوی) کے آثار برآمد ہوئے ہیں، یہاں سے جو کتبے ملے ہیں، ان سے اس جگہ کا جہاں ہاتما بھ نے یہاں کے سفر کے دوران میں قیام کیا تھا، محل وقوع متعین

کچھ خطوط۔ تحریر کے خاص نمبر کے لیے پیش کرتا ہوں۔

خط نمبر ۱۔ ۲۰ عام خط ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمبر ۳ میں میری پریشانیوں سے قبلہ خود پریشان نظر آتے ہیں۔ غزلوں کی اصلاح بھی موجود ہے۔ نمبر ۴ میں بھی ایک مصرعے کی اصلاح کرتے ہیں جو لاجواب ہو۔ نمبر ۵ میں دلشاد کی مینوشی کا ذکر ہے سخت پیار ہے کے بعد جب شاد کی جان بچ گئی، تو اس نے پھر مینا شروع کر دی تھی۔ خط نمبر ۶ میں بھٹنڈہ کے مشاعرے کا ذکر ہے، جہاں آپ نے اپنے عزیز شاگرد ہما ہرنانوی کو بکٹے دیکھا۔ اور نے اسے جن میں خود بھی شامل تھا، پانی ملائے بغیر ملا دی تھی۔ مجھے بھی قبلہ نے مٹھن لکھ کر دکھا تھا۔ خط ۷ میں میری ادراہا کی معذرت کا ذکر ہے۔ خط نمبر ۸ میں حکومت پنجاب کی طرف سے ادیب اعلیٰ کے انعام اور خلعت پانے کا ذکر ہے۔ یہ انعام سب سے پہلے پنجاب میں آپ کو ملا تھا، حالانکہ بعض پر غلط حاسد خود غرضی کی بنا پر اپنے لیے کوٹھن کرتے رہے اور قبلہ کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ نمبر ۹ میں علالت طبع کا ذکر ہے اور ساتھ ہی حکم گورداس پوری مرحوم کی ایک تنقید کا بھی جو انھوں نے قبلہ کی غزل پر کی تھی۔ حکم صاحب کو صحیح شعر کہنے پر بھی قدرت حاصل نہیں تھی۔ یہاں بھی پردہ رنگاری میں کوئی معشوق تھا۔

میں ایک زلزلہ ماہ نو، کا اڈیٹر تھا۔ اس کیلئے قبلہ نے "پرانی یادیں" مضمون میرے ایما پر لکھا۔ وہ رسالہ بھی جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اس میں مضمون کی شاید تین یا چار سطریں شامل ہوئی تھیں۔

خط نمبر ۱۱ اور ۱۲ میں ایک فی البدیہہ مطلع کا ذکر ہے جو قبلہ نے کہا تو تھا، لیکن ان کے حافظے میں عفو ظاہر نہیں رہا تھا۔ چونکہ میں پوجا بھی کیا کرتا ہوں اسی لیے میری مینوشی اور پوجا کے تضاد کو دیکھ کر آپ نے مطلع کہا:

سازگار یہ تھا دھبی کیا لاجواب ہے پوجا کے ساتھ ساتھ میں جام شراب ہے
بعد کو جگر جائز دھری نے تصدیق کر دی تو قبلہ کو بھی یاد آ گیا۔

نمبر ۱۳۔ ۱۴ اور ۱۵ میں غزلوں کی طرف اشارہ ہے، جس کی تالیف

صاحب ہے۔ قبلہ نے خود بھی اس زمین میں ایک غزل بھی جس میں اشعار میں بھی
 قبلہ اپنے عزیزوں کو داد دینے میں نغلیں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی شرافت نفس کا
 گاہر ادیب سلج ہے۔ ایسے مرخان مرغ بزرگ اس دور میں قیمت ہیں۔ ہم ان
 بھی دیکھتے ہیں جو ان کے قدموں میں بیٹھنے کے بھی لائق نہیں، لیکن نکمے نے ان
 آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ علم و فضل کی اس بڑی اعانت اور کیا ہوگی! مجھے فخر
 ان کے دامن فیض سے ایک زمانے سے وابستہ ہوں۔ جب دلی میں جشنِ ساحر
 میں نے مشقین سے صاف کہہ دیا تھا کہ پہلے میرے استاد محترم کی عزت افزائی
 اس عزت کو قبول کر دگا۔ چنانچہ پہلے سپاسنامہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا
 انھیں کا بنایا ہوا ہوں۔ اور وہ خود فرماتے تھے کہ ساحر کی عزت خود میری عزت
 خدا انھیں تادیر ہمارے سردن پر سلامت رکھے۔ اس وقت وہ فصیح الکلام دار
 واحد شاگرد ہیں۔

چند خطوط

۱

نکودر ضلع جالندھر

۱۱ اپریل ۱۹۵۱ء

اخلاص پرور محبی صاحب زادہ لطفہ

محبت نامہ سے بہت مسرت ہوئی۔ ہوشیار پور آنے کا ارادہ پھر مکرر آنے کا وعدہ خودہ جانفزا سے کم نہیں۔ خدا کرے یہ آرزو شگوار سنگا کا پیش خیمہ ہو سبیل معاش اور بات ہو درہ میں تو آپ کو ہوشیار پور ہی میں دیکھنے کا تمنا ہی ہوں۔ قسمت کا پھیر ہے جو آپ کو ساہیال سے ادھر ادھر لیے پھرتا ہے اس مضمون پر میری تازہ غزل کا ایک شعر سن لیں:

دہرے آنکھ میں بھیجا دل سے نکل کر آنسو

جا بجا ان کو لیے پھرتا ہے دانا پانی

پانی کی ردیف میں یہ نزل بھی ہے جن باتفاق ہے کہ یہ شعر آپ کے حالات پر بھی چسپاں ہو گیا۔

غزلیات ضروری اصلاح کے بعد اصال کر رہا ہوں۔

زندہ باش کی دعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عزیز عارف دہلی میں خیر ہو گئے ہیں۔ میں اس سال سے بی اے کے پڑھنا شروع کر رہا ہوں۔ اس لیے اخیر مئی تک کہیں باہر جانے کا ارمان نہیں ہو سکتا۔ آپ کے نگوہ سنانے کا وعدہ بھی مجھے اس مصرع کی یاد دلایا

وہ وعدہ ہی کیا مجھ کو دفا ہو گیا

جوش ملیانی

نکودر

۲۷ نومبر ۱۹۵۱ء

اخلاص پرور ساحر صاحب زاد لطف!

مسودہ دیکھ چکا ہوں۔ والدہ عرض چارپانچ دن تک دہلی کے لیے روانہ ہو گئی۔ ان کے ہاتھ ارسال کر دوں گا۔ آپ عرض سے مسودہ حاصل کر سکتے۔

یہ سن کر آپ خوش و خفا ہو گئے کہ ایک اور ساحر جی اے جالندھر سکرٹریٹ کے ملازم آپ کی جماعت میں شامل ہوئے ہیں۔ پہلے دوشا کرتے تھے۔ ایک دنیا چھوڑ گئے۔ خدا کرے کہ یہ دوسرا حرمی دنیا تک رہیں۔

زیادہ خلوص

۳

نکودر

یکم نومبر ۱۹۵۲ء

سعادت اطوار ساحر زاد لطف!

محبت نامہ پہنچا۔ میں ۱۱۔۱۲ نومبر تک دہلی پہنچ چکا۔ ہوشیار پور اب غیر ادبی علاقہ بن چکا ہے۔ حال آنکہ ٹانڈا سرسری غیر ادبی خطہ تھا، مگر وہاں کے گورنمنٹ کالج میں چوں دو پرچہ شاعری ذوق رکھتے ہیں اس لیے وہاں اوسط درجے کے دو شاعر نے منعقد ہو چکے ہیں۔ پہلا خطوط ختم کا تھا، مگر دوسرا اردو کا گزشتہ ۲۵ اکتوبر کو ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اب ہوشیار پور میں ہیں تو منظم شاعر کو ضرور متوجہ کرتا۔ صداقت کی ملا دونوں دفعہ میرے ہی سر منٹ لاتی رہی۔

آٹھ دس جینے ہم سے کہ ہوشیار پور سے ایک صاحب نے، جن کا نام میں بھول گیا ہوں، یہ لکھا تھا کہ اسے پاس صرف دو سو روپیہ ہے؛ باہر سے صرف پانچ شاعری لیا سکتے ہیں۔ مناسب نام لکھیں۔ میں نے چار پانچ نام داداں کا کم سے کم حادثہ تحریر کر دیا تھا۔ صداقت تحریر ہی ذمہ کی تھی۔ مگر اس کے بعد انھیں سانس نہ مل سکا گیا۔ اب آپ کا مشورہ دیکھیے، کہاں

چند خطوط

کا میاب ہوتا ہے۔ جالندھر ریلوے کو دو دواہ پہلے اطلاع دے کر منظوری لینی پڑتی ہے اور منظوری کے لیے وہ کم سے کم تین چار شاہروں کو بلانے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے مجبوری پڑھین جاتی ہے۔ میرے خیال میں آپ کے مشورہ کے مطابق اگر فائدہ جمع کرنا میں کامیاب بھی ہو جائیں، تو آخری شرط کا پورا کرنا ضرور ان کے لیے مشکل ہوگا۔

آپ کی شکایات اور پریشانیوں کے تعلق میں نے کچھ سنا تو تھا۔ شاید یہ سنا تھا کہ آپ کے بھائی ایک سارکنٹ کے الزام میں منہ خور ہیں؛ مگر صیح طور پر معلوم نہیں کہ یہ خبر تازہ پریشانیوں کی بنیاد ہے، یا کوئی اور وجہ ہے۔ خدا کرے کہ اس آفت سے جلد تر نجات حاصل ہو جائے۔ اس سلسلے میں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مقامی ماحول آپ کے لیے خوشگوار ہو رہا ہے۔ سات سال آپ نے جس صبر و تحمل سے بسر کیے ہیں، شاید یہ اسی کا ثمر ہو۔ میں آپ کی دعا سے متاثر ہوں۔ زیادہ اظہار محبت و خلوص اب دو تین تازہ شعر بھی سن لیں۔ غرضاً بعد اصلاح داپہا بھی۔

نہ غم مجھ کو گردابِ رنج و بلا کا نہ محتاج ہوں میں کسی نا خدا کا
 سینے کو موجوں کی زد سے بچا کر چلا جا رہا ہوں کھائے کنا
 قدامت پسندوں پر کیوں نہیں رہے ہوا خدا کی قدامت پسندی تو کچھ
 ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے، وہی کہ کشادہ دہی چاند
 نہ اہل حرم نے غیری ہمارے نہ اہل کلیلے عنخواریاں کیں
 اگر تم بھی طرزِ فغاں نہ چھوڑو، کہاں جائیں پھر ہم مصیقت کے ار
 شاہو کہ شاعر ہو جو شہرِ تم بھی نظرِ بارغِ جنت پر کیوں ہو تمھاری
 مدد میں حالی تو یہ کہ گئے ہیں مجھ کو بھر دیگے شاعر ہمارے

دشمراد

دل بیتاب سے زندان میں یہ کہنا ہی پڑتا ہے
 جہاں کا آب و دانہ ہو ہوا، رہنا ہی پڑتا ہے
 جگر کی پھانس بے انداز ساقی کس طرح طے
 کالیں پاؤں سے کاٹا تو دکھ سہنا ہی پڑتا ہے
 قیس بستی میں ہیں یا دلھیا نہ میں؟ اگر دلھیا نے میں ہوں، تو دہان کا پتہ دے گا، یہ ہے نقطہ

نکودر

یکم نومبر ۱۹۵۲

اخلاص نواز

نفاذِ ناک کے سپرد کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہوئے آپ کے شعر میں ترمیم در ترمیم ہو گئی ایک خط لکھا پڑا۔

بات بگڑا جائے نہ کہیں بگڑی بات بنانے سے پہلا مصرع ترمیم شدہ ہے؛ اسی کی مزید ترمیم یہ ہے:

اور بگڑا جائے نہ کہیں بگڑی بات بنانے سے
مضمون تو وہی ہے مگر اس ترمیم نے شعروں بہت زیادہ زور پیدا کر دیا۔ جو پسند ہو، وہی رہنے دیں۔

زیادہ دعا میں

جوش ملیحانی

۵

نکودر

۱۶ اگست ۱۹۵۲

اخلاص پروود عزیز القدر زاد لفظ

احلیت نوحہ کچھ بھی ہو، یہ تو ظاہر ہے کہ عبرتناک انجام کے باوجود شادانے حرکت میں نوبت نہیں کیا۔ ترک کا اظہار نہ ہوتا اور صمیم ہو، تو کسی کی ترغیب کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ یہ اصول شادی پر ظاہر نہیں ہوتا سب پر ہوتا ہے۔ (ادنا آپ بھی اسی میں شامل ہیں۔ مگر مراد بادی نے البتہ قول خطا بات کر دیا کہ

چشتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

۱۲۴

مجموعہ زیر تجویز کا نام عرش سے پوچھئے تو مناسب ہو گا۔ میں تو اس کا نام سامری تجویز کر دے گا!
 ساحر سے اسے خاص تعلق بھی ہے۔

زیادہ نصیرت

جو شش ملیاتی

پٹیل وال غزل پر تاپا دہلی کے سنڈے اڈیشن مورخہ ۲ اگست میں شائع ہوئی ہے۔ رجعت
 سے گہرا ہوں، اس لیے میں سے حاصل کر لیں۔

۶

نکودر

۳ دسمبر ۱۹۶۰ء

اخلاص پرورد

آج ایک ناصح کی حیثیت میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ۱۰ فروری ۱۹۶۰ء کو آپ ہی
 نے ہمارے کوالٹج پر ملائی اور ملائی بھی پانی لانے کے بغیر، جس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ آپ کا چشمہ
 ہے اس سے فقط ہمارے سب کی نظروں میں ڈبل ہوا بلکہ اس کی ہینٹ کڑائی سے اردو زبان
 اردو شاعری، اردو شاعر اور اردو کے شاعر بھی سب کی نظر دل میں سبک ہوئے۔ اگرچہ اس
 نادانی کے لیے آپ ہی ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمارے نادانی اس سے بھی زیادہ ہے۔ ایک فہم اور بخیر
 آدمی ایسے وقت میں اپنا انجام نہ سوچ سکے اور آپ کی ترغیب میں آجائے تو یہ حرکت بہت
 افسوسناک ہے اس افسوسناک انجام کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مجھ پر انگشت نما ہوئی۔ ایک دو
 دہائی اصحاب نے کہا کہ جو ش صاحب کے شاگرد بھی ایسے ہیں۔

پچ پوچھو تو ہمارے قابل رحم صورت حال پر مجھے دل ٹیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے اسے دودھ
 کہا کہ اب اٹھ کر پیچھے چلے جاؤ، اور لیٹ جاؤ، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اتنا سہارا تمہارے بچے
 میرا کہا رہا، تو اس سے زیادہ ندامت میرے لیے اور کیا ہوگی۔ مگر ہا ہوتا، اٹھنا، دل
 تو ہمارا جگہ کوئی اور ہی جنس موجود تھی۔

۱۷۵

چند خطوط

دو سرادق بھٹکا ہے۔ اس شاعرے کی بھی شرایوں نے خواب اور بدنام کیا۔ مال مفت
دل بے رحم۔ مفت کی ملتی تھی بے تحاشا پی گئے۔ اگرچہ سات آٹھ شعرا پئے ہوئے تھے، مگر
فرحت لیکٹولی تو بڑی طرح بہک گئے تھے۔ قوالوں کی طرح تالیاں پیٹ پیٹ کر داد دینے
لگے اور شاعرہ کو ایک مضحکہ خیز بنا دیا۔ میرے لیے دہاں بھی بیٹھا شکل ہو گیا۔ میرا خیال ہے
کہ اس چیز کے انتظام میں بھی آپ کو دخل تھا۔ اور آپ نے ان لوگوں کے لیے کوئی احتیاط
روداد رکھی۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ جس طرح آپ خود زیادہ پی کر بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے
یہی کیفیت سب کی ہوگی۔ اخباروں میں اس شاعرے کی روداد چھپی کہ بھٹنڈا کے مشاعرہ
میں سب پئے ہوئے تھے۔ یہاں ایک دوست نے یہ بڑھ کر مجھ سے پوچھا کہ آپ بھی بھٹنڈا
گئے تھے؟ میں نے کہا کہ ہاں، گیا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کا فہرست میں ہے۔ اور یہ بھٹا ہو کہ
سب پئے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ ہاں، میں نے پی رکھی تھی۔ اس جواب پر اسے یقین تو
کیا ہوتا، ہاں یہ ہوا کہ گفتگو سب کی ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ میں بھی اس ہنسی میں شامل
تھا۔ اس سے پہلے سورج تنویر جالندھر ریڈیو میں شامل ہونے والے بلاؤشوں کے متعلق
طویل گفتگو کر چکا تھا، اور یہ بھی کہ چکا تھا کہ میں نے سکاڑی دادوں کی اس صورت حال پر
کیسکر صاحب کو لکھا ہے۔ اس کے بعد میں نے بھٹنڈا میں خود یہ تماشا دیکھ لیا۔ اب آپ
غودھی سوچیں کہ میں ایسے شاعروں میں شامل ہو کر نشانہ نہ ہو جاؤں، تو ادا کیا ہو! آپ کو
یہ کہنے کا حق تھا، اس لیے لکھ دیا۔ درنہ۔۔۔۔۔

کب تک جفاے غیر کا شکوہ کرے کوئی کب تک بروں کی جانی کو دیا کرے کوئی
منہ رحمت و غیرہ، خود داد مجھے دے رہے تھے، وہ بھی آپ کو مطہم ہے اور چشم دید منظر ہے۔
اس سے زیادہ داد کوئی کہوں۔ صاف کوئی اور سچی کوئی برا بھلا و محنت کے سوا اور کیا کہوں!

زیادہ دعائیں

جو شش لمبائی

اسی زمین میں ایک مصرع سو بھا ہے: بدحوہ صحبت یا رداں کبھی ایسی تو تھی! سوچا ہوں
اسے شامل غزل کروں یا چھوڑ دوں۔ فقط

چند خطوط
سرزنش سنی ہے تو ایک تارہ مطلع بھی سن لو:
گرد غم دل پر نمایاں کبھی لسی تو نہ تھی
زندگی خاک بدایاں کبھی لسی تو نہ تھی

۷

مکود
۲۰ مئی ۱۹۶۰

اخلاص پر دروغ، بڑا قدر

معذرت نامر پہنچا۔ میں نے ہمارے نام بھی اسی مضمون کا خط اسی دن لکھا تھا۔ انھوں نے بھی اس حرکت پر بہت اظہارِ غلامت لکھا ہے۔ اوماندہ کے لیے ایسی مضحکہ خیز حرکت کے سرزد ہونے کا یقین دلایا ہے۔ آپ اور ہمدونوں کی سعادت مندی قابلِ مثال ہے۔ میرا شبہ تو ہمارے دو شاگردوں پر تھا، جو چھاونی جانندھر رہے ہیں اور نادونوش کے معاملے میں مشتبہ ہیں۔ لیکن ان دونوں نے یہاں بتایا کہ آپ نے اسٹیج پر پانی لائے ہمارے پلا دی۔ اس لیے میں نے آپ کے نام بھی خط لکھا۔۔۔۔۔ اور فرحت کی قوالی سے میں پہلے ہی دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بٹھنڈے کے اسٹیج پر بیٹھنا بھی مجھے بار معلوم ہوتا رہا۔ پہلے والا شاعر سب کے سامنے خود کو اچھی طرح رسوا کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی قریب بیٹھے ہوئے استاد کو بھی۔ ہمارے اس کا آس کیوں نہ ہوا؟ اکبر تو موتی کی آب ہوتی ہے۔

جہاں تک میں یہ یہودگی محسوس کرتا ہوں اس کا صحیح علاج تو یہ ہے کہ مشاعروں میں جانا ہی چھوڑ دوں۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہو، طبیعت تو خراب نہ ہوگی۔ وہ مصرع تکمیل پا گیا ہے۔

بیٹھنا بزمِ سخن میں بھی ہوا ہے مشکل

بزمِ صحبتِ یاران کبھی لسی تو نہ تھی

آپ کے خلوص و سعادت مندی کا دیا ہی مراح ہیں، جیسا پہلے تھا۔ زیادہ دعا کیں۔
جو حسنِ لمایا

نکودہ

۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء

اخلاص پروردگارِ قادر

محبت نامہ اور رحمت تارِ سخن گوئی کا شکریہ۔ ۲۶ مارچ کو وہ تقریباً قابلِ دید تھی۔ دشا
شال بطور خلعت بھی دیے گئے۔ ایک ایڈریس پڑھ کر سنایا گیا، یہ کافی طویل تھا، اور خوا
ہو کھٹے میں تھا، ایک ابھیندن گزرتا، جو پہلے ابھیندن گزرتا تھا خلاصہ کہا جاسکتا۔
تنگ وقت میں محکمہ لسانیات نئی چیز کہاں سے نکھاتا۔ یہ تو عرش ہی کا کام تھا۔ ایڈریس
کی نقل اس کتاب کے آخر میں شال ہے۔ کتاب مفت تقسیم کی گئی۔ ایک ایسا ہی انعام
و اسے سنت رام صاحب کو جو ہوشیار پور کے قریب پرانی بستی کے باشندے ہیں، دیا گیا
پنجابی کے لیے گوپال سنگھ دروی کو۔ باقی انعام پھوٹے اور خلعت یا ایڈریس کے بغیر
سے کم نہ تھا۔ اور دوا میں دفا صاحب کو ایک ہزار، ہنر کو ۵۰۰، قیس کو ۳۰۰، اختر
کو ۲۰۰ بغیر کسی خلعت وغیرہ کے۔ بخرا لڈ کو کی شاعری تو صفر ہے، یہ سفاشی ہی سمجھا جا

ہے۔۔۔۔۔

تارِ سخن کا مادہ کسی بھروسے تو آتا نہیں، پھر اس کا بلاک چھپنی داد۔

زیادہ دعائیں

جو شش ملیاتی

نکودہ

۲۳ جون ۱۹۶۹ء

اخلاص پرورد

دو ہفتوں سے پیاد ہوں۔ موسم کی شدت و خلعت ہی کا یہ اثر ہے

چند خطوط
چوتھی قسط ارسال کر رہا ہوں۔ تین قسطیں اور ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔ آپ کے بار بار حکم
گور داس پوری نے میری ایک غزل کے خلاف کچھ لکھ کر اس بات کا ثبوت دیا کہ مینڈ کی کو بھی
ہکام ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ مکتوب شانِ شہزادہ مئی کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ میں ان کی
شاعرانہ قابلیت کو جاننے کی طرح جانتا ہوں۔ انھیں کے مکان میں، دین باران کے طرحی اشعار
جو بغرض اصلاح پیش کیے گئے، دیکھتا رہا ہوں۔ تقطیع تک غلط ہوتی تھی، کوئی کل سیدھی
دھمکی، ایک مٹھری کہا ہے، تو دوسرا نہیں لگا سکے، دوسرا لگایا ہے تو پہلا نہیں۔ امرتسر
کے ایک ادیب پرورد دوست نے مجھے اس پر توجہ کیا ہے، مگر میں تو ایسے واقعات پر خاموش
رہنے کا عادی ہوں۔ پھر جواب جاہلان کا ذکر ہی کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حمد پر کھرج
کر رہے ہیں؛ اور وہ بھی بالکل بے تکی۔۔۔ صاحب ہی محرک معلوم ہوتے ہیں۔
جوش ملیح

۱۰

نکودر

۱۸ جون ۱۹۶۹ء

اخلاص پرورد عزیز القدر

پانی یادیں: اس کے متعلق شمارے اب تک نہیں پہنچے۔ شاید نئی یادیں، اس تلاش میں سنبھلا
ہوئی ہوں۔ تاہم نفی و اثبات کا کوئی جواب تو موصول ہونا چاہئے۔ تازہ حالاتِ معاش سے
بھی اطلاع دیں۔ آٹھ شاگرد فوت ہو چکے ہیں۔ اب دیکھئے کس کی باری آئے۔ خاندانِ داغ
میں بھی، ایک میں ہمارہ لگیا ہوں۔ اس ادبی باب کی آخری مان اب مجھی پر ڈھکی۔
امید ہے کہ آپ عافیت سے ہونگے۔ زیادہ دعائیں۔
جوش ملیح

نکودر

۱۲ دسمبر

میں اللہ آپ کی پوجا یا مینوشی کا مذکور ایک ہوتا ہے مفید جھوٹ، ایک ہوتا ہے سیاہ جھوٹ؛
یہ سیاہ جھوٹ ہے، کبھی مخرے نے آپ سے جھوٹ کی ہوگی۔ اور بیچ میں مجھ کو مان لیا۔ خدا اس
سے سمجھے!

میں ہوں امرت لعل عشرت اس عنوان سے تازہ ہو گیا
صدی (سالنامہ) میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں آپ کی ادبی خدمت، گزشتہ ادبی تعلق کا
مختصر سا تذکرہ بھی نہیں۔ میری نظر میں یہ بھی ادبی تقصیر ہے، عجیب ہو کہ اتنی راہ دورم کے باوجود
گیتا صاحب نے یہ دسمبر کے لیے مدعو نہیں کیا۔

۲۳ کو لا کاٹ، پٹیا لکھ کر مشاعرہ گورو نانک دیو پر ہے؛ رضا مندی اور سال کر رہا ہوں۔ ایک
ساحر تو ضرور دقیق سفر ہو گا یعنی ریا ل کوئی۔

گیتا صاحب سے کچھ کہنے کی اگر ضرورت ہوئی تو مناسب وقت پر لکھ دیکھا جائے عند الملاقات بنا
دیکھا۔ مکن ہو کہ ضرورت محسوس ہو۔

زیادہ دھائیں

پیش ملیانی

۱۲

نکودر

۶ جنوری ۱۹۷۰ء

اخلاص پرورد

گیتا صاحب کے متعلق آپ سے کچھ کہنے کی اب ضرورت نہیں رہی۔ پٹیا لکھی آپ نہیں
کئے۔ شہر متنازعہ کے متعلق میں نے وہاں جگر جالندھری سے یہ پوچھا تھا کہ شہر کس سے

چند خطوط
 نہ تھا۔ اس کے علاوہ شعر کی بناوٹ اور اس میں لفظ تضاد کا حرف بھی یہ یقین دلاتا ہے کہ
 شعر میرا ہی کہا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کسی نہ کسی قریب ہی چلا ہو گا۔ وہ قریب دھرم سالہ
 کے سوا اور تو کوئی ہو نہیں سکتی۔ میں نے پوچھا کرتے آپ کو بھی نہیں دیکھا البتہ دھرم سالہ سے
 سات آٹھ میل دور تک رفیق سفر میں کر سادھو سنتوں اور مندروں کی عقیدتمندی ضرور
 دیکھی تھی۔ اسی قریب پر یہ شعر کر لیا ہو گا۔ دیسے یہ شعر میرے لیے بھی ایک بھولا ہوا افسانہ
 تھا۔ اب بھی یہی صورت حال ہے۔ آپ کے خط ہی نے مجھے اس شعر کی طرف متوجہ کیا تھا۔
 مذکورہ بالا کوائف اسے اپنی تصنیف تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ بات اب تک سمجھ میں
 نہیں آئی کہ بیاض میں اس کا اندماج کہیں ہے۔ یہی بات مجھے اس کی تخلیق کے بطلان پر
 مجبور کرتی تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ایک کھوئی ہوئی چیز مجھے آپ کے توسط سے مل
 گئی۔ زعمہ باش

جوش ملیحانی

۱۱۳

نکودر

مخمل میں کیوں چھوٹے ساپ	ساحر سے ہم پوچھیں گے
بن بجا کراتے ساپ	کس جٹل سے لے آئے
ایسے موٹے تازے ساپ	کیونکر آئے قابو میں
کچھ ان میں چٹکے ساپ	کچھ ان میں مٹیالے تھے
دس بارہ تو ہونگے ساپ	ایک نہیں، دو تین نہیں
شاید یہ زہریلے ساپ	دودھ پلا کر پالے تھے
بچپن پھیلانے والے ساپ	میری طرف بھی آئے تھے
آگے تم تھے، پیچھے ساپ	یہ منظر بھی دیکھا تھا
کاٹ نہ لیں ساحر کے ساپ	شہد بپا تھا مخمل میں

۱۵۱

چند خطوط
اس کی نقل اخبار پرتاپ جالندھر میں ارسال کر دی ہے۔

جوش ملیانی

۲۶ مئی ۱۹۷۰ء

۱۴

نکودر

۱۷ جون ۱۹۷۱ء

اخلاص پرورد

کئی دن ہوئے مسانپ کی روئی میں چند مزاحیہ اشعار بھیجے تھے۔ یہ محض تفریحی
دل لگی تھے۔ اخبار پرتاپ، جالندھر میں شائع ہو گئے ہیں۔ مگر آپ نے داد و درود
بیک نہیں بھیجا۔ اس کے بعد ایک اور شعر بھی کہا تھا، وہ بھی اس لیے بھیجے۔
یہ تھا کام سپرے کا شاعر نے کیوں ڈھونڈے
امید ہے کہ جس طرح پوجا دالا شعر تان پٹا یا کہ اسے چکھنے میں جڑوانے کی تجویز
اسی طرح یہ اشعار بھی نفسِ طبع کے لیے برعمل ہونگے۔

زیادہ دعائیں

جوش ملیانی

۱۵

نکودر

۲۲ جون

اخلاص پرورد

محبت نامہ پہنچا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ان اشعار کو پڑھ کر برہم نہ ہوئیں۔ مگر آپ
شاکر و گلی عزت افزائی تسلیم کیا۔ اس صاف قادیانیت اور حسن عقیدت کی دلدوزی
یہ سن کر اور بھی مسرت ہوئی کہ آپ جہاں جلتے ہیں اس غول کی فرمائش ضرور ہوئی

۱۵۲

چند خطوط

یہ قبول عام کا روشن ثبوت ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسی زمین میں تین چار شعر بھی کانا کا رے
دارد ہے۔

یہ بلاشبہ غزل ہے، قطع نہیں ہو۔ قطع کا مضمون مسلسل ہوتا ہے اور اس میں غزل کی طرح
ہر شعر کا الگ مضمون نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مطلع بھی ہے اور مقطع بھی۔ قطع کے
لیے مطلع ضروری اور لازم نہیں ہوتا۔ زندہ باغ کے سوا اور کیا کچھوں، یہی داد کافی ہو۔
ساحر صاحب! اداقت اصحاب ہر جگہ زندہ باد کہہ جاتے ہیں، مگر غلط ہے۔ انقلاب
زندہ باد پنجاب زندہ باد، یہ تو صحیح ہیں، مگر مخاطب کسی یہ کہنا کہ زندہ باد سرسر غلط ہے۔

زیادہ دعائیں

جوش ملیح

میرے استاد کے استاد

میرے استاد محترم جناب نسیم نور علی (مرحوم) فن عروض پر مدرس دیتے ہوئے اکثر متروکات کے ضمن میں میرے استفسار و اظہار شکوک پر فرمایا کرتے: "قبلہ و کعبہ کا یہی حکم ہے، حضورؐ کا یہی فرمان ہے۔ اُس وقت میں ان جملوں کو سن کر صرف متعجب ہو کر رہ جاتا۔ کھلی میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ "قبلہ و کعبہ" اور "حضور کا اشارہ کس ذات و الامصافات کی طرف ہے نیز "حکم" اور فرمان" سے کیا مراد ہے۔ مگر بعد میں جب "بادۂ سر جوش" میرے زیر مطالعہ آئی اور متروکات کے باب میں استاد محترم کے ارشاد کی تصویر و تفسیر و انصاف قبلہ جوش طیبانی کے فرمودات میں بھلکتی نظر آئی، تب مجھے ان کی عظمت کا احساس ہوا اور یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ جناب نسیم صاحب کا اشارہ یادگار بدیع، ماہر فن عروض، شاعر با کمال، دالامرتبت قبلہ جوش صاحب کی طرف تھا۔ اس طرح غائبانہ طور پر میں ان سے متعارف ہوا۔ اب میرے دل میں ان سے قریبی رسم وادہ پیدا کرنے کا اشتیاق جنگاں لینے لگا۔ بالآخر سلسلہ خط و کتابت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ میں ان کی شریف انقش، بلند اخلاق اور مخلصانہ غور و ادرازی کا قائل ہوتا گیا۔

غالباً اگست ۱۹۵۷ء میں شیلے کے ایک سرکاری شاعرے میں جس کے انتظام و انصرام میں میرا بھی دخل تھا، پہلی مرتبہ قبلہ جوش صاحب کے نیا دعائے حاصل کرنے اور قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی شاعرے میں میرے دل پر ان کی بلند مرتبہ شخصیت کے

نقش اور بھی گہرے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ سر شاعر ملک کے نامور اور صفتِ اول کے مخنور
 بنایت عقیدہ مند اندھ گم جوش کے ساتھ ان کی قدیموی کاشرت حاصل کر رہے تھے۔ بعد
 ازاں ان کے نیاز حاصل کرنے کے بہت مواقع نصیب ہوئے اور ہر ملاقات پر میں نے
 ان کی شخصیت کو عظیم سے عظیم تر پایا۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ عظمت اور شہرت فنکار میں احساسِ برتری کا جذبہ پیدا
 کر دیتی ہے اور بعض اوقات فنکار اس جذبے کے تحت رعونت اور غود پرستی میں مبتلا ہو کر
 بلند چکا ہی اور شادہ طبعی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن
 جہاں تک قبلہ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے عظمت اور شہرت کی ان بلند یوں تک پہنچنے
 کے باوجود آپ سادگی، شرافت اور منکسر راجی کا مجسمہ ہیں۔ ان کے محاسن کے اپنے بگائے
 سب قائل ہیں۔ خوش اخلاقی اور بلند کرداری کی وجہ سے آپ ہر ادبی حلقے میں اور ہر
 مکتبہ خیال کے ادیبوں اور عالموں میں تعظیم و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر
 استاد محترم نے بھی آپ کے متعلق بجا فرمایا ہے۔

مشاگرد جوش ملیحانی ہوں میں قرطاسِ سخن پہ نقشِ مانی ہوں میں
 داغ و ذوق و نصیرے ہوں منسوب کیوں فخر نہ ہو کہ خاندانی ہوں میں
 حضرت جوش کی شاعرانہ تفصیلت سے متعلق کچھ عرض کرنا آفتاب کو چہ داغ دکھانے کے
 مترادف ہے کیوں کہ انہوں نے برسوں کی مسلسل ریاضت اور خداداد قابلیت کی بدولت
 علمی اور ادبی دنیا میں وہ مقام پیدا کر لیا ہے جہاں کا مقیم خود اعتمادی سے کہہ سکتا
 ہے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" یا "میری بیاض شعر خدا کی کتاب ہے"۔
 ان کی پہلو دار شخصیت کی تابناکی سے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ شرافت اور شائستگی
 سادگی اور تواضع، خلوص اور انحصار، پاکیزہ خیالی اور بلند چکا ہی ان کی شخصیت کے نمایاں
 جوہر ہیں ان محاسن کی گہری چھاپ ان کے کلام پر بھی ثبت ہے بقول آپ کی ذاتِ گرامی
 پر بجا طور پر صادق ہے کہ عظیم انسان ہی عظیم ادیب یا شاعر ہو سکتا ہے۔ بقول شخصہ:
 یہ وہ کہ ان سے ہر نام گد شنگاں نکلاں یہ وہ کہ ان سے ہر شانِ فرشتگان کی خود

میر استاد کے استاد
حضرت جوش کے ہم عصر اور عہدِ حاضر کے دیگر مشاہیر ان کے مقام و مرتبہ کو کس حد
احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کس قدر ان کی علمی تحقیقات، محاسن شعری اور
صلاحیت کے قائل اور مداح ہیں، اس کا کچھ اندازہ جناب فراق گورکھپوری
سے لگایا جاسکتا ہے۔ چند برس ہوئے، جب پہلی مرتبہ مجھے فراق صاحب
حاصل ہوا۔ جناب خوشتر گوامی مدیر میونسپلٹی نے میر ان سے تعارف
فراق صاحب نے فرمایا:

”پنجاب کیا ہندستان گیر شہرت کے بجا طور پر حقدار اور مالک جوش
لمیانی صاحب کا دمِ غنیمت ہے۔ ان کے ہر عزیز کے کلام میں فن
عرومن کی نشاندہی ملتی ہے۔ ان کے شاگرد سیم ہوں یا نسیم کے
تلمیذ رشتی ہوں، قبلہ کے سب عزیز ہندو فر تیز ہیں۔“

جب میں نے اس واقعے اور فراق صاحب کے ارشاد کا ذکر حضرت جوش قبلہ
انہوں نے جواباً فرمایا: ”فراق صاحب نے جو کچھ کہا، اسے حسنِ فہم ہی کہہ سکتے
منکسر مزاجی اور عقلی سے بے تعلقی کی اس سے بڑھ کر نظیر کہیں کم ہی ملے گی۔
مرزا یاس نگانہ چلیگری جو غالب تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، قبلہ کے کلام کی
اور بلاغت کے دل سے قائل تھے۔ صاحبِ فہم اور اصول و قواعد کا پاس بند
کو کئی مرتبہ انہوں نے مجھے ”میرے استاد کے استاد“ حضرت جوش کے کلام کو فرا
داد و تحسین کا مستحق قرار دیا۔

دل شاہ جہان پوری امیر مینائی کے شاگردِ رشید تھے اور بذاتِ خود ان کا شمار
کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ بھی جوش صاحب کو ہلمنے کی طرح مانتے اور
طرح مانتے تھے۔ ان کے کلام پر اقبابِ برائے کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا
”زبانِ نکالی اور زیادہ سے زیادہ معتبر ہے حسنِ طبیعت کی دلکشی
دادِ طلب ہے۔ اسلوبِ بیان اور حسنِ بندش استادانہ شان کی
حاصل ہے۔ حیران ہوں کہ پنجاب کے ایک گوشے سے رہنے والا

میرے استاد کے استاد
 شخص ایسا زبان دان ہو کہ اس کی ہر غزل اور ہر نظم پر اہل زبان کے کلام
 کا گمان ہو۔

میں نے اپنے استاد محترم جناب نسیم نور محلی کے پاس ان بزرگوں کی طرح معمول
 ہوئے خطوط دیکھے ہیں جو اس صداقت کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔
 جانشین داغ ناخدا اے سخن حضرت نوح ناروی نے بادہ سر جوش پر اچھا برائے
 فرماتے ہوئے بجا طور پر رقم فرمایا تھا:

کیا وصف جناب جوش کیجئے	فلت جو صبر و جوش کیجئے
اعدا ز کلام اثر میں ڈوبا	نشرت کی طرح جگر میں ڈوبا
ہر مطلع ہے آفتاب ان کا	ہر مقطع ہے لاجواب ان کا
جو مصرع ہو انتخاب ہو وہ	جو شعر ہے کامیاب ہو وہ
جو حرف دہ حرف دلنشین ہے	جو لفظ دہ لفظ نازنیں ہے
تو تیب غزل جو ست کچھ نگر	تخیل ہو نا دست کچھ نگر
نوش فکر ہیں نوش داغ یہ ہیں	شاگردِ شید داغ یہ ہیں

اسلامات کی یادگار ٹھہرے
 تاج سیر افتخار ٹھہرے

اپنے عزیزوں نیز تلامذہ کے لیے ابوالفصاحت قبلہ جوش کے دل میں بے پناہ شفقت
 کا جذبہ موجود ہے۔ ہر موقع پر اپنے عزیزوں کی بہتری و ہمد کا خیال اور رہنمائی
 کا احساس ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے کسی شاگرد یا عزیز کے کلام میں کہیں سہو
 بھی سقم رہ جائے تو یہ آپ کے ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اسے دیکھ کر خود اپنے
 دل میں غلامتِ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ اسے آپ سے تلمذ کی نسبت ہے۔ کھر بس قبل
 میری ایک نظم پنجاب کے سرکاری جویدے میں شائع ہوئی ان کی نظر سے گزری تو
 فوراً تحریر فرمایا:

”پاسبان کا تادہ شاہہ دیکھا۔ آپ کی نظم میں ایک جگہ: فلک تیش

پڑا تاد کے استاد
 ہے مقام اس کا... لکھا ہے۔ یہ محلو نظر ہے۔ جب فلک نشیں کر دیا
 تو پھر لفظ مقام سراسر بے ربطا انداز ہے۔ 'ہے آسمان پر مقام اس کا'
 اس طرح کہا جا سکتا تھا۔ ع۔ یزوں کے کلام میں ضعف تا لیف دیکھ کر
 ندامت ہوتی ہے۔ اسی نمبر میں قیس کی ایک نظم ہے۔ دوسری
 قیسے شع کے مصرعے ثانی میں حرب کی دے متحرک کر دی ہے۔
 انھیں بھی متوجہ کر دیا ہوں۔ اہل حرب (سپاہی لوگ) دارا حرب میں
 دے ساکن ہے۔

ایک ادمو قے پر آل انڈیا ریڈیو، جالندھر سے میرا کلام "کلام بزبانِ شاعر"
 نشر ہوا۔ اسے آپ نے بھی اتفاقاً سنا اور تحریر فرمایا:
 اخلاص پر دوزخ بڑا قدر!

۱۰۔ سب کو میں نے ریڈیو کے ذریعے آپ کو سنا۔ سادہ لکھائی بھی اس
 پر دوزخ ام میں شامل تھے۔ کلام پسند آیا اور دیتا ہوں۔ یہاں سب
 (اقوام) کو لکھو دریں شاعر ہے جو آریہ اسکول میں ایک بچے بعد
 دوپہر شروع ہو گا۔ شرکت کا خواہشمند میں ہی نہیں، بعض اور احباب
 بھی ہیں جنھوں نے آپ کو سنا ہے۔ اگر یہ تکلیف آسانی سے گوارا ہو سکے
 تو جنون ہو گا۔ میرے بہت سے عزیزوں نے شامل ہونے کی اطلاع دی
 ہے۔ جناب بیدی صاحب کو صدارت کے لیے تکلیف دے رہا ہوں۔
 وعدہ تو بہت کام دہی گیا تھا مگر غلطوں کی بات جو کچھ ہے بڑی ہمدردی
 جواب کا منتظر رہو گا اور پھر شاعر میں آپ کا انتظار، ریگا۔ پچھلے
 دو انھوں کی تلافی ہو جائیگی۔ بچوں کو دعا ہے درازی عمر۔ ہاں ابھی
 وہ بہتر دار جو گزشتہ دنوں چندی گڑھ میں مجھے دیکھ کر خوش رہتا
 ہوتا تھا۔ اب بھی مجھے یاد کرتا ہے۔ باجول گیا؟

اندازہ لگائیے۔ کتنی شفقت، کتنی محبت اور کتنی شرافت کی چاشنی ہے۔ کس آ

میرے استاد کی یاد
 کا رنگ ہے۔ کہاں مجھ سا کم پایہ، ہتی دامن، ہمت دی قسم کا بے بسا طاعون شاعر اور کہاں قہر
 ایسے شفیق و رنگ کی چشمِ عنایت۔ کیوں نہ کہوں :
 جہاں شاعری میں نام اپنا یوں بھی ہوں بھی
 غلام جو کھسکے، یا رشتی پٹیا لوی کہے

تہمت

اس شمارے کے لیے مولانا غلام رسول ہیر مرحوم اور بچی عمتا حسن صاحب سالیقی نرائس سکریٹری حکومت پاکستان سے بھی مضامین لکھنے کی درخواست کی گئی تھی۔ مقدمہ الکر بزرگ بھی تھے اور والد کے ہم وطن بھی۔ یونہی الکر بڑے صاحب کمال آدمی ہیں، اور والد کے پرانے عقیدہ مند۔ موصوف پاکستان میں اور دہلی کے صدر بھی رہے اور والد کے متعلق ثقافتی اداروں کے سرپرست بھی۔ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ اس حادثے کی وجہ سے مضمون لکھنے سے قاصر رہے۔ مولانا ہیر صاحب نے مضمون لکھ لیا تھا۔ لیکن وہ پچھلے سال کی سہ ماہی اور پاکستان کے درمیان جنگ پھر مچانے اور بعد کے حالات کی وجہ سے ہم تک پہنچ ہی نہ سکا۔ اسی دوران میں مولانا ہیر کا انتقال ہو گیا۔ اب نہ جانے ان کی وہ آخری ادبی تصنیف کہاں اور کس حال میں ہے۔ تیر کا یہاں تہر کے دو نقل کرتا ہوں۔

(۱)

۱۱۱

برادر عزیز۔ دراصل ادراک میں بہار ہو گیا اور پیادہ نے طول کھینچا۔ ارجح میں صحت ہوئی، پھر نقاب خاصہ میر تک دانا میگر رہی۔ لیکن زنا و قوت جسم میں آئی، تو ایک ایک درد دماغی کو کے گھنا سرور کر دیا تھا۔ مشکل مضمون مکمل کر لیا تھا۔ بلکہ بوش صاحب

تمہ

اگر طالب حسین طالب کلیان پوری کو سنا بھی دیا تھا۔ سو وہ میرے پاس موجود ہے۔ صاف نہیں کیا۔ طالب صاحب سے کہا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دی جائے اور مارسل کے بارے میں استصواب کر لیا جائے۔..... کوئی مناسب ذریعہ ہو تو مضمون صاف کر لوں۔ میرا خط اچھا نہیں مضمون خاصا لمبا ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے تاخرات کے مطابق لکھا ہے اور عام قاصدوں کی پابندی نہیں کر سکا۔ امید ہے، آپ بخیر ہونگے۔

نیا ذمہ - ہیر

(۲)

۱۰ اگست ۱۹۷۱

برادر عزیز - تیغیں مکمل ہو گئی مضمون طویل ہو گیا۔ اس میں کچھ باتیں ہیں۔ اپنے وطن کی بعض یادیں محفوظ رکھنے کی غرض سے لکھ دیں۔ لیکن بے تعلق نہیں۔ آپ اب مختار ہیں۔ میں گھر سے باہر نہیں جاتا۔ آٹھ بجے کے قریب باہر دفتر میں بیٹھتا ہوں۔ بارہ بجے کے بعد تک وہیں رہتا ہوں۔ اور کھانا کھا کر سو جاتا ہوں۔ چار بجے سے سات بجے تک پھر دفتر ہی میں رہتا ہوں۔ سہتے کا دن شہر جانے کے لیے مقرر ہے۔ اس دن میں شام لگتا ہوں۔ صبح کو نہیں ملتا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں۔ ہیرانی فرما کر اپنے دل پر ماحول تک میرا سلام پہنچائیں۔ والسلام - تمام احباب کی خدمت میں بھی سلام۔

آپ کا

ہیر

دہلی تک ہندوستان اور پاکستان میں آمدرفت اور ٹاک کا سلسلہ جاری نہیں ہوا۔ اسی کے بعد کوشش کی جاسکیگی مضمون اگر مل سکا، تو وہاں سے منگوایا جائے۔ اوہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں تو مولانا خود ہی ایک تھا، ہو گئے۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ اگر مضمون مل گیا، تو تحریر ہی کی تدر کر دیا جائیگا۔

عرش ملیانی

نوائے سروش

انتخابِ کلامِ جوش

وہی مطلوب ہو، وہی طالب اک معاً ہوا، خدا نہ ہوا
 مختصر بھی ہے اور حسیاب بھی کیا ہو اکا جواب کیا نہ ہوا
 جیہٹا اے الفت فریبِ اعجاب! ابتدا کیا تھی، انتہا کیا ہے؟
 لالہ صحنِ باغ ہوں، گوہرِ شبِ چراغ ہوں پھر بھی میں ایک داغ ہوں، یہ دغا گاریں
 جلوہ رخ دکھا کہیں دل کی خاشاک کہیں نیند ہی بن کے آ کہیں دیدہ انتظار میں
 کیا تجھ سے کہوں دیکھنے والے اگر تو کیا دیکھ آکھیں ہیں تو مظلومی اور بابِ وفا دیکھ
 لے دل! یہ کہیں آہ تری جوم نہ بن جائے خاموش ہو کمِ بخت! زمانے کی ہوا دیکھ
 پھیل کیوں خاموش ہیں؟ پیاد میں کیوں کوکھ مجھ کو درے میرے سرساراجمن ہو جا۔
 لحاظ در محبت کا اور کس کا کرتا یہ جی کا دلگ تھا، جی کو نکلا لیا میں نے
 پھل لے آئے نہ آئے، یہ مقدس کی ہو جا چھاؤں تو نخلِ تمنا کی گھٹی ہوتی ہے
 ضبطِ گوہر سے کہیں چاک نہ ہو جائے جگر بلند آئس کی بھی پیر سے کی گئی ہوتی ہے
 اک تمھاری ہی نزاکت ہو، جو ہو تم پر گراں درندہ ہر پھول میں مالا مال بدنی ہوتی ہے
 اس قدر فریب کیوں حال تھا، والے جوش! کبھی دل پر تو کبھی دم پر بنی ہوتی ہے

انتخاب کلام

بجلی نے کیا خاک چھین جس کو جلا کر
اس جس سے امید نہ رکھ مرہم دل کی
جنوں کے فیض نے معبد بنا دیا جھ کو
طواف کیوں نہ کریں گردِ شیں زانو کی
کھسکیں گی کس طرح راہ طلب کی نکلیں
زندگی کو دو قدم چل کر پسینا آگیا
آؤ چھرا کو رنگ رُخ اپنا ہر اک شتاق پر
جس میں ہولی کھیلے ہیں وہ ہینا آگیا
ناخدا غافل ہوا ایں تندہ موہیں ہولناک
وہ تو قسمت تھی کہ ساحل پر سفینا آگیا
تمنا خود تمنا کا ثمر ہے
اسے کیسے نہاں بے ثمر کیوں
میکدے میں بھی ہر ناصح موجود
اب یہاں بھی نہ غمخوار ہو گا
غم کو انعام سمجھنے والا
ذہر کب تک یہ گواہ ہو گا
معتد بن گئی تھریر پاس رازداری سے
وہ اتنا بھی نہ سمجھے یہ کہانی کون کہتا ہو
جب بنا سکتے تھے حال دل تو وہ سنتے نہ تھے

اب وہ سنتے ہیں تو ہم ان کو سن سکتے نہیں
موت اگر وقت سے پہلے نہیں آتی نہ ہی
اپنی آنکھوں ہی سے دیکھا جو جسے اے ناصح
میری آنکھوں سے بھی تو نے اسے دیکھا تو
قابلِ رحم تھی ہر ایک حسین کی صورت
حسن کے ساتھ اگر عشق نہ پیدا ہوتا
اے خود آج تھے میزان جنوں میں تولوں
میرے بڑھتے ہوئے دعوں کا بھرم کو کھو لو
عاقبت کے لیے بھی کو بکنی کر لو گنا
پہلے دنیا کی مصیبت کے تو پتھر ڈھولوں
میرے اے جنوں مجھے اکارتو نہیں
لیکن اگر وہاں بھی غمخوار نہ ہو سکا!
غرض مندوں نے کس شکل میں ڈالا ابر رحمت کو

یہی اصرار ہے سب کا: یہاں پہلے یہاں پہلے
تھے دیر میں کوئی نام نہاد حرم میں تو نظر آسکا
جنہیں تھم سے لٹنے کی تھی لگن وہ بڑھ گئے تیر کی ہیں
رہے سب اچھے وہی بشر جو ادھر گئے نہ دھر گئے
تجہ شوق کا طلب کیا ہو تو تو کے ہو ذوق نظر نہ کر
جو ٹھہر گئے وہ ٹھہر گئے بوجہ گدگدے وہ گدگدے

تخلیہ کلام

کیا تو نے اپنی مرضی سے چھوڑا ہے دنیا والوں کو

یاد دنیا والوں نے تجھ کو اسے تاکہ دنیا

مرغ چمن اب بھی ہے نہ یاد خواں آپ تو کہتے تھے ہمسار

آپ رہے جس سے بہت عجیب لیجئے آج اس کی خبر آ

ڈوب جاتے ہیں امیدوں کے سینے اس میں نہ مانو گھا کہ آئندہ ہے زور اس

عیب جتنے ہیں منہ پہ کہتا ہے آئینہ بھی ہے کس قدر بیبا

نوشی خوشی ہی نہیں غم کی تینوں کے بغیر فقط نشاط میں گدے تو زندگی

دوست دشمن سب کا ہے میلان قاتل کی طرح ایک مظلومی نظر آتی ہے بسل کو

کیوں نہ ہم پر مغاں کی بھی زیارت کھلیں راہ میخانے سے بھی جاتی ہے منزل

داد و عشر مرالضاف اب کیونکر کرے خود تو وہ میری طرف ہڈیں ہون

باد و عیش کی میں خاک تمنا کرتا وہم تھا زہر نہ بھروسے کوئی پنا

باد کا تند کی موجوں سے یہ کھٹکا ہے مجھے اکہم وہ ڈوب نہ جانے کہیں پیما

میں قید زندگی سے مانوس ہو چکا تھا یارب امری رہا ہی کس جرم کی ر

کیوں نہیں باد و عاف بن کے چھوڑا آپ چارہ جو میں کاپ کی شرفی سے طوفان

رلا زندگی یہ ہر سنگ گراں کو ہنسی سمجھیں نہ وہ میری لگا

میں تو کر دیا خاموشی تم نے مگر رد کو گئے کس کس کی دیا

ادھر صحر اُدھر برق تپاں ہے کہاں لے جاؤں اپنے آشی

کیوں اشتعال جھڑپ جو آپس کی بات پر یوں فیصلہ ہوا را تھا را ای

کوئی چمن میں کوئی بیاباں میں جا دلم وہ کیا کرے کہ جس کا ٹھکانا کجا

یہ گمانی کی بھی حادثہ ہے زمانے کہتے مجھ کو اچھا نہ کہو گے تو یہ اچھ

جو ہوا وہ تو ہوا غم نہیں اس کا اے جرن کھانے جاتی ہے یہی فکر کہ ار

ہر جہر پر سر جھٹکے جھکا یا وہ ہیں تھے دکھا ہو تو ہی بات کو ایسا کوئی

قصہ کہ بگڑنے سے نہیں تو نہیں بگڑے بگڑا ہے راہ بھی زمانے کی

تیں خدا ہوں، ہر گناہ سے مجذوب بنے ^{انتخابِ کلام}
 حق تو یہ ہے، بخود ہی میں خودی کچھ کم نہیں
 آدمی بھی جو خدا سے دل لٹی کرنے میں فخر
 آدمی سے بھی خدا کی دل لٹی کچھ کم نہیں
 سونگ کی تصویریں حاضر بھی ہیں غائب بھی

برودہ مری آنکھوں کا فالو س خیال ہے
 ہر کار میں اک نور ہے، ہر سوز میں اک نغمہ

دنیاے محبت کی دنیا ہی نرالی ہے
 اچھا مذاقت میں ہر چیز کو کھو آئے

اک جانِ حویں ہم نے شکل سے سنبھالی ہے

یہ اندھیرا جھدم پیدا ہوا	دارغ دل چکا، تو غم پیدا ہوا
جب خیالِ بیش و کم پیدا ہوا	ہو گئی ہر ایک بیشی میں کمی
گردنِ مینا میں غم پیدا ہوا	میکدے میں شمع بھی آیا اگر
رند میخانے میں آئے آؤ گھٹا بھی آئی	دیکھ تو رحمتِ باری کے کرشمے ساتی
خاکِ اڑا اٹی ترے کپڑے سے صبا آتی ہو	اک قطرہ میں ہی تو ناکام نہ آیا ظالم!
خوابوں جو نہیں ہے بندگی کا	بندہ ہوں اگر تہوں اس کی کا
وہ ناس ہے یہاں تو زندگی کا	بیچے کی دعائیں دینے والو
وہ راز تو کھل چکا کبھی کا	جس راز کو تم چھپا ہے ہو
منہ بند رہا کلی نکلی کا	کیا جانے، صبا نے کیا کہی بات!

آج یہ کیا ہے جہاں کوئی تماشا تو نہیں؟	پوچھتا پھرنا ہوں ہر ایک سے عمر میں بھی
دلوں ہاتھوں سے کیلچے کو دباؤں تو کہوں	یوں تو مجھ کو بھی ہے کچھ کہنے کی جھلک لیکن
برعلیٰ کوئی تہید اٹھاؤں، تو کہوں	بھائی جہاں کہنے کا سلیقہ بھی ہو شرط
امتِ دہلی جو ہیں کشمیر و صباؤں تو کہوں	ابھاؤ لگا کو جھوٹا، کہوں کیا میں ابھی!
کہنے کی کوئی راہ نکالوں، تو کچھ کہوں	دوستہ کہیں دباؤ سامت ہو میری بات
دونوں جہاں سے ہاتھ اٹھاؤں کچھ کہوں	کیونکہ کہیں مجھے کس چیز کی طلب

دیر سے کہے کہ جانا چوں یہ مقصد لیکر
لے صبا تو نے چہن کی تو سنائی روتا
دیکھ آؤں، کہیں میرا بھی خدا ہو کہ نہیں
آئیائے کا بھی کچھ حال بتا ہے کہ نہیں
کیوں تغزل کا نگہیاں نہ ہے غم میرا
باغ میں کوئی ٹھکانا نہیں ملتا، نہ ہی
دوستوں کی بھی کہیں قدر نہ مٹ کر رہے
ہے دیے گریہ خونیں نے مجھے بھول ہی بھول
چشمِ ظاہر میں تو اک خاک نشین لیکن
باغ ہو دشت ہو یا راگداز ہو کوئی
حرک صحرا پہ نہیں ختم مرا عزم صمیم
یہ تو ہے کفر محبت ہی کا فیضان لے چشما
کہتا ہے وہ ظالم، مری فریاد کو کس کو
کچھ پاس کر اس فصیح کا لے رحمت بارگاہ
تیرا ہی کوشش ہے یہ لے شان کو بھی
غم کی غمی تو پھر بھی تلخی تھی
بھرا الفت میں ہو گیا جو غرق
روداد ہو فلک پہ مرانا لے اسے افرات
حال کیا جب وقت ہی اس سوچ میں گرا
ہم تو سمجھے تھے کہ انصاف لیگا ہر جہز
وہ جو دور رس طاعت تھا، اسے بھول جاؤں میں کس طرح
دی دہ تو جانِ حیات تھے، جو سنہی خوشی میں گور گئے
کھنکھوس ہی ملتا مرکا بے بادی پر
مری بیکردی کو بھی، یا اب بنا دیگا تو جاوگا
کہوں شرع جنوں کی نہ خود مراد کی عقل

انتخاب کلام

ہاں دہر تو ہیں، مگر یہ حال ہے
 میری باتیں سن کے دعا عطا کرے کہا
 کیا خودی تو عید ہی کا نام ہے
 ہے صدائے قلقل میں نہ ہی
 مرسلہ اول کا ہوا تم دار کون
 نہ ملی اس رخ روشن کی مکمل تشبیہ
 عیب کے ڈھونڈنے والے کا ٹھکانا تو ہیں
 زندگی کا ہے سفر یا کوئی چکر اسے جوشن
 جینے کے لیے شرط ہے دنیا کی تباہی
 یاس میں لب پر اب فقاں بھی نہیں
 کیوں کیا دیر سے حسرت کا سفر
 حسن کا جو رنار وا تو نہیں
 شمع کیوں ایسی بات کہ جائے
 جام لے کر کہا، یہ زاہد نے
 سخن ہو ہر ماں، یہ ممکن ہے
 رنج و غم میں بھی خوش رہنے خوش
 دل کو فرحت بخشا ہے دعا غمٹ جانے کے بعد
 دودھ کر دیتا ہو راہ شوق کی تار کجیاں
 قدامت پسندوں پہ کیوں نہیں رہے ہو خدا کی قدامت پسندی دیکھو
 ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں برس سے وہی لکشاں ہو رہی چاند تارے
 نہ غم مجھ کو خود اب رنج و بلا کا، نہ محتاج ہوں میں کسی نافر کا
 سیٹھے کے موجوں کی ڈوسے پھا کر، چلا جا رہا ہوں کٹامے کنارے
 بحث میں دہلیوں کو طعنت آتا رہا
 مجھ کو دل، میں دل کو سمجھاتا

اُن کی محفل میں دل پُر اضطراب
 اپنی ہی ضد کی دل بیتاب لے
 سوزِ غم میں دیدہ حرکام آسکتا نہیں
 منظرِ تصویرِ دردِ دل مٹا سکتا نہیں
 میری روحانی کاحالِ سداورِ محشر نہ پوچھ
 ایک بھی پالانداہت کا مکاں میرے لیے
 ہے اگر راہِ طلبِ تاریک تو پرواہ نہیں
 دلوں دیتا ہوں تجھے یا رب! میں اس غصے کی
 اس سوہم سے کہ عید میں آئے نہ کچھ خلل
 بے فائدہ، اسے دل بند ہو زوروں کے حویں اور

جو مرگ ترے در کا چارہ ہی نہیں اور
 ساقی! مجھے اتنا بھی نہ باتوں میں بھگلا تو
 شیشے میں نہیں اور، تو غم میں بھی نہیں اور؟
 میخانے کے در پر بھی ہوں مجبورِ عبادت
 کچھ کے لیے لاؤں کہاں سے میں جبین اور!
 سوزِ شِ داغِ دلوں سے نظر آتا ہے مجھے
 بھونک دیگا یہ چراغِ تر داماں مجھ کو
 ہوں سیرِ گلستاں ہے، خدا خیر کو ہے
 خواب میں بھی نظر آتے ہیں بیاہاں مجھ کو
 آج وہ شانِ کوہی ہیں دکھانے والے
 کہیں رسوا نہ کرے شکی دامان مجھ کو

روح کا دل کا بیکر کا، لوگ سب جانتا اور
 دس آگاہے خدا کے کھاٹ کا پانی ہے

نقابِ کلام

دیکھئے، بدنام کرنی ہے کسے اسے پسند گو

تیری نادانی تجھے، یا میری نادانی مجھے

ہماری تقدیر جبانے، یا تری تیج جفا

ادرا کھجی پیسا ہے کس کس گھاٹ کا پانی مجھے

داغ غم، داغِ الم داغِ متا دل میں ہے

اتنی قسموں سے بھی رہتا ہے اندھیرا دل میں

عرشِ اعظم سے جو اتری تھی، پلا دی مجھ کو

آگئی موجِ دل ساقی دریا دل میں

کہیں آگ لگ نہ جائے مرے شعلہ بیاں سے

جو گوار گئی ہے مجھ پر، نہ سنو مری زباں سے

بھی آئی ہے جن میں، تو کیا ہے طوفِ اسی کا

رہا برق کو عقیدت مری شاخِ آشیاں سے

وہ فلفلہ بھی کچھ کہینگے، تو وہی بجا رہے گا

جو نکل گیا زباں سے، وہ نکل گیا زباں سے

پ کیا پوچھتے ہیں قیمتِ خود داری دل سادی دنیا کی بھی دولت مجھے منظور نہیں

پارنائی پہ اگر ذکرِ خدا ہے موقوف کسی بے کیف عبادت مجھے منظور نہیں

حق کی دنیا میں دیکھی ہم نے دنیا ایک اور رشتے زبیا میں نہاں تھلنے دیا لیکھا

شق نے ہم کو زیا رنگا و عالم کر دیا گردِ غم سے ہو گیا تعمیرِ کعبہ ایک اور

شرکاء حضرتِ واعظ! یہی مفہوم ہو زندگی کے بعد دیکھینگے تماشا ایک اور

یہاں شامِ غم کا شکوہ نہیں ہے راہِ حلیب میں واجب

یہی اندھیرا بینکا دہیز، اسی سے کچھ روشنی ملیگی

ہر کام پہ آفت ہے مصیبت ہے، بلا ہو ہستی مری نظر دل میں گناہوں کی سزا ہو

سے مست و حوش! یہ جوانی نہ رہی جس حصہ پناہ ازاں ہے وہ پر توں رہا ہو

انتخابِ کلام

سلام شوق پریموں دل کی حیرانی نہیں جاتی
بڑے انجان ہو، صورت بھی پھیپانی نہیں جاتی

بڑی تاثیر والے تیرے دیوانوں کے نامے ہیں
چمن دالوں نے بھی اپنے گمرباں بھاڑ دیے ہیں

براخان ہونہ ہرگز دہنڑوں سے راہِ الفت ہیں
جو اس رستے میں لٹ جائیں بڑی تقدیر والے ہیں

کارِ ناتوانی سے یہی مقبول ہوں یا رب !
یہ چار اشکِ ندامت بھی مصیبت سے نکالے ہیں

سینے تلے کی ہو زندگی تارِ یک تار کی
ہمارے غم کے میں دن نہیں اتنی ہی ہیں

شکستِ انجامِ قیس کو گن ہی کو نہیں دیکھا
بساطِ عشق و الفت پر تو ہر شاطر کو ہائیں ہیں

کہا تم نے، نائیں نے اب اور اتنا بتا جاؤ
یہ طے ہیں کہ باتیں ہیں یا فقرے ہیں گھٹائیں ہیں

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جا سکتی

بدگماں چوں تجھ سے اے عروا
سچ بتا، مجھ کو کہاں لے جائیگی

یہی ہے نظارہ تو مجھ پر نظر ادا، نہ شاقِ جہاں نہ شاقِ جلال
یہ دھندلا سا پر تو یہ مستور جلو، برابر ہو کم کو تو دیکھا دیکھا

جو وہ جھٹھیں دیوانگی میں، تیری بیریخی کا گلہ میں قد دان ہوں
مڑا تو لے احسان مجھ پر کیا، تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا

محنت کہاں یہ تو بچا لگے، شمع بھی نہیں پھر کوم اس کو کھیں
یہ جبر کس لیے کر لیا ہے گوارا کہ اس کے سو کوئی چارہ نہ دیکھا

تھیں خوش، ہم خوب پہلے تھے، تمھاری بلاؤں میں تھے
کہاں تم، کہاں پارنائی کا جامہ، کبھی ہم نے ایسا دکھا دیکھا

مرے دل کو اس کی تلاش ہو، جسے ہم بھی نہ دکھا سکے
اس بے نشان کا خیال ہے جو خیال میں بھی نہ آ سکے

انتخاب کلام

یہی انتہا ہے کہ اے خدا! مجھے حشر سے تو معاف رکھ

وہ تب سے حضور میں آئے کیا، جو کسی کو منہ نہ دکھا سکے

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی، یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی

اسے شوق دید عطا کیا، جو نگہ کی تاب نہ لاسکے

نادانی سے شیخ و برہمن خود کو رسوا کرتے ہیں

ایک ہی منزل کے یہ مسافر ناحق بھگڑا کرتے ہیں

بپنے بچوں کو یہ ناگن مار کے خود کھا جاتی ہے

کس امید پر دنیا والے، دنیا دنیا کرتے ہیں

قضا کو جیتنے والے بھی تہمت ہار بیٹھے ہیں

ابھی تو گلشن جنت کے ہم حقدار بیٹھے ہیں

ترے سکے جو دل پر اے جمال یاد بیٹھے ہیں

اٹھا پرہ کہ لاکھوں طالب دیدار بیٹھے ہیں

نظائے پر جو تیرے تیرے عیار بیٹھے ہیں

جہاں شیخ کی میلرٹ اس میں چل نہیں سکتی

ہم اٹھ جائیں تو اٹھ جائیں مگر یہ اٹھ نہیں سکتے

دکھا جلوہ کہ خلقت منزلیں طے کر کے آئی ہو

اٹھائیں سست بنیادوں نے عالیشان تعمیریں

قضا رہنے بھی دگی ان کمبختوں کو مکاؤں میں

خدا جانے، صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے

کہ پروں کلپنتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں میں

موت کی اد کا خطر ہر فرد کو ہر گھر میں ہے

یہ بڑا اک عیب اے دنیا! تری چورس میں ہے

شیخ سے کچھ ضد نہیں ہے، برہمن سے کد نہیں

دیر د کعبہ دونوں کا جو ہر مے ساغر میں ہے

نقشِ الفت مٹ گیا، تو داغِ الفت ہی رہتا

شکر کو اے دل! کہ تیرے گھر کی دولت گھر میں ہے

منہ سے اُن بھی تو کہ نہیں سکتے

خون افشانے والے نے مارا

انتخاب کلام
زندگی چین سے گزرتی تھی چشمِ نظر رہ باز نے مارا
رہا خوش نظر حسرت کا باب اول سے آخر تک
پڑھی کس نے جنت کی کتاب اول سے آخر تک
رہا اس تک نہ لکھا اس نے کوئی ربطِ باہم کا

بہت سیر بٹا ہے خط کا جواب اول سے آخر تک
میتِ خاک ہوتا زندگی میں لطفِ تہنائی

گلشنِ دہر میں بہنا بھی ہے اک جرمِ خبیث
ہر گلی بھوکہ دکھاتی ہے دہن کے کھٹے
جا بجا کس نے بہائے ہیں لہو کے آئینو
نظر آتے ہیں بیا بیاں میں چین کے کھٹے
ہم سے پوچھے تو کوئی ان کی وفا کی قیمت
بیوفا ہو گئے جو کھلے دہن کے کھٹے
مجھ کو بچا لیا اب شیریں کے فیض نے
باقوں میں تم نے زہر طایا ضرور تھا
موتی کی چشمِ شوق دیکھی طالبِ جلال
ہر رنگ و رنگ آئینہ برقی طور تھا
دعوتِ قدس نے سن لیا اب یہ مجھے بتا ہے
آئیں اگر وہ سامنے ذوقِ نظر کو کیا کہ
دور کر دیتا ہوا ہوشِ شوق کی تاریکیاں
سمجھ بن جاتا ہے ہر پردہ اہل جانے کے بعد
ماؤں پر بھی اٹھی ہیں ہر طرف سے انگلیاں
جو کوئی دنیا میں آیا اس کی رسوائی ہوئی
میری ذاتِ غیر فانی میں فنا کو دخل کیا
دیکھ کر کس رُخِ دیکھیں کو میں یہ ہوشِ مہیا
لے اہلِ بائی جہاں تو کس کی بہکانی ہوئی
دیکھ کر کس رُخِ دیکھیں کو میں یہ ہوشِ مہیا
ہر گلی تر بھیجے دامن کی ہول دیتا ہے
جس نے کچھ ہوشِ سنہالا دی دیر نہ ہوا
عزیزِ مطلب پر وہ گھبرا کے یہ فرماتے ہیں
چار خوفوں کا یہ شکوہ تھا جو افسا ہوا
بتائی فراق میں سو یا ہی کون تھا
اسے خودِ خضر! جامری بالیس سے دور ہو
متمنت میں مغفرت ہو تو یہ بھی عجیب نہیں
گمِ دفترِ حساب سے فردِ قصور تھا
گمِ دفترِ حساب سے فردِ قصور تھا
لال کی جو پوچھو تو نہیں خضر بھی لال
جیتا اُسے آتا ہے تو مرنا نہیں آتا
دلوائی بھی وہی ہے کجِ ادائی بھی وہی
آپ ہی کا رنگ دیکھا آپ کی تصویر میں

خطابِ کلام

دنیا خوفِ حقّی، بارِ غم، فکرِ معاش
 ایک جانِ ناتواں پر سو عذابِ زندگی
 بالی کو بھی یہ کیا لے سانی بزمِ حیات
 موت کے ساغر میں بھر کر دی شرابِ زندگی
 لئے، محشرِ خرامی کے فدا کی اٹھ گئے
 اب ڈرا چلنا زمانے کی ہوا کو دیکھ کر
 وہ حلقے بن گئے ہیں دیدہ پر یاس کے
 میں نے جو پھندے لگائے تھے ماکو دیکھ کر
 دنیا کا مزہ شاید اسی پر ختم ہے
 جو بلا آتی ہے، جاتی ہو مرا گھر دیکھ کر
 آئینہ رو یا تھا انجامِ سکندردیکھ کر
 انسو تھے جو رخ پر آبِ بن کر کو گئے
 ناداری، ہی غیبت سے پسند آئی تھی
 اوزی انسان کے جھٹے نابرا دیکھ کر
 پتھر نہ پڑے غیب کے اسے حضرت جو گدا
 آپ کھلے تو ہیں آئینہ دعویٰ لے کر
 بات ہے، دیدارِ تمہارا نہیں تو ما
 روشن مری قسمت کا ستارا نہیں تو ما
 بزم میں رنگینی صحبت نہیں رہتی
 جس بزم میں کچھ ذکر ہمارا نہیں تو ما
 راز کی باتیں ہیں سنا میں اسے کیونکر
 تنہا کبھی وہ انجمن آرا نہیں تو ما
 میں ڈوبے ہوئے دل کا ٹھکانا ہو کہاں
 یہ بھی حکمت تھی کہ ناکام تمنا ہو کیا
 شہدِ اہلِ محفل ہے بہت ناگفتنی
 شمع کو معلوم ہو سب کچھ، مگر خاموش ہو
 شکوے کے کیا حاصل کہ ہر جو غم صفا
 برائی اس جو سکتے ہیں اکثر خواہوے میں
 میں مجھ کو دیکھ کے وہ تیز ہو گئے
 چیلنے لگی زبان بھی تلوار کی طرح
 انکار پر چمڑواں! کچھ شک گزرا ہو
 ایسے جاتی ہے تو مجھ کو کدھر آہستہ؟
 بھول برساتے ہیں مجھ پر سینکڑوں پتھر کے آہ
 تمنا ہوں میں اس رشک کے مانند
 مرتے ہوئے عاشق کی جو آنکھوں میں کاہ
 اور گرجا میں نہاں نغمہ عید کا
 ہر اشکِ خوں ستارہ ہو صبحِ امید کا
 یا بھی ہوئے درد کی خاک بھی پھاتی
 ترا مزاج نہ اسے گرو دشمن زمانہ باطل
 تو یہ ناز کی اور اس پہ اتنا بارِ حسن
 عاشقوں میں بیٹھ کر شکوہ کرو نقدِ برکا
 جبہ جان لب پڑے مافق ہو چکی
 لبِ سادا بھر سچی کاکنارا ہو گیا

کرباعیات

آئام کو پابستہ آلام نہ کر راحت کو اسیر ہو جس غلام نہ کر
ہر صحت سے اٹھکیاں اٹھکی جی مجھ پر اسے نام کی خواہش! مجھے نام نہ کر

مشکل کا یہ اصرار کہ اب کام نہ کر مقصد کی یہ تاکید کہ آلام نہ کر
اٹھ بانجھ لے بہت کی کر لے نازاں آفاذ کو شرمندہ انجسام نہ کر

دنیا میں جسے کب آ ل آتا ہے دولت ہی سے قدر و منزلت پاتا ہے
درد اور کس عیب میں بھی ہے سخن قبول بے زور کا ہنر بھی عیب سے جاتا ہے

تقدیر جب آبِ زر سے منہ دھوتی ہو آلودہ وہ گر و غم سے کب ہوتی ہے
نردار کے گھر میں بچ و غم منہ سے ہیں نادر کی دنیا میں خوشی روتی ہے

آموں کا شکریہ

میں گوشہ نشین ہو کے بھی گناہ نہیں میخانہٴ فخرت میں تہی جامِ ہنیر
ساتھ نے بھی امتیاد سے کام لیا بھیجے ہیں جو کام، خاص ہیں عام ہنیر

دنیا کو منہ و قرار کھو کر نہ دکھا جو ہر اپنا ذلیل ہو کر نہ دکھا
عالم کو دکھا تو آبِ داری اپنی لیکن کبھی آبرو ڈلو کر نہ دکھا

انی ہی سہی، یہ عمر باقی نہ سہی
پینے کی ہوس بھی خوش مذاقی نہ سہی
مگر دنِ دنیا کو جھکا دو سرِ حرام
مخمل میں، اگر نہیں ہے ساقی، نہ سہی

اجنبے میں کہ پار سائی کیا ہے!
اس کے لیے دجل ب کٹائی کیا ہے!
جا نہیں جسے نامِ خسر اکا لیسکر
اس جامِ شراب میں بُرائی کیا ہے

نہ ہے کئے کو آتش تر کیے
تا ہے مگو یہ آسمانوں کی خبر
دو جب ہے کہ پگھلا ہوا جو ہر کیے
اس پر تو یقین، تو ہمیں برہنہ کیے
عقولِ حیات

جنگ میں بھی جان کے نقصان کا خوف
نہ سب سے بڑی مصیبت ہو تو یہ
مدیا کے سفر میں بھی ہے طوفان کا خوف
انسان کو کھار ہا ہے ان کا خوف

م دسکوں عشق میں کیا بل سکتا!
زودیسود اور منتر بیکار
کیا غنچہ اُمید مرا کھل سکتا!
کیلے بھی ناگ نہیں بل سکتا

محبت کا پرستار بھی ہو
ہے اگر رحمتِ باری کی طلب
اشفاق و مروت کا خمیرا بھی ہو
اس کے لیے تھوڑا سا گہنگار بھی ہو

ناہستم کی چوٹ سہ سکتا ہو
میں جو لاتا نہیں بیچنی کو
طوفان میں بیخطر جو یہ سکتا ہے
دنیا میں دہی چین سے رہ سکتا ہے
کو سمجھنے میں خطا کوشش میں سب
نہ ہی پہ بوجھارِ طامس کی یہ کیوں!
یہ راہ جو بچھو کھی، تو خاموش ہیں سب
میٹالے کے! ہر بھی تو بیہوش ہیں سب

حق بات پر یہ دہم کہ باطل تو نہیں ^{آفتابِ کلام} اکیر سے خدشہ کہ جلاہل تو نہیں
 دیکھا ہے زمانے کے چلن کو جب سے ہر دوست پر شک ہو کہ یہ قاتل تو نہ

جب منزل مقصود نہیں پاتا ہوں کوشش کو نئی راہ پر لے آتا ہوں
 پہلے تو خدا کی جستجو ہوتی تھی اب اپنی ہی جستجو کیے جاتا ہوں

راحۃ میں جو گزرتے وہ زمانہ اچھا غم کا حساب نہ خوشی کا آتا ہوں
 لیکن دل مضطر کا ہے عالم ہی کچھ آؤ آنا اچھا نہ اس کا حساب آتا ہوں

شاعر کے لیے شور مچانا بھی جنوں پینا بھی جنوں اور پلانا بھی جنوں
 کہتے ہیں کہ نئے سے غم غلط ہوتا ہے یہ سچ ہو، تو پھر ہوش میں آتا بھی جنوں

پیرِ کلمہ میں طبیعت کی جوائی کیسی! ٹھٹھکے ہوئے خوں میں ودائی
 امید نہ رکھ زویریاں کی مجھ سے طاقت ہی نہ ہو تو پہلوئی

نظمینی

معالج انسانی

۱۔ ہمارا حسن کے جو یا! کبھی جو یا بھی ہو
 نہ کوئی نہ رہ جائے دل پر شوق میں
 ۲۔ میں اپنی پہچان کا انکسار دھجے
 نامانی پہ لے کر دغیم الفت کے لڑخ
 ۳۔ میں وہ حسن پسند اگر کہ دریاں ہونے لڑ
 یا قیاساً ہر مقصود کا یہ قول سن
 ۴۔ عبادی کا شجاع سے بھی ہر توبہ بند
 بت قربانی حسن اسوا پر ہو چکا
 ۵۔ ہر مقصود کا پانا تو کچھ شکل نہیں
 ان تاب و توال پر ناز کرنا چھوٹے
 ۶۔ ہر قسم میں تقدیر کی کبھی پروا نہ کر
 ۷۔ الفت گہنائے ترس سو کہہ کر کاٹا بھی ہو
 خورشید دریا بھی ہو، خاصوشی صحران بھی ہو
 ۸۔ شان تیری اس میں ہر قطرہ بھی ہو دید بھی ہو
 صحبت احباب میں اجلا بھی رہے میلا بھی ہو
 ۹۔ ہالہ مجنوں میں کچھ رعنائی لیل بھی ہو
 طالب صادق میں ہشیاری بھی ہو ثواب بھی ہو
 ۱۰۔ اس میں کچھ ہوا نیاں ہوتی ہوں تو رہا بھی ہو
 اپنے حسن انجمن افراد کا شیبہ بھی ہو
 ۱۱۔ قتلے سرگزی سے منزل کو کبھی غوٹا بھی ہو
 دوا شہر حرا دت کا اگر ادھیسا بھی ہو
 ۱۲۔ تیرے حق میں وہ برا ہو یا بھلا جیسا بھی ہو

ہر دم داغ داری دپائے ترا معذرت
 ہر نصیب خویش نازاں شو کہ منزل و نہایت

بہشت

پھر نسیم جا بجا فرش گل بچھا گئی
پھر نوید زندگی سب کو گد گدائی
پھر ہمارا پھول کو تخت پر بٹھا
پھر اداسے دلبری معجزہ دکھا
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر ہوا ہے خیمہ زن کاروان رنگت
پھر زمین باغ ہے آسمان رنگ و لہو
پھر کلی کے لب پہ ہے داستانِ رنگ
پھر بے نعل طور پر آشیانِ رنگ
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر مرے کریم نے گنجِ زلٹا دیا
پھر جہاں آرزو دلِ سرا بسا دیا
پھر چمن کے فرخ کو عرش پر بٹھا
پھر حرمِ ناز کو آئینہ دکھا
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر سرو کی گھٹا چھا گئی ہے چار سو
پھر صدائے زلزلہ کو گونجتی ہو چار سو
پھر فضا نے دہریں دلکشی پہ چاڑھ
پھر طرب ہو جا بجا پھر خوشی ہو چاڑھ
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر خمارِ زندگی کیف میں بدل گیا
پھر فسونِ فصل گلِ میکشوں پہ چل گیا
پھر سرو و سرمدی محبوبِ متا نکل
پھر حقیق دیکھیے بوتلوں میں ڈھل
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

بست

بہارِ صبحِ دل کٹا بست بن کے آگئی
 نصیبِ صحنِ باغ کا جو سوراہا تھا سوچکا
 اب اپنے صحن پر فنا خجری بھی ہے جبر بھی ہو
 بجاہِ شوق آج پھر دل پر آرزو ہوئی
 پھر آج دہگن سترن نظر لڑا ہو گیا
 عین کی شاخ شاخ پر طیورِ نعمت زن ہوئی
 ہر ایک شے میں زندگی ادا ہے تازہ ہوئی
 منکبے سے برہن جو ہو کے بقرا اٹھا
 نظر کا ذوق جستجو جن میں چند زن ہوا
 ہر ایک گل ہے باغ میں عروجِ فنا اٹھا
 نمودِ حسن کی گھٹا سرور بن کے چھا گئی
 خزاں کا جو رہو چکا، خزاں کا دور ہو چکا
 کمالِ شانِ دلبری ادھر بھی ہوا دھر بھی ہو
 رہیں سیرِ گل ہوئی خدا نے دہگن لہو ہوئی
 پھر آج برگِ باسمن حرمِ ناز ہو گیا
 نئے حسن بن تھے فروغِ انجمن ہوئے
 شگفتگی میں تازگی کر شمشاد ہو گئی
 بہارِ بزمِ دیکھ کر ہری ہری پکار اٹھا
 یہ خندہ دہگن بن گیا گلوں کا پیر ہوا
 دینِ گلستاں ہے یہ کہ آسمان ابر تھا
 حیاتِ تازہ مل گئی تمام کائنات کو
 طیور کو ہوا م کو جاد کو نبات کو

برسات

ہوتی ہیں نو بیکہ برسات کی گھٹائیں رکھتی ہیں خاص منظر برسات کی گھٹائیں
 کتنی ہیں روح پرور گھٹائیں کی گھٹائیں تم بھی تو دیکھو اٹھ کر برسات کی گھٹائیں
 کیا جھومتی ہیں سر پر برسات کی گھٹائیں
 ضبطِ لوا کے صدمے کتناک ہے پیہا یکشن چہک ہے ہیں کیوں چپے چپے
 طوفانِ رنج و غم میں اب کیوں پیہا اب کیوں نہ مست ہو کر پی پی کہے پیہا
 برسا رہی ہیں ساغر برسات کی گھٹائیں
 اک فیل تیز رو ہے نبیل کی ہے عداوی چلتے ہیں ارڈلی میں دلِ بالوں کے بھاوی
 لیکن گھلانہ ہم پر یہ کس کی ہے عداوی کس برقِ دیش کے رُخ کی کرتی ہیں پڑھ کر
 تلتے ہوئے ہیں چادر برسات کی گھٹائیں
 کس شان سے سجا ہے بزمِ طرب کا ماہا اُمیر کا اک اکھاڑا دنیا میں ہے ناہا
 میر کا پوچھتے ہیں عالم کے حزن و اہا سقفِ فلک کے نیچے یہ پہنچتی ہیں پوٹا
 پکاٹتی ہیں پتھر برسات کی گھٹائیں
 سینے میں دم تھا ادا چلتے ہیں بھولتا ہو اس قدر ناز کی کو بندہ قہر تھا ہے
 لیکن ادھر تو دیکھو، دلِ غم کو بھولتا ہو جھولے بٹا رخ گل کے ہر بھول جھولتا ہے
 رقصاں ہیں اس کے سر پر برسات کی گھٹائیں
 نانا پکاپ حضرت کیوں شرمے نہیں کیوں خوشدلی کے جد جلتا ہے شرمے نہیں
 ہر لعل کے دیکھو جل تھل تھلے ہونے ہیں غراب ہر جمن ہے، بھگل ہر بے ہونے ہیں

انقباط کا لڑا
 برسی ہیں آج گھر گھر سناٹ کی گھٹائیں
 اپنے ہنر کا حضرت! کچھ نقش بھی بھگاؤ
 اس بزم میں نہ تائیں یہ وقت کی اڑاؤ
 حب وطن ہو جس میں وہ گیت بھی سناؤ
 دھڑکتا کو، جوش! چھوڑو، کچھ دس میں سناؤ
 چھائی میں بند رہو، براہ راست کی گھٹائیں

جوش طلب

فقرِ دل کی سن لے صدا، ساقیا! سخاوت کے جو ہر دکھا، ساقیا!
مرا می دہم سے چھپا، ساقیا! پس و پیش کو تباہ کیا، ساقیا!
نگی ہے جو دل میں، بھیا ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
یہ دانا، معن چمن پر نگار یہ گلاب تر کا رخ آب واد
یہ سبزہ، یہ گلشن، یہ فصل بہار یہ ہوئے کا سایہ لب جو پیار
یہ سادوں کی ٹھنڈی ہوا ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
خدا کے لیے بخل امتنا نہ کر دکھائی کی باتیں زیادہ نہ کر
نئی ہے تو سائے سے جھگڑا نہ کر یہ شوخی، یہ تکرار، یہ جھباہ نہ کر
مسافر نوازی دکھا ساقیا!

پلا، ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
نماد کوئی گل بھلانے کو ہے خنداں باغ ہستی میں آنے کو ہو
قصا اپنا خنجر چلانے کو ہے فلک ایک بھلی گھرانے کو ہو
تو قن نہیں اب روا ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
مخلق کی زندگیوں کو عداوت نہیں لوازم کی چنداں ضرورت نہیں
بجز مے کسی غم کی حسرت نہیں ہیں جامِ دریں کی حاجت نہیں

اتخاب کلام
ان آنکھوں کو سنا غریبا، ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!

ماننے کا رجو اور گردش میں ہے سستا روں کا بازار گردش میں ہے
لم ہے کہ پر کا و گردش میں ہے تری چشم سرشار گردش میں ہے

پیالہ بھی گردش میں لا، ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!

سار جو انی کا ایسا یہ ہے نمودِ سحر کا تقاضا یہ ہے
مراگ تشنہ لب کی تمنا یہ ہے ہر اک موجِ مے کا اشارا یہ ہے

فقیروں کی سن لے صدا، ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!

غریبوں کی دنیا

کردی دھوپ میں شامِ عشرت نہ ڈھونڈو شبِ فہم میں نورِ مسرت نہ ڈھونڈو
جہنم کی آنچوں میں جنت نہ ڈھونڈو خوشی کے گھر میں سعادت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کے گھر میں مسرت بھی غم ہے غریبوں کے راز میں امرت بھی کم ہے
غریبوں کی گردن پہ تیغِ ستم ہے غریبوں کی ہستی نہیں اک دم ہے
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

خطا ہو کسی کی، گرفتار یہ ہیں تصورِ اور کا ہو، گھونگا یہ ہیں
شفاحی سے بھاگے وہ بیارہ ہیں نہیں جن کا چارہ، وہ ناچار یہ ہیں
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

ہاں بندِ اللہ پر مروت کی راہیں وفا تو بنا ہیں، تو کیوں محرومِ نایاں ہیں
ہمیشہ خاک پر ہیں اللہ کی نگاہیں قیامت کے اے قیامت کی آہیں
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کی لغزش سنبھالتے نہ دیکھی اتھا با کلام قضا ان کی بالیس سے چلتے نہ دیکھی
 کبھی پھانس دل کی نکلتے نہ دیکھی کبھی نبض صحت سے چلتے نہ دیکھی
 غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
 غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

مغلس کی عید

ایک مغلس عید کے دن روکے یہ کہنے لگا
 جو مجھے دینا تھا وہ دفتر میں پہلے لکھ دیا
 پہلے یہ دیئے عشرت، پہلے یہ عیدِ نشاط
 گلو گئی ہر پاؤں پر شرم، تہی دہی سے آنکھ
 ایک توقیدِ نفس، اداس ہے یہ بے پالِ پری
 شوہر عشرت سے بھی اس کی آنکھ کھل سکتی نہیں
 چاروں در و فلاکت میں کروں تو کیا کروں
 اے مرے مذاق، ہر صحت میں کھن تو کیا کروں
 دہلی جاتی، جو طبیعت، صحت کو تو کیا کروں
 روئے ساقی کی زیارت میں کروں تو کیا کروں
 بارغِ سک اڑنے کی تمہیں میں کوئی تو کیا کروں
 بختِ خواہیدہ کی مشیت میں کروں تو کیا کروں

”بہرِ خوارِ لبیک سرگرم ملاشتم کردہ اند
 پارہ نزدیک در ہر دور ہاشتم کردہ اند“
 (غالب)

ترا دیوانہ

مہو جی کش ہوا سے سا غرو میں لائیں مبتلا ہو
کوئی دوزخ میں کوئی جنت لاندہ میں مبتلا ہو
فرشتہ نور بن کر عالم بالا میں رہتا ہے
نگلشن ہی میں رہتا ہو، نہ دھڑلے رہتا ہے
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

نظر کے سامنے جو کچھ ہے، اسکو اسو سمجھے
حرم کو بتکے کے کو وہ کسی کا نقش پا سمجھے
جسے ہما ہوتا کہتے ہیں، اس کو ابتدا سمجھے
کوئی یہ بھید کیا جانے کوئی یہ اڑ گیا سمجھے
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ خندہ دہی ہو علم و حکمت پر نواں اس کا
کوئی غمناک نہ معنی ہے جام داڑ گول اس کا
دائے بھروسہ کیل ڈالنے والا سکول اس کا
گلے آگ ہفت افلاک میں نہ دڑوں اس کا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

چمن کو شہر کو، بستی کو، دیرا دسمجھ لینا
بیان دوزخ و جنت کو افسانہ سمجھ لینا
خوشی کی پیش کی محفل کو غمناک سمجھ لینا
خوف سے ہوش سے دنیا کو بیگانہ سمجھ لینا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ اس کی چشم قرعے آنسو سکو اتے ہیں
ہمیشہ اس کے تارے نغمہ شیریں بناتے ہیں
ہمیشہ اس کے فقرے کی قسم مٹوا کھاتے ہیں
ہمیشہ اس کی پُر روشنی سے انب فیس پاتے ہیں
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

جہاں جگت ہو کہ داخل کیا اس کی طبیعت میں
جگہ پائی نہیں جنت بھی اس کے بغیر فطرت میں
نہا سوسہ، شہر شش ہواں کے خوش فضا
اس دنیا کی حسرت میں نہ اس دنیا کی حسرتوں
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

صداقت کی باتیں

محبت کا رتبہ نہ کم جانیے گا
اسے چشمہ زندگی مانے گا
بہت ہو چکی بحث کھوٹے کرب کی
زیادہ نہ اس بات کو چھانیے گا
خدا کا نقطہ نام جانا، تو کیا ہے !
اسے جاننے کی طرح جانیے گا
گلے ہیں نا اتفاقی نے چسے کے
یہ بر بھی نہ سمیٹے پہ اب تانیے گا
محبت کی صورت تو پہچان لی ہے
مگر اس کی سیرت بھی پہچانیے گا
محبت، مروت، کرم، فہرہ بانی
انہیں چار کو کیا جانیے گا
ارادے میں لغزش نہ آئیگی ہر جگہ
ارادہ ہی دل میں اب ٹھانیے گا
غریبوں کے دکھ کی دوا تو بنو گے
مگر نہیں بھی انکی پہچانیے گا

سلام

لو، آگے عباسِ دلا دلبِ دریا
 کہتے تھے ہر اک موج کے تیر لبِ دریا
 بانی کئی کونہ دیا اہلِ ستم نے
 محمد اب بھی اہداسے یہ کہتے تھے بہ آواز
 کیا تشنگی شوقِ شہادت تھی کہ عباس
 دشمن کی صفیں در سہم و برہم تھیں کچھ نہیں
 اس غم سے کہ تجوں کو بھی ملنا نہیں تھا
 اک سمت نقطہ چند نفوس اہدہ پایا
 وہ سرد مزاجوں کے مظالم سہریا
 طکیزہ بے آبِ حیات کی روداد
 کس دل سے سُنے انکی حسیّت کوئی اے جو تھیں
 پیاسے ہی جو مر جائیں تڑپ کو لبِ دریا

ہنسنا گاندھی

رہنما اس دین میں آنے کو آئے سینکڑوں
 اپنے پیٹے بول دنیا میں سناٹے سینکڑوں
 روح انساں ہی پر لیکن بحث فرماتے تھے
 زندگی بھر ایک اسی نکتے کو سمجھاتے رہے
 سامنے ان کے تھا آزادی کا پہلو ایک ہی
 راحت و تسکین دل کی تھی قواعد ایک ہی
 شیخ بھی ہم کو ہی اسرار سمجھاتا رہا
 محبت مندر میں پر نہیں بھی مٹھاتا رہا
 روح کو آزاد کرنا ہی رہا ہمیشہ قفس
 جسم پر چھریاں چلیں اس کاہ تھا دل پر اثر
 تھی ہنسنا بھی فقط راہ حقیقت کے لئے
 آج تک برتاؤ تھا اس کو سیاست کے لئے
 وہ فقط گاندھی تھا، اعجاز جس نے کھدیا
 روح کے ہر نقش میں رنگ ریاست بھر دیا
 روح کی تنہا روی بھی اس نے بھر چھوڑ دی
 جسم کی بھی اس نے زنجیر غلامی کوڑ دی

وی جے ٹیل کی وفات پر

عدم کو سدھارے بہت نامور
 یہ دفتر کا دفتر ہوا گاؤں خود
 حبش و مدگی کی صف آرٹیاں
 گھڑی بھر میں شاطر کی بازی ہو بود
 تمنا صبو جی کی بے فائدہ
 خرابات میں اب تو باقی ہے درد
 جدا ہو گیا آہ، وحی جے ٹیل
 سیاست کے میدان کا خرد و گرد
 کوئی مرنے والے سے یہ پوچھتا
 وطن کو کیا تو نے کس کے سپرد

دن کے لیے بخشی ہیں سورج کی دنیا
 دن کا اوجھلاؤ مٹا یا، یارب! ^{مکمل}
 راتوں کے لیے چاند کیا ہم کو عطا
 دنیا سے تو اندر جیتا اس کو کبھی عطا

کوئی زردار، کوئی بے زردیوں ہے؟
 یارب! تری نعمتیں تو ہیں بیش بہا
 کوئی برتر، تو کوئی کم تر کیوں ہے؟
 لیکن تقسیم نا برابر کیوں ہے؟

ایسا یہ کہ شرمندہ کردار ہوں میں
 لیکن اس بات پر مجھے غر بھی ہے
 ہر ایک مقبوت کا سزا دار ہوں میں
 غیروں کا نہیں، تیرا گنہگار ہوں میں

ہے سب سے بلند سرفراز تیری
 کیوں حکم عبادت کا دیا ہو تو نے
 سب پر حاوی ہے کارساز تیری
 کس قسم کی ہے یہ بے نیاز تیری

مصرع: اسے علامہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟ مصرعِ طرح تھا۔ بعض شامیر سے والد کو
یہاں پہلے ہار مشاء خوب خوب داد ملی، خاص کو ان اشعار کی:
کچھ جڑ پھڑکا دق ہو، کچھ اخلاص داد ادا دات

اس سے نہیں کیا بحث، وہ بت ہو کہ خدا ہے
اوست، دعوت! یہ جوانی نہ رہیگی!!

جس حسن پہ نازاں ہو، وہ پر تول رہا ہے

نا اس کا مصرع بھی تھا:

تنگ شیشم، گونظرِ جنت و کوثر کُشم
اس سے قبل شے میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ حسرت موہانی والد کا کلام سن کر
حیران رہ گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اردو سے معیے میں آپ کے حالات اور کلام
شائع کیا۔ پھر وہ جب بھی ملے، بڑی محبت سے۔ وہ آپ کی زبان ذاتی پر دشک کا اظہار
کیا کرتے تھے۔

بزمِ اردو شملہ نے دو تین مشاعرے کیے۔ اس کا آخری مشاعرہ ۱۹۴۱ء میں دلی میں ہوا تھا۔
ایک مشاعرے میں تو آپ سے متواتر تین غزلیں سن گئیں۔ اہل ذوق کا مجمع ہوتا تھا۔
محض سُرताल سے لوگ سامعین کو فریب میں نہیں لاسکتے تھے۔ شعر میں مہمان ہو تو اسے
کس طرح پڑھ لیجیے! سننے والے ہر دور بھرک اٹھتے۔

۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ایک عظیم الشان مشاعرہ صنعتی نمائش کے میدان
میں ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں سر عبد القادر دیوان بہادر راجہ نندرناتھ دونوں
صدر تھے۔ سر عبد القادر کے ساتھ غوثی محمد ناظر کی سر مشاعرہ چلیں میں نے نہیں دیکھی
تھیں۔ سر عبد القادر نے نزل کا پہلا انعام مجھے دیتے ہوئے والد کو سامعین سے تعارف
کرایا اور کہا کہ باپ بیٹا دونوں داغ کی زبان تھے ہیں۔ میرے اس شعر کو ہار بار پڑھا تھا:
دلخدا دل سے گلیا روشنی نہ ملی۔ یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لسیا

اور ساتھ ہی گئی کہ باپ کا داغ کدیاں میں اس غزل کو بھی شامل کر کے پڑھو، تو معلوم ہوا

باداد ہی میں بکنا قسمت میں گر لکھا تھا میرے والد رحمہ صفت مردوں نے پھر کیوں پڑھ نہیں بنا
اس زمانے میں والد معذرات کے پابند نہیں تھے اگر کی جگہ جو بھی لکھتے تھے پڑھنا
میں ہائے سوز کو "الف" نہیں بنانے تھے ؛ لیکن یہ ابتدائی کلام کی باتیں
یہ غالباً ساٹھ سال پہلے کا کلام ہو گا۔

غزلوں کے کچھ غیر مطبوعہ شعر مجھے یاد ہیں انھیں یہاں درج کرتا ہوں :
مے دل کی ترپ نے جان تک چھوڑی نہ قالب میں
بھاڈ والا چو اینا عمر اس پنکے نے ہل ہل کے

سو تو لینے دے ذرا فتنہ عشر ہم کو

اسے کم نعت یہ کیا شوق بجا دکھا ہو؟
مرے چلتے چلتے گھڑی نہ گئی خشبِ غم ڈی کی اڑی گئی
دل سے گئی میرے یادِ بیتاں یہ نعتِ حوم میں بڑی رہ گئی

۱۹۱۵ء میں لالہ رحیم لال نقیصہ داد چند و بیت کی تبدیلی پر دوستوں نے امر کیا تھا
شعر کہے تھے۔ قلم کے چار شعر یہاں درج ہیں۔

دل پریشاں ہوں تو ان کی جھنجھکی پر فزوں جد بند و بیت یہ اک اہل کلا بندوب
اک شکایت پر سرِ مصل کو پیٹنے عزمِ ہم دل ہو نہ خیرِ جد پر اس کا بھی ہوتا بندوب
لطف سے اشکِ جدائی کی پر آمدِ بکد ہو چلتے چلتے کہتے یہ ادا تبا بندوب
خندہ پیشانی سے پیش آتا شاعرِ عام تھا ہم کہتے ہنس کے بیٹھا ہنس کے اٹھا بندوب
اب چند شعر بعد کی غزلوں کے پیش کرتا ہوں :

عطر پس نہ بھلیاں مے داغوں کے سانے جگنوں چمک کے دھواغوں کے سا۔
جانِ نکل بھی تو کوپے میں عدو کے نکلی ہائے خوش اگر مرنا بھی نہ آیا ہم
باتوں باتوں میں جو میں کچھ کہہ گھسیا ہنس کے فرمانے لگے کیا بات۔
پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کے صرف دو شعر یاد ہیں :

وفیات

عارف کے والد قاضی محمد سلیمان عباس صاحب علم بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی فارسی کی تحصیل دیوبند اور دلی کے مدارس میں کی تھی، لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر کہیں ملازمت نہیں کی، اپنی گھر کی ذمہ داری کی دیکھ بھال ہی کرتے رہے۔ اسی اکل حلال پر قانع تھے۔

عارف صاحب یکم مئی ۱۹۰۲ء کو پسوہاری ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بمشکل سلت آٹھ برس کی ہوئی جب ان کے والد قاضی محمد سلیمان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی محسب وخواہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ کالج کھنٹھو سے دسویں درجے کی سند لی اور اس کے بعد گرجھین کالج کھنٹھو میں داخلہ لے لیا۔ انٹر میڈیاں تعلیم پائی اور اس کے بعد کھنٹھو یونیورسٹی سے بی اے کرنے کی ٹھانی، لیکن گھر کے ناساز گھر حالات نے تکمیل کی فرصت نہ دی، آخری سال میں یہ سلسلہ ترک کر دیا۔

پڑا۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہو۔

سیرادقات کے لیے اب انھوں نے کالون تعلقہ دار کالج کھنٹھو میں مدرسہ کر لی۔ یہاں والیان دیاست اور تعلقہ داروں کے ذہنی تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ اچ کالج کے حالات بھی دگرگوں ہو گئے، انو عارف صاحب یہاں کی ملازمت سے استعفیٰ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست ناہرہ اور محمدی تعلقہ (ضلع کیشری) میں صاحبزادگان کے تالیق کے طور پر کام کرتے رہے یہ سلسلہ ۱۵ فاکس ر ہ۔ اس سال انھوں نے آخری مرتبہ غیروں کی غلطی سے غلو خلاصی پائی۔

اس کے بعد انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ بقیہ زندگی اپنی آبائی کاشتکاری کی نگرانی میں لگے رہے۔ اس کے ساتھ کچھ تجارت کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے بیلتر اور ڈ (ریلوے سٹیشن) میں سینک کی دکان کر لی، جس سے بے غفلت تھی آمدنی ہو جاتی تھی کہ عزت آمد کے ساتھ گھر کا اخراج چلی جاتا تھا۔

چند خطوط

استاد محترم قبلہ جو شمس لمیائی سے میری خط و کتابت ۳۵-۴۰ سال سے ہے۔ مجھے بیکار فزوں اور قلق ہے کہ میں نے موصوفی کے بہت سے خطوط یاد نہیں خالص کر دیئے۔ کچھ تو تقسیم وطن کے بعد مجھے اپنے معاملات کی وجہ سے شہر بدر ہونا پڑا یہ طو لانی قسط ہے اور اس میں میرے شباب کی بیشمار کاریوں کو بڑا دخل ہے۔ کچھ بڑے کاموں کا اثر کچھ ایسا شست پر چلا کہ میں دنیا و مافیہا کو بھول گیا، خطوط کہاں یاد رہتے! پہلی زندگی ہی گم ہو گئی۔ آخر جابے امال ملی، تو میں ٹھکانہ کے ایک رسالے "چند" جاری کیا۔ رئیس کا میرے ساتھ تھا۔ جلد ہی اس نے بھی دم توڑ دیا۔ پھر دلی آیا تو پرانے رفیق کنور ہند رنگہ بیدی صاحب مل گئے۔ ان سے وابستہ ہوا، تو یہ کچھ لیجیے کہ پھر دلی نہ چھوٹی۔

یہاں سے پھر قبلہ کے ساتھ مراسلت شروع ہوئی۔ کلام پر اصلاحات کے غور نے تو "آئینہ اصلاح" میں درج ہیں۔ پرانے خطوط اس سے مجھے ایک خط کے ضائع ہونے کا خاص افسوس ہوا، میں آموں کی بیدار کے طور پر ان کی ایک مشہور رباعی تھی، جو قبلہ کے دیوان اول میں طبع بھی ہوئی ہے اور اب تک احباب کی زبان پر ہے:

میں گوشہ نشین ہو کے بھی گنہگار نہیں میخاند شہرت میں نہیں حجام نہیں
ساحر نے بھی اقیاد سے کام لیا پیچھے ہیں جو آم خاص ہیں، عام نہیں
اس رباعی سے میرے اپنے باغ کے آم تو ایک طرف میں خود خورہ جاوید ہو گیا۔ بعد کے